محی الدین نواب

نام کتاب : نیک نام
مصنف : محی الدین نواب
سن اشاعت ۱۹۹۲ء
قیمت : 40/=
مطبوعہ : فائن آفسٹ پریس شاہدرہ دہلی ۳۲
ناشر : کتاب والا ۲۷۹۴
گلی چھوت والی، پہاڑی بھوجلہ دہلی ۶

اس بار مُحی الدین نواب نے ماضی کے آئینے میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ کہانی پڑھ کر فیصلہ آپ خود کریں یہ راہ جس پر آج ہم قدم بڑھا رہے ہیں یہ وہی تو نہیں جو ایک بار پہلے بھی ہمیں مقتل کی طرف لے گئی تھی؟

اس دور کی کہانی جب اپنے بیگانے ہو گئے تھے، زمین اور زبان کو شناخت بنا لیا گیا تھا اور نفرتوں کی ایسی آندھی چلی تھی جو اپنے ساتھ برسوں کی محبتیں، رفاقتیں، رشتے، ناتے اور دوستیاں سب کچھ اڑا کر لے گئی تھی اور ہمارا وجود دو لخت ہو گیا تھا۔ انسانی لہو بے قیمت ہو کر رہ گیا تھا۔ دردمند اور حساس دل اس وقت بھی لہو رو رہے تھے اور آج بھی ان کی حالت تقریباً ویسی ہی ہے۔

**مُحی الدین نواب**

نفرتوں کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک لہو رنگ داستان۔ نواب اس کے عینی شاہدوں میں سے ہیں۔
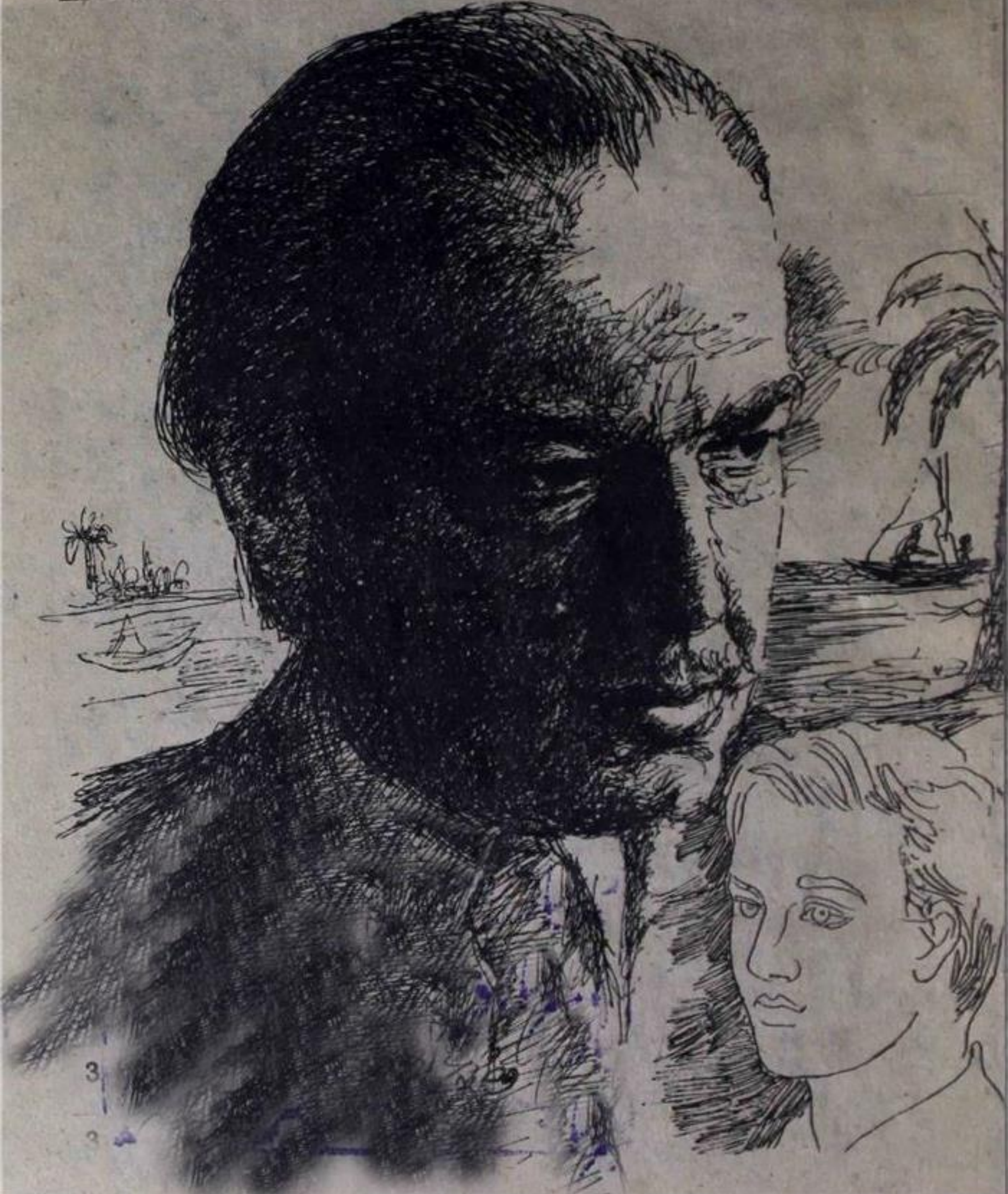
## تصویریں

کی نمائش میں مردوں اور عورتوں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ آرٹسٹ انور علی نے تصویروں کے ذریعے ننگے بھوکے بنگال کو پیش کیا تھا۔ ویسے جو لوگ تصویروں کو دیکھنے آئے تھے وہ بھوکے نہیں لگتے تھے۔ عمدہ لباس بھی پہنے ہوئے تھے۔ ان میں ایک حسینہ سب سے قیمتی ساری پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بدن پر سونے کے زیورات بھی تھے۔ اس بھیڑ میں وہ سب سے منفرد، سب سے مہنگی عورت لگ رہی تھی۔ بھوکوں اور ننگوں کی تصویریں کون دیکھتا ہے۔ سب اسی کو دیکھ رہے تھے۔

انور علی ایک منجھا ہوا معروف مصور تھا۔ خاکوں اور رنگوں کے ذریعے انسانوں کی بدحالی کو بڑی چابکدستی سے پیش کرتا تھا۔ آرٹ گیلری کی دیواروں پر یہاں سے وہاں تک ننگے اور بھوکے عوام کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مگر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے۔ بدصورتی سے منہ پھیر کر خوبصورتی کو جی بھر کے دیکھتا ہے۔ انور علی بھی اپنی تصویروں کو بھول کر اس منفرد اور مہنگی عورت کے حسن کو بار بار دیکھ

رہا تھا۔

وہ اتنی بڑی دنیا میں صرف اپنے فن کو چاہتا تھا۔ اس روز اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اس حسینہ کی چاہت کرنے لگا ہے۔ اس کا مغرور انداز اور حسن کا رعب اور دبدبہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ نہ تو دولت سے نہ محبت سے اور نہ ہی بازو کی قوت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کوئی خوش نصیب اسے حاصل کر چکا ہوگا، یا حاصل کرنے والا ہوگا۔ اس کے باوجود انور چاہت کے لطیف جذبوں میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔

پہلے تو اس سے شناسائی پیدا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے سوچتا رہا کہ کیسے اس سے دو باتیں ہی کر لے۔ آخر اس نے آرٹ گیلری کے مہتمم کے پاس آکر پوچھا: "کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟"

"کون سی عورت؟" مہتمم نے پوچھا۔

"وہ جس نے ساری پہنی ہوئی ہے۔"

"یہاں تو سبھی بنگالی عورتیں ساری پہنتی ہیں۔"

انور کو اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے وضاحت کی۔

"میرا مطلب ہے، وہ جس نے قیمتی زیورات بھی پہنے ہیں۔"

"اچھا وہ۔" مہتمم نے سر ہلا کر کہا: "اس کا نام موتی ہے۔ پورا نام موتی بیگم ہے۔ شاعرہ ہے۔ موتی جیسا مختصر سا خوبصورت نام اس پر جچتا ہے۔"

واقعی وہ موم کا حسین مجسمہ لگ رہی تھی۔ ایسی گوری اُجلی چکنی نار تھی کہ نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ "کیا آپ میرا تعارف کرانا پسند کریں گے؟"

"ضرور۔" مہتمم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا: "میرے ساتھ آیئے۔"

وہ آگے بڑھا تو دل بے اختیار سینے میں اچھلنے لگا۔ مہتمم نے حسینہ کے قریب پہنچ کر بنگالی زبان میں کہا۔ "موتی ان سے ملو۔"

وہ سر اٹھائے ایک تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ مہتمم کی آواز پر اس نے ایک ادائے ناز سے گھوم کر انور کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دل کے ورق پر نقش ہو رہی تھیں۔

مہتمم نے کہا: "یہ انور آرٹسٹ ہیں، جن کی تصویریں تم دیکھ رہی ہو۔"

موتی نے انور کو گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر شاید اسے خیال آگیا کہ ایک عورت کی حیثیت سے نظروں کے مفہوم میں گہرائی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ جلدی سے مہتمم کی طرف دیکھ کر بولی: "اچھا۔ تو آپ ہی انور صاحب ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ کے یہاں آنے سے میری حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔"

"اور میں یہاں آکر ایک بہت بڑے فنکار سے ملنے کا شرف حاصل کر رہی ہوں۔"

وہ جانے کیوں پھر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی اپنی نظریں اس کے قابو میں نہیں ہیں۔ دوسرے لمحے وہ پھر سنبھل کر نظریں نیچی کرتے ہوئے ساری کے آنچل سے کھیلنے لگی۔ اس وقت مہتمم کو کسی نے آواز دی تو وہ ادھر چلا گیا۔

انور نے کہا: "میں بہت دیر سے سوچ رہا تھا کہ کس طرح آپ سے مل بیٹھوں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ میرے اور آپ کے درمیان بہت پرانا رشتہ ہے۔"

اس نے حیرانی سے دیکھا تو اس کی آنکھیں اور خوبصورت لگیں۔ وہ بولی: "کیا ہم آپس میں رشتے دار ہیں؟ مگر نہیں۔ آپ بنگالی بول رہے ہیں لیکن لہجے سے بہاری معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بنگالی اور بہاری آپس میں رشتے دار کیسے ہو سکتے ہیں؟"

وہ بولا: "میری مادری زبان اردو ہے۔ لیکن میں بچپن سے مشرقی پاکستان میں ہوں۔ جوانی بھی یہاں گزر رہی ہے۔ اس لحاظ سے میں صرف بہاری نہیں، بنگالی بھی ہوں۔"

"مگر ہم رشتے دار کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"ہمارے درمیان فن کا بہت پرانا رشتہ ہے۔ آپ شاعرہ ہیں، میں مصور ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی: "او۔ اب سمجھی۔ مگر میں کوئی نامور شاعرہ نہیں ہوں۔ بس کبھی کبھی دل کی بات لفظوں میں ادا کر دیتی ہوں۔"

"دل کی بات ہر کوئی لفظوں میں ادا نہیں کر سکتا۔ اگر بنگالیوں اور بہاریوں کو دل کی بات کہنے اور سمجھانے کا سلیقہ آتا تو آج اتنے برس تک ساتھ رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے نظر نہیں آتے۔"

موتی نے کہا: "آپ درست کہتے ہیں۔ دل کے اندر کی بات ایک فنکار ہی کر سکتا ہے۔ آپ نے بہاری ہو کر بھی بنگال کی صحیح عکاسی کی ہے۔ آج سے میں آپ کو بنگالی سمجھوں گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا: "میں آپ کے دل کی بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولی: "مم.... میرے دل کی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ آ.... آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ آپ بطور فنکارہ ایک فنکار کو بنگالی اور بہاری کی طرح الگ سمجھتی ہیں یا دل کے قریب؟"

اچانک موتی کا حسین چہرہ کسی چور جذبے سے تمتمانے لگا۔ انور کے سوال کا جواب آسان نہیں تھا۔ وہ گڑبڑا گئی کہ کیا بولے اور کیا چھپائے؟ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی: "ایک فنکار دوسرے فنکار

کے دل کے اور اس کی سوچ کے قریب ہوتا ہے۔"

"میں آپ کے اشعار کو آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"کسی ادبی انجمن میں ملاقات ہوگی تو سنا دوں گی۔"

"انجمن تو کہیں بھی کسی وقت بھی سجائی جا سکتی ہے۔ آپ چاہیں تو ہم کل بھی مل سکتے ہیں۔"

"کل؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "یہ... یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"ابتدا میں جھجک ہوتی ہے۔ ملتی رہیں گی تو اچھا لگے گا۔ میں کل شام کو رمنا پارک کی جھیل کنارے آپ کا انتظار کروں گا۔"

وہ جلدی سے جانے کے لیے پلٹ گئی۔ وہ بولا۔ "جواب دے کر جائیے۔"

"سوچوں گی۔" وہ ساری کا آنچل سنبھالتے ہوئے وہاں سے دور چلی گئی۔ دور ہونے کے بعد اس نے ایک ذرا سر گھما کر اسے دیکھا۔ پھر اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر جلدی جلدی قدم بڑھاتی اس ہال سے باہر چلی گئی۔ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

انور نے ایک گہری سانس لی۔ موی کے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ باتوں کے دوران رہ رہ کر اسے دیکھ رہی تھی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ یا جیسے انور کی ذات میں وہ اپنی کوئی گمشدہ چیز پانے والی ہو۔ وہ تمنا کرنے لگا کہ وہ موی کی ضرورت بن جائے۔ کسی کو کسی کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی محبت ہوتی ہے اور جب محبت ہوتی ہے تو بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ انور کی بے چینی یہ تھی کہ وہ اندر ہی اندر موی کے لیے ایک ضدی بچے کی طرح مچلنے لگا تھا۔

بچے ناسمجھ ہوتے ہیں۔ بڑی عمر کے لوگ بھی زندگی کے کتنے ہی موڑ پر ناسمجھ بچے کی طرح پرائے مال کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ موی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اس پر کس خوش نصیب کا حق ہے؟ وہ جیسی بھی ہے، جس کی بھی ملکیت ہے، انور اسے اپنانا چاہتا تھا۔ زندگی کے ایسے ہی موڑ پر آدمی کو بچہ کہنا چاہیے یا دیوانہ۔

اس رات وہ بستر پر لیٹا جاگتی آنکھوں سے اس کے خواب دیکھتا رہا اور اس چھوٹی سی ملاقات کا تجزیہ کرتا رہا کہ موی بھی اس کی طرف مائل ہے یا نہیں؟ وہ کل شام کو ملنے آئے گی یا نہیں؟ دل کہتا تھا آئے گی۔ دماغ کہتا تھا کہ ایک ایسے شخص سے ملنے کیوں آئے گی جس سے دور کا بھی رشتہ نہ ہو۔ فنکار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جھیل کنارے ملاقات شروع ہو جائے۔

موی ویسے تو بڑی مغرور اور بڑی رکھ رکھاؤ والی لگتی تھی۔ اس کے باوجود عورت کو سمجھنا مشکل ہے کہ وہ کب کس پر مہربان ہو جائے۔ دوسرے دن شام کو وہ تقدیر کی طرح مہربان ہو کر اور دعا کی طرح قبول ہو کر جھیل کنارے آ گئی۔ اس نے گلابی رنگ کی ساڑی پہنی تھی۔ لانبے سیاہ بالوں کا خوبصورت سا جوڑا بنایا تھا۔ اس جوڑے پر پھولوں کی وینی بھی تھی۔ گورے مکھڑے پر میک اپ نہیں تھا۔ سحر زدہ کرنے کے لیے قدرتی حسن کافی تھا۔ انور گھاس پر سے اٹھ کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ کئی لمحات تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بولے۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک امیر کبیر اور مغرور حسن کی مالکہ نے آنے کا وعدہ پورا کیا تھا۔

موی نے کچھ پریشان ہو کر ادھر ادھر گزرنے والوں کو دیکھا پھر جلدی سے قریب آ کر آہستہ سے بولی "آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کیا دوسروں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اجنبی ہیں اور یہ ہماری پہلی ملاقات ہے؟"

"نن... نہیں۔" وہ فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "دراصل میں دل کو سمجھا رہا ہوں کہ تم آ گئی ہو۔"

موی نے جھیل کی طرف منہ گھما لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گزرنے والے اس کی حیا اور جھجک کو محسوس کریں۔ انور نے کہا۔ "میں نے تم سے مخاطب کیا ہے۔ تمہیں برا تو نہیں لگا؟"

وہ آہستگی سے بولی "ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

وہ ایک طرف گھوم گیا۔ موی اس کے ساتھ چلنے لگی۔ انور نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے محسوس کیا جیسے اچانک یہ دنیا خوبصورت ہو گئی ہے۔ پہلے نظارے سادہ تھے۔ اب رنگین ہو گئے ہیں۔ گھاس بالکل سبز نظر آ رہی ہے۔ پھولوں کے رنگ الگ الگ دکھائی دے رہے ہیں۔ آسمان کا عکس جھیل کے پانی کو نیلا کر رہا تھا۔ سفید راج ہنس پر پھیلائے تیر رہے تھے۔ ایسے میں جی چاہتا تھا کہ موی کو ساری دنیا سے چرا کر آسمان کے عکس کی طرح اس میں اتر جائے۔ خوشبو کی طرح پھول سے بدن میں سما جائے۔ اور لہو کی طرح رگ رگ میں دوڑ جائے۔

موی نے کہا۔ "آپ نے مجھے تم سے مخاطب کیا ہے۔ یعنی آپ بے تکلفی چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔ اس بے تکلفی تک پہنچنے کے لیے میں کل سے بے چین تھا۔ رات آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ میں تمہارے متعلق ہی سوچتا رہا۔"

"مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟"

وہ ذرا سوچ کر بولا۔ "یوں دیکھا جائے تو تم ایسی ہی ہو جیسی دوسری حسین عورتیں ہوتی ہیں۔ بنگال میں حسن بکھرا پڑا ہے۔ تم پوچھو گی کہ میں دوسری کسی حسین عورت سے متاثر کیوں نہ ہوا؟"

"ہاں۔ یہ اہم سوال ہے۔"

"دراصل یہ دل کی بات ہے کہ یہ تم پر مائل ہوا۔ میری آنکھیں تمہارے سوا اور کوئی نظارہ دیکھنا نہیں چاہتیں۔ میرا دماغ صرف

تمہارے لیے سوچتا ہے۔ جب آنکھیں، دل اور دماغ تینوں متفق ہو کر کسی ایک حسن کو پسند کر لیتے ہیں تو پھر نگاہوں کے سامنے دنیا کے تمام حسین چہرے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔"

موی نے کہا: "پسند بدل بھی سکتی ہے۔ آج کے بعد میں کبھی نہیں ملوں گی تو پھر آپ کو کوئی دوسرا چہرہ پسند کرنا پڑے گا۔"

"تم مایوس کرنے والی باتیں نہ کرو۔ میرا دل کہتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم جلد ہی یوں ملیں گے کہ پھر کبھی جدا نہیں ہوں گے۔"

وہ سرد آہ بھر کر بولی: "کاش ایسا ہو سکتا۔"

وہ سرد آہ بھرتے وقت بڑی مجبور، بڑی دلکش لگی۔ انور کا دل کھنچ گیا۔ وہ اپنی زبان میں بول رہی تھی۔ اس کے لہجے میں اتنی مٹھاس تھی کہ بنگالی زبان شہد کی طرح میٹھی لگ رہی تھی۔ انور نے پوچھا۔

"کیا تم مجبور ہو؟"

"اپنی مجبوری کا احساس بڑھتا ہے تو میں تھک جاتی ہوں۔ میرا سارا وجود پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے۔ یہاں گھاس بہت ملائم ہے کیوں نہ ہم یہاں بیٹھ جائیں۔"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی ساڑی سنبھالتے ہوئے آہستگی سے بیٹھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا واقعی تھک گئی ہے۔ انور نے کہا: "تم اپنی مجبوری بتاؤ۔ شاید میں تمہارے کام آسکوں۔"

وہ قریب بیٹھ گیا۔ عجیب سلگتا ہوا حسن تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار پتا چلا کہ عورت ایسی بھی ہوتی ہے کہ قریب بیٹھو تو بدن کی آنچ دیتی ہے، دور رہو تو یادوں کی آنچ دیتی ہے۔ موی نے کہا: "میری پہلی مجبوری یہ ہے کہ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ جس کے سامنے اپنی مجبوری کا ذکر کروں۔"

"یہ میری خوش نصیبی ہوگی، اگر تم مجھے اپنا ساتھی سمجھ لو۔"

موی نے پھر گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر نظریں جھکا کر بولی: "میں ایک مدت سے ایسے ساتھی کی تلاش میں ہوں، جو کافی قد آور ہو۔ خوب اچھی صحت کا مالک ہو جس کے ساتھ کھڑے ہو کر یقین ہو کہ میں ایک مرد کے ساتھ ہوں۔"

"میرا قد چھ فٹ ہے۔ صحت بہت خوب ہے۔ ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہوں۔ کسی دشمن کو دبوچ لوں تو وہ میرے بازو سے نکلنے نہ پائے۔"

موی نے اس کی پہاڑ جیسی جسامت کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔ پھر کہنے لگی: "میں ادبی انجمنوں میں، میوزیکل فنکشنز میں اور آرٹ گیلری وغیرہ میں جایا کرتی تھی۔ اور میری نظریں کسی ساتھی کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ پھر کل میں نے آپ کو دیکھا تو جیسے سب کچھ پالیا۔ میری تلاش ختم ہو گئی۔ مگر میں ڈرتی ہوں۔"

"کیوں ڈرتی ہو؟"

"سوچتی ہوں، پتا نہیں آپ کا مزاج کیسا ہو گا۔ کہیں آپ مجھے بدنام تو نہیں کریں گے؟"

"میں کم ظرف نہیں ہوں۔ میں نے آج تک کبھی کسی سے عشق نہیں کیا۔ تم سے محبت ہوئی ہے تو میں تمہارے لیے جان دے سکتا ہوں اور جان کی قربانی دینے والے کسی کو بدنام نہیں کرتے۔"

"پتا نہیں کیوں میرا دل بھی اندر سے کہہ رہا ہے کہ تم دل سے میری تمنا کر رہے ہو۔ پھر بھی ایک مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری؟"

"یہی کہ تم بہاری ہو۔"

"تو کیا ہوا؟ کتنی ہی بہاری عورتوں نے بنگالیوں سے اور بنگالی عورتوں نے بہاریوں سے شادی کی ہے۔ ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

"ہم نہیں کر سکتے۔"

"آخر کیوں؟"

وہ ذرا ہچکچاتی رہی، پھر بولی: "اب وقت بدل گیا ہے۔ بائیس برس میں ہم ایک دوسرے کے نہ ہو سکے۔ ایک دوسرے کی تہذیب کو قبول نہ کر سکے۔ اب یہ خلیج اتنی بڑھ گئی ہے کہ بہت جلد یہ بنگلہ دیش بن جائے گا جو بہاری اور پنجابی ہم پر حکومت کر رہے ہیں انہیں یہاں سے نکال دیا جائے گا۔"

"موی! یہ سیاسی باتیں ہیں۔ ہماری محبت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ایک دن سیاست ہماری محبت پر اثر انداز ہو گی۔ ایک بہاری سے ملتے رہنے پر میرے لوگ اعتراض کریں گے۔"

"میں بنگالی بولتا ہوں۔ بنگالی تہذیب کو پسند کرتا ہوں بنگالی لڑکی سے محبت کر رہا ہوں۔ پھر مجھ سے دشمنی کیوں کی جائے گی؟"

"آپ جیسے ایک دو آدمیوں کے بنگالی بن جانے سے پوری بہاری قوم تو نہیں بدل جائے گی۔ بہاریوں نے خود کو ہم سے الگ کہا ہے۔ اس لیے وہ اب الگ ہی رہیں گے۔ ان کے ساتھ آپ جیسے بھی سزا پائیں گے۔"

وہ بہت بڑے انقلاب کی پیشگوئی کر رہی تھی۔ لیکن انور کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف موی کو اپنانے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے کہا: "اگر ایسا ہے تو میں محبت کرنے کی سزا پاؤں گا مگر تمہاری چاہت سے باز نہیں آؤں گا۔"

"آپ جیسے ضد کر رہے ہیں، ویسے ہی میرا دل آپ کے لیے ضد کر رہا ہے مگر ایک اور مجبوری ہے۔"

"وہ مجبوری کیا ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی: "میں.... میں ابھی نہیں بتا سکتی۔"

"پھر کب بتاؤ گی؟"

"سوچوں گی۔" اس نے سر کو جھکا لیا۔ جیسے سوچ رہی ہو۔ انور تھوڑی دیر تک دیوانہ وار دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا: "اپنی کوئی کویتا (شاعری) سنائیے۔"

وہ بولی: "یہ درست ہے کہ شاعر اپنے دل کی چھپی ہوئی بات کو شاعری کے بہانے پیش کرتے ہیں۔ میں بھی کچھ پیش کرتی ہوں سنیئے۔"

وہ ذرا سوچنے کے بعد سنانے لگی۔

"میں ایک سیپ ہوں۔
بڑے سمندر کے کنارے پڑی ہوں
سمندر کی بوڑھی لہریں مجھے آغوش میں نہیں لے سکتیں
میں چاہتی ہوں کہ لہریں مجھے اچھال کر
سمندر کے اندر لے جائیں ــــ یا
پورا سمندر میرے اندر سما جائے
پھر دنیا دیکھے کر
میرے اندر بھی موتی ہوتا ہے
ابھی تو میں ــــ ایک بند سیپ ہوں۔"

"واہ واہ۔" انور نے لطف اندوز ہو کر کہا: "تم نے کتنے خوبصورت انداز میں پیاسے جذبوں کو پیش کیا ہے۔"

وہ ایک دم سے شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ساری کو ادھر ادھر سے یوں درست کرنے لگی۔ جیسے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ انور نے کہا: "اب تو بتا دو کہ تمہارے ساتھ کیا مجبوری ہے؟"

اس نے سر کو جھکا لیا۔ چپ رہی جیسے اپنے اندر لڑ رہی ہو۔ انور نے پھر پوچھا: "کیا نہیں بتاؤ گی؟"

وہ بڑی مشکل سے بولی: "میں یہاں نہیں بتا سکتی۔ کہیں تنہائی ہو تو...."

انور نے آس پاس دیکھا۔ باغ میں دور دور تک مرد، عورتیں اور بچے نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی کچھ لوگ قریب سے بھی گزر جاتے تھے۔ اس نے کہا: "موہنی! میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ میرا کوئی مکان نہیں ہے۔ کرائے پر مکان دینے والے پوچھتے ہیں کہ میرے بیوی بچے کہاں ہیں۔ نہ میں نے شادی کی ہے، نہ مجھے کوئی مکان کرائے پر دیتا ہے۔"

"پھر آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"رنگشا ہوٹل کے ایک کمرے میں۔ اس کا یومیہ کرایہ دس روپے ہے۔ یعنی میں اس کمرے کا ماہانہ کرایہ تین سو روپے ادا کرتا ہوں۔ یہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں تنہائی میں تم کچھ کہہ سکو گی۔ کیا میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟"

اس نے ہولے سے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد رات کا اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ وہ رمنا پارک کے باہر ایک رکشہ میں آ کر بیٹھ گئے۔

انور نے رکشے والے کو نواب پور چلنے کے لیے کہا۔ موہنی کی فرمائش پر اس نے رکشے کا ہڈ چڑھا دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی جان پہچان والا اسے دیکھے اور پہچان لے۔ اسی لیے اس نے سر پہ آنچل کو گھونگھٹ کی طرح بڑھا لیا تھا۔ تقریباً آدھے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ انور اس کی گھبراہٹ کو صاف محسوس کر رہا تھا۔

نشاط سینما کی گلی کے موڑ پر رنگشا ہوٹل تھا۔ جب وہ ہوٹل پہنچے تو رات کی تاریکی پھیل گئی تھی۔ نواب پور روڈ پر قمقمے روشن تھے۔ ہوٹل کے اوپری حصے میں رہائشی کمرے تھے۔ انور کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ موہنی جیسی حسین عورت اس معمولی ہوٹل کے کمرے میں آئے گی۔ وہ حیران تھا کہ موہنی اتنی آزاد کیسے ہے؟ رات ہو گئی ہے۔ کیا اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ وہ اتنی دیر تک کہاں تھی؟ بنگالی عورتیں اتنی آزاد نہیں ہوتیں کہ رات ہونے پر بھی گھر سے باہر رہیں۔ انور کے دماغ میں اس کے متعلق بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے۔

ہوٹل کے کنارے گلی میں ایک تنگ سا زینہ تھا۔ موہنی انور کے پیچھے زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر چار نمبر کے کمرے تک پہنچی۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ اس تنگ و تاریک ہوٹل میں پہنچ کر یہ احساس ستا رہا تھا کہ وہ اپنے مقام سے گرنے کے لیے وہاں پہنچی ہے اور وہ اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی کہ مجبوری ہے۔ کبھی کبھی بلندی سے پستی کی طرف گرنا اچھا لگتا ہے۔

انور نے کمرے کے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے کہا: "اس چھوٹے سے ہوٹل میں تمہیں گھٹن کا احساس ہو رہا ہو گا۔ ٹھہرو۔ میں لائٹ آن کرتا ہوں۔"

مونی نے اندھیرے میں محسوس کیا کہ دروازہ کھل گیا ہے۔ وہ اندر گیا ہے، پھر سوئچ کی آواز آئی۔ کمرے کے اندر بلب روشن ہوگیا۔

"اندر آجاؤ۔"

اس نے اندر پہنچ کر دیکھا۔ ایک طرف بستر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے اوپر تکیے الٹے پڑے تھے۔ کھڑکی کے پاس ایزل پر ایک ادھوری تصویر رکھی ہوئی تھی۔ کلر پلیٹ پر رنگ خشک ہو رہے تھے۔ اس کے قریب میز پر بہت سے برش بکھرے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے اس کمرے کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ فرش پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کمرے کو دیکھ کر ایک مصور کی بے پروائی اور منتشر مزاجی کا پتا چلتا تھا۔

وہ منہ بنا کر بولی: "چھی چھی۔ تم کتنے گندے کمرے میں رہتے ہو۔"

"ہاں۔ میرا یہ کمرہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے لیکن تم تنہائی چاہتی تھیں اس لیے میں یہاں لے آیا۔"

مونی نے دروازے کی طرف دیکھا، پھر بولی: "کوئی مجھے یہاں پر دیکھے گا تو کیا سوچے گا؟"

انور نے آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر اُسے تسلی دی۔ "اب کوئی نہیں دیکھے گا، کوئی نہیں سنے گا۔ اپنی مجبوری بتاؤ۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ بے ارادہ ساری کے پلو سے کھیلنے لگی۔

انور نے پوچھا: "مونی! ایسی کیا بات ہے کہ ہم ایک نہیں ہوسکتے؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر جھجکتے ہوئے بولی: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے سامنے کیسے زبان کھولوں؟"

"میرے سامنے شرم آرہی ہے تو میں بتی بجھا دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ بند کمرے میں اچانک گہری تاریکی چھا گئی۔ انور کی آواز سنائی دی: "میں اب تمہارے سامنے نہیں ہوں۔ تمہارے پاس صرف اندھیرا ہے۔ اندھیرے سے بولو۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر تاریکی بولنے لگی: "میں کبھی بہت ہی غریب لڑکی تھی۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ میں چھ برس کی عمر تک کبھی دو وقت اور کبھی تین وقت کے فاقے کرتی رہی۔ میرا باپ مچھلیاں پکڑتا تھا۔ ایک بار ایسا سیلاب آیا کہ وہ مچھلیوں کے ساتھ بہہ کر کہیں نکل گیا۔ پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ ماں کو یقین ہوگیا کہ وہ مر چکا ہے۔ تب وہ مجھے اس شہر میں لے آئی۔"

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی: "گرام (گاؤں) میں رہ کر میں یہ سمجھتی تھی کہ اتنی بڑی دنیا میں صرف بنگالی رہتے ہیں۔ کنویں کے مینڈک کی طرح میں نے اپنے گرام کو ساری دنیا سمجھ لیا تھا۔ شہر آکر میں نے پہلی بار بہاریوں اور پنجابیوں کو دیکھا۔ ماں نے بتایا کہ یہ لوگ بہت امیر ہوتے ہیں۔ اتنے امیر کہ پلنگ پہ سوتے ہیں، موٹروں پر بیٹھتے ہیں، لاہور اور کراچی کے قیمتی کپڑے پہنتے ہیں۔ تھوڑی دور بھی جانا ہو تو رکشوں پر آتے جاتے ہیں جیسے رعایا اپنے حکمرانوں سے ڈرتی ہے، اسی طرح میں ان لوگوں سے ڈرنے لگی تھی۔

ان دنوں ہم میڈیکل کالج کے پیچھے ریلوے لائن کے کنارے شکستہ جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور بڑے گھروں میں برتن اور کپڑے دھونے کا کام کرتے تھے۔ میری ماں بھی یہی کرتی تھی۔ ایک دوپہر کی بات ہے، میں اپنی ماں سے ملنے وہاں گئی جہاں وہ کام کرتی تھی۔ گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ باہر والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ایک کمرے کی باہری کھڑکی سے ماں کو آواز دی۔ پہلے تو خاموشی رہی پھر ماں کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے مونی! کیوں آئی ہو؟"

میں نے جواب دیا: "تم دوپہر کا کھانا ابھی تک نہیں لائیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"تم گھر جاؤ۔ میں ابھی لے آؤں گی۔"

میں نے پاؤں پٹخ کر کہا: "میں نہیں جاؤں گی۔ پہلے مجھے بھات دو۔"

کھڑکی کے پیچھے کھسر پھسر سنائی دی۔ ماں کے ساتھ کسی مرد کی آواز بھی تھی۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ ماں نے مجھے اندر بلا کر دروازے کو دوبارہ بند کیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ اس نے باورچی خانے میں لے جا کر مجھے ایک برتن میں دال بھات اور گوشت کا سالن دیا۔ پھر بولی: "یہاں بیٹھ کر کھاتی رہو۔ ادھر کمرے میں نہ آنا نہیں تو وہ مالڑا..... (ہماری پنجابی) غصہ کرے گا۔"

یہ سمجھا کر وہ پھر اسی کمرے میں چلی گئی۔ میری ماں بہت خوبصورت تھی۔ اگر وہ بہت زیادہ خوبصورت نہ ہوتی، تب بھی یہاں کی عورتوں کو اپنی محنت کے ساتھ اپنا جسم بھی بیچنا پڑتا ہے۔ ایسا نہ کریں تو صرف سوکھی تنخواہ ملتی ہے، بچا ہوا کھانا نہیں ملتا۔ مالکوں کی ایکسٹرا مہربانیاں نہیں ملتیں۔ مجھے جیسے جیسے یہ معلومات حاصل ہوتی رہیں، ویسے ہی ویسے آپ لوگوں سے نفرت بڑھتی رہی۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہوئی۔ انور نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اندھیرا نفرت کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ انور نے پوچھا: "اب تو نفرت نہیں ہے؟"

مونی نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: "جب مجھے ساتواں برس لگا تو ماں نے ایک بنگالی زمیندار کے گھر میں کام پکڑ لیا۔ وہاں دو زمیندار بھائی تھے۔ وہ بہت ساری زمینیں بیچ کر پٹ سن کا کاروبار کرنے نارائن گنج آئے تھے۔ میں نے کہا نا کہ میری ماں بہت خوبصورت تھی۔ جس گھر میں عورتیں نہیں ہوتی تھیں، وہاں مرد لوگ فوراً میری ماں کو کام کے بہانے رکھ لیتے تھے۔ چھوٹے زمیندار نے بھی میری ماں کو دیکھتے ہی اپنے گھر کا کام اسے سونپ دیا۔ بڑے زمیندار کا نام امداد میاں

تھا۔ اُن دنوں اس کی عمر پچاس کے اوپر رہی ہوگی۔ سر کے بالوں اور مونچھوں پر لگا ہوا خضاب اڑ رہا تھا۔ بڑھاپے کی سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

ماں نے بیٹی کا رشتہ بتایا۔ امداد میاں نے میری عمر پوچھی۔ اسے عمر بھی بتائی گئی۔ اس نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا: "یہ لڑکی مجھے دے دو۔ جو دام مانگو گی تمہیں ادا کروں گا۔"

بے شک قحطِ بنگال کے زمانے سے بچوں کو بیچ دینے کی تاریخی عادت پڑ گئی ہے۔ آج بھی بھوکوں مرنے والے ماں باپ بچوں کو اس خیال سے بیچ دیتے ہیں کہ بچے گھر سے نکل کر جہاں بھی جائیں گے، بھوکے ننگے نہیں رہیں گے۔ ایسی ممتا سے کیا حاصل؛ جو بچوں کو ترسا ترسا کر مار ڈالے۔ مگر میری ماں نے گھبرا کر مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ امداد میاں سے بولی: "میں اپنی بچی کو دو وقت کھلا سکتی ہوں۔ میں اسے نہیں بیچوں گی۔"

"تمہاری مرضی۔ تم اس کی ماں ہو۔"

دونوں بھائیوں نے ماں کو مجبور نہیں کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ امداد میاں کا چھوٹا بھائی میری ماں کو کمرہ بند کرنے کے بعد سمجھایا کرتا تھا: "اس کے دادو (امداد میاں) کے پاس رہنے سے مومنہ کی زندگی سنور جائے گی۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا اور اچھی تعلیم بھی دی جائے گی۔" میری ماں یہ سب کچھ میرے لیے کرنا چاہتی تھی مگر وہ بولی: "میری مومنہ ابھی سات برس کی بھی نہیں ہوئی اور آپ کے دادو ساٹھ برس کے لگتے ہیں۔ میری بچی تو بالکل بچی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ جب تک وہ جوان نہیں ہوگی۔ دادو اسے بیوی نہیں بنائیں گے۔"

"تو پھر اسے جوان ہونے دیں۔"

چھوٹے زمیندار نے کہا: "دادو بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ اُن کی پیشگوئی ہے کہ تمہاری بیٹی جوان ہو کر ایسی غضب کی عورت ہوگی کہ کوئی بھی بدمعاش تمہاری جھونپڑی سے اسے اٹھا کر لے جائے گا۔ یا پھر تم دوسروں کے گھروں میں اپنی طرح اسے کام کرنے کے لیے بھیجو گی اور اپنی ہی طرح اس کی جوانی کو بھی سستا کھلونا بنا دو گی۔ ذرا عقل سے سوچو اور مومنہ کو دادو کے حوالے کر دو۔"

ماں نے کچھ سوچ کر کہا: "میں مانتی ہوں، تم عقل کی بات سمجھا رہے ہو۔ چند برسوں کے بعد مومنہ ایسی دولت بن جائے گی جسے میں چوروں سے بچا کر نہیں رکھ سکوں گی۔ مجھے آپ کی بات مان لینا چاہیے۔ مگر مجھے اس بات کی ضمانت چاہیے کہ مومنہ کو ایک نوکرانی کی بیٹی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کی عمر سے زیادہ اس پر زیادتی نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دادو سے کوئی ضمانت طلب کروں گا۔"

دوسرے دن دادو یعنی امداد میاں نے خود ماں کو بلا کر کہا: "اس سے بڑی ضمانت نہیں ہو سکتی کہ میں تمہاری بیٹی سے ابھی نکاح پڑھوا لوں گا۔"

ماں نے حیرانی سے پوچھا: "اتنی سی عمر میں مومنہ کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" امداد میاں نے کہا: "کیا ہماری لوک کہانی میں روپ بان نے ایک نوزائیدہ بچے سے شادی نہیں کی تھی؟ کیا ہمارے ہاں بچپن میں شادی کا رواج نہیں ہے؟"

ماں نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "ہاں، ایسا تو ہوتا ہے مگر....؟"

"مگر کیا؟ میں مومنہ کو مہر کے طور پر پانچ سو روپے ادا کروں گا۔"

"پانچ سو روپے!" ماں کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ ہماری سات پشتوں میں بھی شاید کسی نے یکمشت پانچ سو روپے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے منہ تکنے لگی۔ امداد میاں نے کہا۔ "آج شام کو میں ایک سرخ جوڑا دوں گا۔ تم یہاں مومنہ کو دلہن بنا دینا۔ قاضی آکر نکاح پڑھائے گا۔ نکاح نامے میں مہر کی رقم پانچ سو روپے لکھائی جائے گی۔ تم نکاح نامہ رکھ لینا۔ میں مومنہ کو اپنے پاس رکھ لوں گا۔"

ماں راضی ہو گئی۔ "اس رات میں دلہن بن کر امداد میاں کی سیج پر پہنچ گئی۔ میں اچھی طرح نہیں سمجھ رہی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے مگر دلہن بن کر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنے کپڑے ایک ساتھ پہنے تھے۔ ساٹن کا سرخ جوڑا تھا اور بہت سے زیورات میرے بدن پر تھے۔ میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ یہ میرے لیے گڑیا گڈے کا کھیل تھا۔ پھر پتا نہیں کتنی دیر کے بعد وہ میرے کمرے میں آئے۔"

انور اندھیرے میں گم صم کھڑا تھا۔ مومی غائب تھی مگر اس کی آواز کانوں میں اتر رہی تھی۔ وہ امداد میاں کے متعلق کہہ رہی تھی کہ "وہ" کمرے میں آئے تھے۔ کیا مومی نے سات برس کی عمر میں امداد میاں کو قبول کر لیا تھا؟ کوئی بھی لڑکی قبول کرنے کے بعد ہی اپنے مرد کو "وہ" کہتی ہے۔

انور نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا: "مگر مومی! تم تو بالکل بچی تھیں؟"

"ہاں۔ بعد میں عقل آئی تو سوچا کہ امداد میاں جیسے بوڑھے لوگ مجھ جیسی لڑکیوں کو بیٹی بناتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بیوی بنایا تھا اور میرے بچپن کو خوش کرنے کے لیے مجھے سہاگ کی سیج پر دلہن بنا کر بٹھا دیا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بولے: 'ہائے، تم کتنی سندر ہو۔ دلہن بن کر تو اور غضب ڈھا رہی ہو۔' کاش، اسی وقت

اچانک تمہاری عمر بڑھ جائے اور میری عمر گھٹ جائے۔ آہ۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا:

مجھے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ میں چپ چاپ ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔ وہ جلدی سے بولے: "تم مجھے ایسے نہ دیکھو۔ میں بوڑھا نہیں ہوں۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میں تمہارے جوان ہونے تک جوان رہوں گا:"

انہوں نے باتوں کے دوران میرے زیورات اتار دیے۔ مجھ سے کہا: "تمہاری ماں بتا رہی تھی کہ تم جلدی سو جاتی ہو۔ آؤ میں تمہیں سلا دوں:"

میں بستر پر لیٹ گئی۔ وہ میرے پاس لیٹ کر مجھے سینے سے لگا کر تھپکنے لگے۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ اس رات مجھے کس قدر سکون مل رہا تھا۔ وہ مجھے سہلا رہے تھے اور میرے دکھ کو لگتا رہے تھے۔ پھر پتا نہیں میں کب سو گئی۔ مجھے ماں یاد نہیں آئی۔ جب محبت اور شفقت روپ بدل کر ملتی ہے۔ تو پچھلی محبتوں کی جدائی کا صدمہ دھیما پڑ جاتا ہے۔

دوسرے دن سے میرے لیے ایک گورنس کا انتظام کیا گیا۔ وہ مجھے پڑھاتی تھی۔ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے اور لباس پہننے کا سلیقہ سکھاتی تھی۔ دس برس کی عمر تک میں نے بنگالی اور انگریزی کی چھ جماعتوں والی کتابیں ختم کر دیں۔ گورنس بہت ذہین تھی۔ اس کی ذہانت مجھے ملی۔ وہ مجھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی تھی۔ اس کی زبان سے اخلاق اور تہذیب کی باتیں سن سن کر میں نے امداد میاں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونے سے انکار کر دیا۔ پہلے تو وہ بڑے تلملائے، بڑی ضد کی مگر میں ان سے زیادہ ضدی ہوں، آخر وہ مان گئے کہ اپنے وقت سے پہلے قدرت مہربان نہیں ہو سکتی۔

بارہ برس کی عمر میں میری علمی ذہانت کے پیش نظر گورنس نے مجھے شاعری یا افسانہ نگاری کا مشورہ دیا۔ میں نے اس مشورے پر عمل کرنا شروع کیا تو میرے اندر کی شاعرہ بیدار ہونے لگی۔ عشق و محبت کے جذبات نے ایک ایسا آئیڈیل میرے دماغ میں بسا دیا۔ جو نوجوان اور خوبرو ہونے کے علاوہ صحت مند اور قد آور تھا۔ جب میں کوئی شعر کہنا چاہتی تو پہلے اسے تصور میں بلا لیتی۔ جب وہ آتا تو میں شرمانے لگتی۔ اس سے چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہ ملتی تو میں اسی کے بازوؤں میں خود کو اس سے چھپا لیتی۔ ایسے ہی خیالی رومانس میں میری شاعری جوان ہونے لگی امداد میاں کو ایکا ایکی پتا چل گیا کہ میں جوان ہو چکی ہوں۔

گورنس کی توجہ اور تعلیم نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ میں ایک خیالی شہزادے سے محبت کرتی تھی۔ مگر مجھے امداد میاں سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے تعلیم دلائی تھی۔ میں جھونپڑوں

اور فٹ پاتھ پر جانوروں کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ انہوں نے مجھے انسان بنا دیا۔ زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ ان احسانات کے علاوہ میں آٹھ برس سے ان کے قریب رہتی آئی تھی۔ اب ان کی قربت کی عادی ہو گئی تھی۔ ان کی محبت اور شفقت کی محتاج ہو گئی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد امداد میاں ایک ایسے بزرگ رہ گئے تھے۔ جن کے سائے میں گزری ہوئی محبتیں مل جاتی تھیں اور وہ میرے مجازی خدا بھی تھے۔ آئندہ بھی ان سے ہی محبتیں ملنے والی تھیں۔

۲۵ مارچ کو امداد میاں نے ہماری شادی کی سالگرہ بڑی ہی دھوم دھام سے منائی۔ ان کے تمام رشتے دار اور دوست احباب یہ جانتے تھے کہ امداد میاں نے سات برس کی ایک بچی سے نکاح پڑھایا تھا۔ اگرچہ ایسا نکاح جائز نہیں ہوتا مگر قاضی نے پیسوں کے زور پر سات برس کی جگہ سترہ برس لکھ دیا تھا۔ جو لوگ مجھے بچی سمجھتے تھے، ان لوگوں نے سالگرہ کے دن مجھے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ میں اپنی تعریف نہیں کرنا چاہتی کہ میرے حسن و شباب اور قیمتی زیورات کی چمک دمک نے لوگوں کو کتنا متاثر کیا۔ اتنا ضرور کہوں گی کہ امداد میاں تعریفیں سن سن کر فخر سے اکڑے جا رہے تھے۔ خوشی کے مارے کچھ بوکھلائے ہوئے بھی تھے۔ مہمانوں کے سامنے بار بار میرا ہاتھ پکڑ لیتے تھے جیسے سہارا تلاش کر رہے ہوں جیسے گر پڑنے کا ڈر ہو۔ میں نے کئی بار انہیں ڈگمگاتے دیکھا۔ کئی بار سرگوشیوں میں مشورہ دیا کہ وہ ایک جگہ بیٹھ جائیں مگر وہ سینہ تان کر چلتے ہوئے خود کو جوان ثابت کرتے رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بالوں میں خضاب لگا رکھا تھا جس کی وجہ سے انہیں زکام ہو گیا تھا۔

رات کو تمام مہمان رخصت ہو گئے۔ میرے لیے امداد میاں کی خواب گاہ کو سجایا گیا تھا۔ میں جس بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اس پر پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جب وہ کمرے میں آئے تو میں نے گھونگھٹ نکال لیا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ میں تصور میں کسی نوجوان شہزادے کو دیکھ رہی تھی اور سامنے امداد میاں آ کر میرا گھونگھٹ الٹ رہے تھے اور زکام کی وجہ سے چھینک رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ گھونگھٹ اٹھاتے وقت ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں میرے حسن کا قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس رات میں انہیں بڑی دیر تک ہانپتے کانپتے دیکھتی رہی۔ کبھی وہ چھینکتے اور ناک صاف کرتے رہے۔ کبھی کہتے رہے کہ زکام سے سر چکرا رہا ہے۔ آخر تھک ہار کر کہا: "تمہیں سو جانا چاہیے۔ ورنہ میرے چھینکنے سے تمہیں بھی زکام ہو جائے گا:"

میں کچھ دیر تک منہ چھپا کے بیٹھی رہی۔ دوسرے کمرے میں جا کر پھر ایک بار مجھے دوسرے کمرے میں جا کر سونے کے لیے کہہ

میں دوسرے کمرے میں جاکر بستر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے نیند نہیں آسکتی تھی۔ کیونکہ بند آنکھوں کے پیچھے مجھے وہ خیالی شہزادہ نظر آرہا تھا۔"

تاریکی گہری تاریکی تھی۔ ہوٹل کے تاریک کمرے میں موہنی گم ہوگئی تھی۔ اس کی آواز بھی گم ہو گئی تھی۔ اپنی روداد کے اس موڑ پر آگے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ البتہ انور کی نگاہوں کے سامنے دور بہت دور جھیل کا کنارہ تھا اور ایک شاعرہ الفاظ کے درد میں کہہ رہی تھی۔

"میں ایک بند سیپ ہوں
بوڑھے سمندر کے کنارے پڑی ہوں
سمندر کی بوڑھی لہریں مجھے آغوش میں نہیں لے سکتیں
میں چاہتی ہوں کہ لہریں مجھے اچھال کر
سمندر کے اندر لے جائیں۔ یا
پورا سمندر میرے اندر سما جائے
پھر دنیا دیکھے کہ
میرے اندر بھی موتی ہوتا ہے
ابھی تو میں ـــــ ایک بند سیپ ہوں۔"

بند کمرے میں روشنی نام کو نہیں تھی۔ گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کسی کا وجود نہ ہو۔ اندھیرے نے آگے بڑھ کر تاریکی کو چھو لیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ جیسے سہارا چاہتی ہو۔ اندھیرے نے اسے تھام لیا۔

"میں زندگی بھر تمہارا ساتھ دوں گا۔ جو ساتھ نہ دے سکے اسے چھوڑ کر آجاؤ۔"

"میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر کوئی ساتھ نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم اس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں.... اتنی محبت کرتے ہیں کہ میرے بغیر رہ نہیں سکتے۔"

"اور تم؟"

"میں بھی ان سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ انہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اور میں؟"

"تم۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "تم میری تلاش کا حاصل ہو۔ میں دو برس سے بھٹک رہی ہوں۔ دور ہی دور سے کسی نہ کسی کو دیکھ کر سوچتی رہی کہ کسی کو اپنا ساتھی بنالوں۔ پھر ڈر لگتا تھا کہ پتا نہیں وہ ساتھی تمام عمر راز داری کرے گا یا نہیں؟"

"تم نے مجھ پر کیسے بھروسہ کرلیا؟"

"میں تلاش کرتے کرتے، سوچتے سوچتے اور ڈرتے ڈرتے تھک گئی ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ ڈرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس لیے آج بہت بڑا جوا کھیلنے آگئی ہوں۔ میں اپنے آپ کو داؤ پر لگا رہی ہوں۔ اگر تم نے مجھے کوئی سستی بازاری عورت سمجھا تو میں ذلت کے احساس سے مر جاؤں گی۔"

"نہیں! تم بہت اونچی عورت ہو۔ اس مقام پر پہنچ کر بھی اپنے شوہر کا دم بھر رہی ہو۔ مانا کہ تم مجھے مل رہی ہو۔ مگر تمہاری محبت نہیں مل رہی ہے۔ اس لحاظ سے تم سستی نہیں۔ اس محبت کی طرح مہنگی ہو، جو مجھے نہیں مل سکتی۔"

انور نے اچانک محسوس کیا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔ دبی دبی سسکیاں لے رہی ہے۔ اس عورت کے پاس عزت تھی۔ شرافت تھی اور شرم تھی اور یہی چیزیں اسے رلا رہی تھیں۔ بعض حالات میں انسان اپنی مرضی سے سودا کر کے روتا ہے۔

رات کے گیارہ بجے وہ اپنی کوٹھی کے دروازے پر پہنچی تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ بہت زیادہ تھک جانے سے بھی بدن ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی جائے اور بستر پر ایسی گرے کہ صبح تک نہ اٹھے۔

مگر وہ سیدھی اپنے کمرے تک نہ جا سکی۔ ڈرائنگ روم میں امداد میاں ایک صوفے پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی مونچھوں کے اور سر کے بال سفید تھے۔ وہ اچھا قد آور تھا۔ معلوم ہوتا تھا جوانی میں خوب صحت مند اور بھاری بھرکم رہا ہوگا۔ مگر اب غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔ وہ دبلا پتلا لانبے بانس کی طرح لگتا تھا۔

اس نے موہنی کو دیکھتے ہی پیار سے پوچھا۔ "کہاں رہ گئی تھیں۔ گیارہ بج چکے ہیں۔"

وہ ساڑی کے پلو کو شانے پر درست کرتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ پھر جھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔ آج پہلی بار اتنی دیر ہو گئی۔ فلم بہت اچھی تھی۔"

امداد میاں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ موہنی پھر ایک بار ساڑی کو ادھر ادھر سے یوں درست کرنے لگی جیسے اپنے آپ کو چھپا رہی ہو۔ جیسے ڈر رہی ہو کہ کہیں سے ظاہر نہ ہو جائے۔ امداد میاں نے کہا۔ "تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔"

"نہیں۔ نیند آرہی ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے اکثر راتوں کو اٹھ کر دیکھا ہے، تم جاگتی رہتی ہو۔"

وہ بھی صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "آج خوب نیند آرہی ہے۔ آج میں سو جاؤں گی۔"

اس نے امداد میاں کے بازو کو پیار سے تھام لیا۔ پھر اس

کے ساتھ خواب گاہ کی طرف چلتے ہوئے بولی: "آپ کتنے اچھے ہیں۔ میرے لیے ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہارے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔"

"ہاں۔ چلیے میں آپ کو سلاؤں گی، پھر خود سونے جاؤں گی۔"

وہ خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ وہاں دو پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ دونوں پلنگ ایک دوسرے سے ذرا دور تھے۔ امداد میاں نے اپنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا: "میں خود ہی سو جاؤں گا۔ تم جیسے لیے نہ جاگو۔"

"چلیے لیٹ جائیے۔ آپ کے لیے جاگنا میرے لیے عین راحت ہے۔"

وہ بستر پر لیٹ گیا۔ موی سوئچ بورڈ کے پاس گئی۔ اس نے زیرو پاور کے بلب کو آن کر کے دوسری بتیاں بجھا دیں۔ خوابیدہ دھیمی روشنی میں وہ کمرہ بڑا پُراسرار اور رومان پرور لگتا تھا۔ امداد میاں کو موی شعلے کی طرح نظر آتی تھی۔ وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ اس رات بھی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ موی آ چکی ہے۔ اس کا یہ معمول تھا کہ ہر رات امداد میاں کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر سہلاتی تھی اور گنگناتے ہوئے اسے سُلا دیتی تھی۔

امداد میاں آنکھیں بند کر کے چپ سادھ لیتا تھا۔ اسے یہ احساسِ جرم ستاتا اور جگاتا تھا کہ اس نے ایک عورت کی جوانی میں اس کی نیندیں اڑا دی تھیں اور وہ ایسی وفادار اور ایسی محبت کرنے والی بیوی تھی کہ جس کی مثال مشرقی ملکوں میں ہی ملتی ہے۔

موی نے اس کے سر کو ایک بازو میں لیا جیسے وہ بچہ ہو پھر وہ سر کو اپنے سینے سے لگا کر سہلانے اور گنگنانے لگی۔

امداد میاں نے کہا: "موی! آج اپنی کویتا سناؤ۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر گنگناتے ہوئے سنانے لگی۔

"سردی شباب پر ہے
انگیٹھی میں آگ نہیں ہے، اور
میں ٹھنڈ سے کانپ رہی ہوں
میرے ساتھی! کیا تمہارے پاس دیا سلائی ہے؟
آؤ! انگیٹھی کو انگاروں سے بھر دو۔
نہیں، دیا سلائی ختم ہو گئی ہے۔
مجھے سردی لگ رہی ہے۔
اپنی ضرورت کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔
میں اپنے پڑوسی سے آگ مانگ کر لے آئی ہوں۔
اب انگیٹھی دہک رہی ہے۔
کمرہ گرم ہو گیا ہے
میرے ساتھی آؤ، میں تمہیں سُلا دوں۔"

امداد میاں کی آنکھیں بند تھیں مگر ذہن جاگ رہا تھا۔ موی کی کویتا سُن کر اسے سردی کا احساس ہوا۔ وہ آہستگی سے بولا: "موی! ایک بات بتاؤ گی؟"

"جی ہاں۔ پوچھیے۔"

"وہ آرٹسٹ آج بھی ملا تھا؟"

"ایں۔ وہ۔ ہاں۔ جی ہاں ملا تھا۔"

"کیا اسی نے فلم دکھائی تھی؟"

وہ چپ رہی، کچھ بول نہ سکی۔ زیرو پاور کی روشنی میں کسی کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ موی نے اس کے چہرے کو اپنے سینے میں ذرا اور چھپا لیا۔ تاکہ امداد میاں اسے نہ پڑھ سکے۔ وہ بولا: "میں نے تمہیں آزادی دی ہے۔ کبھی تم سے نہیں پوچھا کہ تم کہاں جاتی ہو؟ اور کن لوگوں سے ملتی ہو؟ لیکن کل تم ہی نے بتایا تھا کہ وہ آرٹسٹ بہاری ہے۔"

"جی ہاں مگر وہ بہاری نہیں لگتا۔"

"اکثر بدمعاش اوپر سے بدمعاش نہیں لگتے۔"

"وہ... وہ بہت اچھا ہے۔"

"ہوں۔ وہ تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

وہ ذرا ہچکچائی پھر بولی: "کس ملک میں اور کس قوم میں بدمعاش نہیں ہوتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنی اپنی قوم کے لوگوں کی بدمعاشیاں چھپا کر صرف اچھائیاں پیش کریں اور ایک باوصف اعلیٰ ظرف قوم کی تاریخ مرتب کریں۔ اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ اپنا اصلی چہرہ چھپا لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری قوم میں آئندہ بدمعاش پیدا نہیں ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ مگر بنگالیوں میں بدمعاش کم ہوتے ہیں۔"

"کم سہی، مگر ہوتے ہیں۔"

"تم اس بہاری کی حمایت میں بول رہی ہو۔ میں سمجھ گیا، تم اسے پسند کرنے لگی ہو۔"

"وہ ایک اچھا آرٹسٹ ہے۔"

"صرف ایک اچھا آرٹسٹ ہے؟"

"اس کی سوچ بھی اچھی ہے۔"

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر امداد میاں نے بچوں جیسا

سوال کیا: "اس نے جو فلم تمہیں دکھائی، کیا بہت اچھی تھی؟"

وہ جواب سوچتی رہی۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر بولی: "بہت۔ اچھی تھی۔ میں نے آج سے پہلے ایسی فلم نہیں دیکھی۔ بس اب آپ سو جائیں۔"

"مومی! ملک کے حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں تم اس سے ملتی رہو گی تو ہمارے لوگ کیا کہیں گے؟"

"یہ سوچ کر میں بھی ڈر رہی ہوں۔"

"ہوں۔" وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا: "میں تمہیں خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر اس طرح کہ ہماری نیک نامی خطرے میں نہ پڑے۔ میں تمہاری آزادی میں مخل نہیں ہوں گا۔ تمہاری دوستی پر اعتراض نہیں کروں گا۔ مگر کسی کو اس دوستی کا علم نہ ہو تو بہتر ہے۔"

مومی اسی لیے امداد میاں پر جان دیتی تھی کہ وہ شکی نہیں تھا۔ اگر ہو بھی تو بڑی فراخدلی سے شک و شبہات کو اپنے اندر کچل دیتا تھا، وہ بولی: "آپ اطمینان رکھیں۔ ہماری دوستی دو فنکاروں کی دوستی ہے۔"

دوستی کی بات پر مومی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اور امداد میاں کا سر اس کے دل کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ یقیناً دھڑکنیں کچھ چغلی کھا رہی ہوں گی۔ وہ ذرا الگ ہو کر اسے تھپکتے ہوئے بولی۔ "اب آپ سو جائیں۔"

"میں دوسری طرف کروٹ بدل کر سونا چاہتا ہوں۔ اب تم اپنے بستر پر جاؤ۔ بہت رات ہو چکی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے گھوم کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ مومی نے چند لمحوں تک اسے دیکھا پھر اسے تھپک کر اپنے پلنگ پر چلی گئی۔

رات جاگنے لگی۔ امداد میاں کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ اگر یہ خبر ہو جائے کہ کسی نے اپنی دولت کو تھوڑا سا خرچ کیا ہے تو برداشت نہیں ہوتا۔ امداد میاں خود کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر تھوڑا سا گنوا کر ساری دولت کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھا جا سکتا ہے۔ تو تھوڑا سا نقصان برداشت کرنا چاہیے۔ اگر اپنے گھر اور اپنی عزت کا بھرم رہ جاتا ہے تو چپ چاپ ذرا سا غنڈہ ٹیکس ادا کرنے میں ہرج نہیں ہے۔

امداد میاں کو مومی سے ایسی محبت تھی جیسے آنکھ کو نیند سے اور دماغ کو بیداری سے ہوتی ہے۔ مومی بیوی تھی اور بڑھاپے میں جوان بیوی کو بس میں رکھنا ایسا ہی تھا جیسے ٹمٹماتا ہوا چراغ منہ زور آندھی کو اپنے بس میں رکھ کر روشن رہنا چاہے۔ اس عمر میں جوان عورت چھوڑ کر چلی جائے تو عزیز و اقارب، دوست احباب کے طعنے برداشت نہیں ہوتے۔ امداد میاں کو بیک وقت کئی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ ایک تو محبت تھی۔ دوسرے عزت کا خیال تھا۔ تیسرے یہ فکر تھی کہ اسے کس طرح بس میں رکھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے مومی کو بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا اور ساتھ ہی اسے اتنی محبت اور توجہ دیتا تھا کہ وہ کسی دوسرے سے مل بیٹھ کر باتیں تو کر سکتی تھی، مگر اس سے متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر متاثر ہو بھی جاتی تو محبت کرنے والے ایک بڈھے کا ساتھ چھوڑتے وقت اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا۔

وہ دوسری طرف کروٹ بدلنے کے بعد آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ آج اسے یقین تھا کہ مومی کسی دوسری شخصیت سے متاثر ہو گئی ہے۔ اب اور ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک طرف اس پر زیادہ مہربان ہو۔ اور دوسری طرف اس کی آزادی کو اپنی مٹھی میں رکھے۔ اس بوڑھے نے بڑی عمر گزاری تھی، بڑی دنیا دیکھی تھی۔ اسی لیے اس کی پہلی اور آخری کوشش یہی تھی کہ مومی کو جیتنے میں وہ آرٹسٹ سبقت نہ لے جائے۔

اس نے کروٹ بدل کر مومی کو دیکھا۔ وہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس نے آہستگی سے آواز دی: "مومی!"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے اپنے بستر سے اٹھ کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ ادھر ادھر پورے بستر پر ہاتھ پاؤں پھیلائے ایسی گہری نیند سو رہی تھی جیسے میلوں دور سے چلتے چلتے منزل پر پہنچ کر اپنی تھکن نکال رہی ہو۔ امداد میاں نے پہلی بار اسے بے ڈھب ہو کر سوتے دیکھا تھا۔

دوسری صبح وہ دیر تک سوتی رہی۔ ناشتے کی میز پر وہ تنہا رہا۔ یہ خیال پریشان کرتا رہا کہ آج مومی دور ہو گئی ہے۔ اس نے گہری نیند سونے کا نسخہ پا لیا ہے۔ وہ بیدار ہوئی تو شرمندہ سی تھی۔ اپنی نیند پر حیرانی کا اظہار کیا کہ جانے کیوں وہ اتنی دیر تک سوتی رہی۔ انجانے میں کیا ہوتا ہے۔ ایک ذرا سی دوری تو ہو ہی گئی تھی۔

امداد میاں نے پریشان ہو کر کہا: "میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔"

"تدبیر؟ کیسی تدبیر؟"

"تم اس آرٹسٹ کو یہاں لے آؤ۔ مجھ سے تعارف کراؤ۔"

"آ... آپ... اس سے ملیں گے؟ یہ... مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"تم نادان ہو۔ میں جہاندیدہ ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا والوں کا منہ کیسے بند کیا جا سکتا ہے؟"

"کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

"میں اسے اپنا دوست یا دور کا رشتہ دار بنا لوں گا۔ میرے رشتے سے تم اس سے ملو گی، باتیں کرو گی تو دنیا ہمیں بدنام نہیں کرے گی۔"

"مگر ہم کتنے لوگوں کو بتاتے پھریں گے کہ وہ آپ کا کوئی

عزیز ہے؟"

"کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ ہماری کوٹھی میں رہا کرے گا تو دنیا دیکھے گی۔"

ملکہ نے شدید حیرانی سے پوچھا: "وہ.... اور ہماری کوٹھی میں رہے گا؟"

"ہاں میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں تمہاری خوشی کے لیے اس آرٹسٹ کو خرید سکتا ہوں۔ یہاں اس کو رکھ کر اس کے اخراجات برداشت کر سکتا ہوں۔"

"لیکن آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ بڑی مشکل سے سانس لے کر بولا: "تاکہ تمہاری دوستی اس کوٹھی کی چار دیواری تک محدود رہے۔ میں کوٹھی کے باہر دوستوں اور رشتے داروں کو بتاؤں گا کہ وہ آرٹسٹ میرے ایک بہت پرانے دوست کا لڑکا ہے۔ کلکتے کا بنگالی ہے۔ یہاں بہت عرصہ بعد ملاقات ہوئی ہے اس لیے کبھی کبھی ہماری کوٹھی میں آکر رہتا ہے۔ ویسے اس کی رہائش کہاں ہے؟"

"وہ تنہا ہے اور ایک ہوٹل کے کمرے میں برسوں سے رہتا آرہا ہے۔"

"پھر تو یہ بہت آسان ہو گیا۔ ہم اسے رہنے کے لیے اپنی انیکسی دے دیں گے۔ تصویریں بنانے کے لیے بھی یہاں کا ماحول بہتر ہے۔ بولو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ مگر یہ سب کچھ مجھے خواب جیسا لگتا ہے۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں نہیں دے سکتا؟"

"ایں۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں اپنی حیثیت کو یاد رکھتی ہوں۔ میں ایک پتھر تھی، آپ نے تراش کر ہیرا بنا دیا۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں جانتی ہوں آئندہ بھی آپ اتنا کچھ کریں گے جس کی توقع میں نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر جاؤ اور ابھی اس آرٹسٹ کو بلا کر لے آؤ۔"

"وہ اس وقت کہاں ہوگا؟ میں نہیں جانتی۔ ہاں شام کو ملنے کا وعدہ ہے۔"

"وعدہ،" وہ سوچنے لگا۔ "یہی تو میں نہیں چاہتا کہ باہر ملنے کے وعدے ہوتے رہیں۔ عورت پہلے بدنامی سے ڈرتی ہے، بدنام ہونے لگے تو ڈھیٹ بن جاتی ہے۔ اسے عشق کی نیک نامی سمجھ کر عاشق کے ساتھ فرار بھی ہو سکتی ہے۔"

وہ موتی کو تکنے لگا۔ موتی نے پوچھا: "کیا بات ہے؟ آپ پریشان نظر آرہے ہیں؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا: "موتی! اس بڑھاپے میں میرے پاس صرف ایک ہی پونجی رہ گئی ہے اور وہ ہے تمہاری محبت۔ میری دولت اور جائداد کو کوئی مجھ سے چھین نہیں سکے گا۔ میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی تمہیں بھی مجھ سے نہیں چھینے گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ بولی: "میری محبت، میری وفا صرف آپ کے لیے ہے۔ یہ میں کسی کو نہیں دوں گی۔ دنیا کا کوئی شخص مجھے آپ سے کبھی نہیں چھین سکے گا۔"

زبان سے محبت کا اظہار ہو تو بات زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتی مگر ایسا کہتے وقت موتی کی آنکھوں میں محبت کی گہری سنجیدگی تھی۔ آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں کہتیں۔ وہ دل کی سچائی سے کہہ رہی تھی۔ امداد میاں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر یقین کرتے ہوئے کہا: "شام کو جاؤ گی تو جلدی آجانا۔ میں تمہارا اور اس آرٹسٹ کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

اس نے جلدی واپس آنے کا وعدہ کیا۔ شام کو رنگیتا ہوٹل پہنچی تو اندر سے سامنا کرنے کے خیال سے دل دھڑک رہا تھا۔ قدم ڈگمگانا چاہتے تھے مگر وہ سنبھل رہی تھی۔ اس نے جوانی میں وہ آسمان پر کمند ڈال کر چڑھ سکتی تھی۔ لیکن جڑوں کی مختصر سی سیڑھیاں چڑھتے وقت ہانپ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ موتی کو گندگی پسند نہیں تھی، اس لیے اندر کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ

کر بولا: "تم وعدہ کی پابند ہو۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا، آؤ۔"

"مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ سیکرٹری شوہر تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو۔"

"چلوں گا۔ اندر تو آؤ۔"

وہ چند لمحوں تک کشمکش میں مبتلا رہی پھر امداد میاں سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ وہ بولی: "نہیں۔ میں اندر نہیں آؤں گی۔"

"جان! آجاؤ۔" یہ کہتے ہی اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔

امداد میاں کی گھڑی میں شام کے چھ بج رہے تھے۔ موہنی پانچ بجے گئی تھی۔ اسے ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ اپنی کار میں نہیں گئی تھی۔ ڈرائیور کو وہ جگہ بتانا نہیں چاہتی تھی اور رکشا ٹیکسی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ گھڑی میں سات بجنے لگے تو امداد میاں کی بے چینی بڑھ گئی۔ وہ کئی بار کوٹھی سے باہر باغیچے میں آیا۔ بڑھاپے میں شام کی ٹھنڈک برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے وہ مجبور ہو کر کوٹھی میں واپس چلا جاتا تھا۔ کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھتا تھا مگر وہ نظر نہیں آتی تھی۔

دل میں اندیشے گھر کرنے لگے۔ اگر وہ آرٹسٹ کے ساتھ بھاگ جائے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ برسوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ابھی تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ موہنی کو اس بڈھے نے جوانوں سے زیادہ خوش رکھا ہے۔ ابھی بڑھاپے کے باوجود جوانی کا بھرم قائم تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ "آہ۔ موہنی! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، آجاؤ۔"

رات کے آٹھ بجے کوٹھی کے سامنے ٹیکسی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ موہنی ایک شخص کے پاس کھڑی تھی۔ وہ شخص ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کر رہا تھا۔ اسے موہنی کو دیکھ کر اطمینان اور خوشی تو ہوئی مگر وہ منہ پھلا کر خواب گاہ میں چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد موہنی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

"میں جانتی ہوں آپ ناراض ہیں۔" وہ قریب آتے ہوئے بولی: "مگر میری مجبوری بھی سن لیجیے۔ آج انور کی تصویروں کی نمائش کا آخری دن تھا۔ آرٹ گیلری میں انور کی موجودگی ضروری تھی۔ اس لیے ہمیں دیر ہو گئی۔"

بڑا معقول بہانہ تھا۔ امداد میاں کو اطمینان ہو گیا۔ مگر وہ بدستور منہ پھلا کر بولا: "میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اب تم مجھے تنہا چھوڑنے لگی ہو۔"

موہنی نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے پچکار کر کہا: "میں آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ سے دور نہیں رہ سکتی۔ آئیے ڈرائنگ روم میں انور صاحب انتظار کر رہے ہیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"آپ جائیں گے۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ میری بات مان لیتے ہیں۔ ہیں نا؟"

وہ سمجھا منا کر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ وہاں دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ ان میں ایک بوڑھا تھا، دوسرا جوان اور ان کے سامنے ایک عورت اپنے سر پر آنچل رکھ رہی تھی۔ تینوں کے درمیان شرم کا پردہ حائل تھا۔ وہ جس قوم سے بھی تھے، ان کی تہذیب اور شرافت سمجھاتی تھی کہ اگر کوئی بدمعاشی مجبوراً ہوتی ہے تو بدمعاشوں کی طرح آپس میں اس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے بلکہ شریفوں کی طرح اسے شرم کے پردے میں چھپا لینا چاہیے۔

موہنی ان دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے بعد کچن میں چلی گئی۔ بنگالی عورتیں خواہ کتنی ہی مالدار ہوں، وہ گھر کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہیں۔ موہنی رات کا کھانا، دوپہر کو پکا کر گئی تھی۔ وہ کھانا گرم کرنے کے بعد ڈائننگ روم میں لے آئی۔ پھر تینوں وہاں بیٹھ کر کھانے لگے۔ اس وقت تک انور اور امداد میاں کے درمیان یہ خوشگوار مسئلہ طے ہو گیا تھا کہ انور اچھے ماحول میں تصویریں بنانے کے لیے ان کی انیکسی میں آکر رہے گا اور جب چاہے گا اپنی انیکسی میں موہنی کو بلا سکے گا۔ اس طرح دنیا دو فنکاروں کو بدنام نہیں کرے گی۔ اصل فنکار امداد میاں تھا جس نے بڑی فنکاری سے یہ مسئلہ حل کیا تھا۔

انور دوسرے دن ہوٹل سے تمام سامان سمیٹ کر انیکسی میں لے آیا۔ اگرچہ کسی کے ہاں مستقل رہنا اور کھانا پینا بالکل ہی نامناسب تھا مگر موہنی نے ناراض ہونے کی حد تک ضد کی تھی اور موہنی ایسی چیز تھی جسے پاکر وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خاطر اسے انیکسی میں آکر رہنا پڑا۔ ویسے بھی حالات کا تقاضا یہی تھا۔ اس کے وہاں پہنچنے کے چند روز بعد ہی ملک میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ پتا چلا کہ سینکڑوں بہاری عورتیں اور بچے میمن سنگھ سے بیوہ اور یتیم ہو کر آرہے تھے۔ کچھ روز بعد اس سے زیادہ ہولناک خبر یہ ملی کہ دیناج پور اور سانتاہار میں اردو بولنے والے ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ تب حالات معمول پر لانے کے لیے پاکستانی فوج کو میدانِ عمل میں آنا پڑا۔

جلد ہی وقتی طور پر امن و امان قائم ہو گیا۔ پاکستانی فوج بیرکوں میں واپس گئی تو اردو بولنے والے مشتعل ہو گئے۔ کیونکہ ہزاروں کی تعداد میں ان کے عزیز و اقارب مارے گئے تھے۔ کسی بھی قوم کا کوئی شریف آدمی قتل و غارتگری نہیں چاہتا۔ ایسے وقت غنڈے بدمعاش ہنگامے کرتے ہیں۔ بہاری بدمعاشوں نے بھی یہی کیا۔ کبھی قتل اور کبھی لوٹ مار شروع

کردی۔

امداد میاں پریشان تھا۔ ایک تو گھر سے باہر بہاریوں سے خطرہ تھا۔ دوسرے گھر کے اندر ایک بہاری محبت سے انہیں لوٹ رہا تھا۔ موی امداد میاں کے گلے کا ہار بنی رہتی تھی۔ صبح سے شام تک شوہر کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتی تھی کہ کہیں وہ شبہ میں یا احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائے۔ لیکن جب وہ گھر میں موجود نہ ہوتا یا نیند میں گم رہتا تو وہ انیکسی کی آغوش میں پہنچ جاتی تھی۔

ایک روز امداد میاں نے بہت مجبور ہو کر جھجکتے ہوئے کہا "موی! رات کو کوٹھی سے باہر نہ نکلا کرو۔"

موی نے چونک کر اسے دیکھا۔ خیال ہوا کہ شاید چوری پکڑی گئی ہے۔ وہ جلدی سے بولی "رات کو نیند نہیں آتی تو میں باغیچے میں ٹہلنے چلی جاتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر بہاری غنڈے کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں۔"

"ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے۔ مگر انور صاحب بہاری ہیں۔ ان کی موجودگی میں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"میرا دل نہیں مانتا۔ ڈرتا ہوں کہ کوئی تمہیں اٹھا کر نہ لے جائے۔ جب تک حالات معمول پر نہ آ جائیں، تمہیں رات کو باہر نہیں نکلنا چاہیے۔"

وہ ذرا چپ رہی۔ بے چینی سے کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "اگر آپ انور صاحب کو اس کوٹھی میں کوئی کمرہ رہنے کے لیے دیں تو.....؟"

امداد میاں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر بولی "میرا مطلب یہ ہے کہ رات کو اگر غنڈوں نے حملہ کیا تو انور صاحب کو انیکسی سے یہاں تک پہنچنے میں دیر لگے گی۔ ہم تینوں یہاں ایک جگہ رہ کر رات کے وقت کوٹھی کو اندر سے بند رکھ سکتے ہیں۔"

ازدواجی زندگی گزارنے والے میاں بیوی گنتی کے وقت "ہم دونوں" کہتے ہیں۔ موی "ہم تینوں" کہہ رہی تھی۔ یہ بات امداد میاں کے دل میں چبھ گئی۔ شدید احساس ہوا کہ وہ بے شرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارا مذہب سکھاتا ہے کہ بیوی کے ساتھ ازدواجی تعلقات نہ رکھ سکو تو اسے آزاد کر دو۔ تاکہ وہ کسی کے ساتھ شرعی ازدواجی زندگی گزار سکے۔ ایسا نہیں کرو گے تو تمہارے درمیان گناہ کے راستے نکل جائیں گے اور تم ایک دوسرے کے ساتھ بے حیائی کے رشتے قائم کرتے رہو گے۔

امداد میاں نے جھکی ہوئی نظروں سے موی کو دیکھا۔ وہ موی کو آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ مذہبی احکامات اپنی جگہ اٹل سہی، مگر آدمی دل کے ہاتھوں بھی تو مجبور رہتا ہے۔ یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ جو اچھی چیز اپنے ہاتھ سے نکلنے لگتی ہے اسے وہ اور شدت سے پکڑ کر رکھنا چاہتا ہے۔ ایک طرح سے وہ موی کا عادی ہو گیا تھا۔ جب تک اس کے سینے سے سر لگا کر آنکھیں نہیں بند کرتا تب تک نیند نہیں آتی تھی۔ اگر دور ہوتا تو ہوا کا کوئی جھونکا آتا اور موی کے بدن کا پسینہ نتھنوں میں آ کر مہکنے لگتا۔ وہ ایک دم سے بے چین ہو جاتا۔ موی کو ایسے ڈھونڈتا جیسے مسافر کارواں کو اور بچہ ماں کو ڈھونڈتا ہے۔ آدمی بڑھاپے میں بچہ بن جاتا ہے۔ وہ بھی ایک بچے کی طرح موی کے لیے ضد کرتا تھا۔

وہ ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا "میں نہیں چاہتا کہ ایسے حالات میں تم باہر باغیچے میں بھی جاؤ۔ اب کوٹھی کے اندر رہنے کے لیے تم جو چاہو، سو کرو۔ میں اعتراض نہیں کروں گا۔"

موی خوش ہو گئی۔ اس نے انیکسی میں آ کر انور سے شوخی میں کہا "میں تمہیں ایک خوش خبری سناؤں گی۔ تم مجھے کیا انعام دو گے؟"

انور تصویر بنا رہا تھا۔ اس نے برش کو ایک طرف رکھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "بتاؤ، کیا خوش خبری ہے؟"

وہ جلدی سے بولی —— "تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے، اگر وہ اچانک یہاں آ جائیں تو؟"

اس نے انجان بن کر پوچھا "کون آ جائیں تو؟ بہاری یا بنگالی؟"

وہ ہونٹوں کو بھینچ کر اس کے سینے پر جھکے سے گھونسا مار کر بولی "میں میاں صاحب کی بات کر رہی ہوں۔ جانتے ہو آج میں نے انہیں اس بات پر راضی کر لیا ہے کہ تم رات کو انیکسی میں نہیں، کوٹھی میں رہا کرو گے۔"

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ یہاں رات کو غنڈے بدمعاشوں کا خطرہ ہے۔"

"خطرہ مجھے نہیں، تمہیں ہے۔ کیونکہ تم کوٹھی سے رات کو نکل کر پچیس قدم کا فاصلہ طے کر کے یہاں آتی ہو۔ یقیناً میاں صاحب نے رات کو تمہیں یہاں آتے دیکھا ہو گا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ اگر وہ کبھی دیکھ لیں گے تو ہم دونوں کو جان سے مار ڈالیں گے....."

ایسا کہتے وقت موی کے لہجے میں پختگی نہیں تھی۔ حالات بتاتے تھے کہ امداد میاں سب کچھ جانتا ہے اور انجان بنتا ہے۔ لیکن موی اسے تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایسا سوچنے سے امداد میاں کے کردار پر حرف آتا تھا اور وہ بچپن سے ان کی پوجا کرتی آئی تھی۔ اس لیے حالات کچھ بھی کہیں، وہ اپنے میاں صاحب کو بے غیرت تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔

انور نے مسکرا کر کہا "میں میاں صاحب کے متعلق سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ کوئی بھی بوڑھا خاوند کسی نوجوان کو اپنی حسین بیوی کے قریب پھٹکنے نہیں دیتا، بجائے یہ کہ انہوں نے مجھے یہاں لا کر

رکھ لیا ہے۔ جب پہلی بار تم نے مجھے یہاں آ کر رہنے کے لیے کہا تو میں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ یہاں رہنے سے ہماری ملاقاتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ تم نے مجھے یقین دلایا کہ میاں صاحب شکی نہیں ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں، واقعی وہ بڑے فراخدل ہیں۔ اب کوٹھی کے اندر رہنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ ہم دونوں جوان ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں اور ہر رات ہمارے درمیان صرف چند قدموں کا فاصلہ رہے گا اور جوانی ایسے فاصلوں کو ایک ہی جست میں طے کر لیتی ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"موی! مجھے یقین ہے کہ میاں صاحب ہمارے تعلقات کو سمجھ رہے ہیں۔"

وہ غصے سے بھڑک گئی۔ مٹھیاں بھینچ کر بولی: "تمہیں ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ کیا تم میرے شوہر کو بے غیرت سمجھ رہے ہو؟ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہارے جیسا فنکار میری مجبوریوں کو سمجھنے کے بعد، مجھ سے تعلقات قائم کرنے کے بعد میرے عزت دار اور غیرت مند شوہر پر اس طرح کیچڑ اچھالے گا۔"

انور نے ندامت سے کہا: "تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تمہارے میاں صاحب کی توہین نہیں کر رہا ہوں۔ کچھ جہاندیدہ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو اخلاق اور تہذیب کی لاج رکھنے کے لیے کچھ ناپسندیدہ باتوں کو پسند کر لیتے ہیں۔ جو شخص ایسا مصلحت پسند ہو کہ ہمارے تعلقات پر کیچڑ نہ اچھالے، میں اس پر کیسے کیچڑ اچھال سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ اب بھی تم یہی کہہ رہے ہو کہ وہ ہمارے تعلقات کو سمجھتے ہیں اور مصلحتاً برداشت کر رہے ہیں؟"

"تم برا مانتی ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"گالی دے کر الفاظ واپس لینے سے کیا گالی نہیں پڑتی؟ کیا گالی سے ملنے والی ذلت کا احساس ختم ہو جاتا ہے؟"

وہ غصے سے جانے لگی۔ انور نے آواز دی: "رک جاؤ موی! میری بات تو سنو۔"

وہ دروازے سے پلٹ کر بولی: "میں تم سے پہلے ہی دن کہہ چکی تھی کہ میں کسی صورت میں میاں صاحب کی توہین برداشت نہیں کروں گی۔ خدا کے بعد میرا کوئی ہے تو وہ میاں صاحب ہیں۔ تم نے جو کچھ کہا، انہیں نہیں کہا بلکہ میرے منہ پر جوتا مارا ہے۔"

"موی! میں شرمندہ ہوں.....۔"

موی کچھ کہے بغیر غصے سے تنتناتی ہوئی چلی گئی۔ وہ اسے پکارتا ہوا دروازے تک آیا۔ پھر ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ کیونکہ اس کے پکارنے کی آواز امداد میاں کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر سوچنے لگا۔ موی اور امداد میاں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟

امداد میاں نے پہلی ملاقات میں اس سے کہا تھا: "موی کو مصوری سے دلچسپی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہوٹل میں رہنے کے بجائے ہماری انیکسی میں رہو۔ یہاں تصویریں بناؤ۔ موی کا شوق بھی پورا ہوتا رہے گا۔"

انور تقریباً ایک ہفتے سے انیکسی میں رہ رہا تھا۔ موی آدھی رات کو آتی تھی اور جلد ہی چلی جاتی تھی۔ انور کے دماغ میں یہ سوال کلبلاتا تھا کہ کیا کسی رات امداد میاں کی آنکھ نہیں کھلتی ہوگی؟

موی نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ میاں صاحب خواب آور گولی کھا کر سوتے ہیں۔ تب انور نے ضد کی کہ موی کو رات کے وقت اس کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا چاہیے مگر وہ جلدی بھاگ جاتی تھی۔ کیوں چلی جاتی تھی جبکہ امداد میاں دوا کے اثر سے گہری نیند سوتے چلے گئے؟ یہ باتیں ایسی تھیں جو انور کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھیں کہ امداد میاں جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں اور یہی بات موی کو بری لگ گئی تھی۔

وہ انور کو غصہ دکھا کر کچن میں آئی۔ امداد رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔ پکانے کے دوران اس کے دماغ میں انور کی باتیں گونجتی رہیں۔ وہ نادان نہیں تھی۔ امداد میاں کی مصلحت اندیشی کو سمجھ رہی تھی۔ مگر شرم بھی کوئی چیز ہوتی ہے جب تک بے شرمی چھپی رہے ایک دوسرے کے سامنے اپنی اپنی شرم کو برقرار رکھنا چاہیے۔ اور وہ اپنی شرم رکھ رہے تھے۔ ایسے میں انور نے ان کی ذات پر حملہ کیا تھا۔ موی کے نقطۂ نظر سے امداد میاں اس کے لیے بہت بڑی قربانی دے رہے تھے۔ اس لیے وہ ان کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتی تھی۔ اور اسی لیے وہ انور کو غصہ دکھا رہی تھی۔ ارادہ تھا کہ جب تک وہ اس کی خوشامد نہیں کرے گا اور امداد میاں کی غیرت مندی کا اعتراف نہیں کرے گا آئندہ ان کی برائی کرنے سے توبہ نہیں کرے گا، وہ اس سے بات نہیں کرے گی۔

رات کو کھانے کا وقت ہوا تو اس نے انیکسی سے باہر کھڑے ہو کر انور کو آواز دی۔ یہ کہہ کر واپس جانے لگی کہ میاں صاحب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔ انور نے انیکسی کے اندر آنے کے لیے اس سے التجا کی مگر وہ کوٹھی میں چلی گئی۔ کچن سے کھانا لا کر میز پر رکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد انور وہاں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ موی امداد میاں کے پاس بیٹھ کر کھانے لگی۔ امداد میاں نے کھانے کے دوران انور سے کہا: "شہر میں بڑی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تمہیں رات کو انیکسی میں تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ یہ اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ یہاں کسی کمرے کو اپنا بیڈ روم بنا لو۔"

انور کو یہ معلوم تھا کہ موی بھی یہی چاہتی ہے۔ اس نے ٹالنے کے لیے کہا: "میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں کھڑکیوں اور دروازوں کو اندر سے بند کر کے سوتا ہوں۔"

"پھر بھی ہمیں اطمینان نہیں ہوتا۔" امداد میاں نے کہا: "خدانخواستہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو ہمیں بہت افسوس ہوگا۔ تم ہمارے ہاں ہو۔ ہم

پر تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہے۔"

وہ بولا: "میں آپ کی محبت اور مہربانیوں کو مانتا ہوں۔ آپ کے حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن......"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ مومی لقمہ چباتے چباتے رک گئی۔ امداد میاں نے پوچھا: "لیکن کیا؟"

"میں نے ایک تصویر شروع کی ہے۔ آج پتا نہیں کتنی رات تک پینٹنگ کرتا رہوں گا۔ کل بھی شاید وہ مکمل نہ ہو سکے۔"

"پینٹنگ کا سامان کوٹھی میں لے آؤ۔"

"میں نے انیکسی کے ماحول میں ایک خاص موڈ میں کام شروع کیا ہے۔ ماحول بدلے گا تو موڈ بھی بدل جائے گا۔ میں آپ کو اپنی مجبوری سمجھا نہیں سکتا۔"

امداد میاں نے کہا: "ایک آرٹسٹ ہی اپنے موڈ کو سمجھ سکتا ہے۔ ٹھیک ہے جس دن تصویر مکمل ہو، کوٹھی میں چلے آنا۔"

انور نے فاتحانہ انداز میں مومی کو دیکھا۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی: "بس میں اور نہیں کھاؤں گی۔"

امداد میاں نے اسے بٹھا کر کھلانے کی ضد کی مگر وہ بہانہ کر کے کچن میں چلی گئی۔ انور بھی کھانے سے فارغ ہونے کے بعد امداد میاں سے اجازت لے کر انیکسی کی طرف چلا گیا۔ مومی دوبارہ کچن سے واپس آئی تو امداد میاں نے پوچھا: "کیا انور سے ناراضگی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"آج تم اس کی موجودگی میں ایک بار بھی نہیں مسکرائیں۔"

"مجھے سر بھاری لگ رہا ہے۔ ایسے میں مسکرانے کا خیال نہیں رہتا۔"

"میں نے اندازہ لگایا ہے کہ انور کوٹھی میں آ کر رہنا نہیں چاہتا۔ اس نے ماحول اور موڈ کا بہانہ کیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہماری بلا سے۔ یہاں آ کر نہ رہے۔ آپ نے سمجھانے کا فرض ادا کر دیا۔ اب اس کی خوشامد تو نہیں کی جا سکتی۔"

امداد میاں وہاں سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں جانے لگے۔ مومی کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ انور سے ناراض ہے، غصہ میں ہے۔ شاید انور سے بیزار ہو گئی ہے یا انور کا دل اس سے بھر گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ بات خوش آئند تھی۔ امداد میاں کو خوشی ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد مومی نارئیل کا حقہ تیار کر کے لے آئی۔ وہ چور نظروں سے مومی کے تیور کو بھانپ رہا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو اس نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے سوچا۔ میں بھی تو اکثر مومی سے روٹھ جاتا ہوں تاکہ وہ منائے۔ اور اس کی محبت کا یقین ہو کہ وہ مجھے ناراض نہیں دیکھ سکتی۔ ناراضگی اسی سے ہوتی ہے، دکھاوے کی نفرت اسی سے ہوتی ہے۔ جس سے گہری محبت ہوا کرتی ہے۔ کیا مومی کے دل میں آرٹسٹ کی محبت نقش ہو گئی ہے؟ کیا وہ چاہتی ہے کہ آرٹسٹ اسے پیار سے منائے اور گلے سے لگا کر گلے دور کر دے؟

اسی سوچ کے دوران اس کے اندر بے چینی پیدا ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ آرٹسٹ ایک وقتی ضرورت بنے۔ مومی کی محبت نہ بنے۔ لیکن محبت اور ضرورت کے درمیان جنگ ہو تو اکثر ضرورت غالب آ جاتی ہے۔ مثلاً اناج ایک ایسی ضرورت ہے، جس کی خاطر آدمی محبت کے رشتوں کو ٹھکرا دیتا ہے۔ مثلاً آدم کو شجر ممنوعہ کی ضرورت تھی۔ اور یہ ضرورت تمام عمر کی عبادت اور خدا کی محبت پر غالب آ گئی تھی۔ اس کی سزا آدم کو ملی۔ سزائیں تو آج بھی ملتی ہیں۔ مگر آج بھی ضرورت ہی غالب آتی رہتی ہے۔

اس نے حقے کا کش لیا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔ وہ اپنے دل میں بڑبڑانے لگا: "کچھ بھی ہو۔ محبت کا ہی بول بالا ہوتا ہے۔ محبت ایک روحانی جذبہ ہے۔ مومی مجھے روح کی گہرائی سے چاہتی ہے، اور اسے ضرورت کے لیے پوجتی ہے۔ ضرورت تو بس آنی جانی ہوتی ہے۔"

ہاں انسان بھی دنیا میں آتا ہے چلا جاتا ہے۔ ضرورت بھی اس کے ساتھ آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی جاتی ہے۔ انسان اس کے لیے لڑتا ہے۔ پسینہ پسینہ ہوتا ہے۔ خون بہاتا ہے۔ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے۔ بے شک محبت روحانی ہوتی ہے۔ مگر ضرورت زندگی کی جان ہے۔ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ زندگی بے ضرورت ہو ہی نہیں سکتی۔ محبت بھی وہاں ہوتی، جہاں چھپی ہوئی ضرورت چپ چاپ چنگاری سے شعلہ بنتی آتی ہے۔

رات کو حسب معمول مومی اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر اسے تھپک تھپک کر سلانے لگی۔ اس نے کہا: "مومی! شہر میں اغوا کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تم باغیچے میں ٹہلنے جاؤ گی تو مجھے فکر سے نیند نہیں آئے گی۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"مگر کمرے میں تمہیں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔"

"میں کھڑکیاں کھول دوں گی مگر باہر نہیں جاؤں گی۔ آپ اطمینان سے سو جائیں۔"

امداد میاں نے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر نہ جانے کی بات پر مومی کا دل ضد کرنے لگا تھا۔ دھڑک دھڑک کر سینے کی دیوار سے سر ٹکرا رہا تھا۔ انور کو پکار رہا تھا۔ اور اس کے سینے سے امداد میاں کا سر لگا ہوا تھا۔ اور ان دھڑکنوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ دھڑکنیں محبت کے لیے ہیں یا ضرورت کے لیے۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں لیٹی رہی۔ جب امداد میاں کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو وہاں سے اٹھ گئی۔ اپنے بستر پر جانے کا ارادہ تھا مگر بے ارادہ کھڑکی کے پاس آ کر اس کے پٹ کھول دیے۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے بالکل سامنے انیکسی نظر آنے لگی۔ ابھی رات کے گیارہ بجے تھے۔ انیکسی کا اسٹوڈیو والا کمرہ روشن تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور تصویر بنا رہا ہے۔ خیال کے سادے کینوس پر مومی کی تصویر۔

وہ دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنی بے قراری کو سہلانے لگی۔ پھر کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ کمرے کے وسط میں آ کر دو پلنگ کے درمیان

میٹنے لگی۔ کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔ دل انیکسی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ انور کو پانے سے پہلے وہ سوچتی تھی کہ وہ صرف امداد میاں کو چاہے گی۔ وہ جو ایک شہزادے کا تصور ہے تو وہ اب مزید تا آئے گا۔ امداد میاں کی محبت کی جڑیں دل کی گہرائیوں تک ہیں۔ کوئی نہیں اکھاڑ نہیں سکتا۔ انور بھی امداد میاں کو نہیں اکھاڑ رہا تھا مگر اس سے الگ موی کے دل پر اپنا سکہ جما رہا تھا۔

ضرورت تو کہیں بھی پوری ہو سکتی ہے۔ ایک انور ہی کیوں؟

یہاں عورت کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ وہ کپڑے بدلتی ہے مرد نہیں بدلتی۔ امداد میاں اگرچہ اپنا لباس بھی بن سکتا تو وہ انور کو ہرگز نہ پہنتی۔ ہر شخص اپنے حالات کے مطابق گناہ کی ایک حد مقرر کرتا ہے۔ موی انور کی حد سے آگے کسی اور کے متعلق سوچنا گناہ سمجھتی تھی۔

رات کا ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ کھڑکی کے باہر انیکسی کا کمرہ روشن رہا۔ وہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ کھڑکی کی طرف سے منہ پھیر کر امداد میاں کی طرف کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ادھر چند دنوں سے بڑی آسودگی ملی تھی۔ جذبات نہیں بھڑک رہے تھے۔ اسے ہوس نہیں کھینچ رہی تھی۔ انور کی شخصیت اسے پکار رہی تھی۔ پہلے ایسا ہی ہوتا ہے پہلے ضرورت کھینچ کر لاتی ہے پھر رفتہ رفتہ محبت کا روگ لگتا ہے۔ ابھی وہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اسے انور سے کیسی محبت ہے؟ یا اس کے بازوؤں میں سب کچھ پانے کے بعد وہ اچھا لگ رہا ہے یا اس کے جیتنے کا انداز بھا رہا ہے؟ یا پھر یہ حقیقت ہے کہ آدمی سماجی جانور ہے۔ قریب آ کر ایک دوسرے کو پاتا ہے یہی پہچان محبت بڑھاتی ہے۔

وہ کروٹیں بدل بدل کر سو گئی۔ صبح چار بجے تک امداد میاں بھی ایک آنکھ سے جاگتا رہا تھا۔ خواب گاہ میں زیرو پاور بلب کا یہی فائدہ تھا۔ صفر درجہ کی روشنی میں سونے یا جاگنے والا پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ چار بجے جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ سو گئی ہے تو وہ بھی مطمئن ہو کر سو گیا۔

دو گھنٹے بعد ہی موی کی آنکھ کھل گئی۔ چھ بج گئے تھے۔ دن کا اجالا پھیل گیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دماغ میں انور کا ہی خیال تھا۔ سوتے وقت بھی خیالوں میں وہی تھا۔ امداد میاں تو سامنے تھے۔ "جو سامنے ہوتا ہے" اسے یاد نہیں کیا جاتا۔ وہ کھڑکی کے پاس آئی۔ انیکسی کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ پتا نہیں وہ رات کو سویا بھی تھا یا نہیں؟

وہ پلٹ کر کمرے سے باہر آئی۔ پھر کوٹھی سے باہر نکلی۔ پچیس قدم کا فاصلہ طے کر کے انیکسی کے دروازے پر پہنچی۔ انور اپنے کمرے میں پلنگ کے پاس کھڑا ہوا ایک سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہا تھا۔ ایک طرف پیکنگ کا سامان بندھا پڑا تھا۔ موی نے حیرانی سے پوچھا: "یہ سامان کیوں باندھ لیا ہے؟"

وہ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولا: "میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟"

اس نے سوٹ کیس کے پاس سے گھوم کر اسے دیکھا پھر جواب دیا:

"اس لیے جا رہا ہوں کہ آدمی کو اپنی جگہ اپنی زمین نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہم ہندوستان سے اپنی زمین چھوڑ کر آئے مگر یہاں کی سرزمین پر اپنے قدم نہ جما سکے۔ لگتا ہے بہت جلد ہمارے قدم اکھڑنے والے ہیں۔ میں برسوں سے ہوٹل میں رہتا آیا ہوں۔ تمہارے بہکانے پر وہ جگہ چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اب یہاں تمہارے تیور بدلتے جا رہے ہیں۔ کل ایک ذرا سی بات پر تم ایسی ناراض ہوئیں کہ ...."

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی: "کیا مجھے ناراض ہونے کا حق نہیں ہے؟ میں اپنا سب کچھ نچھاور کر چکی ہوں۔ کیا مجھے اتنی سی توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں روٹھ جاؤں گی تو تم مجھے مناؤ گے؟"

"تم میرے گھر میں میرے ہوٹل کے کمرے میں روٹھ جاتیں تو میں ہزار بار مناتا۔ یہاں مجھے احساس ہوا کہ تم اپنے گھر بلا کر اپنے پیچھے لگا رہی ہو۔ عورت کے گھر میں رہ کر اس کی خوشامدیں کرنے والا گھر داماد ہوتا ہے۔ یا زن مرید۔ آج یہ عقل آ گئی ہے کہ دین کے لیے، دنیا کے لیے بھی کہ عورت کے لیے بھی اپنا گھر اپنی زمین نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

موی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا: "ایسے ہی تجربات کی باتیں کر رہے ہو تو بتاؤ کیا ایک عورت کو دوسرے مرد کے لیے اپنے مرد کو دھوکا دینا چاہیے؟"

"یہ عورت کو سوچنا چاہیے۔"

"جب تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے تو صرف عورت کو کیوں سوچنا چاہیے؟ تم بالکل ہی معصوم نہیں ہو۔ جب میں تمہارے پاس آئی تھی اس وقت تم اشارتاً بھی کہہ سکتے تھے کہ اے عورت تو غلطی کرنے آئی ہے۔ تو اپنے مرد کو دھوکا دینے والی بے وفا اور بدکار عورت ہے۔ مگر کوئی مرد پہلے ایسا نہیں کہتا۔ پہلے بدکاری میں شریک ہو جاتا ہے۔ بعد میں طعنے دیتا ہے۔"

"میں طعنے نہیں دے رہا ہوں۔ میں نے تمہیں گناہ کے خیال سے نہیں، محبت کے جذبے سے اپنایا تھا۔ مگر تم دو مردوں کی محبت میں تقسیم ہو گئی ہو۔"

"یہ میری مجبوری ہے۔"

"ایسی مجبوریوں کو کوئی نہیں مانتا۔ تم بہن، بیٹی اور ماں بن کر ہزاروں سے محبت کر سکتی ہو لیکن محض ایک عورت بن کر، محض ایک مرد سے وفا کرنا ہو گی۔ دو مردوں سے بیک وقت وفا نہیں ہو سکتی۔"

"تم صرف دو سے وفا کی بات کر رہے ہو۔ جبکہ مرد بیک وقت چار عورتوں سے وفا کرنے اور برابر انصاف کرنے کا دعویٰ کرتا آیا ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر موی کو دیکھا: "میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ میں تمہیں صرف اپنی ملکیت بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ تم چاہو تو ابھی اسی لمحہ میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ میں نے سامان باندھ لیا ہے۔"

وہ بے بسی سے بولی: "انور! یہ کیا ستم ہے۔ پہلی ملاقات میں تم نے میری مجبوریوں کو سمجھ لیا تھا۔ میرے ساتھ میرے بڈھے شوہر کے وجود کو برداشت کر لیا تھا۔ میری شوہر پرستی کی بھی تعریف کی تھی کہ میں انہیں بڑھاپے میں

تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑنا نہیں چاہتی۔ آج تم میاں صاحب کو چھوڑنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ پھر ایک دن آئے گا جب تم طعنہ دو گے کہ ایک مرد کو ٹھکرانے والی دوسرے مرد سے بھی وفا نہیں کر سکتی۔"

"میں طعنے نہیں دوں گا۔"

"انور! ہمارے سماج کی کوئی کل سیدھی ہو تو یقین بھی کیا جائے کہ طعنے نہیں ملیں گے۔ کل تمہیں میری ایک بات اچھی لگی آج وہی بات غلط ہے اور آج جس بات کو تم اچھا کہہ رہے ہو کل وہ بات بھی غلط ہو جائے گی۔"

"ہاں ہماری دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم ایک ٹھوس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی نہیں گزارتے۔ ہم نے بھی جذبات میں بہہ کر جو غلطی کی ہے ہم بچے نہیں ہیں۔ ہم اب بھی ایسی غلطی سے باز آ کر مذہبی، قانونی اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں۔ میں تمہیں ایک سیدھا راستہ دکھا رہا ہوں۔ اس راستے پر میرے ساتھ چل سکتی ہو تو پھر آؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ مومی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر راستہ روکتے ہوئے پوچھا "مذہب، قانون اور اخلاق سب اپنی جگہ اٹل ہیں۔ میں صرف انسانیت کے ناتے سے پوچھتی ہوں۔ کیا ایک بوڑھے کی آس اور امید توڑ دوں؟ اس کے اعتماد پر ٹھوکر دوں؟ ہائے اس عمر میں یہ ذلت اٹھانے کے لیے چھوڑ دوں کہ میں اسے ٹھکرا کر چلی گئی ہوں۔ وہ میری جوانی کی دھوپ میں سایہ نہیں بن سکتا، کیا میں بھی اسے اپنے آنچل کے سائے سے بھگا دوں؟ انسانی رشتے کچے دھاگے تو نہیں ہوتے کہ تم نے کہا اور ٹوٹ گئے۔"

انور نے جواب نہیں دیا۔ مومی کے روکنے والے ہاتھ کو ایک طرف ہٹا کر جانے لگا۔ وہ ڈوبتے ہوئے دل سے اور بھیگتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جانے والے کے قدم دروازے کے پاس رک گئے۔ جیسے وہ جانا نہ چاہتا ہو اور جا رہا ہو۔ اس نے پلٹ کر مومی کو دیکھا۔ ایک گہری سانس لی، پھر بولا "واقعی انسانی رشتے توڑے نہیں جا سکتے اور نہ ہی میں تم سے رشتہ توڑ کر جا رہا ہوں۔ ہم دور رہیں گے تو ایک دوسرے کی اہمیت کا صحیح پتا چلے گا۔ پھر ہم اپنی اپنی جگہ سوچیں گے اور فیصلہ کریں گے کہ ہم کس کو چھوڑ کر اور کس کو اپنا کر جائز ازدواجی زندگی گزار سکتے ہیں۔"

اس نے دروازے کے پاس رکھے ہوئے ایزل کو اٹھا کر شانے سے لٹکایا۔ ایک کینوس کو بغل میں دبایا۔ پھر پینٹنگ کے سامان سے بھرا ہوا تھیلا اٹھا کر وہاں سے جانے لگا۔ مومی آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ جانے والے کے ہر قدم پر گمان ہوتا تھا کہ وہ لوٹ آئے گا لیکن وہ جاتے جاتے نظروں سے اوجھل ہو گیا تب اس نے تکلیف کی شدت سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ سینے کے اندر دل کے ٹوٹنے کا پتا چلا تھا۔ وہ پلٹ کر انور کے خیال چھوڑتے ہوئے بستر پر آئی اور اس پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی۔

رونے سے کیا ہوتا ہے کوئی جانے والا آنسو پونچھنے نہیں آتا۔

# نہ جانے کب

روتے روتے اُسے خیال آیا کہ بہت دیر ہو چکی ہے، دھوپ تیز ہو رہی ہے میاں صاحب بیدار ہو گئے ہوں گے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر آنسو پونچھنے لگی۔

آئینے کے سامنے پہنچ کر ساری کے پلّو سے اپنے چہرے کو صاف کیا۔ کہیں کہیں بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں کی کنگھی سے جمایا۔ پھر ٹیکسی سے باہر آ گئی۔ وہاں کا دروازہ بند کرتے وقت دل رو رہا تھا کہ اب وہ نہیں آئے گا۔

جب وہ کوٹھی کے اندر اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو امداد میاں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، سامنے میز پر چائے کی کیتلی اور پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے کیتلی اٹھا کر ایک پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔ "چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ تم نہیں تھیں، اس لیے میں خود چائے بنا کر لے آیا۔ آؤ ایک پیالی پی لو۔"

مومی کو اپنا سر بھاری لگ رہا تھا۔ وہ نڈھال سی ہو کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "وہ چلے گئے۔"

امداد میاں نے اس کے آگے پیالی رکھتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں میں نے یہاں کھڑکی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

اس نے پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ پیا۔ چائے بہت میٹھی تھی۔ جی متلانے لگا۔ سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ وہ درد میں کمی کرنے کی خاطر ہاسی منہ چائے پی رہی تھی۔ دوسرا گھونٹ پیتے ہی اُبکائی محسوس ہوئی۔ وہ فوراً ہی پیالی کو رکھ کر تیزی سے چلتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی۔ دوسرے ہی لمحے قے کرنے کی آواز سنائی دی۔

امداد میاں کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ وہ اضطراب کی حالت میں سیدھے ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اضطراب قائم رہا کیونکہ باتھ روم سے ٹھہر ٹھہر کر کبھی اُبکائی آنے، کبھی قے کرنے اور کبھی کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ امداد میاں کے کانوں میں جیسے ہوائیں شور مچا کر آنے والے طوفان کی اطلاع دے رہی تھیں۔ وہ گم صم بیٹھا ہوا تھا، مگر اس کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔

باتھ روم سے آنے والی آوازیں تھم گئیں۔ اب شاید مومی وہاں سے نکلنے والی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگا مگر وہ نہیں آئی۔ امداد میاں کے پیچھے باتھ روم کا دروازہ تھا۔ شرم کے مارے وہ پلٹ کر پیچھے دروازے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ چپ چاپ موموی کو ڈھیل دیتا رہے گا، اور اس کے چور رشتے سے انجان بنا رہے گا۔ اس طرح اس کا بڑھاپا اور موموی کی جوانی شرم کے پردے میں گزر جائے گی۔ لیکن اب قدرت نے اس پردے کو چاک کر دیا تھا۔ اب اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ موموی سے آنکھ ملا سکتا۔ اس بوڑھے نے گناہ نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود یہ بھی ایک گناہ تھا کہ وہ جوان بیوی کا شوہر بنا بیٹھا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سامنے سنگھار میز کا ایک قدِ آدم آئینہ تھا۔ اس آئینے میں موموی سر جھکائے باتھ روم کے دروازے پر نظر آ رہی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ ایک ہتھیلی سے چھپا ہوا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ میاں صاحب کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ انور نے یہی تو کہا تھا کہ میاں صاحب جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں۔ موموی نے اس حقیقت سے انکار کیا تھا۔ اب وہی حقیقت سامنے تھی۔ امداد میاں جان بوجھ کر انجان بنا بیٹھا تھا۔

موموی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ ہلکی ہلکی آواز میں رونے لگی۔ آنسوؤں کی زبان میں اپنی غلطی کا اعتراف کرنے لگی۔ اپنی شرمساری کو آنسوؤں کے ذریعہ میاں صاحب تک پہنچانے لگی مگر وہ پتھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور میاں صاحب کی طرف سے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ ہوا تو وہ مجبور ہو کر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "آپ خاموش کیوں ہیں؟ مجھے گالی کیوں نہیں دیتے؟ مجھے مارتے کیوں نہیں؟ مجھ پر تھوک دیجیے۔ کچھ نہیں کر سکتے ہیں تو گھر سے نکل جانے کا حکم دیجیے۔ میں پھر کبھی اپنا منہ نہیں دکھاؤں گی۔"

امداد میاں کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اب بھی پلٹ کر موموی کو نہیں دیکھا۔ نظریں چراتا ہوا آہستہ آہستہ چھڑی ٹیکتا ہوا خواب گاہ سے باہر جانے لگا۔ موموی آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ خواب گاہ کے دروازے پر رک گیا۔ موموی کی طرف دیکھے بغیر بولا... "جس عورت کا شوہر زندہ ہو، اسے بدنامی کی آنچ نہیں لگتی۔ آرام کرو۔"

وہ چلا گیا۔ موموی باتھ روم کی چوکھٹ سے لگی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر یوں آہستہ آہستہ بیٹھنے لگی جیسے شرم سے زمین میں گڑی جا رہی ہو۔

⬥

انور موموی کو چھوڑ کر آ گیا تھا مگر اب پچھتا رہا تھا۔ دل اسی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اور دماغ اسے روک رہا تھا۔ ایک فن کار کی سوچ میں جو نفاست ہوتی ہے، وہ لیے سمجھا رہی تھی کہ محبت کے نام پر گناہ نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک موموی کو چھوڑا نہیں جا سکتا لیکن غیر اخلاقی طریقہ سے حاصل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے برے کی پہچان کے لیے دماغ دیا ہے۔ کچھ تو اس دماغ سے کام لے کر برائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اسے رہنے کے لیے ہوٹل کا وہی کمرہ خالی مل گیا تھا جہاں وہ پہلے رہتا آیا تھا۔ بلکہ اب تو سارا ہوٹل ہی خالی پڑا رہتا تھا۔ شہر کے راستے بھی ویران رہتے تھے۔ بنگالی بہاری فسادات نے زور پکڑ لیا تھا۔ پہلے بنگالیوں کا پلڑا بھاری رہا تھا۔ میمن سنگھ اور سانتا ہار میں ایک بہاری کو زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اگر پاکستانی فوج آڑے نہ آتی تو دوسرے شہروں سے بھی بہاریوں کا صفایا ہو جاتا۔ بہر حال بہاریوں نے انتقاماً بنگالیوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ کچھ عرصہ تک ایسا ہوتا رہا۔ پھر اچانک بنگالیوں کا پلڑا بھاری ہونے لگا۔ پاکستانی فوج کے جوان جب بھی امن و امان قائم کرنے کے لیے بیرکوں سے باہر آنا چاہتے، ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں۔ فوجی گاڑیوں کو روکنے کے لیے کہیں راستے میں درخت کاٹ کر گرا دیے جاتے تھے۔ کہیں لانچ کو تباہ کر دیا جاتا تھا۔ اور کشتیاں غائب کر دی جاتی تھیں۔ ٹیلیفون

وغیرہ کے تار کاٹ دیے جاتے تاکہ فوجی ایک جگہ سے دوسری جگہ رابطہ قائم نہ کر سکیں۔

ان حالات میں بہاری مغربی پاکستان بھاگ کر آنے لگے۔ ہر روز دو تین طیارے ان بہاری خاندانوں کو وہاں سے لاہور اور کراچی پہنچانے لگے۔ مومی نے ڈوبتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ کیا انور بھی اسے چھوڑ کر چلا جائے گا؟

مومی نے دو دنوں سے انور کو نہیں دیکھا تھا اور دو دنوں سے امداد میاں مومی کا منہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک کمرے میں ہوتی تو وہ سر جھکا کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ رات کو وہ اپنی خواب گاہ میں نہیں آتا۔ وہاں جانے سے دل کو یہ بات لگتی تھی کہ کسی دوسرے نے اس کی خواب گاہ پر شب خون مارا ہے۔ اگرچہ یہ بات وہ پہلے سے جانتا تھا تاہم جاننا اور بات ہے اور کسی بات کا بے شرمی سے کھل جانا اور بات ہے۔ ایسے میں کسی کا منہ دیکھنے یا اپنا منہ دکھلانے کا حوصلہ نہیں رہتا۔

مومی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ وہ دونوں بڑی احتیاط سے کام لیتے رہتے تھے مگر کسی وقت جذبات کی اندھی غلطی ہو گئی تھی۔ کون عورت ماں بننا نہیں چاہتی؟ مومی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کہ بچے کو امداد میاں کا نام نہ ملتا اور امداد میاں کو ایک بچے کی خوشی نہ ملتی۔ لیکن نہ چاہنے کے باوجود جب ایسا ہو گیا تو مومی کے اندر ممتا اٹھنے لگی۔ ابھی تک امداد میاں اور انور کی دو طرفہ کشش تھی اب وہ بچہ تیسری طرف سے کھینچ رہا تھا۔

ابتدا میں گناہ بہت آسان لگتا ہے۔ یقین ہوتا ہے کہ بے حیائی چھپی رہے گی اور عیاشی ہوتی رہے گی۔ مومی کے خیال کے مطابق اسے امداد میاں سے محبت تھی اور انور کی ضرورت تھی۔ ضرورت ایسی بھی ہوتی ہے کہ وقت گزرا اور ضرورت ختم ہوئی۔ انور کو بھی مومی کی زندگی سے ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن جب اس کا بچہ ستانے لگتا، جب ابکائی آنے لگتی، جب وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑتی تو ایسے تمام وقت اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا رہتا اور اس اندھیرے میں انور ہی انور نظر آتا رہتا تھا۔ جو چیز جس سے منسوب ہوتی ہے، وہی یاد آتا ہے۔ امداد میاں تو یاد آنے سے رہے۔

مومی کے دو دن قیامت کی طرح گزرے۔ انور رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ پرواز کر کے اس کے پاس پہنچ جاتی۔ مگر امداد میاں کا رویہ عجیب تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بوڑھا کیا سوچ رہا ہے اور اب آنے والے لمحوں میں وہ کیا کرنے والا ہے۔ رات کو بڑی دیر تک خواب گاہ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ آدھی رات کو اٹھ کر اس نے کوٹھی کے اندر ایک چکر لگایا۔ معلوم ہوا کہ امداد میاں ایک کمرے میں ہیں اور دروازے کو اندر سے بند کر رکھا ہے۔ مومی نے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے آواز دی "آپ بولتے کیوں نہیں؟ آپ نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ خدا کے لیے آپ غصہ دکھائیں۔ باہر آکر مجھے ماریں۔ انتظار میں کہیں مر جاؤں۔"

دروازے کے پیچھے بھاری بھرکم آواز سنائی دی: "مومی! کیا تم نے کبھی مجھے غصہ دکھایا ہے؟"

"میں بھلا کیسے دکھاتی؟ آپ نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔"

"پہنچایا ہے۔ پینسٹھ برس کی عمر میں چودہ برس کی چھوکری کو دلہن بنایا تھا۔ ایک دوشیزہ کی جوانی کو نقصان پہنچانا سب سے بڑا جرم ہے۔ مجھے اس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ میں اس سزا کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر رہا ہوں۔ اس لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑ دوں۔ میں تنہا رہ جاؤں گی۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دو۔ ابھی چلی جاؤ۔"

"چلی جاتی ہوں۔ مگر خدا کے لیے مجرم بن کے نہ سوچیں۔ آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔ گناہ گار میں ہوں۔"

"مومی! گناہ گار کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ گناہ کا بیج کہاں سے بویا گیا؟ اس گناہ کی تحریک میرے بڑھاپے سے چلی ہے۔ پلیز چلی جاؤ۔"

وہ اپنی خواب گاہ میں واپس آ گئی۔ دوسرے دن دونوں کا سامنا ہوا دونوں بجھے بجھے سے تھے۔ ان کے اندر اتنی روشنی نہیں تھی کہ وہ باہر ایک دوسرے کو دیکھ سکتے۔ اس لیے ان کی نظریں جھکی رہیں۔ مومی نے کھانا لا کر میز پر رکھا۔ وہ چپ چاپ کھا کر اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم میں حقہ گرم تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر کش لگاتا رہا اور گہری سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ اس طرح وہ دن بھی خاموشی سے گزر گیا۔ مومی کو وحشت سی ہونے لگی۔ پھر امداد میاں اور اُدھر انور دونوں گیلی لکڑیوں کی طرح اس کے وجود میں سلگ رہے تھے۔ اس کے اندر دھواں بھر رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔

دوسری رات بھی اس نے خواب گاہ میں تنہا گزاری۔ صبح ہوتے ہی وہ دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے کے سامنے پہنچی اور دروازے کو پیٹ پیٹ کر جنونی انداز میں چیخنے لگی: "میں مر جاؤں گی۔ دروازہ کھولیے۔ نہیں تو میں ابھی جان دے دوں گی۔"

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ مومی چیخنا بھول گئی۔ امداد میاں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ بھی مومی کی طرح رات بھر جاگتا رہا ہے۔ مومی کا دل محبت سے بھر گیا۔ سر ندامت سے جھک گیا۔ وہ قدموں سے لپٹنے کے لیے جھکی لیکن امداد میاں نے فوراً ہی اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر قدموں کی طرف جانے سے روک دیا۔ مومی نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا تو اس بوڑھے نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

کہتے ہیں میاں بیوی کے درمیان جب تک ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوں، اس وقت تک ان کا رشتہ مضبوط اور پائیدار نہیں ہوتا لیکن مومی اور امداد میاں کے درمیان ایسے تعلقات نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ امداد میاں نے کہا: "مومی! ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ مغربی پاکستان چلے جائیں گے۔"

وہ بولی: "نہیں۔ ہم اپنی زمین چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

"تم نہیں سمجھتیں۔ یہاں میں تمھارے بچے کو اپنا نام نہیں دے سکوں گا۔ جوانی میں میری دو بیویاں مر چکی ہیں۔ ان سے اولاد نہیں ہوئی۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق میں بانجھ ہوں۔ یہ بات میرے دوست احباب اور خاندان کے تمام افراد جانتے ہیں۔ یہاں میری بدنامی ہوگی۔"

"یہاں سے جانے کے بعد کیا یہ بات چھپ جائے گی؟"

"ہاں، تم دیکھ لینا۔ پاکستان کے دونوں بازو ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ یہ بنگلہ دیش بن کر رہے گا۔ اُدھر کے لوگ اِدھر نہیں آ سکیں گے۔ اور اِدھر کے بنگالیوں کو کیا پڑی ہے کہ اُدھر جائیں۔"

مومی سوچنے لگی۔ امداد میاں نے ترپ کا پتا پھینکا: "وہاں لاہور یا کراچی میں انور بھی ہمارے ساتھ رہے گا۔"

مومی نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر نظریں ملتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔ اُسی وقت انور جیسے آسمان سے ٹپک پڑا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر سے امداد میاں کو پکار رہا تھا۔ امداد میاں نے مومی کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا: "جاؤ اسے اندر بلا کر لے آؤ۔ آج ہم تینوں اپنے مستقبل کے بارے اہم فیصلہ کریں گے۔"

مومی چاہتی تھی کہ نہ جائے۔ وہ آیا ہے تو آپ اور قریب آ کر اسے منائے۔ وہ روٹھی رہے گی۔ اس سے خوشامدیں کرائے گی لیکن یہ اس کا موقع نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ امداد میاں اسے بلانے کے لیے خود باہر جائیں۔ آخر وہ بزرگ ہیں۔ ان کی کوئی عزت ہے۔ انہیں انور کے مقابلے میں کمتر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ لٰہذا وہ آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے باہر جانے لگی۔

انور برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ مومی کو دیکھتے ہی ایک جگہ کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنسوؤں سے دُھلی ہوئی سیاہ غزالی آنکھیں بڑی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ مومی نے نظریں جھکا کے روٹھے ہوئے انداز میں پوچھا: "اب کیا لینے آئے ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا: "وہ میرا — میرا ایک برش یہاں رہ گیا ہے۔ وہ لینے آیا ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمھارے جانے کے بعد میں نے اچھی کی صفائی کی تھی۔ وہاں تمھارا ایک تنکا بھی نہیں ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ میری بربادی کا تماشہ دیکھنے آئے ہو۔"

"دیکھنے نہیں خود کو دکھانے آیا ہوں۔"

تب مومی نے دل کی آنکھ سے دیکھا۔ انور کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ بال پریشان بجھے بجھے تھیں۔ چہرہ بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ وہ بولا: "نہ کھانے کو جی چاہتا ہے، نہ سونے کو۔ میں تمھیں خبردار کرنے آیا ہوں کہ تمھارے لیے یونہی جاگتے جاگتے مر جاؤں گا۔"

مومی نے بڑی مشکل سے آنسو ضبط کیے۔ منہ پھیر کر بولی: "میاں صاحب تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ اندر آ جاؤ۔"

"میں تمھارے میاں صاحب سے کیوں ملوں؟ میرا تعلق صرف تم سے ہے۔"

"میرے تعلق سے ملو۔ مگر اس سے پہلے ایک خبر سن لو۔ پتا نہیں یہ خوشخبری ہے یا بے حیائی؟ میرے لیے یہ ایسی خوشی ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے میں شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہوں۔"

انور نے حیرانی سے کہا: "یہ تو عجیب خوشی ہے۔ مجھے سنو۔"

مومی نے آنچل سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ پھر اٹک اٹک کر بولی: "م۔ میں — میں ماں بننے والی ہوں۔"

انور نے چونک کر اسے دیکھا۔ جلدی سے اس کے قریب آیا۔ پھر خوش ہو کر پوچھا: "یہ — یہ میرا ہے؟"

اس نے آنچل میں چھپے ہوئے چہرے کو اثبات میں ہلایا۔ انور نے اس کے بازو کو مضبوطی سے تھام کر پوچھا: "اس میں شرمانے اور ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہم نے محبت کی ہے۔ میاں صاحب سے فوراً طلاق لو اور میرے نکاح میں آؤ۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہوں گا کہ میں تمہارے بچے کا باپ ہوں۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی: "نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا: "کیا نہیں ہو سکتا؟"

"میں پہلے کہہ چکی ہوں۔ میں میاں صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ٹھیک ہے تم نے کہا تھا۔ مگر اب بچے کی خاطر فیصلہ بدلنا ہوگا۔ وہ صرف میرا اور تمہارا ہے۔ ہم ایک معصوم بچے کی ولدیت کو غلط نہیں کریں گے۔"

"ہاں۔ یہ تم پر ہے۔ تم چاہو تو بچے کی معصومیت پر حرف نہیں آئے گا۔ تم سنجیدگی سے اصول کے مطابق سوچو۔ میں میاں صاحب کی شریکِ حیات ہوں۔ اصولاً بچے کو میاں صاحب کا نام ملے گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ تم میری چیز دوسرے کو نہیں دے سکتیں۔"

"میں بھی تو دوسرے کی تھی۔ تمہاری کیسے ہو گئی؟ جذباتی نہ ہو۔ میں تن من سے تمہاری ہوں۔ اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔ ایک بوڑھے شخص کی مجبوری۔ اس کی شرافت اور عزت کو لاجو نہیں سمجھو گے تو میں مر جاؤں گی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میاں صاحب کو نہیں چھوڑو گی۔ مجھ سے شادی نہیں کرو گی۔ ہم اسی طرح بے حیائی کی زندگی گزاریں گے؟"

"کوئی بھی سمجھ دار عورت بے حیائی پسند نہیں کرتی مگر میں جس دوراہے پر کھڑی ہوں۔ وہاں صرف یہی دعا مانگ سکتی ہوں کہ خدا مجھے معاف کرے اور کوئی ایسا راستہ دکھائے کہ تم سدا میرے ساتھ رہو اور میاں صاحب کی آخری عمر میں میں اپنے حصے کے فرائض نباہ سکوں۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"تم صرف اتنا سوچو کہ مجھے موجودہ حالات میں اپنا کے رکھنا چاہتے ہو یا نہیں۔ اگر چاہتے ہو تو اندر آ جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس اعتماد کے ساتھ گئی کہ وہ بھی کچے دھاگے میں بندھا آئے گا۔ اور اس کے جانے کا انداز نہایت ہی مناسب اور سبق آموز تھا۔ انور کو یہ سبق ملا کہ وہ منہ پھیر کر جائے گی تو وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اسی طرح مومی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

وہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح سر جھکا کے اندر آگیا۔ امداد میاں ڈرائنگ روم کے ایک صوفہ پر بیٹھے ہوئے اپنے حقے کو گرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں ناکام ہوتے دیکھ کر مومی نے ناریل کے حقے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر راکھ میں دبی ہوئی کسی نامعلوم چنگاری کو... پھونکنے لگی۔ انور امداد میاں کو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر تک ایک شرمسار سکوت چھایا رہا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیسے شروع کی جائے۔ ان تینوں میں امداد میاں کی حالت زیادہ قابلِ رحم تھا کیونکہ اس کی بیوی تھوڑی سی پرائی ہو گئی تھی۔ ان کے نقطۂ نظر سے انور لٹیرا تھا۔ ایسا لٹیرا جس نے پہلے تو مومی کو لوٹا پھر ایک بچے کو چوری کے مال کی طرح اس کے گھر میں لے آیا۔ اس بوڑھے کو مجبور کیا کہ وہ اپنی غیرت کو مار ڈالے اور اپنی عزت کو بالائے طاق رکھ کر بے شرم بن کر کوئی نیا فیصلہ کرنے ان کے سامنے بیٹھ جائے۔ اس لوٹ کھسوٹ میں مومی کی طرف سے شہ مل رہی تھی۔ کیونکہ جوانی شہ دینے کے لیے ہی ہوتی ہے۔

آخر امداد میاں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔"

مومی اور انور نے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھا۔ امداد میاں نے کہا: "میرا مطلب یہ ہے کہ ملک کے حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔"

انور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ملکی حالات سے کیا لینا ہے۔ امداد میاں نے سمجھایا: "یہ پاکستان نہیں رہے گا اور میں پاکستان میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ باہر جانے کے تمام راستے بند ہو جائیں ہمیں یہاں سے لاہور یا کراچی چلے جانا چاہیے۔ اور انور ہم تمہارے ساتھ جائیں گے اور وہاں تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔"

سچ بات تو یہ ہے کہ انور بھی پچھلے دو دنوں سے یہی سوچ رہا تھا۔ رہ رہ کر مومی کا چہرہ سامنے آتا تھا۔ اور وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچتا تھا کہ کسی طرح مومی کو یہاں سے بھگا کر مغربی پاکستان لے جائے۔ اب امداد میاں خود ہی یہ چاہتے تھے کہ مومی اور انور پاکستان کے دوسرے بازو میں جائیں فرق یہ تھا کہ وہ بھی ساتھ رہتا۔ کباب میں ہڈی نہیں ہوتی مگر ہو جاتی ہے۔

امداد میاں نے کہا: "ہزاروں بہاری مغربی پاکستان جانے کے لیے ایئرپورٹ پر دن رات بیٹھے رہتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ائرپورٹ پر ہی کھاتے اور سوتے ہیں۔ اور طیارے میں جگہ حاصل کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا انور! یہ بہاری موت کے منہ میں بھی کاروبار کرتے ہیں۔ یہاں ان کے بال بچوں کے لیے جان و مال کا خطرہ ہے۔ اس کے باوجود کتنے ہی بہاری ایسے ہیں جنہیں طیارے میں جانے کے لیے دو چار دن پہلے تاریخ اور سیٹ نمبر مل جاتی ہے مگر وہ لوگ اپنے سیٹ نمبر بلیک میں فروخت کر دیتے ہیں۔ تم چاہو تو کل کے طیارے میں دو سیٹ نمبر بلیک سے خرید سکتے ہو۔ میں ابھی تمہیں پانچ ہزار روپے دیتا ہوں۔"

"صرف دو ٹکٹ؟" انور نے پوچھا۔

"ہاں تمہارے اور مومی کے لیے۔"

"میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

امداد میاں نے کہا: "میں کب چاہتا ہوں کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو؟ نہیں۔ میں ایک ہفتے کے بعد کا سیٹ نمبر خرید لوں گا کیونکہ مجھے یہاں

کی جائداد فروخت کرنے اور نقد روپے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہے۔"

مومی نے کہا: "تو پھر آپ جائداد فروخت کرنا شروع کریں ہم سب ایک ہفتہ بعد جائیں گے۔"

امداد میاں نے ڈانٹ کر کہا: "بچکانہ ضد نہ کرو۔ یہاں آنے والی گھڑیوں میں کیا قیامت آنے والی ہے، کوئی نہیں جانتا، میں پہلی فلائٹ سے تمہیں صحیح سلامت بھیجنا چاہتا ہوں۔ تم بے جا ضد کرو گی تو ہم اُدھر پاکستان میں اپنا اچھا مستقبل نہیں بنا سکیں گے۔ یہاں ہم شاید بچ جائیں مگر انور بہاری ہے۔ بکتی باہنی کے لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

مومی نے گھبرا کر انور کو دیکھا۔ امداد میاں یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا کہ وہ پانچ ہزار روپے لانے جا رہا ہے۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں چند لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر انور نے کہا: "میں کسی نہ کسی طرح کل کی فلائٹ میں جگہ حاصل کر لوں گا۔"

وہ عاجزی سے بولی: "انور! میں تو تمہارے ساتھ پنکھ لگا کر اڑنے کو تیار ہوں، مگر میاں صاحب ایک ہفتہ بعد نہ آ سکیں، رکاوٹیں پیدا ہو جائیں تو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ہمارے بعد ضرور لاہور پہنچ جائیں گے۔ وہ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"یہ میں جانتی ہوں، مگر اپنی آنکھوں کے سامنے انہیں تنہا چھوڑ کر جانا بُرا لگتا ہے۔"

"صرف ایک ہفتہ کی بات ہے۔ دیکھو مومی! تمہارے کہنے پر میں ہوٹل چھوڑ کر اس کوٹھی میں آ گیا تھا۔ اب تمہاری خاطر ڈھاکہ چھوڑ کر لاہور جانے کے لیے تیار ہوں۔ اور تمہارے ساتھ میاں صاحب کو بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ لہٰذا تمہیں بھی میری خواہش کے مطابق یہاں سے چلنا ہوگا۔ تم یہاں رکنے کا کوئی بھی بہانہ کرو گی تو میں تنہا چلا جاؤں گا۔ تاکہ کبھی تمہاری صورت نظر نہ آئے۔ کیا تم چاہو گی کہ میں ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤں؟ بولو مومی! میرے ساتھ چلو گی نا؟"

وہ امداد میاں کے لیے پریشان تھی۔ اس نے پریشانی کو چھپاتے ہوئے انور کو دیکھا پھر سر کو جھکا لیا۔

◆

رات جا رہی تھی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ مومی اور امداد میاں کی آنکھوں میں لتے آنسو تھے کہ ان آنکھوں میں نیند نہیں سما سکتی تھی۔ انور دن کے گیارہ بجے وہاں سے گیا تھا، پھر شام کو پانچ بجے واپس آ کر اپنے طور پر یہ خوشخبری سنائی تھی کہ کل کی فلائٹ پر دو سیٹیں مل گئی ہیں۔ گویا وہ رات مومی اور امداد میاں کے لیے آخری رات تھی۔

وہ دونوں رہ رہ کر آہیں بھر رہے تھے، کبھی رو رہے تھے، کبھی ایک دوسرے کے آنسو پونچھ رہے تھے۔ مومی لاہور جانے سے بار بار انکار کر رہی تھی۔ امداد میاں اسے بڑے پیار سے تھپک تھپک کر لاہور جانے کے فائدے گنوا رہے تھے۔ بڑھاپے میں اس کی جوانی کی قسمیں کھا کر یقین دلا رہے تھے کہ وہ ہفتے دس دن میں اس کے پیچھے چلے آئیں گے پھر وہ تینوں مل کر پاکستان کے اس حصے میں ایک نئی زندگی گزاریں گے۔

امداد میاں کے اصرار پر مومی روتے روتے سامان باندھ رہی تھی۔ جانا نہیں چاہتی تھی مگر جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ دوسری طرف انور کی بھی یہ کوشش تھی۔ امداد میاں کے پاس اس وقت ڈیڑھ لاکھ روپے نقد تھے، مومی کے پاس تقریباً دو لاکھ روپے کے زیورات تھے۔ امداد میاں نے تمام نقدی اور زیورات اس کے سامان میں بندھوا دیے۔ بار بار نصیحتیں کرتے رہے کہ انور پر زیادہ بھروسہ نہ کرے۔ تھوڑی بہت نقدی اور زیورات بُرے وقت کے لیے چھپا کر رکھے۔ ویسے انور اچھا آدمی ہے مگر ذہین عورت اپنے اچھے مرد سے بھی کچھ چھپا کر رکھتی ہے۔

مومی نے بڑے دکھ سے پوچھا: "کیا ہم کبھی اپنے دیس واپس نہیں آئیں گے؟"

"اللہ نے چاہا تو ایک دن یہاں آئیں گے۔ اپنے لوگوں کو کھو دیں گے کہ تم نے کسی کا بچہ گود لیا ہے۔"

وہ سر جھکا کر بولی: "جس طرح بچہ ماں کی کشش پاتا ہے، اسی طرح میں اس زمین سے لگی ہوئی ہوں۔ یہاں سے جاتے ہوئے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے اندر سے جان نکل رہی ہے۔ پتا نہیں لوگ کیسے اپنا وطن چھوڑ دیتے ہیں۔"

"رفتہ رفتہ چھوڑنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ جس زمین پر محبت ملتی ہے، وہیں اپنا وطن بن جاتا ہے۔"

وہ رات دونوں نے جاگ کر گزار دی۔ صبح آٹھ بجے انور اپنا مختصر سا سامان لے کر آ گیا۔ وہاں سے امداد میاں کی کار میں ایئرپورٹ جانا تھا۔ مومی بے اختیار امداد میاں سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی۔ عجیب منظر تھا۔ وہ ایک محبوب کے ساتھ جانے کے لیے دوسرے محبوب کی جدائی کا صدمہ اٹھا رہی تھی۔ ایئرپورٹ پر بھی یہی تماشا رہا۔ امداد میاں اور انور اسے تھپک تھپک کر سمجھاتے رہے۔ وہاں بہاریوں کے سبھی خاندان رو رہے تھے۔ اس لیے کوئی نہ سمجھ سکا کہ مومی کیوں رو رہی ہے۔

آخر وہ تقسیم ہو گئی۔ اپنا دل امداد میاں کے پاس چھوڑ دیا۔ جان انور کے ساتھ لے گئی۔ اپنی گاڑی کی طرف واپس جاتے وقت امداد میاں کو زندگی بھاری لگ رہی تھی۔ مومی کے چھوڑ جانے سے دل کیسے دکھ رہا تھا۔ یہ دکھ سینے کے اندر ہی سلگ رہا تھا۔

پہلے کچھ دن بڑے کرب میں گزرے۔ مومی کے بغیر گھر میں رکھی ہوئی مومی کی ایک ایک چیز ایک ایک یاد بن کر جڑی تھی۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ وعدے کے مطابق مومی کے پیچھے نہیں گیا۔ دوسرے ملنے جنگ چھڑ گئی۔ بودے کر پاکستان بنانے والے بنگالیوں نے پھر ایک بار لہو

دے کر اسی زمین کو بنگلہ دیش بنا دیا۔ تاریخی عوامل کے طمانچوں سے انسان کے مزاج، اصول اور نظریات سب کچھ بدل جاتے ہیں، مگر زمین کا رشتہ نہیں بدلتا۔ اس رشتے سے وہ بنگالی تھے، بنگالی رہے۔

امداد میاں جانتا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا اور پاکستان کے دوسرے بازو سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ راہیں الگ ہو جائیں گی، اجنبیت کی اتنی اونچی دیوار کھڑی ہو جائے گی کہ پھر وہ موی کے پاس نہیں جا سکے گا۔ موی اس کے پاس آنے کے لیے تڑپے گی۔ پھر اسے قرار آنے لگے گا، انور کے جوان بازوؤں میں چھپ کر وہ بوڑھے ماضی کو بھولنے لگے گی۔

وہ بوڑھا دن رات روتا رہتا تھا۔ کبھی مر جانے کے لیے سوچتا تھا، پھر اس آس میں زندہ رہتا کہ وہ ایک دن واپس آئے گی۔ اس نے ایک وکیل کے پاس جا کر وصیت نامہ لکھوایا کہ اس کی بیوی مومنہ بیگم عرف موی اپنے عزیز سے ملنے مغربی پاکستان گئی تھی۔ وہ اپنے عزیز کے ایک بچے کو گود لے کر واپس آنے والی تھی کہ واپسی کے راستے بند ہو گئے۔ اگر کبھی پاکستان اور بنگلہ دیش کے باشندوں کے لیے آمد و رفت کا راستہ کھلے یا موی کسی دوسرے ذریعے سے بنگلہ دیش پہنچے اور یہاں مستقل رہنے کا فیصلہ کرے تو امداد میاں کی تمام دولت اور جائداد کی وہ بلا شرکت غیر حقدار ہوگی۔ امداد میاں کی موت کے بعد وہ دوسری شادی کرے تب بھی یہ وصیت اس کے حق میں ہوگی۔

دو سال کے بعد موی کا ایک خط بر ملک کے راستے پہنچا۔ امداد میاں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر پڑھا۔ اس خط میں لفظوں کے آنسو تھے۔ اس نے لکھا تھا: "میں یہاں آ کر پچھتا رہی ہوں۔ آپ کو چھوڑنے کی سزا پا رہی ہوں۔ انور مجھے بہت چاہتے ہیں۔ سنا تھا کہ ایک شخص کی چاہت سے عورت کی دنیا بدل جاتی ہے مگر تجربے سے پتا چلا کہ ایک شخص دن رات توجہ نہیں دے سکتا۔ اس کی دوسری مصروفیات بھی ہوتی ہیں اور میں یہاں ایک ایسی ننھی سی بچی ہوں جسے ہر لمحہ توجہ چاہیے۔ کیونکہ یہاں کی زبان میں نہیں جانتی۔ یہاں کا لباس اور طور طریقے ہم سے بالکل الگ ہیں۔ مجھے ایک نئی بچی کی طرح عمر کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب کو سیکھنا پڑے گا اور یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ میں حقیقتاً بچی نہیں ہوں۔ ہوا کے تھپیڑوں سے نئی کونپل جھک جاتی ہے مگر میں تناور درخت ہوں۔ ٹوٹ سکتی ہوں، جھک نہیں سکتی۔ یہاں آ کر میں قید ہو گئی ہوں کہ ذرا کا راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ راستہ نظر آیا تو میں انور اور بچے کو لے کر واپس آ جاؤں گی۔"

موی نے اور بہت کچھ لکھا تھا مگر امداد میاں کے دل کو یہی بات لگی کہ موی انور کے پاس رہ کر بھی خوش نہیں ہے۔ اور کبھی وہ واپس آ سکتی ہے۔

وہ خط پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ خوشی اس فکر میں بدلنے لگی کہ انور بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ پھر وہی بے شرمی کی زندگی ہوگی۔ پھول کے ساتھ ایسا کانٹا لگا ہوا تھا کہ اسے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کاش وہ مر جاتا۔ دوسری طرف شاید انور بھی امداد میاں کے لیے یہی سوچتا ہوگا۔

امداد میاں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ موی کے لیے قربانی دے گا۔ وہ جوان ہے، اسے جوان مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کا موقع دے گا۔ اسی لیے اس نے موی کو بہلا پھسلا کر انور کے ساتھ آہنی دیوار کے اس پار بھیج دیا تھا۔ جہاں سے وہ واپس نہیں آ سکتی تھی۔ انسان عجیب چیز ہے۔ جس کے لیے مرنا چاہتا ہے اسی کی آس میں جیتا رہتا ہے۔ اتنی قربانی دینے کے باوجود امداد میاں کے دل میں ایک آس تھی کہ موی کسی دن واپس آئے گی۔ اسی لیے اس نے وصیت لکھوا دی تھی۔ موی کا خط پڑھنے کے بعد اسے دوبارہ پا لینے کا یقین ہو گیا تھا اور اب اتنا کچھ ہونے کے بعد دل سے دعا نکل رہی تھی کہ انور مر جائے۔

بے چارہ خود مرنے کی عمر کو پہنچ گیا تھا مگر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے موت آئے گی۔ آئے گی بھی تو اس سے پہلے موی آئے گی۔ سب یہی سوچتے ہیں کہ مرنے سے پہلے آرزو پوری ہو جائے گی اور سوچتے سوچتے اپنی زندگی پر بڑھاپا لے آتے ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے چھ برس گزر گئے۔ وہ کچھ اور بوڑھا ہو گیا۔ آنکھوں سے کم نظر آنے لگا۔ اب کوئی چیز اٹھاتا تو اس کے ہاتھ کانپتے۔ موی کے متعلق سوچتا تو گردن ہلنے لگتی۔ موی کے انتظار نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک شام ایک ٹیکسی کوٹھی کے سامنے آکر رکی۔ امداد میاں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی سے دیکھا تو دل کی دھڑکنیں یکبارگی بڑھ گئیں۔ مومی ٹیکسی سے سامان اتروا رہی تھی۔ اس کے ساتھ پانچ یا ساڑھے پانچ برس کا ایک نہایت ہی خوبصورت سا لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ انور نظر نہیں آیا تھا۔ کیا وہ مر گیا تھا؟ یا مومی اسے چھوڑ کر آگئی تھی؟

مارے خوشی کے امداد میاں کی ٹانگیں کانپنے لگیں سینے کے اندر دھڑکنوں کی دھمک برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے کھڑکی کی سلاخ پکڑ کر اور دوسرے ہاتھ سے دل کو تھام کر آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا۔ اس میں کھڑے رہنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ پرواز کرتے ہوئے مومی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا مگر مسرتیں اُسے اٹھا کر پٹخ رہی تھیں۔

وہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا اس وقت اس کی شدید خواہش تھی کہ جوانمرد کی طرح یکبارگی اچھل کر دوڑتا ہوا مومی کو پکارتا ہوا جائے اور اسے بازوؤں میں اٹھا کر سارے گھر میں ناچتا پھرے۔ مگر افسوس بڑھاپے کے سلو موشن میں ایسا ممکن نہیں تھا۔

تھوڑا سا وقت گزرا تو مومی خود اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔ سامنا ہوتے ہی اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ امداد میاں کی مونچھیں سر کے بال چاندی ہو گئے تھے۔ وہ تو پہلے بھی سفید تھے۔ مگر ان کی سفیدی کسی نے دیکھی نہیں تھی۔ مومی کے شایانِ شان نظر آنے کے لیے خضاب لگایا جاتا تھا۔ بہر حال اتنے عرصہ بعد مومی کو وہ بہت بدلا ہوا نظر آیا۔ چہرے کی جھریاں اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ اسے پہچاننے کے لیے مومی کو ذرا رکنا پڑا۔

پھر پہچانتے ہی وہ دوڑتے ہوئے آئی۔ اس کے پاس بیٹھی۔ منہ سے کچھ نہ نکلا۔ اِدھر یہ چپ تھی۔ اُدھر وہ مومی کو محسوس کرنے میں گم تھا۔ ایسے ہی وقت کہا جاتا ہے کہ وقت ٹھہر گیا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے وجود میں ٹھہر گئے تھے۔

پھر وہ بولا "میرا دل کہتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔"

"میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔"

"اور انور؟"

مومی کے سینے سے ایک گہری سانس نکلی "اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

امداد میاں نے ایسی سانس چھوڑی جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ افسوس کا اظہار ہے یا اطمینان کا سانس۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ امداد میاں نے محسوس کیا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر اپنے آنسو چھپا رہی ہے۔ وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ "صبر کرو۔ موت ایک ایسی سرحد ہے جسے پار کرنے کے بعد کوئی مسافر واپس نہیں آتا۔ صبر کرو...."

مومی الگ ہو کر ساری کے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر جلدی سے مسکرا کر بولی۔ "میں نے آپ کو پھر سے پا لیا ہے۔ مجھے رونا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "مومی! اگر وہ زندہ ہوتا تو تم نہ آتیں؟"

"کیوں نہ آتی؟ وہاں انور کے سوا میرا کیا تھا؟ کچھ نہیں۔ وہاں جا کر مجھے غلطی کا احساس ہوا — میں اپنے آباؤ اجداد کے ناتے سیکڑوں ہزاروں سال سے بنگالی ہوں۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے جس بیٹے کو جنم دیا ہے اسے وہاں۔ وہ غیر بنگالی بنا رہی ہوں۔ میں نے انور سے کہا، میرا بیٹا یہاں جس صوبے میں رہے گا، اُسی صوبے کی زبان سیکھے گا۔ پھر میری زبان کا کیا ہوگا؟ انور نے کہا ہم کراچی جائیں گے۔ وہاں جس صوبہ کے لوگ بھی آتے ہیں، اردو بولتے ہیں۔"

مومی بولتے بولتے رک گئی۔ دوسرے کمرے سے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ مومی نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ "ببلو! تمی کو تھائے؟ ایکھنے آشو۔"

امداد میاں نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا ہمارا بیٹا بنگالی بولتا ہے؟"

"ہاں انور اسے اردو سکھاتے تھے اور میں بنگالی۔ میں ان سے ضد کرتی تھی کہ اردو بولنا چھوڑ دو۔ واپس چلو۔ مگر وہ مجھے اور ببلو کو لے کر کراچی چلے گئے۔"

اتنا کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ امداد میاں نے حیرانی سے پوچھا۔ "اب رونے کی کیا بات ہے؟"

وہ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر بولی۔ "کیا یہ رونے کی بات نہیں ہے کہ وہ اردو بولتے ہوئے مارے گئے۔ ہم کراچی پہنچے تو وہاں دو زبانوں کا جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ ہم وہاں اجنبی تھے۔ بھٹکتے ہوئے ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں اردو کے مخالف تھے۔ وہ مخالفت کا شکار ہو گئے۔ میں اور ببلو صرف بنگالی بولتے تھے۔ اسی لیے بچ گئے۔ اگر ہم انور کی زبان بولتے تو ہمارا کیا ہوتا؟ میرا ببلو کہاں جاتا؟"

اتنے میں ببلو آگیا۔ مومی اس سے لپٹ کر اسے بے تحاشہ چومنے لگی۔ کہنے لگی۔ "بیٹے! میں نے تمھیں بتایا تھا نا کہ تمھارے ابا بنگلا دیش میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس جاؤ۔ یہی تمھارے ابا ہیں۔"

"نہیں۔" وہ ماں کی گود سے ایکدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "یہ میرے ابا نہیں ہیں۔ یہ تو بہت بڈھے ہیں۔"

امداد میاں کے دماغ کو شدید جھٹکا سا لگا۔ وہ ببلو کو دیکھ رہا تھا ببلو سے گھور رہا تھا۔ تب امداد میاں کو معلوم ہوا کہ انور ابھی زندہ ہے۔ ابھی جوانی اور بڑھاپے کا بے جا سمجھوتہ بھی زندہ ہے۔ آدمی لاکھ پردہ ڈالے تب بھی اس کی غلطی پردے کے پیچھے ہی پیچھے آئندہ نسل تک پہنچ جاتی ہے۔ ببلو کو کون مٹا سکتا تھا؟
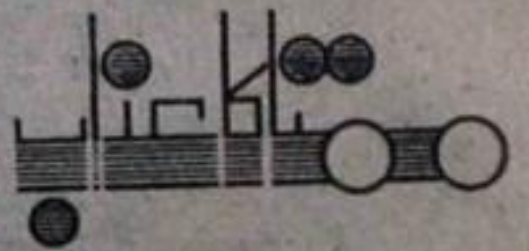
محی الدین نواب

آپ کے محبوب قلم کار محی الدین نواب اب پوری جولانی پر ہیں۔ گزشتہ چھ ماہ سے ہر شمارے میں ان کی نئی نویلی چھبیلی کٹیلی تحریریں آخری صفحات میں آپ پڑھ رہے ہیں اور خوب داد دے رہے ہیں۔ اس ماہ نواب نے فلمی دنیا کی خبر لی ہے۔ یہ ایک کہانی نہیں بلکہ نوحہ ہے، ماں کے عذاب کا نوحہ۔

کون نہیں جانتا کہ ماں کا رشتہ عظیم اور مقدس ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے اور محسوس کرتے ہیں کہ مائیں ساری زندگی اپنی ممتا کا عذاب سہتی رہتی ہیں۔

آپ کے محبوب قلم کار نے اس عذاب کو پیش کیا ہے۔ ایک ایسی ماں کے جذبات پیش کیے ہیں جو فلموں کی سدا بہار ہیروئن یعنی محبوبہ تھی اور اندر سے ماں تھی۔ ایک طرف زندہ رہنے کے لیے اداکاری کا پیشہ ضروری تھا، دوسری طرف ممتا لازمی اور فطری تھی۔ وہ بیٹے کو بیٹا نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ اسے جبراً ماں بنایا گیا تھا۔ اور جب ماں نے ممتا کا سبق سیکھ لیا تو وہ سبق وہ ممتا کی فطرت ایک عذاب بن گئی۔

**کون ایسا ہے جو اولاد کی بات نہیں چاہتا۔ ایک ماں سے ممتا کے عذاب کی بات [illegible]**
**کے لیے جو قربان ہو رہی ہو۔ اس کی عزت میں ہمیشہ [illegible]**

حسبِ دستور آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

جب وہ دس برس کا تھا، تب ہندوستان میں گز بھر فلمیں تیار ہوتی تھیں۔ اس وقت وہ دفتر کا چپراسی تھا۔ شوٹنگ کے وقت وہ اسٹوڈیو میں اوپری کام کیا کرتا تھا۔ سب اُسے شیخو کہہ کر پکارتے تھے۔ اوپری کام کرنے والے بچّے حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ فلمی سماج میں اُن کے نام کے ساتھ "ابے" لگایا جاتا ہے: "ابے شیخو!"

اُسے یہ بچکانہ گالی پسند نہیں تھی۔ وہ بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ فلمسازوں اور ہدایت کاروں کے پاؤں داب داب کر وہ بیس برس کی عمر میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر بن گیا۔ وہ بچکانہ گالی کے بجائے بڑی سی گالی چاہتا تھا جو اس کی عمر کے مطابق اُس کی صلاحیتوں کے مطابق شایانِ شان ہو۔ کیونکہ اِس دنیا میں لوگ دوسروں کی صلاحیتوں کے مطابق گالیاں دیتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ گالیاں اُن کی شہرت کا سبب بن جاتی ہیں۔ وہ شیخو سے جناب شیخ بختیار صاحب بن گیا۔

اچانک پچیس برس کی عمر میں ایک فلمساز اور ایک ہدایتکار کے درمیان سخت جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا اس بات پر ختم ہوا کہ فلمساز نے اس ڈائریکٹر کو فلم سے نکال دیا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر شیخو تھا لہٰذا اُسے ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ فلموں میں صلاحیتوں کا نہیں مقدر کا زیادہ حساب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا پھر ایک بار شیخو کا مقدر چمک گیا۔ اُس کی فلم نے گولڈن جوبلی منائی۔ اِس طرح راتوں رات وہ مقدر کا سکندر ہو گیا۔ شیخو سے شیخ صاحب بن گیا۔

کس کی مجال تھی کہ اب کوئی اُسے چپراسی یا اوپری کام کرنے والا ملازم سمجھتا۔ جس کی فلم ہٹ ہوتی ہے۔ وہ قسمت کا بادشاہ کہلاتا ہے حتیٰ کہ فلموں میں لاکھوں روپے خرچ کرنے والا فلمساز بھی اُسے شیخ صاحب کہنے لگا۔ اُس نے دوسری تیسری فلمیں بنائیں جو لاکھوں کروڑوں روپے کا بزنس کرتی چلی گئیں۔ وہ بنگلہ اور موٹر کار کا مالک بن گیا۔ بڑے بڑے کروڑ پتی سیٹھ اُس کی فلموں میں بڑی سے بڑی رقم لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ فلموں میں آنے والی خوبصورت لڑکیاں اُس پر عاشق ہوتی رہتی تھیں۔ جس لڑکی پر اُس کی نظرِ کرم ہوتی تھی، وہ اُس کی اگلی فلم کی ہیروئن بن جاتی تھی۔

اُس کے عروج کا یہی زمانہ تھا کہ اُس کی زندگی میں شبانہ آ گئی۔ ایک روز وہ اپنے دفتر میں بیٹھا شراب پی رہا تھا اور اپنے منشی سے ایک فلم کی کہانی لکھوا رہا تھا۔ ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں کہانی نویس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ ناک پر عینک پہن کر کان میں قلم اٹکا کر ڈائریکٹر کے منہ سے کہانی سنتا ہے، سر ہلاتا جاتا ہے پھر کان پر سے قلم نکال کر لکھنے لگتا ہے۔ فلمی دنیا میں ایسے شخص کو منشی کہتے ہیں۔ شیخو ایسے ہی ایک منشی سے کہانی لکھوا رہا تھا کہ ایک فلمی چمچے نے آ کر اطلاع دی کہ ایک آدمی فسٹ کلاس مال لے کر آیا ہے۔

مال کا مطلب چھوکری تھا۔ شیخو نے کہا: "اگر فرسٹ کلاس ہے تو لے آؤ اور منشی جی اب تم جاؤ۔ باقی کہانی شوٹنگ کے وقت سیٹ پر لکھی جائے گی۔"

منشی عینک اور قلم سنبھالتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا دفتر میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ کوئی بارہ یا تیرہ برس کی لڑکی تھی۔ شیخو بدستور دروازے کی طرف نظریں جمائے رہا۔ اُسے فرسٹ کلاس چھوکری کا انتظار تھا۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔ "شیخ صاحب! میرا نام جوگی پرشاد ہے۔ یہ میری بیٹی شبانہ ہے۔ اسے فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔"

شیخو نے گھنٹی بجا کر چمچے کو بلایا۔ پھر پوچھا: "وہ کہاں ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا؟"

چمچے نے شبانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "حضور شیخ صاحب! یہی تو وہ فتنہ ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ کیا تیکھے تیور ہیں۔"

"ابے گدھے کے بچّے! یہاں فتنے کی نہیں قیامت کی ضرورت ہے۔"

جوگی پرشاد نے کہا: "مائی باپ! آپ کے پاس تو کمال ہے۔ آپ فتنے کو قیامت بنا سکتے ہیں۔"

"مگر یہ تو ابھی بچّی ہے۔"

چمچے نے کہا: "حضور! یہی بچّی تو ہوگی جو ستائے گی جوانوں کو جوان ہو کر۔"

"گیٹ آؤٹ۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ سارا نشہ چوپٹ کر دیا تو نے۔"

چمچہ باہر چلا گیا۔ جوگی پرشاد نے کہا: "بچّی ہونے سے کیا ہوتا ہے یہ رام لیلا میں سیتا کا پارٹ ادا کرتی ہے"

شیخو نے کہا: "مجھے اپنی آئندہ فلم کے لیے جوان ہیروئن چاہیے۔ اور ہاں کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"شبانہ۔ اِس کا نام شبانہ ہے۔ نام کا کیا ہے آپ جو چاہیں رکھ لیں۔"

"لیکن تمھارا نام جوگی پرشاد ہے۔ تم ہندو ہو۔ بیٹی مسلمان

ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"اُس کے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ اس کا باپ میرا دوست تھا۔ دوستی کے ناطے میں نے اس لڑکی کی پرورش کی۔ آپ مسلمان ہیں شیخ صاحب! میں نے سوچا آپ کو ایک مسلمان لڑکی سے ہمدردی ہوگی۔ اِس لیے میں کسی ہندو ڈائریکٹر پروڈیوسر کے پاس نہیں گیا سیدھا آپ ہی کے پاس لے آیا ہوں۔"

شیخو نے شبانہ کو دیکھا۔ جوگی پرشاد نے اُسے حکم دیا۔ "مسکراؤ۔"

وہ مسکرانے لگی۔ وہ گورے رنگ کی خوب صورت ناک نقشہ والی لڑکی تھی۔ اُس کا حسن جوانی میں اور زیادہ نکھرنے والا تھا مگر ابھی بچی تھی۔

جوگی پرشاد نے التجا کی۔ "اسے اپنے پاس رکھ لیجیے ایک رات میں ہیروئن بنا دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

شیخو نے پوچھا۔ "تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا تم اُسے بھی اتنی کم عمری میں یہاں لے آتے؟"

وہ بے حیائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "میری اپنی بیٹی سندر نہیں ہے۔ ویسے شبانہ کو میں اپنی ہی بیٹی سمجھتا ہوں۔"

شبانہ نے پہلی بار زبان کھولی۔ "شیخ صاحب! میں آپ سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

شیخو کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جوگی پرشاد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ٹھیک ہے بیٹی! تم اکیلے میں باتیں کرو۔ میں باہر بیٹھا رہوں گا۔"

وہ اپنی دھوتی کی لانگھ سنبھالتا ہوا باہر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی شبانہ میز کے دوسری طرف سے گھوم کر شیخو کے پاس آئی۔ پھر بولی۔ "مجھے بوتل سے گلاس میں شراب انڈیلنا آتا ہے۔ آپ کو پلاؤں؟"

اِس لڑکی کی بے باکی پر شیخو کو پسینہ آگیا۔ اُس نے پوچھا۔ "تم نے اتنی سی عمر میں شراب پلانا کہاں سے سیکھ لیا؟"

"میں اتنی سی نہیں ہوں۔ میرا بابو (باپ) مجھے مار مار کر ناچنا سکھاتا ہے۔ بڑا جلاد ہے۔ شراب کے نشے میں میری اس لیے پٹائی کرتا ہے کہ میں جلدی جوان کیوں نہیں ہوتی۔ میں اُس کے ڈر سے جوان عورتوں جیسے کام کرتی ہوں۔ مجھے اتنی سی نہ کہو۔"

وہ اُسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ شریف گھرانوں میں تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیٹیاں جلدی جوان نہ ہوں۔ بابل کے آنگن میں گڑیاں کھیلتی رہیں اور کچھ گھرانے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں بچیوں کے جلد جوان ہونے کی دعائیں بھی مانگی جاتی ہیں اور دوائیں بھی کھلائی جاتی ہیں تاکہ جلدی کاروبار شروع ہو

> کہا ایک تازہ ایم بی بی ایس نے۔ "نزلے زکام کی چار وجوہات ہیں ان میں سے دو مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہی ہیں اور باقی دو سے سب ہی واقف ہیں۔"

سکے۔ شبانہ ایسی ہی تھی جو وقت سے بہت پہلے جوان بنائی جا رہی تھی۔

شیخو نے اُس سے پوچھا۔ "تم کیا کام کر سکتی ہو؟"

"میں وہ تمام کام کر سکتی ہوں جو ایک عورت کو کرنا چاہیے۔ میں کھانا پکا سکتی ہوں۔ برتن مانجھ سکتی ہوں۔ بابو نے مجھے سکھایا ہے کہ کس طرح کسی کے بھی گھر میں جھاڑو پھیری جا سکتی ہے۔"

"اچھا تم کیا کام آسکتی ہو؟"

"میں تمہاری فلموں میں کام آسکتی ہوں۔ محبوبہ سے لے کر بیٹی تک کا رول ادا کر سکتی ہوں۔ اس سنسار میں بیٹی تو کوئی بناتا نہیں ہے۔ میں تمہاری محبوبہ بن سکتی ہوں۔ بس ایک بار فلم میں ہیروئن بنا دو میرے بابو سے کنٹریکٹ سائن کرلو۔ نہیں تو ناکام گھر واپس جا کر میری پٹائی کرے گا۔"

"دیکھو ابھی تو میں تمہیں ہیروئن نہیں بنا سکتا۔ پہلے میں دیکھوں گا کہ تم میری ہیروئن بن سکتی ہو یا نہیں۔ پہلی فلم میں میں تمہیں ایک کم عمر ہیروئن کا رول دوں گا۔ اس کے لیے تمہیں سخت محنت کرنی ہوگی۔"

وہ شبانہ سے ایک یادگار ملاقات تھی۔ وہ ایسی عجیب و غریب لڑکی تھی جسے نہ تو بھلایا جا سکتا تھا اور نہ ہی اُس وقت ٹالا جا سکتا تھا۔ اُس نے جوگی پرشاد سے معاہدہ کرلیا کہ شبانہ اُس کے پاس بارہ گھنٹے رہا کرے گی۔ اُس کے پرائیویٹ گھر کا کام کرے گی۔ دفتر میں ریہرسل کرے گی اور اسٹوڈیو میں ایکٹنگ کرے گی۔ اُس کے عوض ہر ماہ اُسے پچیس روپے پگار (تنخواہ) ملا کرے گی۔ کھانا کپڑا الگ سے ملے گا۔ ان دنوں پچیس روپے آج کے پچیس سو سے بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔ جوگی پرشاد شیخو کا داس (غلام) بن کر رہ گیا۔

شبانہ نے پہلی فلم بنارس کے ٹھگ میں ایک بڑی عمر کی بچی اور کم عمر حسینہ کا رول ادا کیا۔ یہ فلم ایک برس میں تیار ہوئی۔ ایک برس میں شبانہ کی عمر بھی کچھ اور بڑھ گئی۔ جب وہ فلم ریلیز ہوئی تو اُس کا کام بہت پسند کیا گیا۔ کتنے ہی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اُسے اپنی فلم میں بچی کا رول دینے کے لیے تلاش

کرنے لگے۔ کیونکہ اب وہ فلم والی بچی نہیں رہی تھی۔ شیخو نے ایک برس میں اسے جوان بنا دیا تھا۔ اسی لیے کسی پروڈیوسر ڈائریکٹر کو وہ بچی نظر نہیں آئی۔

دوسری فلم "دشمن" میں شیخو نے اسے سائڈ ہیروئن کے لیے کاسٹ کیا۔ اسکرپٹ میں اس کا بہترین کردار لکھا گیا۔ ریہرسل میں بڑی محنت کرائی گئی۔ شوٹنگ کے دوران اس کے کئی ری ٹیک شاٹس لیے گئے۔ جب وہ فلم ریلیز ہوئی تو تہلکہ مچ گیا۔ فلم کی ہیروئن سے زیادہ سائڈ ہیروئن شبانہ کو پسند کیا گیا۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کی بڑی بڑی تصویریں شائع ہونے لگیں۔ بڑے بڑے فلمساز اسے بطور ہیروئن کاسٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن شیخو سے پانچ برس کا معاہدہ تھا۔ اس لیے وہ دوسری فلموں میں ہیروئن بننے کے لیے ترس کر رہ گئی۔

اسے پہلی بار شیخو پر بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ اب وہ اسے ہیروئن کے طور پر اپنی فلموں میں کاسٹ کر رہا تھا مگر وہ زیادہ سے زیادہ فلموں میں کام کرنا چاہتی تھی۔ جوگی پرشاد بھی یہی چاہتا تھا کہ راتوں رات کروڑ پتی کا راور بھاری بنک بیلنس بن جائے۔ معاہدے کی رو سے شبانہ پانچ برس تک کسی دوسرے کی فلم میں کام نہیں کر سکتی تھی۔ معاہدے کے دو برس گزر گئے تھے۔ ابھی تین برس کا طویل عرصہ باقی تھا اور انہیں معاہدہ توڑنے کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا۔

اس نے شیخو سے کہا "مجھ سے فوراً ہی شادی کر لو نہیں تو تمہارا بچہ ولدیت کو بجلیں کملائے گا۔"

"میں شادی نہیں کر سکتا۔ میری بیوی بڑی ظالم ہے۔ وہ مجھے دوسری شادی نہیں کرنے دے گی۔"

"پھر بچے کا کیا ہوگا؟"

"اسے ضائع کر دو۔"

"اپنے بچے کو ضائع کرنے کو بولتے ہو۔ شرم نہیں آتی؟"

"میرے چار بچے پہلے سے ہیں۔ مجھے پانچویں کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ غصہ میں بولی "مجھے ضرورت ہے۔ سنا ہے یوں کرنے سے صحت خراب ہو جاتی ہے صحت نہیں رہے گی تو میں دو چار مہینے فلم میں کام نہیں کر سکوں گی۔ تمہاری میری فلم ادھوری رہ جائے گی۔"

شیخو نے اس پہلو سے غور نہیں کیا تھا۔ اب غور کرنے پر حساب لگایا تو پتہ چلا کہ شبانہ کا کام دو مہینے میں مکمل نہ کیا گیا تو پھر وہ زچگی کے بعد بھی دو چار ماہ فلم میں کام کرنے کے قابل نہیں رہے گی۔ اس نے فیصلہ سنایا "میں کل ہی سے شوٹنگ کا شیڈول تیار کرتا ہوں۔ دو ماہ کے اندر اپنی فلم میں تمہارا کام مکمل کر لوں گا۔"

"میں تمہاری فلم میں کام نہیں کروں گی۔"

"معاہدے کی رو سے تمہیں کرنا ہوگا۔"

"معاہدے میں بچہ شامل نہیں تھا۔ پہلے بچے کا فیصلہ کرو۔"

"بچہ نو ماہ بعد ہوگا۔ فلم کو دو ماہ میں مکمل ہونا چاہیے۔"

"پہلے بچے کا کام مکمل ہونا چاہیے۔ میں شادی کے بعد کام کروں گی۔"

وہ غصہ میں میز پر گھونسہ مارتے ہوئے بولا "میں تم سے زبردستی کام کرواؤں گا۔"

وہ جواباً میز پر گھونسہ مارتے ہوئے بولی "میں تمہاری گھروالی کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ اسے بتاؤں گی کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

وہ گھبرا کر بولا "ارے خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ وہ پہرہ دینے کے لیے روز اسٹوڈیو میں آنے لگے گی۔ ہر روز میری شوٹنگ فیل کرائے گی۔"

"تو پھر مجھے بدنامی سے بچاؤ۔ شادی کر لو ایسا نہ ہو کہ میں ہیروئن بننے سے پہلے سارے ہندوستان میں بدنام ہو جاؤں۔"

"میں تمہیں بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے ذرا سوچنے کا موقع دو۔"

اسی شام شیخو ایک دوسرے ڈائریکٹر ویسے دت کے ساتھ بیٹھ کر پی رہا تھا۔ باتوں باتوں میں شبانہ کا ذکر آ گیا۔ ویسے دت نے کہا "میرا پروڈیوسر کروڑ پتی ہے۔ وہ شبانہ کو میری فلم میں کام کرنے کے پچاس ہزار روپے دے سکتا ہے۔"

شیخو نے سینہ تان کر کہا "مگر شبانہ میری داشتہ ہے۔ معاہدے کے مطابق وہ مزید تین سال تک کسی فلم میں کام نہیں کرے گی۔"

ویسے دت نے کہا "تمہارا کیا بگڑے گا اگر شبانہ میری ایک فلم میں کام کر لے گی۔ اس کے بدلے میں تمہارے کسی کام آ جاؤں گا۔ میں یاروں کا یار ہوں۔ کبھی آزما کر دیکھ لینا۔"

شیخو کو اچانک یاد آیا کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت ہے اور یہ ویسے دت کو آزمانے کا اچھا موقع ہے۔ اس نے کہا "میں ایک مصیبت میں ہوں۔"

"مصیبت بیان کرو۔ میں دور کروں گا۔"

"مصیبت یہ ہے کہ شبانہ دس ماہ سے پہلے شوٹنگ میں حصہ نہیں لے سکے گی۔ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"بھئی مبارک ہو۔"

"کیا خاک مبارک ہو۔ وہ کہتی ہے میں اس سے شادی کروں۔ نہیں کروں گا تو وہ زچگی سے پہلے فلم میں کام نہیں کرے گی اور

میری بیوی کے پاس پہنچ جائے گی۔"

"پھر تو واقعی تم مصیبت میں ہو۔"

"تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"تم جو کہو گے وہ کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ شبانہ کو میری فلم میں کام کرنے دو۔"

"مجھے شرط منظور ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ بچہ ناجائز نہ کہلائے میں اُسے راضی کروں گا کہ وہ کسی سے بھی شادی کر کے اُسے بچے کا باپ بنا لے۔ کیا تم اُس سے شادی کرو گے؟"

"اِیں میں۔ میری تو شادی ہو چکی ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے دھرم میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی نہیں کی جا سکتی مگر میں تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہوں۔ مجھے ایک بار شبانہ سے تنہائی میں بات کر لینے دو۔"

"ٹھیک ہے۔ کل میرے گھر آ جاؤ میں ملاقات کرا دوں گا۔"

دوسری صبح شیخو نے شبانہ سے کہا۔ "آج ڈائریکٹر بھیجے دت تم سے ملنے آئے گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "سچ؟ وہ کیوں ملنے آئے گا؟ کیا تم مجھے اُس کی فلم میں کام کرنے کی اجازت دو گے؟"

"ہاں۔ اس شرط پر اجازت دوں گا کہ تم دو ماہ کے اندر میری فلم کی شوٹنگ مکمل کر لو گی۔"

"میں کر لوں گی مگر پہلے معاہدہ ہونا چاہیے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "تریا چلتر یعنی عورت کی مکاری اِسی کو کہتے ہیں۔ کل تک تم کام کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ آج دوسری فلم میں کام کرنے کی آزادی ملتے ہی تم راضی ہو گئیں۔"

"عورت مردوں سے ہی مکاری سیکھتی ہے۔ میرے باپو نے مجھے سکھایا ہے کہ مرد ذات پر کبھی بھروسہ نہ کرو اور ٹھیک ہی سکھایا ہے۔ پہلے تم مجھ پر مرتے تھے۔ بچے کا ذکر سنا تو سارا عشق ٹھنڈا ہو گیا۔ اب وہ بھیجے دت سے ملا رہے ہو تو اس میں بھی کوئی چال ہو گی اور بدنام عورت ہوتی ہے کہ ہم مکار ہیں۔"

"تم بہت زیادہ بولتی ہو۔ بہرحال اسے یاد رکھنا کہ میں نے صرف بھیجے دت کی فلم میں کام کرنے کی اجازت دی ہے۔"

"اگر تم نے اپنے معاہدے کے خلاف کسی غیر کی ایک فلم میں بھی کام کرنے کی اجازت دی تو وہ معاہدہ منسوخ ہو جائے گا پھر میں آزاد ہو جاؤں گی۔ پھر مجھے جتنی فلمیں ملیں گی۔ میں کام کرتی جاؤں گی۔ تم مجھے نہیں روک سکو گے۔"

شیخو نے پشیمان ہو کر ناگواری سے کہا۔ "جب تم میرے پاس آئی تھیں تو بچی تھیں۔ اب کسی جہاندیدہ عورت کی طرح بول رہی ہو۔"

"آخر بات کیا ہے بیگم؟" شوہر نے حیرت سے پوچھا "آج تم نے فون پر صرف تین منٹ بات کی؟"

بیگم نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ "رانگ نمبر تھا۔"

❋

جی ایم نوشاہی کا کہنا ہے کہ دنیا کا کوئی شخص بھی تمہیں اس وقت تک احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں کر سکتا جب تک اس میں تمہاری اپنی مرضی بھی شامل نہ ہو۔

❋

دو باتوں میں سے اگر کوئی شخص ایک بات بھی کہے تو سمجھو وہ اوّل درجے کا جھوٹا ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ شراب کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ میں روپیوں کو سمجھتا ہوں۔

❋

مخالف جنسوں کے درمیان ہونے والی جنگِ عظیم میں کسی بھی جنس کو کبھی مکمل فتح حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں منافقت بھی پائی جاتی ہے۔

❋

عورت دنیا کی وہ عظیم ہستی ہے جو شوہر ہی کی نہیں چیتے تک کی کھال اتار لیتی ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنا کوٹ تیار کرا سکے۔

"مجھے بچی سے جہاندیدہ عورت تم نے ہی بنایا ہے اب کیوں پچھتا رہے ہو؟"

جس طرح استاد حضرات اپنے شاگردوں کو تمام داؤ پیچ سکھانے کے بعد پچھتاتے ہیں۔ اس طرح اکثر ڈائریکٹر کسی حسینہ کو اپنی فلم میں ہیروئن بنانے کے بعد پچھتایا کرتے ہیں۔ ہیروئن کی حیثیت سے شہرت ملتے ہی حسین لڑکیاں پھر دام میں نہیں رہتیں۔ جال توڑ کر پنجرے سے اُڑ جاتی ہیں۔ شبانہ کو بھی اُڑنے کا موقع مل گیا تھا۔ شیخو کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ اُسے بے وفا نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ خود اپنے بچے کو قبول نہ کر کے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا تھا۔

شام کو بھیجے دت آیا تو شبانہ نے کہا۔ "تم لوگ عورت کو طوائف بنانے کے اچھے ہتھکنڈے جانتے ہو۔ دو برس میں فلم انڈسٹری نے مجھے سکھا دیا ہے کہ ہیروئن بننے کے لیے پہلے فلمساز اور ہدایت کار کی

سچ پوچھا جانا پڑتا ہے سو جے بالو تم بھی مجھ سے یہی فرمائش کرو گے تو پھر ہم شیخ صاحب کے گھر میں بیٹھ کر باتیں کیوں کریں۔ بہتر ہے کہ تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔"

وجے ورت نے کہا: "شیخ صاحب! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ شبانہ کو آج رات کے لیے اپنے ہاں لے جاؤں۔ وہاں ذرا کھل کر باتیں ہو سکیں گی۔"

شیخو کو ہونے والے بچے سے پیچھا چھڑانا ہی تھا۔ اس لیے اس نے اجازت دے دی۔ شبانہ باہر آ کے وجے ورت کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ بہت ہی پرانے ماڈل کی کھٹارا گاڑی تھی۔ چلتے وقت دائیں بائیں ڈگمگاتی تھی۔ ان دنوں مشہور ہدایت کاروں کے پاس ایسی ہی گاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ اُن میں بیٹھ کر وہ اس وقت کے رئیس اعظم کہلاتے تھے۔ وجے ورت کو شبانہ کے ساتھ جاتے ہوئے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن وہ پریشان تھا۔ بار بار کن انکھیوں سے شبانہ کو دیکھ رہا تھا جیسے کسی خاص مقصد کے لیے اسے ناپ تول رہا ہو۔

گھر پہنچ کر اُس نے بتایا کہ اُس کی بیوی میکے گئی ہوئی ہے وہاں کوئی انھیں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ اس نے وہسکی کی بوتل اور گلاس نکالتے ہوئے پوچھا: "کیا تم پیتی ہو؟"

"نہیں سنا ہے کہ شراب عیاشی کے لیے پی جاتی ہے یا پھر اس سے غم غلط ہوتا ہے۔ جب مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے تو میں پینا شروع کر دوں گی۔"

وہ پینے لگا۔ کہنے لگا: "میں بہت غم کا مارا ہوں۔ دنیا میں مجھ جیسا دکھی انسان کوئی نہ ہوگا۔"

"پہلے میں بھی یہی سوچتی تھی۔ جب باپو مجھے مار مار کر نچاتا تھا تو میں سمجھتی تھی کہ مجھ جیسی بدنصیب کوئی نہ ہوگی۔ اب پتہ چلا کہ تقدیر کوڑے مار مار کر نچا نچا کر کسی کو ہیروئن بناتی ہے تو کسی کو ڈائریکٹر، کسی کو لیڈر اور کسی کو گیدڑ بنا دیتی ہے۔ آدمی کو کچھ بننے کا سلیقہ بھی آنا چاہیے۔ تب وہ ناچ ناچ کر کچھ بن جاتا ہے۔"

"تم بہت بولتی ہو۔ دوسروں کی بھی سنا کرو۔ یقین جانو میں بہت دکھی اور پریشان ہوں۔"

"کیا دکھ ہے؟ کون پریشان کرتا ہے تمھیں؟"

"میری بیوی۔"

"وہ شیخو بھی اپنی بیوی کی شکایتیں کرتا ہے۔ کیا تم لوگوں کی نظروں میں بیویاں ظالم ہوتی ہیں؟"

"میں نے اپنی بیوی کو ظالم تو نہیں کہا۔ وہ تو اتنی پیاری ہے کہ اُس کا حسن اور اُس کی وفاداری نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

وہ حیران ہو کر بولی: "تعجب ہے۔ بیوی کی وفاداری نے تمھیں کیسے پریشان کیا ہے؟"

"بس میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ طلاق لے کر چلی جائے مگر وہ بے انتہا شوہر پرست ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کی خوبیاں کیسے بیان کروں؟"

"تم اپنی خرابیاں بیان کرو کہ ایک نیک بخت سے تم پریشان کیسے ہو جاتے ہو۔"

اُس نے گلاس میں شراب ڈالتے ہوئے پوچھا: "اگر میں اپنا ایک گھریلو راز تمھیں بتاؤں تو کیا تم ہمیشہ اُسے راز رکھ سکو گی؟"

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔ تمھارے گھر کی بات شیخ صاحب یا اور کسی صاحب کو نہیں بتاؤں گی۔"

"تو پھر سنو۔ تین برس پہلے میری شادی ہوئی تھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تیس برس تک میرے گھر والے مجھے پریشان کرتے رہے اور میں انھیں ٹالتا رہا۔ مجھے صرف شراب سے محبت ہے۔ شباب سے کبھی دلچسپی نہیں رہی مگر میری ماں نے مرنے سے پہلے قسمیں دے دے کر میری شادی لکشمی سے کرا دی۔"

اُس نے شراب کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "لکشمی بہت اچھی بہت سندر اور شوہر پرست عورت ہے میں اُس کی خوبیاں کیسے بیان کروں؟"

"تم بس اپنی خرابیاں بیان کرو۔"

"میری خرابی یہ ہے کہ میں لکشمی کو سب کچھ دے سکتا ہوں مگر پیار نہیں دے سکتا۔ شادی کو تین برس ہو گئے۔ لکشمی ابھی تک ابھی تک.... " وہ کوشش کے باوجود کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔

"میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں اسے سچ مچ کی سہاگن نہیں بنا سکتا۔ وہ مجھ پر تھوک کر چلی جائے۔"

اُس نے تھوک نگلنے کے انداز میں شراب کو نگلتے ہوئے کہا: "لکشمی پتی ورتا ہے۔ وہ مر کر ہی میرے گھر سے نکلنا چاہتی ہے۔ میں نے ایسی وفادار بیوی نہیں دیکھی۔ وہ میرے اور اپنے خاندان والوں کے سامنے ہنستی بولتی رہتی ہے اور اندر ہی اندر جوانی کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ اُس نے میری شرم رکھی ہے۔ مرتے دم تک وہ کسی کے سامنے میری کمزوری کا ذکر کبھی نہیں کرے گی۔"

شبانہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہی تھی پھر وہ بولی: "ہائے بیچاری اپنے اوپر کیسا ظلم کر رہی ہے۔ وہ تمھیں چھوڑنا نہیں چاہتی مگر تم زبردستی اُسے چھوڑ دو

تو یہ نیکی ہوگی۔"

"میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اپنے اور اس کے خاندان والوں کے سامنے چھوڑنے کی وجہ بتانی ہوگی۔ جس کمزوری کو میں چھپاتا آرہا ہوں اُسے کیسے بیان کردوں۔ میں شرم سے کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔ میری مردانگی کا بھرم نہیں رہے گا تو میں مر جاؤں گا۔"

"پھر تو تمھیں مر جانا چاہیے۔ وہ بیوہ ہونے کے بعد دوسری شادی کرسکے گی۔"

"زندگی بہت خوبصورت ہے اور یہ زندگی ہمیں ایک ہی بار ملتی ہے۔ اس لیے میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اُس سے ہمدردی کرو۔"

"کیسے کروں؟"

"دیکھو وہ بیوی بن کر بہل نہیں سکتی۔ ماں بن کر بہل جائے گی۔ وہ ایک بچے کی ماں بننا چاہتی ہے۔ تم اپنے ہونے والے بچے کو اُس کی گود میں ڈال دو۔"

"عورت سب کچھ دے دیتی ہے۔ اپنا بچہ کسی کو نہیں دیتی۔"

"مگر تم بیاہتا عورت نہیں ہو۔ بچہ ہمیں نہیں دوگی تو اُسے گود میں رکھ کر بدنام ہو جاؤ گی۔ ابھی تمھاری شہرت کی ابتدا ہوئی ہے وہ سب خاک میں مل جائے گی۔"

"میں فوراً ہی کسی سے شادی کرلوں گی۔"

"تم شادی کروگی تو یہ خبر اخباروں میں چھپے گی۔ فلم دیکھنے والے ہیروئن کو کنواری دیکھنا چاہتے ہیں۔ شادی شدہ کو دیکھنا ہو تو وہ اپنے گھروں میں بیوی کو دیکھ کر بہل سکتے ہیں مگر ایسا نہیں ہوتا۔ دنیا والوں کو پرائی عورت حسین اور کنواری لگتی ہے۔ تمھیں بھی ایسی ہی لگنا چاہیے۔ شادی کروگی تو تمھاری فلمیں فلاپ ہو جائیں گی پھر کوئی تمھیں کاسٹ نہیں کرے گا۔"

یہ بات تو اُس کا باپو بھی سمجھاتا تھا کہ کسی سے چلتا پھرتا عشق کرلینا مگر شادی نہ کرنا۔ نہیں تو بڑھتی ہوئی شہرت پل بھر میں خاک ہو جائے گی۔ وجے دت کی یہ بات دل میں اتر گئی کہ شادی کرنے کی حماقت نہیں کرنا چاہیے ورنہ اخبار اور رسالے والے اُس کی خفیہ شادی کو بھی خوب اچھالیں گے۔

وجے دت نے کہا۔ "تمھارے ساتھ وہ ہونے والا بچہ بھی بدنام ہوگا۔ اخباروں اور رسالوں میں اُس کی ناجائز پیدائش پر من گھڑت کہانیاں شائع کی جائیں گی۔ پھر وہ بچہ بڑا ہو کر تمھیں گالیاں دے گا۔"

"نہیں۔ میں شادی نہیں کروں گی مگر بچے کو ایک باپ کا نام ضرور ملنا چاہیے۔"

ایک عورت مرنے کے بعد جنت کے دروازے پر پہنچی اور وہاں کے داروغہ سے کہا۔ "میں اپنے شوہر سے ملنا چاہتی ہوں جب تک ہم دونوں دوبارہ یکجا نہیں ہوں گے مجھے سکون میسر نہیں ہو سکے گا۔"

جنت کے داروغہ نے پوچھا "تمھارے شوہر کا نام کیا ہے؟"

"ان کا نام عبدل ہے۔"

"جنت میں لاکھوں کروڑوں عبدل موجود ہیں۔ اپنے شوہر کی کوئی خاص نشانی بتاؤ۔"

وہ بہت ہی عجیب و غریب انسان تھے مرتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔ "دیکھو نصیبا اگر کبھی تم نے مجھ سے بے وفائی کی تو میں قبر میں بے چینی سے کروٹ بدل دوں گا۔"

"اوہو۔۔۔" جنت کے داروغہ نے کہا "تمھاری مراد اس عبدل سے ہے جو اپنی قبر میں لیٹے لیٹے اضطرابی رقص کرتا رہتا ہے۔"

"میں اُسے اپنا نام دوں گا۔ شادی کے بعد اب تک لکشمی نے میری عزت رکھی ہے لیکن اب ہمارے کنبے میں پوچھا جاتا ہے کہ بچہ کیوں نہیں ہوتا۔ لکشمی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ ہم کسی اناتھ آشرم سے کوئی بچہ گود لے کر آجائیں اور کنبے والوں سے کہہ دیا جائے کہ لکشمی بانجھ ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ تمھارے بچے کو گود لے لیا جائے۔ اس طرح میری مردانگی کا بھرم بھی رہ جائے گا۔"

"بھرم کیسے رہے گا؟"

"ایسے کہ تم اور لکشمی پانچ مہینے کے لیے کسی ایسے شہر میں رہو گی جہاں ہم لوگوں کو کوئی پہچانتا نہ ہو۔ میں گھر والوں سے بہانہ کروں گا کہ لکشمی کو چار ماہ کا حمل ہے اور میں اُسے اپنے ساتھ دور ایک پہاڑی علاقہ میں فلم کی شوٹنگ کرنے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ فلمی صحافیوں کو تمھارے بارے میں یہی بیان دیا جائے گا۔ جب تمھاری زچگی ہو جائے گی اور بچہ لکشمی کی گود میں آ جائے گا تو پھر ہم وہاں سے واپس آکر ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جائیں گے۔"

"اجنبی بن جانے کا مطلب کیا ہوا؟"

"یہی کہ تم کبھی لکشمی اور بچے سے نہیں ملو گی۔ وہ میرے نام سے پرورش پائے گا۔"

"میں اُس کی ماں ہوں گی۔ میں اُس سے ضرور ملوں گی۔"

"تم ماں کے رشتے سے ملنے آؤ گی تو میں اُسے باپ کا نام کیسے دے سکوں گا؟"

"میں کسی سے نہیں کہوں گی کہ میں اُس کی ماں ہوں۔"

"تم زبان سے نہیں کہو گی مگر ماں کی آنکھیں ممتا کے جذبات یہ سب مل کر چغلی کھائیں گے۔ تم ابھی سے اپنے دل کو سمجھاتی رہو کہ بچے کو بدنامی سے بچانے کے لیے تمھیں اُس سے دور رہنا ہو گا تبھی اُسے میرا اور میرے معزز خاندان کا نام ملے گا۔ ماں کو اتنی قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔"

"میں قربانی دے سکتی ہوں مگر میرا دل چاہے گا کہ میں اپنی اولاد کے کسی کام آتی رہوں۔"

"جب بھی تمھارا جی چاہے تم میرے ذریعہ اُس کے کام آسکتی ہو۔ ماں وہی ہے جو ممتا نہ جتائے بلکہ دور ہی سے ممتا کی ذمہ داریاں پوری کرتی رہے۔"

"ہائے میں زندگی کے کیسے موڑ پر آگئی ہوں۔ بچہ میرا ہو گا۔ تکلیف میں اٹھاؤں گی، پیدا میں کروں گی اور نام تمھارا ہو گا۔"

"دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ انڈا مرغی دیتی ہے۔ کھاتا آدمی ہے۔ وہ بچہ ایک پردہ ہو گا جو میری کمزوری کو چھپائے گا۔ وہ ایک اعلان ہو گا میری مردانگی کو ثابت کرے گا۔ بس بات طے ہو گئی ٹھیک ہے؟"

شبانہ نے اپنے حالات پر غور کیا اور مان گئی۔ اُس نے شنخو اور وجے دت کا موازنہ کیا تو وجے دت بہتر لگا۔ کیونکہ شنخو کامیاب ڈائریکٹر سہی مگر بنیادی طور پر چپراسی تھا۔ اُس کے خاندان کا کوئی بڑا پس منظر نہیں تھا۔ اُس کے برعکس وجے دت کامیاب ڈائریکٹر بھی تھا اور خاندانی آدمی بھی کہلاتا تھا۔ صرف ایک قباحت تھی کہ اس کا بچہ ہندو گھرانے میں پرورش پائے گا لیکن خود شبانہ بھی تو ایک ہندو گھرانے میں پرورش پا چکی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وجے دت اور نکشمی ضرورت مند تھے۔ بچہ اُن کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ شبانہ کے بچے کو وہ اپنی جان سے لگا کر رکھتے اور پرورش کرتے۔ لہٰذا اُس نے وجے دت کی بات مان لی۔

⭘

پندرہ برس گزر گئے۔ اس طویل مدت میں شنخو نے کئی بار اپنا عروج و زوال دیکھا۔ کبھی اُس کی فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوتیں تو اسے ہندوستان کا عظیم ہدایت کار کہا جاتا۔ کبھی کوئی فلم فلاپ ہو جاتی تو اخباروں اور رسالوں میں وہ گھسیارا کہلاتا۔ پیسہ لگانے والے فنانسر اس کی طرف رُخ نہ کرتے۔ فلمی دنیا میں بہت جلد کسی کی کامیابی اور صلاحیتوں کو بھلا دیا جاتا ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فلمیں ۔۔۔۔ ذہانت اور صلاحیتوں سے تیار نہیں کی جاتیں۔ فلموں میں دولت صرف کرنے والے اسے تاش کی بازی سمجھتے ہیں۔ تقدیر کا جوا کھیلتے ہیں کامیاب ہو جائے تو ہدایت کار باصلاحیت نہیں بلکہ خوش قسمت ہے اور ناکام ہو جائے تو وہی ہدایت کار بدقسمت کہلاتا ہے۔

شنخو کی مسلسل تین فلمیں فلاپ ہوئیں تو سیٹھوں اور مہاجنوں نے اُس کی فلم میں پیسہ لگانا چھوڑ دیا۔ اُسے طنزیہ انداز میں کہنے لگے: "فلاپ فلمیں پاکستان میں بنتی ہیں۔ تم مسلمان ہو پاکستان چلے جاؤ۔ وہیں تمھارا گزارہ ہو گا۔"

مگر شنخو کو ہندوستان سے محبت تھی۔ وہ اسی دھرتی پر رہنا اور وہیں کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے پھر ایک بار کامیاب ڈائریکٹر کی حیثیت سے اُبھرنے کے لیے جی جان سے کوششیں کیں۔ کتنے ہی سیٹھوں اور مہاجنوں کو یقین دلایا کہ وہ منافع کمانے والی فلم بنائے گا لیکن زبان پر کوئی بھروسہ نہیں کرتا۔ کچھ کر کے دکھانا ہوتا ہے اور کچھ کرنے کے لیے دولت نہیں تھی۔ تب اُسے شبانہ یاد آئی۔

شبانہ اب عروج پر تھی۔ ایک فلم میں کام کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے معاوضہ لیتی تھی۔ اس کے جیسی دولت مند ہیروئن ہندوستان میں صرف دو چار ہی تھیں۔ شنخو اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شبانہ کے ملازم نے پہلے تو اُسے دروازے سے داخل ہونے ہی نہیں دیا جب شنخو نے جھوٹ کہا کہ وہ ہدایت کار ہے اور بی بی سے کنٹریکٹ سائن کرانے آیا ہے تو اُسے ویٹنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ کیونکہ ڈرائنگ روم میں وہ کسی دوسرے ہدایت کار سے آیندہ فلم کی کہانی سُن رہی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب شبانہ ہیروئن بننے کے لیے شنخو کے دروازے پر گئی تھی۔ اَب یہ زمانہ آگیا تھا کہ وہ شبانہ کی دہلیز پر پھر ایک بار ڈائریکٹر بننے آیا تھا۔ وہ صبح سے دوپہر تک ویٹنگ روم میں اُس کا انتظار کرتا رہا۔ کسی نے ایک پیالی چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ ڈائننگ روم سے کھانے کے برتنوں کی آواز کے ساتھ کبھی کبھی قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ کھانے کے بعد دوسرے ہدایت کار کی ٹیم چلی گئی۔ تب شبانہ نے اسے بلایا۔

شبانہ اب پہلے جیسی چھوکری نہیں رہی تھی۔ بھاری بھرکم حسین و جمیل عورت کے روپ میں نکھر آئی تھی۔ اُسے اتنی شہرت حاصل ہو چکی تھی کہ ایک عام آدمی اُس کے سامنے باتیں کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔

شنخو نے اُسے دیکھتے ہی کہا: "کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی۔ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔۔۔۔"

شبانہ نے ڈانٹ کر کہا: "میرے پاس بکواس سننے کے لیے

وقت نہیں ہے۔ کیوں آئے ہو؟"

"میرے پاس ایک فلم کا دھانسو آئیڈیا ہے۔ سنو گی تو پھڑک جاؤ گی۔"

"میرے پھڑکنے کی عمر گزر چکی ہے۔ کسی اور کو بے وقوف بناؤ۔"

"شبانہ! اتنی بے رخی سے بات نہ کرو۔ کبھی ہمارے درمیان بہت گہرا رشتہ تھا۔ میں تمہاری تنہائیوں کا..."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "زیادہ نہ بولو۔ ایک بچہ ہوتے ہی تمہارا گہرا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ اگر مجے دت میرے بچے کو گود نہ لیتا تو آج وہ بچہ ناجائز اور تم اس کے ناجائز باپ کہلاتے۔"

"اگر میں زبان کھول دوں تو تمہارا بچہ آج بھی بدنام ہو سکتا ہے۔"

وہ حقارت سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ نہ بھولو کہ تم بھی بدنام ہو جاؤ گے۔"

"نہیں میرا تو نام ہو گا کہ ہندوستان کی ٹاپ کی ہیروئن سے میرے تعلقات رہے ہیں۔ ایسے ہی موقع کے لیے کہا جاتا ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا؟"

"کیا تم مجھے دھمکی دینے آئے ہو؟"

"تمہارا بچہ پندرہ برس کا ہو چکا ہو گا۔ سنا ہے بہت ذہین ہے اور عمدہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ بڑے اچھے خاندان کا لڑکا سمجھا جا رہا ہے۔ کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ کبھی کوئی اُس کی اصلیت کو نہ سمجھے۔"

"ہاں میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میرا بیٹا بدنام ہو۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

"اس راز کی قیمت چاہتا ہوں۔ میں ایک فلم شروع کر رہا ہوں۔ تم اس میں رقم لگاؤ۔ منافع آدھا آدھا۔"

"مجھے فلم پروڈیوسر بننے کا شوق نہیں ہے۔"

"مگر مجھے ایک پروڈیوسر کی ضرورت ہے۔ ہمارے بچے کی بھلائی کے لیے تم رقم لگاؤ گی۔"

"تم بلیک میل کر رہے ہو۔ کیا تم اپنے بچے کی نیک نامی نہیں چاہتے؟"

"میرا کوئی بچہ وچہ نہیں ہے۔ میری بیوی مر گئی۔ بچوں نے جوان ہو کر ساتھ چھوڑ دیا۔ جب جائز اپنے نہ ہوئے تو ناجائز کو کون گنتا ہے۔ میں تمہارے بچے کے ذریعہ تمہیں بلیک میل کر کے اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنا سکتا ہوں۔ تمہاری دولت سے ایک سپر ہٹ فلم تیار کر سکتا ہوں۔ میں اِس یقین کے ساتھ آیا ہوں کہ تمہاری جیسی چٹان کو صرف ممتا ہی جھکا سکتی ہے اور میں تمہاری ممتا سے کھیلنا جانتا ہوں۔"

شبانہ نے بڑی بے بسی سے اُسے دیکھا۔ پھر اُس کے سامنے ایک صوفہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تم لوگ عورت کو عورت کیوں نہیں رہنے دیتے۔ اسے روپیہ پیدا کرنے کی مشین کیوں بنا دیتے ہو؟ تمہارے بعد مجھے پریم کمار سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ غریب تھا۔ محنتی اور ایمان دار تھا۔ تم نے اُسے دیکھا ہے وہ خوب صورت بھی ہے۔ میں اُس پہ مرمٹی تھی۔ اپنے باپو کی نصیحت بھول گئی تھی کہ کسی سے سچا عشق نہ کرنا۔"

وہ ایک لمحہ کو رکی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "یہ سالی فلم انڈسٹری بڑی کمینی جگہ ہے۔ یہاں صرف مطلب کے یارانے ہوتے ہیں۔ پریم کمار فلموں میں ہیرو کا چانس لینا چاہتا تھا۔ میری سفارش پر اُسے ایک فلم میں کام ملا پھر دوسری فلم میں کام ملا۔ اُس کے بعد وہ تیسری فلم کی ہیروئن سپنا کماری پر عاشق ہو گیا۔ کیونکہ سپنا کماری بھی بڑی ہیروئن ہے اس کی بھی بڑی سفارش چلتی ہے۔ میں پریم کمار سے شادی کرنا چاہتی تھی اور سپنا کماری شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتی اور مرد ایسی ہی عورت کو پسند کرتا ہے جو شادی نہیں صرف عشق کرتی ہے۔"

تیخو نے پوچھا۔ "تم مجھے یہ باتیں کیوں سنا رہی ہو؟"

"اِس لیے کہ تم نے بھی ایسا ہی عشق کیا تھا۔ تم سارے مرد ایک جیسے ہو لیں لگتا ہے جیسے فلم انڈسٹری میں مرد نہیں ہوتے سب مجے دت... ہوتے ہیں لوپر سے کچھ اندر سے کچھ... اَب مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں میں آئندہ کسی سے سچی محبت نہیں کر سکوں گی۔ صرف ماں بیٹے کا رشتہ ہی سچا رہے گا۔ میں مرنے سے پہلے اپنی ساری دولت اور جائداد اپنے بیٹے کے نام لکھ دوں گی مگر تم اِس میں نقب لگانے آ گئے ہو۔"

"میں جو فلم بناؤں گا اُس سے تمہارے بیٹے کی جائداد میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ ہماری فلم گولڈن جوبلی اور ڈائمنڈ جوبلی منائے گی۔"

"اور اگر فلاپ ہو گئی تو؟"

"تمہارے بیٹے کی تقدیر اچھی ہے۔ فلاپ نہیں ہو گی۔"

"تم بلیک میلنگ کے لیے مجھ سے پانچ دس ہزار روپے لے لیا کرو۔ فلم بنانے کا خیال چھوڑ دو۔"

"فلم تو میں ضرور بناؤں گا اور تم رقم ضرور لگاؤ گی۔"

شبانہ نے اُسے نفرت سے دیکھا مگر وہ مجبور تھی۔ بیٹے کی نیک نامی کی خاطر ایک بلیک میلر باپ کے آگے جھکنا پڑ رہا تھا۔ وہ حقارت سے بولی۔ "میں اُسے

پیدا کرنے کی گناہگار ہوں مگر ممتا کا سارا عذاب مجھے سہنا پڑ رہا ہے۔ باپ کی شفقت جیسے کچھ نہیں ہوتی۔ کیا تمھیں ذرا سی بھی شرم نہیں آرہی ہے۔"

"میں تمھارے بیٹے کی رہائش اور دولت میں اضافہ کرنے کے لیے فلم بنا رہا ہوں۔ میں اس کی بھلائی چاہتا ہوں۔ میں جان بوجھ کر فلم فلاپ نہیں کراؤں گا۔ آخر میں بھی اُس کا باپ ہوں۔ آخری بات بولو میری فلم میں رقم لگاؤ گی یا نہیں۔"

"تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وجے دت کے پاس جو بیٹا ہے وہ تم سے ہے؟"

تیجو نہیں جانتا تھا کہ وجے دت کی اصلیت اندر سے کیا ہے؟ لیکن ڈاکٹری معائنہ سے اصلیت ظاہر ہو سکتی ہے بیٹا ایک پل میں گناہ کی پوٹ کہلا سکتا تھا۔ شبانہ نے پریشان ہو کر تیجو کی فلم میں رقم لگانے کی ہامی بھر لی۔ تیجو اپنے ذاتی اخراجات کے لیے اُس سے پانچ ہزار روپے لے کر چلا گیا۔ ارادہ تھا کہ وہ دو ایک دن آکر نئی فلم کی مہورت کے لیے پانچ لاکھ روپے کا چیک لے جائے گا۔

شبانہ اس روز بہت پریشان رہی۔ ہندوستان میں ایک اے کلاس فلم کا بجٹ ایک کروڑ روپے تک ہوتا ہے۔ بی کلاس فلمیں ساٹھ ستر لاکھ روپے تک بن جاتی ہیں اور وہ تیجو کی فلم میں اتنی بڑی رقم کا جوا نہیں کھیلنا چاہتی تھی۔

اُس نے بہت سوچ بچار کے بعد وجے دت کو فون کیا "وجے! میں بیٹے کی وجہ سے بہت مشکل میں پھنس گئی ہوں مجھ سے فوراً آکر ملو۔ ورنہ یہ تیجو تمھیں برباد کر دے گا۔"

وجے دت نے پوچھا "تیجو اس معاملے سے بالکل الگ ہو گیا تھا۔ پھر وہ ہمیں برباد کیسے کرے گا؟"

"وہ کہتا ہے کہ میں اُسے فنانس کروں۔ اُس کی فلم میں رقم لگاؤں نہیں تو وہ دنیا والوں کو ہمارے بیٹے کی اصلیت بتا دے گا۔"

"اوہ! یہ تو بہت بُرا ہو رہا ہے۔ میں بھی یہاں بہت پریشان ہوں۔ ابھی تمھیں آکر بتاؤں گا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔"

آدھ گھنٹے بعد وہ شبانہ کے ہاں پہنچ گیا۔ اس سے بولا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ کوئی اچھی سی وھسکی پلاؤ۔ سنا ہے آج کل تم بھی پینے لگی ہو۔"

"ہاں یاد ہے تم نے پہلی ملاقات میں مجھے شراب پینے کے لیے کہا تھا۔ میں نے جواب دیا تھا کہ جب مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے تو میں پینا شروع کر دوں گی۔ اب میں غم غلط کرنے کے لیے پیتی ہوں۔"

وہ دونوں وھسکی کی ایک بوتل اور گلاس لے کر بیٹھ گئے وجے دت نے کہا۔ "یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ دو برس پہلے لکشمی مر گئی تھی۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ میں اپنے بیٹے کی وجہ ہی تو دور سے سب خبر رکھتی ہوں۔ اس کے ساتھ تمھارے خاندانی حالات بھی معلوم ہوتے رہتے ہیں۔"

وجے دت نے کہا۔ "لکشمی کے مرنے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا میرے سینے پر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا۔"

"تم ایسی وفادار بیوی کو بوجھ سمجھتے رہے۔ تم کیسے آدمی ہو؟"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اُس کی وفاداری ہی مجھے پریشان کرتی رہی —————— یہ بات میرے سینے پر بوجھ بن کر رہتی تھی۔ اُس کے مرنے سے اطمینان ہوا کہ چتا کی آگ نے اُسے جلا دیا۔ اب جدائی کی آگ کبھی نہیں جلائے گی۔"

"مگر تم فون پر کہہ رہے تھے کہ اب بھی پریشان ہو۔"

"ہاں پنجاب سے ایک بہت حسین لڑکی آئی ہوئی ہے۔ وہ ہیروئن بننے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ کل رات میں نے اُس کے ساتھ بہت زیادہ پی لی۔ یہ سکھ لڑکیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں کم بخت چار گلاس پینے کے بعد بھی بولتی رہی۔ میں خوشی میں زیادہ پی گیا تھا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے بولی "چل مینوں ہیروئن بنا دے۔"

میں نے اُس سے انکار کیا۔ اُسے سمجھایا کہ میں اُسے ہیروئن نہیں بنا سکتا مگر وہ سر ہو گئی۔ تم ٹھونک کر بولی "تمھیں تو بنانا ہی پڑے گا۔" چونکہ میں بہت زیادہ پی گیا تھا۔ نشہ میں بہک رہا تھا۔ اس گڑبڑی میں میں نے بتا دیا کہ اصل میں میں کیا ہوں۔ میرا بھید اسے معلوم ہو گیا ہے۔"

شبانہ نے تشویش ظاہر کی "یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

"ہاں بہت بُرا ہوا۔ وہ سکھنی میرے بنگلے میں پڑی ہوئی ہے۔ کہتی ہے کسی فلم میں ہیروئن کا چانس دلاؤ۔ نہیں تو وہ میرا بھید کھول دے گی۔"

"شراب میرے لیے اچھی ہے کہ میرا غم غلط کرتی ہے۔ تمھارے لیے بُری ہے کہ تمھارا بھید کھولتی ہے۔ اب تو تم اُسے کسی فلم میں چانس دے ہی دو۔"

"کیسے دوں؟ اُسے تو بولنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ بظاہر لڑکی ہے لیکن میں نے اُس کا اسکرین ٹیسٹ لے کر دیکھا ہے وہ

بڑے پرٹے پر بڑی عمر کی عورت لگتی ہے۔ وہ ہیروئن بننے کے قابل نہیں ہے۔"

"وہ ہمارے بیٹے کے بارے میں کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے کہ وہ میرا بیٹا ہو ہی نہیں سکتا۔ لکشمی نے کسی دوسرے سے منہ کالا کیا ہوگا۔ یہ بیچاری لکشمی پر بہتان ہے۔ وہ بیچاری جنم کی کنواری رہ کر مرگئی۔ اب دنیا اُسے بدنام کرے گی۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔"

"تم نے اُسے کیا جواب دیا؟"

"میں نے اُسے سمجھایا کہ لکشمی پوجا کیے جانے کے قابل تھی۔ اس بیچاری پر کیچڑ نہ اچھالو۔ ہم اس بیٹے کو انا تھ آشرم سے لائے تھے مگر وہ حرام زادی یقین نہیں کرتی ہے۔ لکشمی کو بدنام کرنے پر تُل گئی ہے۔"

"میرا بیٹا بھی بدنام ہو جائے گا۔"

"میں بھی بڑے خطرناک طریقے سے بدنام ہونے والا ہوں۔"

"یہ شراب زیادہ پینے کا نتیجہ ہے۔"

"جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب ہم اس کے نتیجہ سے کیسے بچ سکتے ہو۔"

شبانہ نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "جی چاہتا ہے اس سکھنی کا گلا گھونٹ دوں۔ اُسے سندور کھلا دو۔ اُس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل سکے گی۔"

"وہ اور زیادہ مصیبت بن جائے گی۔ کوئی اچھی سی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ آہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔"

"میں سمجھتی ہوں عورت اتنی بے حیا نہیں ہوتی۔ کچھ بھی ہو وہ سکھنی عورت ہے۔ اپنی زبان سے تمہارا بھید نہیں کھول سکے گی۔"

"ارے وہ تو ایسی سڑی گالیاں دیتی ہے کہ سن کر ہوش اُڑ جاتے ہیں۔ وہ بڑی بے شرمی سے مجھے بدنام کرے گی۔ تمہارا بیٹا بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

شبانہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں اپنا دکھڑا رونے کے لیے تمہیں بلائی تھی۔ تمہارے دکھڑے نے تو مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا ہے۔ اُس سکھنی کو اچھی خاصی رقم کا لالچ دے کر اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرو۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ابھی جا کر اُس کے پاؤں پکڑ لوں گا۔ اسے سمجھاؤں گا کہ میرے فلمساز اسے ہیروئن کے طور پر پسند نہیں کرتے ہیں۔ میں اُسے ہیروئن کی ماں کا رول دوں گا اور موٹی رقم کا لالچ بھی دوں گا۔ اچھا اب میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں جاتے ہو؟ میری مصیبت کا کیا ہوگا۔ میں شخرے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟"

"اس کی فکر نہ کرو۔ وہ سالا مسلمان ہے۔ ہندو غنڈے اسے دھمکی دیں گے کہ وہ پاکستان جا کر فلمیں بنائے۔ نہیں تو اُدھر ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ تم ابھی اُسے چیک دینے کے بجائے ٹالتی رہو۔ میں سکھنی سے نمٹ کر اُسے سیدھا کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شبانہ کی تسلی نہ ہوئی۔ جب وہ اپنے دل کو دلاسہ دیتی کہ شیخرے سے وجے دت نمٹ لے گا تو سوال پیدا ہوتا کہ سکھنی سے کون نمٹے گا؟ بیٹا جوانی میں قدم رکھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت چھپی ہوئی بدنامی بھی جوان ہونا چاہتی تھی۔ اس نے فکر اور پریشانی میں کھانا نہیں کھایا۔ رات کو نیند بھی نہیں آئی۔ شراب نوشی کی زیادتی نے اُسے دوسرے دن تک مدہوش رکھا۔ جب اُسے ہوش آیا تو وجے دت اُس کے بستر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

اُس نے وجے دت سے پوچھا۔ "تم ابھی تک گئے نہیں؟ یہیں بیٹھے ہوئے ہو؟"

وہ بولا۔ "شبانہ جی! اب ہوش میں آجاؤ۔ میں کل یہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔ آج دوسرا دن ہے۔ تم نے تو پینے میں ہمیں بھی مات دے دی۔"

"آہ کیا کروں غم غلط نہیں ہوتا۔ یہ بتاؤ اُس سکھنی کا کیا ہوا؟"

"اس حرام زادی نے سب کچھ مٹی میں ملا دیا۔"

"کیا ہوا؟" شبانہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا وہ دنیا والوں کے سامنے بھید کھول رہی ہے؟"

"دنیا کو گولی مارو۔ اُس نے ہمارے بیٹے کے سامنے بھید کھول دیا۔"

شبانہ بڑبڑا کر بستر سے اُٹھ گئی۔ "کیا میرے بیٹے کو معلوم ہوگیا؟"

"ہاں میں اس سکھنی کے ہاتھ پاؤں پڑ رہا تھا۔ اُسے سمجھا رہا تھا کہ وہ مجھ سے بڑی رقم لے لے مگر لکشمی کو بدنام نہ کرے۔ لکشمی نے اُسے جنم نہیں دیا ہے۔ بلکہ ہم اُسے اناتھ آشرم سے لائے ہیں۔"

سفید لباس سے خوشی اور مسرت کا اظہار ہوتا ہے اور سیاہ لباس سے بے پناہ رنج و غم کا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک کی دلہنیں سفید لباس زیب تن کرتی ہیں اور دولہا — ہم تو یہی کہیں گے کہ وقت سے پہلے واویلا کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

وجے دت نے اتنا کہہ کر گہری سانس لی پھر کہا: "آج میں ہمارا بیٹا اُدھر مجھ سے ملنے آ گیا۔ اُس نے ساری باتیں سُن لیں۔ اُسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں اُس کا باپ نہیں ہوں اور لکشمی اس کی ماں نہیں تھی۔"

شبانہ نے تڑپ کر پوچھا: "پھر تو اُس نے پوچھا ہو گا کہ اُس کی ماں کون ہے؟"

"ہاں اُس نے اپنے ماں باپ کے متعلق پوچھا تھا۔ میں اُسے نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ تمہاری ناجائز اولاد ہے۔ بولو کیا اسے یہ بتانا مناسب تھا؟"

"نہیں ناجائز ثابت ہوتے ہی وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گا۔ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے ذلیل اور کمتر انسان سمجھنے لگے گا۔ ہائے میں اُسے دنیا کا سب سے اونچا انسان کیسے بنا دوں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے اُسے یقین دلایا ہے کہ اُسے اناتھ آشرم سے لایا گیا تھا۔"

"کیا اُسے یقین آ گیا؟"

"شاید وہ الجھن میں ہے۔ اُس نے میرا گھر چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

"کہہ رہا تھا کہ اب میرا گھر اُس کے لیے اجنبی ہے۔ اب وہ خود محنت کرے گا اور اپنی کمائی سے روٹی کھائے گا۔"

"ہائے میرا بیٹا کتنا خوددار ہے مگر وہ کہاں گیا ہے؟"

"وہ پرکاش پروڈکشنز میں کام حاصل کرنے گیا تھا۔ پروڈکشن مینیجر نے چپ چاپ مجھے فون پر بتایا کہ میرا بیٹا ملازمت کے لیے آیا ہے۔ میں نے اُسے چپکے سے سمجھا دیا کہ اُسے ملازمت دے دی جائے۔ آخر کو وہ ایک دن میری طرح بہت بڑا ڈائریکٹر بنے گا۔ لہٰذا ابھی سے اُسے فلمی دنیا کا تجربہ ہونا چاہیے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ وہ فلم انڈسٹری میں رہے گا تو ہماری نظروں کے سامنے ہر دم رہے گا۔ ہم اُس کی ترقی کے لیے سفارشیں کرتے رہیں گے۔ اُس کی کامیابی کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہیں گے لیکن شیخو کا کیا ہو گا؟"

"اُس کی فکر نہ کرو۔ میں اُس کا دھڑن تختہ کر دوں گا۔"

اسی رات وجے دت نے اپنے ہاں شیخو کو پینے کی دعوت دی اور بمبئی کے بدنام ترین غنڈوں کو بھی بلا لیا۔ وہاں شیخو کو شراب پلا پلا کر مارا گیا۔ اچھی طرح اُس کی پٹائی کرنے کے بعد اُسے حکم دیا گیا کہ وہ فلم انڈسٹری چھوڑ کر بمبئی سے چلا جائے۔ یا پھر شبانہ کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھے۔ کبھی وہ زبان کھولے گا تو ہمیشہ کے لیے اُسے خاموش کر دیا جائے گا۔"

شیخو کے سامنے کتنے ہی کھلے ہوئے چاقو کے پھل بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے جیسے موت چمکیلے دانت نکوس رہی ہو۔ وہ مرنے سے ڈرتا تھا۔ زندگی سے بہت پیار تھا۔ اس لیے اُس نے کان پکڑ کر توبہ کی۔ اب شبانہ کے پاس نہیں جائے گا اور کسی طرح بھی اُسے بلیک میل نہیں کرے گا۔

شبانہ نے ایک ماں کی حیثیت سے پھر بازی جیت لی۔ اپنے بیٹے کو بہت بڑی بدنامی سے بچا لیا۔

○

پانچ برس اور گزر گئے۔ فلم انڈسٹری میں شیخو کی ساکھ بالکل گر گئی۔ اُسے ایک ڈائریکٹر کا چانس ملنا تو دور کی بات تھی۔ کوئی اُسے اپنی فلمسازی کے ادارے میں ملازم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

شیخو ہر وقت سستی شراب کے نشے میں دھت رہتا۔ لوگ اُس سے ملتے ہوئے کتراتے تھے۔ پھر نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہے بس اتنا سمجھتا تھا کہ یہ سب وجے دت کی سازشیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شیخو پھر ایک کامیاب ڈائریکٹر کی حیثیت سے ابھرے اور وجے دت اور شبانہ کے شانہ بشانہ کھڑا ہو سکے۔ اُس کی سازشوں نے اسے بھیک منگا بنا کر رکھ دیا تھا۔ پھر ایک بار چپراسی بننے کی نوبت آ گئی تھی۔

کامیاب ہدایت کار بننے کے بعد اب اپنے زوال کے دور میں چپراسی بننا بڑی توہین کی بات تھی۔ مشکل یہ تھی کہ فلمی دنیا میں رہنے والا کسی اور شعبے میں کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ فلم نگری کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ ہر وقت یہ خیال دماغ میں سمایا رہتا ہے کہ شاید پھر کوئی عمدہ چانس مل جائے۔ پھر کامیابی نصیب ہو جائے اور لوگ دوبارہ اُس کی پوجا کرنے لگیں۔

وہ اور پانچ برس تک فلمی دنیا کی خاک چھانتا رہا۔ پھر بڑھاپے نے کمر توڑ دی۔ آخر اُس نے ایک پبلسٹی ایجنٹ انیل دت کے ہاں ملازمت حاصل کر لی۔ انیل دت کا ایک کاٹیج آبادی سے ذرا دور سمندر کے ساحل پر تھا۔ وہاں اور بھی عیاش دولت مندوں نے اپنے لیے کاٹیج بنا رکھے تھے۔ شیخو کاٹیج کے پچھواڑے ایک جھونپڑی میں رہتا تھا اور انیل دت کی پبلسٹی کے کاغذات سنبھال کر رکھتا تھا۔ وہاں کوئی دوسرا ملازم نہیں تھا۔ کیونکہ دوسرا ملازم رکھنے سے انیل دت کی پرائیویٹ زندگی میں خلل پڑتا تھا۔ اس کاٹیج میں وہ ہر شام پینے کے لیے بیٹھ جاتا تھا اور رات کو مدہوش ہو کر سو جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی جوان لڑکی کو ساتھ لاتا تھا۔ اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ کاٹیج میں بوڑھے شیخو کے سوا کوئی نہ رہا کرے۔

شیخو کو وہاں دو باتیں زیادہ سوچنے پر مجبور کرتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ شاندار گاڑی میں بیٹھا ہوا انیل دت بہترین سوٹوں

میں ملبوس اور نوٹوں سے لدا ہوا ایک جواں سال چھوکرا لگتا تھا۔ بمشکل چھبیس برس کا جوان ہوگا۔ اس کم عمری میں اس نے وہ سب کچھ پالیا تھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! اس کے روشن حال سے روشن تر مستقبل صاف جھلک رہا تھا۔

دوسری بات تیجو یہ سوچتا تھا کہ انیل دت اتنی کم عمری میں اتنی زیادہ شراب کیوں پیتا ہے اور نشہ میں ساری دنیا کو گالیاں دیتے دیتے ہوش سے بیگانہ کیوں ہوجاتا ہے۔ اُسے کیا غم ہے؟ اس نشے کے پیچھے اسے کون غصہ دلاتا ہے؟

ایک رات وہ نشہ میں تھا۔ کوئی لڑکی ساتھ نہ تھی۔ ایسے وقت وہ تیجو کو سامنے بٹھا کر بکواس کرتا تھا۔ تیجو نے موقع پاکر پوچھا: "مالک! آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"چھبیس برس۔"

"آپ فلمی دنیا میں کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"تقریباً پانچ برس سے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بیس برس کی عمر سے ہی عملی زندگی میں داخل ہوئے اور اتنی جلدی اتنی ترقی کرلی؟"

اس نے شراب کا ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا: "ہاں....."

تیجو نے شدید حیرانی سے پوچھا: "آپ کو فلمی دنیا کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود بڑے بڑے فلمساز اپنی کروڑوں روپے کی فلموں کی پبلسٹی آپ سے کراتے ہیں؟"

"بالکل۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ میں خود پبلسٹی کی دردسری مول نہیں لیتا۔ میں زیادہ منافع رکھ کر دوسرے ایجنٹوں کو ٹھیکہ دے دیتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح آپ کامیابی کی بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔"

وہ لاپرواہی سے بولا: "یہ کامیابی کوئی اتنی قابل فخر نہیں ہے۔ میں ایک مہینہ میں صرف چالیس پچاس ہزار روپے کماتا ہوں۔"

"صرف؟" تیجو نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

انیل دت ماہانہ پچاس ہزار روپے کے منافع کے لیے "صرف" کا لفظ استعمال کر رہا تھا اور وہ بھی اس حال میں کہ وہ بہت کم عمر اور فلمی صنعت میں نوآموز تھا۔ جبکہ برسوں فلمی دنیا کی خاک چھاننے کے باوجود تیجو کے دل میں آیا کہ وہ پھر وہی چپراسی کا چپراسی ہی رہا۔

اس لمحہ بوڑھے تیجو کے دل میں ارادے جوان ہوئے کہ وہ پھر ڈائریکٹر بن سکتا ہے۔ آخر اس چھوکرے کی کامیابی کے پیچھے کون سا راز چھپا ہے۔ نہ تو اس کی کھوپڑی میں کوئی افلاطونی دماغ تھا۔ نہ لکھنے کے معاملے میں اس کی املا تک درست تھی۔

نہ ہی اُس کی شخصیت مقناطیسی تھی جیسی کہ وہ بہت زیادہ خوش شکل بھی نہ تھا۔ تیجو نے سوچا: "پھر یہ نوجوان اس قدر کامیاب کیسے ہے؟ کیا تقدیر پھر میرے لیے فلمی دنیا کے دروازے نہیں کھول سکتی؟ آہ میری کیسی ناقدری ہو رہی ہے۔ میں کل کے چھوکرے کا ملازم ہوکر زندگی گزار رہا ہوں۔"

انیل دت نے پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو؟ جب میں پیتا رہتا ہوں تو اس وقت سوچنے والا آدمی مجھے الو نظر آتا ہے۔ کچھ بولتے رہو۔"

تیجو نے پوچھا: "ایک بات پوچھوں؟"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ آپ کو کون سا غم کھائے جا رہا ہے؟"

"مجھے کوئی غم نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ اتنی زیادہ کیوں پیتے ہیں؟"

"یہ میری مرضی ہے۔"

"یہی تو بات ہے آدمی پہلے اپنی مرضی سے شراب پینا شروع کرتا ہے۔ پھر شراب اپنی مرضی سے آدمی کو پیتے پیتے خالی کردیتی ہے۔"

انیل دت نے گلاس کو اٹھاتے ہوئے کہا: "میں بھی پیتے پیتے ایک دن خالی ہوجانا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ کے دل میں یہ خوب صورت زندگی گزارتے رہنے کی خواہش نہیں ہوتی؟"

"خواہش؟" وہ تلخی سے بولا: "میری ایک ہی خواہش ہے اور وہ یہ کہ میں ایک حرام زادے کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔"

"قتل؟" تیجو نے حیرانی سے پوچھا: "آپ کسے قتل کرنا چاہتے ہیں؟"

"اپنے باپ کو۔"

تیجو نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ نشے میں بک رہا ہو۔ بھلا کوئی بیٹا اپنے باپ کو قتل کیوں کرے گا؟ انیل دت نے اُس کے سامنے ہاتھ نچا کر کہا: "اے بڈھے! مجھے نشے میں نہ سمجھنا۔ میں پورے ہوش وحواس میں بھگوان کو گواہ رکھ کر... کہتا ہوں کہ جس دن میرا باپ مجھے ملے گا۔ میں اپنے ہاتھوں سے اسی دن اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

"آپ کا باپ کون ہے؟"

"یہی تو سالا معلوم نہیں ہے۔ پہلے میں وجے دت کو اپنا باپ سمجھتا رہا....."

تیجو ایک دم سے ہڑبڑا کر سیدھا بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس مالک کو دیکھنے لگا جو حقیقتاً اس کا اپنا بیٹا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ اسے بیٹا کہہ کر اس سے لپٹ جائے مگر بیٹے کی

شراب زدہ سرخ انگارہ آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ابھی ابھی وہ گلا گھونٹنے کی بات کر رہا تھا۔

انیل دت کہہ رہا تھا: "ہاں میں اس سالے ویجے دت کو اپنا باپ سمجھتا رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھے اناتھ آشرم سے لایا گیا ہے۔ مجھے زبردست صدمہ ہوا۔ میں غصہ میں آکر گھر سے نکل گیا۔ پھر ایک دن میں نے ویجے دت سے اس اناتھ آشرم کا پتہ پوچھا۔ ویجے دت نے مجھ سے پوچھا: تم اناتھ آشرم کا پتہ پوچھ کر کیا کرو گے؟"

میں نے جواب دیا: "میں اس آشرم کے برسوں پہلے کے رجسٹر کھلوا کر معلوم کروں گا کہ میرے باپ اور ماں کون تھے۔"

ویجے دت نے مجھ سے جھوٹ کہا کہ وہ آشرم بنارس میں ہے۔

میں نے کہا: "میں بنارس جاؤں گا۔ بہرحال میں اپنے اصل ماں باپ تک ضرور پہنچوں گا۔"

میرا یہ عزم دیکھ کر ویجے دت پریشان ہو گیا۔ اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی مگر میں ٹلنے والا نہ تھا۔ آخر اسے سچی بات بتانی پڑی....."

"سچی بات؟" شیخو نے سہم کر تھوک نگلتے ہوئے پوچھا: "اس نے آپ کو کون سی سچی بات بتائی۔ کیا آپ کے باپ کا نام بتا دیا؟"

انیل دت نے میز پر ایک گھونسا مارا، شراب کی بوتل اور گلاس جھنجھنا گئے۔ پھر وہ بولا: "افسوس اس کا نام ویجے دت کو بھی معلوم نہیں ہے۔"

شیخو نے ذرا اطمینان کی سانس لے کر پوچھا: "پھر ویجے دت نے کیا بتایا؟"

"اس نے بتایا کہ وہ اور اس کی بیوی بانجھ تھے۔ ان کے پڑوس میں ایک کنواری لڑکی ماں بننے والی تھی، یعنی وہ میری ماں بن گئی۔ ویجے دت کو اولاد کی ضرورت تھی۔ اس نے میری کنواری ماں کی عزت رکھنے کے لیے مجھے گود لے لیا۔"

شیخو نے ڈرتے ڈرتے کہا: "ہو سکتا ہے ویجے دت نے جھوٹ کہا ہو۔ قصور آپ کے باپ کا نہیں ماں کا ہو۔"

"ماں کی غلطی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس نے مجھے نو ماہ تک پیٹ میں رکھا۔ جس طرح میرا باپ عیاشی کر کے بھاگ گیا، اسی طرح میری ماں بھی مجھے پیدائش سے پہلے مار کر قصہ ختم کر سکتی تھی مگر اس نے میری جان نہیں لی۔ ہاں مجھے اس سے بھی نفرت ہے کہ اس نے مجھے جنم دے کر کہیں چھوڑ دیا۔ اب میں ناجائز کہلاتا ہوں۔"

وہ گلاس اٹھا کر غٹاغٹ پینے لگا۔ شیخو اسے دیکھ کر سوچ رہا تھا: "میرا بیٹا کتنا بڑا آدمی بن گیا ہے۔ اگر یہ مجھے معاف کر دے۔ ابا کہہ کر گلے لگائے تو مجھے بھی یہ مہنگی شراب پینے کو ملنے لگے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی دولت سے میں پھر ایک فلم شروع کر کے ڈائریکٹر بن جاؤں....."

یہ سوچتے ہی اس نے کہا: "بیٹے! ہم میرا مطلب ہے مالک! انسان پہلے غلطی کرتا ہے۔ بعد میں پچھتاتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے والد اپنی غلطی پر بہت زیادہ پچھتا رہے ہوں۔"

"اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے جبکہ میں ناجائز کہلانے لگا ہوں۔"

"کون آپ کو ناجائز کہتا ہے؟"

"ویجے دت کے پاس ایک فاحشہ آتی تھی۔ میں نے اس کی زبان سے اپنے لیے ناجائز والی گالی سنی۔ وہ بڑی منہ پھٹ تھی۔ پتہ نہیں اس نے مجھے کہاں کہاں بدنام کیا ہو گا۔"

شیخو نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "مالک! ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ نشے میں جھومتے ہوئے بولا: "کرو۔"

"آپ کے والد اب بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ اگر کبھی وہ خود آپ کے پاس آکر معافی مانگیں تو آپ....."

"تو میں معافی مانگنے سے پہلے ہی اس کی زبان کھینچ لوں گا۔ کیونکہ اسی زبان سے میری ماں کو گناہ کے لیے اکسایا ہو گا۔ میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گا کیونکہ انھیں میلی آنکھوں سے اس نے میری ماں کو دیکھا ہو گا۔ پھر میں اس کا گلا گھونٹ ڈالوں گا۔"

شیخو اندر ہی اندر کانپ گیا۔ آدمی کو بڑھاپے میں بھی اپنی زندگی سے پیار ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بے موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب انیل دت نشے میں مدہوش ہو گیا تو شیخو بڑی مشکل سے اسے کھینچ کر بستر تک لایا۔ پھر وہاں اسے لٹا کر کوٹھی کے پچھلے حصے میں اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا تھا کہ بیٹے کی دولت اسے مل رہی ہے اور وہ پھر سے ڈائریکٹر بن رہا ہے۔

صبح وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گیا۔ اسے شبانہ کی یاد آئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ شبانہ یا وجے دت نے اگر انیل دت کو یہ بتا دیا کہ وہ اس کا اصلی باپ ہے تو پھر کیا ہو گا؟ انیل دت اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

ایک بات شیخو کے حق میں بہتر تھی اور وہ یہ کہ شبانہ اور ویجے دت اس کاٹیج میں کبھی نہیں آتے تھے اور انیل دت ان لوگوں سے نہیں ملتا تھا لیکن یہ راز معلوم ہو گیا تھا کہ انیل دت کی ترقی اور کامیابی کے پیچھے شبانہ اور ویجے دت کی بھرپور سفارش کام کر رہی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب شیخو نے شبانہ کو بلیک میل کرنا چاہا تھا۔ اب یہ زمانہ آیا تھا کہ شبانہ اسے بلیک میل کر سکتی تھی۔ انیل دت کو بتا سکتی تھی کہ اس کا بدمعاش باپ کون ہے۔ ایک طرح سے

اُس کی زندگی اَب شبانہ اور بیٹے وت کے رحم و کرم پر تھی۔ اُس نے سوچ لیا کہ وہ کبھی دونوں کا سامنا نہیں کرے گا اور نہ ہی یہ معلوم ہونے دے گا کہ وہ اپنے بیٹے کے ہاں ملازم ہے۔

ان دنوں جب کہ وہ شبانہ سے چھپ کر رہنے کے ارادے پر عمل کر رہا تھا، تب ہی اچانک شبانہ کی موت کی خبر ملی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق وہ شام کے وقت سمندر میں تیز رفتاری سے موٹر بوٹ چلا رہی تھی۔ حسبِ معمول وہ کشتیوں کی دوڑ میں چوتھی مرتبہ انعام جیتنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کے ساتھ حادثہ کس طرح پیش آیا۔ کیونکہ چشم دید گواہ کوئی نہ تھا۔

بہر حال بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی کشتی آگے جاتی ہوئی ایک دوسری کشتی سے بُری طرح ٹکرائی۔ دوسری کشتی پر ایک بہت بڑے سیٹھ کا بیٹا کشور ناتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ٹکراؤ کی صورت میں دونوں کشتیاں پانی کی تہہ میں چلی گئیں۔ غوطہ خور رات تمام لاشیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ صبح کشور ناتھ کی لاش خود بخود ساحل پر آ گئی۔ اُس سے اگلے دن سمندر کی موجوں نے شبانہ کی لاش کو بھی ساحل کی طرف اچھال دیا۔

شبانہ کی لاش ناقابلِ شناخت تھی۔ پولیس والے کئی دن تک اُس کی شناخت میں لگے رہے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ لانبے بالوں والی تباہ حال اور شکستہ لاش شبانہ کی ہے۔ اخبارات کے لیے یہ ایک بہت بڑی خبر تھی۔ کیونکہ شبانہ نے فلمی دنیا میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ اتنا طویل عرصہ کہ پچیس برس پہلے وہ شیخو کے پاس چانس لینے کیسے پہنچی تھی۔ یہ بات وقت کے ساتھ ساتھ فراموش کر دی گئی تھی۔ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ نہ ہی پچیس برس پہلے کے لوگوں نے یاد رکھا تھا۔ شبانہ نے پریم کمار سے جو عشق کیا تھا۔ وہ بھی ڈھکا چھپا ہوا تھا۔ شیخو اور پریم کمار سے چرکر لگنے کے بعد اُس نے پھر کسی مرد کو لفٹ نہیں دی۔ کبھی شادی نہیں کی۔ ایسی زندگی گزارتی رہی کہ وہ فلمی دنیا کی پُراسرار حسینہ کہلانے لگی۔

اس پُراسرار حسینہ کی موت کے بعد سوالات اُٹھائے گئے کہ آخر شبانہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اس کا ماضی کیا تھا؟ وہ کس طرح زندگی گزارتی تھی اور اس کی جوانی کس پر مہربان تھی اور کس پر نامہربان؟ اخبارات اور فلمی رسائل والے محض افواہوں اور اندازوں کے مطابق شبانہ کی داستانِ حیات پیش کرنے لگے۔ گزشتہ بیس برس کے ہر معروف اداکار سے لے کر اسٹوڈیوز کے چپراسیوں تک سے شبانہ کا ناتہ جوڑا گیا اور اُس کی زندگی کا اصلی پہلا مرد شیخو دم سادھے خاموش بیٹھا رہا۔ اگر وہ زبان کھولتا اور بات بڑھتی چلی جاتی تو اندیشہ تھا کہ اصل وت اُسے باپ کی حیثیت سے پہچان کر

مار ڈالتا۔

ایک شام اصل وت بہت خوش تھا۔ اُس نے کاٹیج میں آتے ہی شیخو سے کہا: "بابا! بوتل اور گلاس نکالو۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں خوب پیوں گا۔"

"کیا بات ہے مالک! کیا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟"

"ہاں وہ فلم اسٹار شبانہ کی موت مجھے شہرت کی بلندی پر پہنچانے والی ہے۔"

شیخو نے حیرانی سے پوچھا: "وہ کیسے؟"

"ایسے کہ شبانہ فلم 'انگارے' میں کام کر رہی تھی۔ انگارے کا ڈائریکٹر وجے وت ہے اور پروڈیوسر لکشمی نارائن ہے۔ شبانہ نے پچھلے دنوں انگارے کا آخری منظر فلمبند کرایا تھا۔ ایک کروڑ روپے مالیت کی یہ ٹیکنی کلر سپر سینما اسکوپ فلم جس میں شبانہ کے علاوہ تین نامور مشہور معروف ہیروز نے کام کیا ہے اِس وقت لیبارٹری میں جا چکی ہے۔ سارے سیٹ توڑ دیئے گئے ہیں اور ایسے ہی موقع پر شبانہ مر چکی ہے۔"

"تو پھر؟" شیخو نے پوچھا۔

"تو پھر یہ کہ پروڈیوسر لکشمی نارائن کے ایک کروڑ ڈوبنے والے ہیں۔ اگر لکشمی نارائن اس پوزیشن میں ہوتا کہ فوری طور پر فلم کو نمائش کے لیے پیش کر سکتا تو شبانہ کی موت کے باعث یہ فلم خوب رش لیتی کافی منافع حاصل ہوتا لیکن یہ اِس سال کی سب سے زبردست فلم ہے۔ لکشمی نارائن نے دیوالی کے موقع پر اُس کی نمائش کے انتظامات کیے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ رش لینے کے ساتھ اس فلم کو ایوارڈ کے مقابلے کے لیے بھی پیش کیا جا سکے۔"

اُس نے پہلا گلاس پینا شروع کیا پھر کہا: "اب صورتِ حال یہ ہے کہ دیوالی تک شبانہ کو مرے ہوئے چھ ماہ گزر چکے ہوں گے۔ اِس کے متعلق فلم بینوں کا سارا جوش و خروش اور جذباتی وابستگی سرد پڑ چکی ہو گی۔ فلم دیکھنے والوں کے دماغوں سے شبانہ کا نام مٹنے لگے گا پھر بھولی بسری ہستی کے لیے کون دو چار روپے کے ٹکٹ خرید کر فلم دیکھے گا؟ یہ فلم محض شبانہ کی موت کے باعث بُری طرح فلاپ ہونے والی ہے۔"

وہ وہسکی کا دوسرا گلاس بناتے ہوئے بولا: "لکشمی نارائن اب منافع کے متعلق کیا سوچے گا۔ اس نے جو ایک کروڑ روپے لگائے ہیں وہی اُسے واپس مل جائیں تو بڑی بات ہو گی۔ آج کل لکشمی نارائن کو مستقل سر درد کی شکایت ہے اور وہ اسپرین کے کئی ڈبے معدے میں اُتار چکا ہے۔"

"لیکن مالک! یہ معاملہ آپ کو شہرت کی بلندیوں پر کیسے پہنچائے گا؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے دو گھونٹ نگل کر کہا:

بات یہ ہے کہ لکشمی نارائن کے تمام اہم افراد اِس معاملے پر غور و خوض کر کے تھک چکے تھے۔ انھیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک کروڑ روپے یقینی طور پر ڈوبتے نظر آ رہے تھے۔ ٹھیک ایسے مرحلہ پر میں نے اِس معاملے میں مداخلت کی۔ میں نے لکشمی نارائن کے سٹے کو نہ صرف ڈوبنے سے بچانے کا حل پیش کیا ہے بلکہ ریکارڈ توڑ منافع کمانے کا نسخہ بھی اس کے سامنے رکھ دیا ہے۔"

شیخو نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یعنی آپ نے اتنے پیچیدہ مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیا ہے؟"

"بالکل۔ یہ میری ذہانت ہے۔"

"اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟"

"یہ ہے کہ اب میں شبانہ کی موت کو ایک نیا روپ دوں گا۔ وہ زندہ نہیں ہے مگر میں چھ ماہ تک اِس کے تذکرے کو عوام میں زندہ رکھوں گا۔ میں اخبارات اور رسائل میں کچھ اِس طرح بحث شروع کروں گا۔ "کیا شبانہ ابھی زندہ ہے؟" جس طرح اِس ہیروئن کی زندگی پُراسرار رہی ہے وہ پُراسرار حسینہ کہلاتی رہی ہے اسی طرح میں اُس کی موت کو بھی پُراسرار بناؤں گا۔"

"لیکن اس کی لاش کو شناخت کر لیا گیا تھا۔"

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ماتا ہری کی لاش کو بھی شناخت کر لیا گیا تھا اس کے باوجود برسوں تک اُس کے زندہ ہونے کا ڈھنڈورا پٹتا رہا تھا۔"

اُس نے تیسری بار گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ "میں چھ ماہ تک شبانہ کو زندہ رکھوں گا۔ ضروری ہوا تو اس کے نام سے ماہنامہ "پُراسرار شبانہ" شائع کروں گا۔ جگہ جگہ شبانہ کے پرستاروں کے کلب قائم کیے جائیں گے۔ ان کلبوں کی نام نہاد تقریبات اور بیانات کو پریس میں جگہ دلوائی جائے گی۔ ایک زنانہ رسالہ بھی شائع کیا جائے گا۔ اس رسالے کا نام ہوگا..... "شبانہ" اس میں شبانہ کی زندگی کے بارے میں دردناک انکشافات کیے جائیں گے کہ روشنیوں کے دیس کی اس ہنستی مسکراتی شہزادی کے سینے میں درحقیقت کیسے کیسے دکھ کروٹیں لے رہے تھے اور اُس نے ایک باحیا ہندوستانی لڑکی کی طرح کیسے ساری زندگی کنوارے پن میں گزار دی۔"

شیخو نے بے اختیار کہا۔ "وہ کنواری ہرگز نہیں تھی بلکہ اُس نے ایک بیٹے کو....."

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ غلطی کرتے کرتے سنبھل گیا۔ انیل دت نے دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ وہ نشہ میں تھا اور اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا۔ "یقیناً وہ کنواری نہیں ہو سکتی۔ مجھے معلوم ہے وہ چالیس سے اوپر عمر کی تھی لیکن ایسی حسین اور جوان نظر آتی تھی کہ ہندوستان کے کروڑوں تماشائی اس پر مرتے تھے۔ اُس نے جس طرح خود کو حسین اور جوان بنائے رکھا تھا اِس سے ہمیں یہ سہولت حاصل ہوگی کہ ہم اُسے کنواری دوشیزہ بنا کر پیش کر سکیں جیسے دس بچوں کی ماں بھی فلموں میں کنواری ہیروئن بنا کر پیش کی جاتی ہے۔"

اُس نے چوتھی بار وِھسکی کا گلاس بناتے ہوئے کہا۔ "ہمارے لیے یہ بھی بڑی سہولت ہے کہ شبانہ کے متعلق کوئی بھی زیادہ نہیں جانتا ہے۔ ہم اُس کے متعلق جس قسم کی داستان چاہیں تخلیق کر سکتے ہیں۔ ایسے عنوانات سے مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ "شبانہ کا اصل روپ" یا پھر یہ عنوان "شبانہ جسے کوئی نہ جان سکا۔"

شیخو نے سر ہلا کر کہا۔ "واقعی آپ کی منصوبہ بندی ایسی ہے کہ شبانہ مرنے کے بعد بھی برسوں عوام کے درمیان موضوعِ گفتگو بنی رہے گی۔ یعنی آپ اُسے دوبارہ زندہ کر رہے ہیں۔"

شیخو کے دل کو ٹھیس پہنچی کہ شبانہ کو مرنے کے بعد نیک نامی ملے گی۔ وہ کنواری نہ تھی مگر پارسا کہلائے گی۔ وہ فلموں کی ایک ہیروئن تھی مگر اب اُسے ہندوستان کی عظیم عورت سمجھا جائے گا اور یہ سب کچھ ایک بیٹا انجانے میں اپنی ماں کے لیے کر رہا تھا۔

انیل دت نے ایک گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "اخباروں اور رسالوں میں تقریباً ہر ہیروئن کی عشقیہ داستانیں شائع ہوتی ہیں لیکن میں شبانہ کے ماضی کی تحقیقات نہیں کراؤں گا۔ اپنی مرضی سے اُس کا ماضی تخلیق کرواؤں گا۔ میرے کرائے کے لکھنے والے اگر شبانہ کے عشق و محبت کا کوئی قصہ چھیڑیں گے تو وہ ہیر رانجھا اور سسی پنوں سے بڑھ کر افسانوی ہوگا۔ اِس میں الف لیلوی عشق کا سوز، ایثار و قربانی کے انوکھے موڑ، محبت دوستی اور رقابتوں کی عجیب رنگ آمیزی اور پتہ نہیں کیا کیا ہوگا۔"

شیخو نے پوچھا۔ "شبانہ کی زندگی میں آپ اُس کے قریب رہے ہوں گے؟"

"یقیناً۔ اُس کے کتنے ہی کاروباری معاملات میرے ہی ذریعے طے ہوتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں وہ مجھ پر بہت زیادہ مہربان رہتی تھی۔"

"اس کے متعلق آپ کے کیا تاثرات ہیں؟"

"میں کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ جی چاہتا ہے ہر انسان سے نفرت کرتا رہوں۔ اِس دنیا میں سبھی خود غرض ہوتے ہیں۔ ناجائز بچے پیدا کر کے چھوڑ دیتے ہیں پھر پلٹ کر اُن کی خبر نہیں لیتے۔"

اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ ایک گھونٹ پیا۔ پھر کہا۔ "میں اس دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر محبت کر

خیرات کے طور پر دینے کے لیے کہا جائے تو میں وہ خیرات شبانہ کو دوں گا۔ پتہ نہیں کیوں وہ مجھے کچھ اچھی لگتی تھی۔"

"شاید اس لیے کہ مہربان تھی۔ آپ کا زیادہ خیال رکھتی تھی۔"

"ہاں یہی ہو سکتا ہے کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شبانہ کی لاش پر اپنی کامیابیوں کا محل تعمیر نہیں کرنا چاہیے۔ انسان ساری زندگی دنیا کی خباثت اور کمینگی کا سامنا کرتا رہتا ہے کم از کم مرنے کے بعد تو اسے سکون کی ابدی نیند سونے دینا چاہیے۔ مردوں کا کسی حد تک احترام ہونا چاہیے۔"

"پھر کیا خیال ہے ؟"

"خیال یہ ہے کہ ہم زندہ لوگ مردوں کی بھی تجارت کرتے ہیں۔ کیا مزاروں اور سمادھیوں سے ہزاروں لاکھوں روپے کا منافع حاصل نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر میں مردہ شبانہ سے منافع حاصل نہیں کروں گا تو لکشمی نارائن کرمیکر بدلے کوئی دوسرا مل جائے گا۔ میں یہ موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا۔ سیٹھ لکشمی نارائن فلم انگارے کی ریلیز تک شبانہ کو زندہ رکھنے کے لیے بیس لاکھ روپے خرچ کرے گا۔ اس میں سے دس لاکھ روپے کا منافع میں حاصل کروں گا۔"

شیخو نے حسرت سے سوچا۔ "کاش اتنی رقم مجھے مل جاتی۔ میں ایک فلم شروع کر دیتا۔ پھر ایک بار ڈائریکٹر بن جاتا۔ کاش!"

⭘

انیل دت نے اپنے منصوبوں پر عمل کرنا شروع کر دیا جلد ہی خاطر خواہ نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے۔ پہلے پہل خبروں کی رم جھم شروع ہوئی۔ پھر یہ رم جھم موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئی۔ اخباروں اور رسالوں میں خبروں کا سیلاب امنڈ آیا پہلے ہی مہینے میں شبانہ نے ایک زندہ و تابندہ ہستی کی حیثیت حاصل کرنا شروع کی۔ دوسرے ماہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس سے متعلق افسانوی قسم کے تحقیقی مقالوں اور فیچروں کا طوفان برپا ہو گیا۔ اس کی یاد میں بیسیوں رسالوں اور اخباروں نے خصوصی نمبر نکالے۔ جگہ جگہ شبانہ کے پرستاروں کے کلب قائم ہو گئے حتیٰ کہ ٹی وی والوں کی یہ حالت ہوئی کہ وہ شبانہ کی زندگی میں اس پر ریکارڈ کیے گئے پروگراموں کی پرانی پرانی ریلیں نکال کر چلانے پر مجبور ہو گئے۔

سب کچھ بالکل اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح انیل دت نے سوچا تھا۔ ہر طرف شبانہ کے چرچے تھے معلوم ہوتا تھا جیسے ہر شخص شبانہ پر کچھ نہ کچھ لکھ رہا ہے۔ کوئی شبانہ کی سخاوت اور مہربان طبیعت پر مضمون نگاری کر رہا تھا۔ کوئی اس کے ساتھ اپنے نہایت ہی خصوصی قسم کے مراسم کے انکشافات میں مصروف تھا۔ کوئی ریڈیو اور ٹی وی پہ انٹرویو دے رہا تھا کہ اس نے شبانہ کے ساتھ آخری دن کس طرح گزارے۔ کہیں مکاتیب شبانہ چھپ رہے تھے۔ کہیں اس کی عظمت اور انفرادیت پر مذاکرے ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں شبانہ سے زیادہ شریف النفس، ذہین، پاکباز، باصلاحیت، کم عمر، نجیب الطرفین، حسین اور ایثار پسند عورت نہیں گزری جس نے اداکاری کا پیشہ اختیار کر کے بلاشبہ اس فن پر اور فلمی دنیا پر عظیم احسان کیا تھا صرف تین ماہ کے اندر ہر ہندوستانی شبانہ کی زندگی کے ہر افسانوی پہلو سے واقف ہو چکا تھا۔

بلاشبہ شبانہ کی ریکارڈ توڑ پبلسٹی کی گئی تھی۔ توقع سے زیادہ کامیاب نتائج سامنے آ رہے تھے۔ ایسے ہی وقت انیل دت نے ایک اور زبردست دھماکہ کیا۔ اس نے اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ ایک نئی بحث شروع کرائی۔ اس بحث کا عنوان تھا۔ "کیا شبانہ زندہ ہے ؟"

بحث کے اہم نکتے یہ تھے کہ حادثہ ہوتے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ پھر یہ کہ وہ دونوں کشتیاں کہاں غائب ہو گئیں جنہیں حادثہ پیش آیا تھا ؟ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ساحل پر بہہ کر آنے والی کسی لاش کو شبانہ کیوں تسلیم کیا گیا ؟ جب کہ لاش ناقابلِ شناخت تھی۔ صرف وہ لانبے بالوں کی وجہ سے شبانہ نہیں ہو سکتی تھی۔ تمام اخباری مضامین کی تان یہاں آ کر ٹوٹتی تھی کہ آخر ایسا کون سا ٹھوس ثبوت موجود ہے جس کی بنا پر شبانہ کو مردہ تسلیم کر لیا جائے ؟

بڑی ہنگامہ خیز اور قیامت جگانے والی پبلسٹی تھی۔ ان ہنگاموں کے ساتھ ساتھ "انگارے" کی نمائش کا وقت قریب آ رہا تھا۔ "انگارے" وہ فلم جو اس عظیم اور لازوال فنکارہ کے فن کا آخری شہ پارہ تھی۔ آٹھ سال کے بچے سے لے کر اسی سال کے بوڑھوں تک کو "انگارے" کی نمائش والے دن کا اس طرح انتظار تھا جیسے اس دن آسمان سے پھولوں کی بارش ہونے والی ہو۔

⭘

ساحل سمندر کی وہ رات بڑی تاریک تھی۔ چاند ذرا دیر سے طلوع ہونے والا تھا۔ کاٹیج کے اندر برقی روشنی تھی۔ انیل دت فلمساز لکشمی نارائن کے دفتر سے لوٹا تو دیر ہو چکی تھی۔ وہ اندھیرا ہونے کے بعد اپنے ساحلی کاٹیج میں پہنچا تھا۔ اس نے کامیابی کی خوشی میں لکشمی نارائن کے ساتھ تھوڑی سی پی تھی۔ اب کاٹیج میں جشن منانے کا ارادہ تھا۔

اس نے آتے ہی شیخو سے کہا۔ "بوتل اور گلاس نکالو۔

تیجو نے اس کے آگے بوتل اور گلاس رکھتے ہوئے پوچھا۔
"مالک! آج آپ بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔"
وہ بوتل کھول کر پہلا پیگ بناتے ہوئے بولا۔ "میں نے جو عزم کیا تھا اسے عملی طور پر پورا کر دکھایا ہے۔ ہم اگلے ہفتے انگارے کو ملک گیر پیمانے پر ریلیز کر رہے ہیں۔ کیا مجھے ملک گیر پیمانے پر اخباروں میں کوئی پیشگی تبصرہ نہیں ہوا۔ ڈسٹری بیوٹرز یعنی تقسیم کنندگان کو ایک ریل بھی چلا کر نہیں دکھائی گئی۔ اس کے باوجود پتہ ہے کیا عالم ہے؟ ڈسٹری بیوٹرز اور سینما مالکان نوٹوں کی گڈیاں لیے دفتر پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ فلمی دنیا کی تاریخ میں سب سے مہنگے نرخ پر فلم کی بکنگ ہو رہی ہے اور چیکوں کے بجائے سارا لین دین نقد ہو رہا ہے۔ دفتر میں ٹیلکس اور ٹیلیگراموں کے انبار لگ گئے ہیں۔ ٹیلیفون سنتے سنتے لکشمی نارائن کا دماغ جواب دے گیا ہے اور دولت سمیٹ کر رکھنے کے لیے اس کی تجوریاں چھوٹی پڑ گئی ہیں۔"

اس نے پینا شروع کیا پھر کہا۔ "یہ سب کچھ کس کی بدولت ممکن ہوا۔ میری بدولت....." وہ ایک ہاتھ سے اپنے سینے کو ٹھونکنے لگا۔ پھر اس نے ایک حکم دیا۔ "ایک گلاس لاؤ۔"
تیجو نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے ایک گلاس لا کر سامنے رکھا تو انیل دت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں تمہیں بھی پلاؤں گا۔"
اس نے گلاس بھر کر وہسکی تیجو کی طرف بڑھا دی۔ تیجو نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے گلاس کو اٹھا لیا۔ کوئی پانچ چھ سال بعد شراب نصیب ہو رہی تھی۔ وہ بھی بیٹے کے ہاتھ سے..... وہ گلاس کو منہ لگا کر ایک ہی سانس میں پینے لگا۔

انیل دت نے دوسرا گلاس شروع کرتے ہوئے کہا۔ "فلم انڈسٹری کے تمام بڑے بڑے لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ انقلاب میں نے برپا کیا ہے۔ سب جانتے ہیں میرے انمول ذہن کو لوٹنے کے لیے بڑے بڑے فلمسازوں کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی ہے۔ لکشمی نارائن نے دولت کی اس بارش میں سے ایک لاکھ روپے میرے لیے انعام کے طور پر رکھے ہیں۔ اس نے فوری طور پر میرے ساتھ پانچ سال کا معاہدہ کر لیا ہے۔ کوئی جوہری اپنے ہاتھ سے ہیرے کو گنوانا پسند نہیں کرتا اور یہ سب کچھ میرا حق ہے۔ اس مہم کے لیے میں نے خون پسینہ ایک کیا ہے۔ ایسے مرحلوں پر کوئی میری راہ کی رکاوٹ بننا چاہتا تو میں اسے قتل کر دیتا....."
"قتل؟" تیجو کا سر تھوڑا چکرانے لگا کیونکہ بڑی مدت
کے بعد اس نے پی تھی اور ایک ہی سانس میں پی تھی۔ شراب نے بوڑھے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ وہ بوکھلا کر بولا۔ "قتل؟ نہیں نہیں میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔ مجھے قتل نہ کرنا۔ میں بے گناہ بے ضرر بوڑھا ہوں۔"
انیل دت نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "بڈھے کو ایک ہی گلاس میں چڑھ گئی۔ سالا میری شراب پی کر اپنے کو میرا باپ سمجھ رہا ہے۔ ابے میں نے کب تجھے باپ سمجھا ہے ابے؟"
اس نے دوسرا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "سالے باپ بن جانا کون سی بڑی بات ہے۔ میں تمہیں پھر سے ڈائریکٹر بنا سکتا ہوں مگر تمہاری زندگی میں نہیں۔ کیونکہ زندگی میں ایک انسان دوسرے انسان کو کوئی مقام دینا نہیں چاہتا۔ شبانہ زندہ ہوتی تو آج دنیا والے اسے سر آنکھوں پر نہ بٹھاتے۔ اسے محض ایک اداکارہ سمجھ کر نظروں سے گرا دیتے۔ وہ مرنے کے بعد بھلا دی جاتی مگر میں نے اسے لافانی بنا دیا ہے۔ اس نے بھی مر کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو مجھے زبردست نقصان پہنچتا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو....."
اس کی بات پوری ہوتے ہی کاٹیج کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ سمندر سے چلنے والی تیز ہواؤں کا جھونکا اندر آیا۔ دونوں نے سر گھما کر دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ ہوا کی زد پر اڑنے والی چادر کو سنبھال رہی تھی۔ دونوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا۔ پھر بیک زبان کہا۔ "شبانہ!"
مگر وہ تو مر چکی تھی۔ انیل دت نے سنبھل کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"
اس نے دروازے کو اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں وہی ہوں جسے تم نے لافانی بنا دیا ہے۔ مجھے زبردست بھوک لگ رہی ہے۔"
وہ کن انکھیوں سے تیجو کو دیکھ رہی تھی اور اس خیال سے تیجو کا دم نکل رہا تھا کہ شبانہ کہیں رشتہ ظاہر نہ کر دے۔ شبانہ سوچ رہی تھی کہ باپ بیٹے ایک جگہ کیسے آ گئے؟ اور یہ تیجو نوکر کی طرح فرش پر کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ کیا دونوں ایک دوسرے کو باپ بیٹے کی حیثیت سے نہیں پہچانتے ہیں؟
انیل دت حیران اور پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "تم اب تک کہاں چھپی ہوئی تھیں؟"
"میں بمبئی سے ذرا دور گورئی گاؤں کے ایک کاٹیج میں کچھ عرصہ سکون سے گزار رہی تھی۔ کیا مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گے؟"
"ہاں ہاں بیٹھو مگر وہ حادثہ؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی: "حادثہ یوں ہوا کہ میری کشتی اس دوسری کشتی سے ٹکرا گئی تھی جس میں وہ احمق کشور ناتھ سوار تھا اور بغیر لائٹ کے ہی کشتی لیے چلا آ رہا تھا۔ وہ کشتی پر تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ لانبے بالوں والی ایک لڑکی بھی تھی جو اس کی بیوی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ کوئی بازاری لڑکی تھی۔ کشور ناتھ نے اپنی شام رنگین بنانے کے لیے اُسے ساتھ لے لیا ہو گا۔ کشتیوں کے اس تصادم میں کشور کے ساتھ درحقیقت وہی لڑکی ہلاک ہوئی ہو گی۔ ہو گی کیا یقیناً وہی ہلاک ہوئی تھی۔ بعد میں اُسے میری لاش سمجھ لیا گیا۔ کیونکہ لاش کئی دن بعد ملی تھی اور اس کی حالت خراب تھی۔"

"اور تمھارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"میں یہی بتانے لگی ہوں۔ ٹکر ہوئی تو میرے ہوش و حواس بھی جواب دے گئے۔ بہرحال مجھ میں اتنی سکت ضرور تھی کہ میں کشتی سے چمٹی رہی۔"

"لیکن کشتی تو ڈوب گئی تھی۔"

"نہیں میری کشتی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ ڈوبی نہیں تھی۔ ڈگمگاتی ہوئی میلوں دور ایک ویران ساحل پر پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے میں گورے گاؤں چلی گئی۔"

"تم بمبئی واپس کیوں نہیں آئیں؟"

"گورے گاؤں میں میرا ایک کاٹیج ہے۔ میں نے سوچا کچھ روز شہر کے ہنگاموں سے دور رہوں گی۔ پھر تیسرے روز میں نے اخبار میں اپنی موت کی خبر پڑھی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ایک لانبے بالوں والی لڑکی کی لاش کو مجھ سے منسوب کیا جا رہا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا سنسنی خیز لگا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ چپ چاپ گورے گاؤں میں بیٹھ کر تماشہ دیکھوں گی کہ میرے مرنے کے بعد دنیا والے میرا کیا تماشہ بناتے ہیں۔ ویسے تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔"

"تم کس رشتے سے فخر کرو گی؟"

"ایں؟" انیل دت کے سوال پر شبانہ گھبرا گئی۔ اس نے شیخو کو دیکھا۔ شیخو اُسے رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ رشتہ نہ بتائے۔ وہ بولی: "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

انیل دت نے کہا: "تم بہت زیادہ پینے کی عادی ہو۔ بتاؤ کھانے سے پہلے کون سی شراب پیو گی؟"

"شراب ملتی ہے۔" شبانہ کے سامنے وھسکی کی بوتل رکھی ہوئی تھی مگر اُس نے کہا: "نہیں کبھی انسانوں کے درمیان پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ میں تمھارے سامنے کبھی نہیں پیوں گی۔"

"کیوں نہیں پیو گی۔ ہمارے درمیان پاکیزگی کیوں ہونا چاہیے۔"

"اس لیے کہ میری عمر اتنی زیادہ اور تمھاری عمر اتنی کم ہے کہ عمر کے فاصلے کے حساب سے ہم ماں بیٹے بن سکتے ہیں۔ مجھے صرف کچھ کھلا دو۔"

شیخو نے فرش پر سے اُٹھتے ہوئے پوچھا: "مالک! کیا میں کچن سے کھانا لے آؤں؟"

"ہاں لے آؤ۔"

وہ جانے لگا۔ شبانہ نے کہا: "میں بھی کچن میں چلوں گی وہیں کھا لوں گی۔"

انیل دت نے کہا: "ٹھیک ہے جاؤ۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ میں کچھ سوچنا سمجھنا چاہتا ہوں۔"

شبانہ شیخو کے ساتھ کچن میں آ گئی۔ وہاں اُس نے پوچھا۔ "کیا تم انیل کے ملازم ہو؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میرا بیٹا ہے لیکن میں نے آج تک رشتہ ظاہر نہیں کیا۔ تم بھی نہ کرنا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اُسے اپنے ناجائز ہونے کا زبردست صدمہ ہے۔ وہ ہمیں قتل کرنے کے لیے ہماری تلاش میں ہے کیونکہ ہم اس کی ناجائز پیدائش کے ذمہ دار ہیں۔"

"میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں تو تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔"

"انیل یقین نہیں کرے گا۔ وہ ہم دونوں کو گناہگار اور قابلِ گردن زدنی کہتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے ہمارا گلا گھونٹنا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہی چاہتا ہے۔ ہماری سزا یہی ہو سکتی ہے۔ تم یقیناً مرنے سے ڈرتے ہو۔ اسی لیے بیٹے کے قدموں میں ملازم کی طرح جی رہے ہو۔"

"ہاں زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی؟"

وہ بولی: "میں بیٹے کے ہاتھوں سزا پانے کے لیے تیار ہوں۔ جاؤ انیل کو جا کر بتا دو کہ میں اس کی گناہگار ماں ہوں۔"

کچھ ڈائجسٹوں میں چھپنے والے ترجموں کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ مترجم اس زبان سے ترجمہ کر رہے ہیں، جسے وہ پڑھ نہیں سکتے اور اس زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں جسے وہ لکھ نہیں سکتے۔

---

"تنخواہ اس مخصوص رقم کو کہتے ہیں جو چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، لوگ اس سے زیادہ خرچ کر دیتے ہیں۔"

"نن نہیں۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"
"لیکن میں بتاؤں گی کہ تم اُس کے بدمعاش باپ ہو۔"
"خدا کے لیے ایسا سنگین مذاق نہ کرو۔ ان ہانڈیوں میں سے اپنی پسند کا کھانا نکال کر کھا لو۔"
"شیخو! ایک وقت تم مجھے بلیک میل کر رہے تھے۔ آج میری باری ہے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کا ملازم بن کر رہے۔"
"میں ملازمت نہیں کروں گا۔ یہاں سے چلا جاؤں گا۔"
"یکا یک چھوڑ میں اپنے بیٹے پر تمہارا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم اپنے مفاد کی خاطر کسی دن انیل کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔"
"نہیں میں کبھی ایسی ذلیل حرکت نہیں کروں گا۔"
"تم بلیک میلنگ کی ذلیل حرکت کر چکے ہو۔ میں تم پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ میں پچیس برس سے دُور رہی دُور رہ کر اس کی ترقی کے ذرائع پیدا کر رہی ہوں۔ اُس کا تحفظ کر رہی ہوں۔ تمہارے جیسے آستین کے سانپ کو یہاں رہنے نہیں دوں گی یا تو تم یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ۔ یا بیٹے کے ہاتھوں سے مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔"
"نہیں میں چلا جاتا ہوں۔ انیل سے کچھ نہ کہنا۔ میں جا رہا ہوں۔"
یہ کہتا ہوا وہ کچن سے باہر چلا گیا۔ شبانہ ایک پلیٹ اٹھا کر ہانڈیوں سے اپنی پسند کا کھانا نکالنے لگی۔ شیخو نے سوچ لیا تھا کہ اسی وقت کاٹج کے پیچھے اپنی جھونپڑی میں جائے گا اور اپنا ضروری سامان ایک گٹھڑی میں باندھ کر پچھلے راستے سے چپ چاپ چلا جائے گا۔ انیل کو خبر بھی نہ ہو گی۔
لیکن کچن سے نکل کر اپنی جھونپڑی کی طرف جانے کیلئے اُسے اس کمرے سے ہو کر جانا پڑا۔ جہاں انیل وت بیٹھا پی رہا تھا اور صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ اُس نے شیخو کو جھونپڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر ہاتھ میں بوتل اٹھا کر وہ بھی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔
شیخو کی جھونپڑی میں مدھم سا بلب روشن تھا۔ وہ اندر آکر فوراً ہی اِدھر اُدھر سے اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ اُسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو جان نکل گئی۔ دروازے پر انیل وت ہاتھ میں بوتل لیے کھڑا تھا۔
اُس نے جھونپڑی کے اندر آکر بوتل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو۔ اس بوتل کی ساری شراب پی جاؤ۔"
وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا "نہیں مالک! میں زیادہ نہیں پیتا۔"
"میرا حکم ہے۔ اِسے پی جاؤ۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ صورتِ حال سے کیسے نمٹنا چاہیے۔"
یہ کہہ کر اُس نے زبردستی شیخو کے ہاتھوں میں بوتل تھما دی پھر ڈانٹ کر بولا۔ "دیر نہ کرو۔ پیتے چلے جاؤ۔"
وہ بوتل کو منہ سے لگا کر پینے لگا۔ انیل وت دیدے پھیلائے وحشیانہ انداز میں باچھیں پھیلا کر مسکراتے ہوئے اسے پیتے دیکھ رہا تھا۔ دس منٹ میں بوتل خالی ہو گئی۔ شیخو نے خالی بوتل کو چارپائی پر اچھال دیا۔ اَب وہ اطمینان کی سانس لینا چاہتا تھا اسی وقت انیل وت نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن دبوچ لی۔
شیخو تڑپ کر آزاد ہونا چاہتا تھا مگر وہ بوڑھا تھا اور انیل وت قد آور جوان تھا۔ گردن پر اس کی گرفت بھی جوان تھی۔ وہ دانت پیستے ہوئے بول رہا تھا "بڈھے! میں قاتل نہیں ہوں۔ میں صرف اپنے باپ کو مارنا چاہتا تھا مگر تو بدنصیب ہے کہ تیری گردن میرے ہاتھوں میں آ گئی۔"
شیخو کے دیدے پھیل گئے۔ آخری لمحوں میں وہ پھیلے ہوئے دیدے پوچھ رہے تھے کہ جب باپ کا رشتہ ظاہر نہیں ہوا تو پھر گلا کیوں گھونٹا جا رہا ہے مگر وہ کوئی جواب پانے سے پہلے ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کا جسم جھونپڑی کی دیوار سے لگ کر فرش کی طرف گرنے لگا۔ انیل وت نے اسے فرش پر چھوڑ کر کہا۔ "پہلے میں شبانہ کو یہاں سے رخصت کر دوں پھر میں تمہاری لاش کو ٹھکانے لگاؤں گا۔"
اُس نے باہر آکر جھونپڑی کے دروازے کو بند کر دیا پھر اپنے کاٹج میں آیا۔ اسی وقت شبانہ کھانے سے فارغ ہو کر اس کمرے میں آئی۔ انیل وت کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ایک ہفتہ بعد فلم انگارے ریلیز ہونے والی ہے۔ میں نے سوچا اِس فلم کے پریس شو میں مجھے حاضر ہونا چاہیے یا نہیں؟ تم نے بڑی محنتوں سے مجھے زندہ رکھا ہے۔ آج تک مرنے کے بعد کسی کو ایسی زندگی نہیں ملی جیسی تم نے مجھے دی ہے۔ میں تم سے پوچھنے آئی ہوں کہ مجھے اب دنیا والوں کے سامنے آنا چاہیے یا نہیں؟"
اُس نے آگے بڑھ کر شبانہ کے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ باہر چل کر باتیں کریں۔ یہاں اندر شراب کی گرمی اور گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے۔"
شبانہ نے اُس کے ساتھ کاٹج سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔ "وہ بوڑھا ملازم کہاں ہے؟"
"وہ جھونپڑی میں اپنا سامان باندھ رہا ہے۔ میں نے اُسے ہمیشہ کے لیے چھٹی دیدی ہے۔"
"یہ تم نے اچھا کیا۔ اُس بوڑھے خبیث ڈائریکٹر کو میں برسوں

سے جانتی ہوں۔ وہ مجھی تمھیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے خود اُسے ڈانٹ کر کہا تھا کہ وہ تمھارے کاٹیج سے چلا جائے۔"

"تم میری بھلائی کیوں چاہتی ہو؟ میں نے دیکھا ہے شروع سے تم مجھ پر مہربان ہو۔ آخر مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟"

"تم بہت پیارے پیارے سے بچے ہو۔ وجے دت نے مجھے بتایا تھا کہ تم خطرناک ارادوں سے اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ انتقام کا جذبہ بُرا ہوتا ہے بیٹے!"

"مجھے بیٹا نہ کہو۔ مجھے اس رشتے سے نفرت ہے۔"

وہ چپ ہو کر سوچنے لگی۔ رات کی تاریکی چھٹ گئی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ وہ دونوں چاندنی میں راستہ دیکھتے ہوئے ایک اونچی ساحلی چٹان پر پہنچ گئے۔ چٹان کے آخری سرے پر گہری پستی میں سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔

شبانہ نے کہا: "تمھاری ماں جو کوئی بھی ہوگی۔ اُس نے بڑے درد سے تمھیں پیدا کیا ہوگا اور اب وہ جہاں بھی ہوگی تمھارے لیے تڑپ رہی ہوگی۔ یہ سوچ سوچ کر مر رہی ہوگی کہ تمھارے لیے ایسا کرے کہ تم بہت ہی عظیم اور نیک نام بن جاؤ۔ انیل دنیا کی کوئی ماں ممتا کے عذاب سے نجات نہیں پاتی۔ آخری سانس تک اپنی اولاد کے لیے سوچتی اور مرتی رہتی ہے۔"

"تم ممتا کو کیا جانو۔ تم نے تو کبھی شادی بھی نہیں کی۔ پتہ نہیں تم کیا ہو مگر میں نے تمھیں اس دیس کی عظیم کنواری دوشیزہ بنا دیا۔ میں نے یہ بحث شروع کی تھی: کیا شبانہ زندہ ہے؟ اس پر پولیس والوں کی طرف سے دھمکیاں ملنے لگیں کہ میں گڑے مردے نہ اکھاڑوں۔ کیونکہ پولیس والے بدنام ہوتے تھے۔ ناچار میں نے اسی بات پر زور دیا کہ تم مردہ ہو اور اب اگر زندہ ہو جاؤ گی تو میں ساری دنیا کے سامنے جھوٹا پڑ جاؤں گا۔"

وہ بولی: "میرا خیال ہے فلم ریلیز ہونے سے پہلے میں منظر عام پر آؤں گی تو وہ فلم اور زیادہ سپر ہٹ ہوگی۔"

"تمھارا خیال غلط ہے۔ ہم ایشیائی باشندے مردہ پرست ہیں۔ ہم انسان کو نہیں پتھر کو پوجتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے مندروں میں پتھر کی مورتیاں ہوتی ہیں۔ مسلمان مزاروں پر جا کر ہزاروں روپے کی چادریں چڑھاتے ہیں۔ مہاکوی کالیداس اور غالب کو مرنے کے بعد پوجا گیا۔ رام کو زندگی میں بن باس کی سزا دی گئی۔ مرنے کے بعد اسی رام کو بھگوان کا اوتار مان لیا گیا۔ اگر تم یہ سوچتی ہو کہ دنیا والے تمھاری زندگی کو خوش آمدید کہیں گے تو یہ تمھاری بھول ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے چٹان کے سرے پر پہنچ گیا۔ شبانہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر بولی: "تم اتنے کنارے کیوں آ گئے ہو؟ یہاں خطرہ ہے۔ اُدھر چلو۔"

لیکن وہ اپنی دھن میں بولتا رہا: "جب تم دنیا والوں کے سامنے آؤ گی تو پہلے بڑی حیرانی کا اظہار کیا جائے گا۔ پھر تمھیں ایسے دیکھا جائے گا جیسے تم دھوکے باز ہو کیونکہ تم نے چھ ماہ تک روپوش رہ کر دنیا کو دھوکا دیا ہے۔ اُن کے جذبات سے کھیلتی رہی ہو اور میں جاسوسی ایجنٹ کی حیثیت سے تمھارا نام اچھالتا رہوں۔ لوگ مجھے بھی جھوٹا اور فریبی کہیں گے۔ لہٰذا تمھیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر اُس نے شبانہ کے دونوں شانوں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ وہ چپ رہی۔ اس کے ارادوں کو سمجھتے ہوئے بھی اپنی سلامتی کے لیے جدوجہد نہیں کی۔ نیچے سمندر کی گہری خطرناک لہریں جوار بھاٹا کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ وہ اسے اور سختی سے جکڑ کر بولا۔ "میں نے تمھاری خیالی موت کے بعد تمھیں لافانی بنا دیا ہے۔ اب تمھیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ وہ بڑھا تمھاری زندگی کا چشم دید گواہ تھا۔ میں نے اُسے بھی مار ڈالا ہے۔"

"میرے بچے! میں تو تم سے یہی پوچھنے آئی تھی کہ مجھے دنیا والوں کے سامنے آنا چاہیے یا روپوش رہنا چاہیے۔ میں تمھارے منصوبوں پر پانی نہیں پھیرنا چاہتی۔ اب تم چاہتے ہو کہ مجھے ہمیشہ کے لیے مر جانا چاہیے تو یہی سہی۔ میرا بیٹا جس حال میں خوش رہے۔۔۔"

"مجھے بیٹا نہ کہو۔" یہ کہتے ہی اُس نے زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی چٹان کے سرے پر گئی۔ وہاں سے پستی میں چلی گئی۔ انیل دت نے آگے بڑھ کر ذرا جھک کر دیکھا۔ وہ اوپری چٹان پر سے گرنے کے بعد بھی سنبھل گئی تھی۔ نیچے دوسری چٹان کے سہارے لٹک گئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ چٹان کے سرے پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ نیچے بھیانک لہریں گرج گرج کر اُسے نگلنے آ رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر بیٹے کو اوپری چٹان پر دیکھا۔ پھر کہا: "بیٹے! میں اب بھی اس چٹان پر چڑھ کر زندہ رہ سکتی ہوں مگر بہت ہو چکا۔ اب ممتا کا عذاب سہا نہیں جاتا۔ اپنے بیٹے کی اس بہت بڑی کامیابی پر ماں اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرتی ہے۔ جیتے رہو میرے لعل۔۔۔"

یہ کہتے ہی اس نے چٹان پر سے ہاتھوں کی گرفت ڈھیل کر دی۔ دوسرے ہی لمحہ سمندر کی بپھرتی ہوئی لہروں نے ایک ماں کو ممتا کے عذاب سے نجات دلا دی۔

اس بارے میں ان دنوں نواب کا قلم کہتا ہے کہ ہم
جا بجا اپنے حالات خود ہی پیدا کرتے ہیں۔ پھر حالات
کے غلام بن جاتے ہیں۔ اور دنیا کے سامنے تقدیر کا شکوہ
کرتے ہیں۔ اپنی مجبوری اور بے بسی پر روتے ہیں
دوسروں کا سہارا مانگتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھنا نہیں
چاہتے کہ جو کچھ ہوا اس کی تحریک ہم سے چلی تھی۔

جب یہ اعتراف ہو کہ ہم اپنے پیدا کردہ حالات سے
گزرتے ہیں تب یہ آگہی ملتی ہے کہ ہم سب قدرت
کے آگے بے بس نہیں ہیں۔ ہم محبت میں جذبوں کی روانی
میں اور انتہائے شوق میں کچھ بھی سوچے بغیر کچھ کر
گزرتے ہیں۔ اور نادانستگی میں آنے والے وقت کو دعوت
دیتے ہیں کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص
انجام کے ساتھ آئے۔

بے شک تقدیر بھی اپنے داؤ پیچ دکھاتی ہے لیکن کامیاب
و کامران ہونے والوں کی زندگی کے حالات گواہ ہیں
کہ جو لوگ اپنے ہر عمل سے پہلے انجام سے باخبر رہے تقدیر ان پر
اپنے داؤ پیچ آزمانے کے بجائے ان کے لیے پھولوں کا ہار بنتی رہی
زیر نظر کہانی کے کسی کردار کو پھولوں کا ہار نہ مل سکا۔
اسے پڑھنے کے بعد آپ کچھ دیر تنہائی میں بیٹھ کر غور
کریں کہ آپ خود انتہائے شوق میں کیا کرتے رہے
ہیں۔ ہر عمل کے مخصوص نتائج کا پہلے سے اندازہ کرنا کچھ
زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس کہانی پر نواب کو داد دینے کا
معقول طریقہ یہ ہوگا کہ آپ اپنے اعمال کے مطابق
آئندہ مخصوص حالات کا اندازہ کریں۔ ایک قلم کار
اپنی تحریر کے ذریعے جو سمجھانا چاہتا ہے اسے آپ بخوبی سمجھ
کر عمل کریں تو یہی قلم کاری کا سب سے بڑا
کارنامہ ہوتا ہے۔

یہ کہانی نصف ماخوذ اور نصف طبع زاد ہے۔

محی الدین نواب

**پریتی بالا** یوں تو کچھ زیادہ حسین نہیں تھی مگر نشہ کی طرح آہستہ آہستہ دل و دماغ کو متاثر کرتی تھی۔ پہلی ملاقات میں اپنی شخصیت کا "پرشیس لفظ" چھوڑ جاتی تھی۔ بعد میں تحریک پیدا ہوتی تھی کہ پوری کتاب پڑھنا چاہیے۔

وہ وکالت کر رہی تھی۔ ایک مقدمے کے دوران اس سے ایک ایسی غلطی ہو گئی جس سے قانون کے احترام کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ شاید اس سے وکالت کے حقوق چھین لیے جاتے لیکن... کلکتہ بار کی ایک بہت ہی اہم اور معزز شخصیت سنجے مکرجی نے اس کی طرف سے وکالت کی اور یہ ثابت کر دیا کہ پریتی بالا نے اپنے موکل کی مدافعت میں دانستہ قانون کی ملامت نہیں کی تھی۔ وہ ایک جذباتی اور بے اختیاری بات تھی جو زبان سے نکل گئی تھی جس کے لیے پریتی بالا معافی کی طلبگار ہے۔

پریتی بالا کی غلطی معاف کر دی گئی تھی۔ اس کیس کے دوران سنجے مکرجی نے اس سے مختصر سی ملاقات کی تھی۔ پریتی بالا کو اوپر سے پرشیس لفظ کی طرح پڑھا تھا۔ بعد میں شام کو وہ اپنی عادت کے مطابق وسکی کی بوتل کھول کر بیٹھا تو وہ یاد آنے لگی۔

اسے تعجب ہوا کہ پہلے اس میں یاد آنے والی خوبیاں نظر کیوں نہ آئیں۔ وہ کسی بات پر بڑی کنجوسی سے مسکراتی تھی جیسے یونہی مسکراہٹ کی جھلک دے رہی ہو۔ لبِ حسن کی وہ سخاوت جیسے کسی خلا کو پُر کر رہی تھی۔ وہ بہت دھیمے سُروں میں بولتی تھی۔ اب وہ سُر دل کے تاروں کو چھیڑ رہے تھے۔ دو پیگ کے بعد یاد آیا کہ وہ حسین ہی نہیں پُرشباب بھی تھی اور اس کا شباب بڑا ہی ٹھیس پہنچانے والا تھا۔ سیاسی حلقوں میں سنجے مکرجی بہت اونچی شخصیت کا مالک تھا۔ آئندہ انتخاب میں حصہ لینے والا تھا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ایک عام آدمی کی طرح عاشق بن کر پریتی بالا سے دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔

ان دنوں پریتی بالا کی وکالت برائے نام چل رہی تھی۔ اس کے پاس ایسے غریب موکل آتے تھے جو منہ مانگی فیس ادا نہیں کر سکتے تھے۔ کبھی سوناگاچی کی طوائفیں اپنے کسی کیس میں اس کے پاس ضمانت کے لیے آتی تھیں۔ کبھی کوئی خون خرابے والا کیس آتا تھا لیکن پولیس والے اوپر ہی اوپر فریقین سے اچھی خاصی رقم لے کر اس کیس کو عدالت تک پہنچنے سے پہلے ہی دبا دیتے تھے۔ پریتی کی ہونے والی آمدنی ایک جھٹکے سے ختم ہو جاتی تھی۔ وہ حیرانی سے سوچتی تھی کہ دوسرے وکلا کو وہ دولت مند موکل کیسے مل جاتے ہیں جو مقدمے میں بھی سمجھتے نہیں کہ انہیں اپنا مقدمہ عدالت میں لڑتے ہیں اور اپنے وکلا کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بنے رہتے ہیں۔

پریتی بالا کی یہ حیرانی رفتہ رفتہ دور ہونے لگی۔ اس کے پاس اچانک ہی جانے کیسے دولت مند موکل آنے لگے۔ وہ خوش لباس ہوتے تھے اور کاروں میں آتے تھے۔ ان کے پاس بڑی بڑی جائدادیں اور بڑی بڑی کمپنیوں کے شیئرز کے معاملات تصفیہ طلب ہوتے تھے اور وہ اپنے معاملات کو نمٹانے کے لیے پریتی کو منہ مانگا معاوضہ دیتے تھے۔

وہ اپنے دولت مند موکلوں سے کبھی کبھی دریافت کرتی تھی "آپ نے میرا نام کہاں سنا تھا؟ آپ کو میرا پتہ کیسے معلوم ہوا؟ آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ میں آپ کا کام حسن و خوبی انجام دے سکوں گی؟"

اس کے موکل جواب دیتے تھے۔ کوئی کہتا "میں نے آپ کے متعلق پڑھا تھا۔" کوئی سوچنے کے انداز میں بولتا "میں نے کسی تقریب میں آپ کا ذکر سنا تھا۔" آخر ایک موکل کی زبان سے سچی بات نکل گئی۔ وہ روانی میں کہہ گیا "مجھے آپ کے پاس آنے کا مشورہ سنجے صاحب نے دیا ہے۔"

"سنجے صاحب؟" پریتی نے شدید حیرانی سے پوچھا "کیا سنجے مکرجی صاحب؟"

اس موکل نے ہچکچاتے ہوئے کہا "جی۔ جی ہاں۔ مگر انھوں نے کہا تھا کہ میں آپ کے سامنے ان کا ذکر نہ کروں۔ آپ اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔"

بات ختم کیسے ہوتی؟ ابھی تو ابتدا ہوئی تھی۔ پریتی کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنا دولت مند اتنی اونچی سیاسی شخصیت کا مالک اس پر احسانات کیوں کر رہا ہے؟ چپ چاپ اس کی آمدنی میں اضافہ کیوں کرتا جا رہا ہے؟ اگر یہ مہربانی اس لیے ہے کہ وہ جوان دوشیزہ ہے تو اس نے پھر کبھی ملاقات نہیں کی، کبھی بہانے... رابطہ قائم نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ خود کو چھپا رہا تھا۔ کبھی موکل کی زبان سے بھی اپنی مہربانیوں کا بھید نہیں کھولنا چاہتا تھا۔

مکرجی صاحب کے اسی انداز نے بے حد متاثر کیا۔ اب پریتی کا فرض تھا کہ ان کا شکریہ ادا کرتی۔ وہ سوچنے لگی کس طرح شکریہ ادا کرے۔ اتنے مصروف آدمی سے شاید فون پر ہی دو چار باتیں ہو سکتی تھیں۔ وہ شکریے کے لیے دو چار فقرے تراشنے لگی۔ دل ہی دل میں ان فقروں کو ادا کرنے کی ریہرسل کرنے لگی۔ وہ اپنے موکلوں کی حمایت میں جج صاحبان کے آگے بے تکان بولتی تھی۔ کبھی کسی کے عہدے اور شخصیت سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ سنجے مکرجی سے فون پر گفتگو کرتے وقت خود کو بہت چھوٹا بہت کمتر محسوس کر رہی تھی۔

اچھی طرح ریہرسل کرنے کے بعد اس نے سنجے مکرجی کے نمبر پر فون کیا۔ دوسری طرف سے اس کے سیکرٹری نے جواب دیا "مکرجی صاحب تین دن کے لیے یورپ کے دورے پر گئے ہیں۔"

جانے کیوں پریتی کو ایسا لگا جیسے سنجے کے چلے جانے سے وہ

پھر ہار گئی ہے۔ یہ عجیب سا احساس تھا۔ جبکہ سنجے سے کوئی تعلق نہ تھا۔
اُس نے تین ماہ تک بڑی ہی بے صبری سے انتظار کیا جس طرح گلے میں ہچکی اٹک جاتی ہے اُسی طرح شکریہ کے بول اٹکے ہوئے تھے۔ انتظار کی مدت ختم ہونے کے بعد اُس نے پھر فون کیا۔ جواب ملا "مکرجی صاحب جنوبی امریکہ میں ہیں۔ اگلے ماہ تک واپس آئیں گے۔"

اِس بار اُس نے مایوس ہو کر سوچا "آخر ایسی بے صبری بھی کیا؟ اب میں اُسے فون نہیں کروں گی۔ کبھی اخبارات کے ذریعہ پتہ چلے گا کہ وہ شہر میں موجود ہیں تو پھر دیکھا جائے گا۔"

یہ فیصلہ کرنے کے باوجود وہ سنجے کو نہ بھلا سکی۔ اُسے پتہ چلا کہ وہ چار ماہ سے شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنے من مندر میں اُس کے نام کی مالا جپ رہی ہے۔ یعنی شکریہ کے رسمی تکلف سے آگے نکل گئی ہے۔ اُس نے اپنے دل کو سمجھایا "یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کیا میں اتنے بڑے آدمی کی دلہن بننے کے خواب دیکھ رہی ہوں؟ نہیں۔ وہ یقیناً شادی شدہ ہوں گے اور اُن کے کئی بچے ہوں گے۔"

اُس کے دل نے ضد کی "اگر بیوی بچے ہوتے تو کبھی نہ کبھی اخبارات میں اُن کا ذکر ہوتا۔"

اُس نے پھر دل کو سمجھایا "سیاست میں حصّہ لینے والے اپنے گھریلو معاملات کو اخبارات تک پہنچنے نہیں دیتے۔ مکرجی صاحب نے بھی یہی کیا ہوگا۔ نہیں، میرا دماغ چل گیا ہے۔ مکرجی صاحب نے ایک مہربانی کی ہے تو میں پاگل سپنے دیکھنے لگی ہوں۔ بس اب ایک بار رسمی طور پر شکریہ ادا کر کے سب کچھ بھول جانا چاہیے۔"

مگر وہ شکریہ ادا ہونے نہیں پا رہا تھا۔ سنجے مکرجی یورپ اور امریکہ سے واپس آ کر مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور مدراس کا دورہ کر رہا تھا۔ یعنی جتنے عرصہ تک دورہ کر رہا تھا، اتنا ہی اُس کے دل میں گھستا جا رہا تھا۔ انہی دنوں پریتی ایک قتل کے مقدمہ میں مصروف ہو گئی۔ اِس مقدمہ نے پریتی بالا کا نام اخبارات کے پہلے صفحہ پر شہ سرخیوں کے ساتھ پہنچا دیا۔

قتل کی واردات جیل خانے کے اندر ہوئی تھی۔ ایک قیدی نے دوسرے قیدی کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ قیدی جو قاتل تھا۔ وہ اب پریتی کا مؤکل تھا۔ اُسے بے گناہ ثابت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ سرکاری وکیل اُسے پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ پریتی نے نہایت ذہانت سے یہ ثابت کیا کہ قاتل قیدی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جیل کے ریکارڈ نے بتایا کہ اُس سے شریف اور معزز لوگ ملنے آتے تھے۔ جبکہ مقتول قیدی سے غنڈے اور بدمعاش صرف ملنے ہی نہیں آتے تھے بلکہ اُس کے لیے چرس وغیرہ بھی لاتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں نے مقتول کے پاس وہ چاقو پہنچایا تھا۔ لڑائی جھگڑے کے دوران وہ چاقو پریتی کے مؤکل کے ہاتھ لگ گیا۔ اُس نے اپنی حفاظت کی خاطر مقتول کو زخمی کیا۔ قتل کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ وہ زخمی ہسپتال پہنچائے جانے تک مر گیا تھا۔

مجبوری قاتل ہو گئی کہ پریتی کا مؤکل جیل کی سلاخوں کے پیچھے مجبور تھا۔ اُس نے اپنی حفاظت کی خاطر اپنے مقابل کو بلکہ حملہ آور کو محض زخمی کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ بہرحال اُس نے اپنے مؤکل کو سزائے موت سے بچا لیا۔ اخبارات نے پریتی بالا کے اِس کارنامے کا بڑا چرچا کیا اور پریتی کو اس کا انعام یہ ملا کہ اُسی شام سنجے مکرجی نے اُسے فون پر مخاطب کیا "ہیلو میں نے سوچا کہ اتنی زبردست کامیابی پر تمھیں مبارک باد دے دوں۔"

پریتی کے دل کی دھڑکنیں یک بارگی تیز ہو گئیں۔ اُسے یقین کی حد تک شبہ ہوا کہ وہ سنجے مکرجی کی آواز ہے۔ کیونکہ وہ اُس آواز کو چھ ماہ سے اپنے اندر گونجتی سنتی آ رہی تھی۔ اُس کی خاموشی پر دوسری طرف سے سنجے نے کہا "میں بھی عجیب ہوں۔ پہلے مجھے اپنا نام بتانا چاہیے تھا۔ میرا نام....."

وہ بے اختیار بول پڑی "میں جانتی ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ پریشان ہو گئی کہ اُس نے ایسا کیوں کہا؟ کیا ایسا کہنے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ چھپا رہا اور وہ ... جاننے پہچاننے کی حد تک سوچ کی نگری میں اُسے تلاش کرتی رہی۔ یہ ٹھیک ہے کہ عورت کسی کو بھی جان سے چاہے۔ مگر یہ بھید نہ کھولے کہ چاہت میں اُس نے پہل کی ہے۔

سنجے نے کہا "میں اخبارات میں پوری تفصیل پڑھتا رہا ہوں۔ جس انداز سے تم اِس مقدمہ کو ہینڈل کر رہی تھیں، اُس سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ جیت تمہارا مقدر بنے گی۔"

"شکریہ۔ یہ سب آپ کی ہمت افزائی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ آگے کیا کہے، سمجھ میں نہ آیا۔ یوں دیکھا جائے تو بات ختم ہو چکی تھی۔ اُس نے مبارکباد دی تھی، اُس نے شکریہ ادا کیا تھا۔ اِس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا۔ کیا وہ ریسیور رکھ دے گا؟ کیا اور کچھ کہنے کے لیے اُس کے دل میں کوئی بات نہ ہوگی؟

پھر اُس نے اپنے دل کی بات کہہ دی "کیا تم کبھی میرے ساتھ رات کا کھانا پسند کرو گی؟"

پریتی نے گھڑی دیکھی۔ چھ بجے تھے۔ دو گھنٹے بعد رات کے کھانے کا وقت شروع ہو جاتا۔ کیا دو گھنٹے بعد وہ اُس کے سامنے بیٹھی ہو گی۔ اُس نے کہا "جی۔ جی ہاں۔ یہ آپ کی عزت افزائی ہوگی۔"

"تم بہت ہی تکلفانہ الفاظ استعمال کر رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈنر کے وقت ہم بڑے چھوٹے نہ ہوں۔ تو بی ویری فرینک ... میں دوستانہ ماحول چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے؟"

"وہ کچھ کہہ کر رہ گئی۔ سنجے نے پوچھا: "ڈنر کے لیے ہفتہ کی بات کیسی رہے گی؟"

اس کی آدھی سانس اوپر رہ گئی۔ ہفتہ میں... ابھی دو دن باقی تھے۔ یہ دو دن کیسے گزریں گے؟ وہ آہستگی سے بولی: "ٹھیک ہے۔"

"کیا میں تمہارے گھر سے تمہیں لے چلوں؟"

اس نے سوچا۔ نیلا چھوٹا سا کاٹیج ایسا نہیں ہے کہ سنجے جیسا بڑا آدمی وہاں آئے۔ مجھے شرمندگی محسوس ہوگی۔

وہ جلدی سے بولی: "آپ کو زحمت ہوگی۔ مجھے جگہ بتا دیں۔ میں پہنچ جاؤں گی۔"

"کیا تم کس ریسٹورانٹ کا کھانا پسند کرو گی؟"

"وہاں کا کھانا چکھنے کے بعد ہی پسند کر سکتی ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا: "ٹھیک آٹھ بجے۔"

"میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ پریتی اپنے ریسیور کے ساتھ یوں گم صم بیٹھی رہی جیسے سنجے کا ہاتھ تھامے کہیں دور پہنچ گئی ہو۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی: "یہ سنجے کے ساتھ محض دلچسپی ہے۔ وہ یقیناً بیوی والا ہوگا اور اس کے کم از کم دو تین بچے بھی ہوں گے۔"

اس کے معاون کرم چند نے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا: "ماسٹر اتادفی کے سلسلے میں کیا خیال ہے؟"

پریتی نے خیالات سے چونک کر ریسیور... کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر کہا: "کرم چند! ایک شخص کے متعلق تحقیقات کرو۔ اس کا نام سنجے مکرجی ہے۔"

اس نے کہا: "اس کے متعلق بھلا کیا معلوم کرنا ہے۔ آپ اخبارات پڑھ لیا کریں۔ ساری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔"

"تم کیا جانتے ہو؟"

"میری معلومات کے مطابق وہ خاندانی رئیس ہے۔ فولاد کے ایک کارخانہ کا مالک ہے۔ بہت بڑا وکیل اور سیاست داں ہے۔ اس نے بنگال لاء اسکول قائم کیا ہے۔"

پریتی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا: "اور کیا جانتے ہو؟"

"اور یہ کہ آئندہ بھارتی سینیٹ کے لیے امیدوار ہوگا۔ سیاسی حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ اسے حکمراں پارٹی کی حمایت حاصل ہے۔"

پریتی نے دل میں کہا۔ یقیناً وہ حکمراں پارٹی اور عوام میں یکساں مقبول ہے۔ بھگوان سے میری پرارتھنا ہے اسے کامیابی ہوگی۔

پھر اس نے کرم چند سے اپنے دل کی بات پوچھی: "اس کی ذاتی یعنی گھریلو زندگی کیسی ہے؟"

"کسی کی گھریلو زندگی میں جھانکنا ذرا مشکل ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی ایک بیوی ہے۔ بچے نہیں ہیں۔"

پریتی کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے چہرے سے ڈوبنے کا صدمہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کرم چند نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

"آں۔ کچھ نہیں۔ بس تم جاؤ۔"

کرم چند کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ کیا سنجے نے محض رسماً کھانے کی دعوت دی ہے؟ وہ مجھے مبارکباد دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے فون پر یہ رسم ادا کر دی۔ پھر دعوت کا مقصد کیا ہے؟ کیا مل بیٹھنے کا بہانہ ہے؟"

وہ بڑے اضطراب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ "میں نے کبھی ملتے انھیں ایک ہی بار دیکھا ہے اب دوسری بار دیکھوں گی کیا وہ مجھے بتائیں گے کہ ان کی شادی ہو چکی ہے؟ ان کا فرض ہے کہ وہ مجھے بتائیں لیکن اکثر مرد کسی جوان لڑکی کے سامنے اپنی بیوی کا ذکر آنے نہیں دیتے۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے ہفتہ کی رات وعدہ کے مطابق ملاقات کرنا ہے اور یہ ملاقات آخری ہوگی۔"

ہفتہ کا دن بہت دور لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ملاقات کی شام سو سال بعد آنے والی ہو۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ کسی مقدمہ پر توجہ دینا چاہتی تو سنجے سامنے آکر بیٹھ جاتا اور وہ ساری دنیا کو بھول جاتی۔ اس کی حالت بڑی مضحکہ خیز تھی۔ یہ دیوانگی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ایک ہی بار اسے دیکھا تھا اور بار بار اسے ذہن سے نکالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی اس دیوانگی کا تجزیہ کیا پہلے یہ بات سمجھ میں آئی کہ سنجے مکرجی نے ایک بار اسے قانون کی نظروں سے گرنے سے بچایا تھا اس لیے وہ احسان مند ہے۔ پھر سنجے اس کے پاس دولت مند مؤکل بھیج رہا تھا۔ بڑے مقدمات دلا رہا تھا۔ بڑی خاموشی سے اس کے کام آ رہا تھا۔ اس لیے وہ بے حد شاکر ہو گئی تھی لیکن احسان مند ہونا اور بات ہے شاکر ہونا اور بات ہے اور اس کے دل میں کچھ اور ہو رہا تھا جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ ایسے جذبے انگڑائی لے رہے تھے۔ جو پہلے کہیں خوابیدہ تھے۔ اس نے کبھی کسی کی ذات میں کشش محسوس نہیں کی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں وہی ایک مرد تھا جو اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

آخر ہفتہ کی وہ طلسماتی رات آگئی۔ وہ صبح سے گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ ایک کپ چائے پی کر شاپنگ کے لیے گھر سے نکل گئی تھی۔ اپنے سنگار کے لیے کچھ خریدنے کا ارادہ تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا خریدے؟ اور کس انداز سے سنگار کرے؟ وہ دوپہر سے پہلے گھر واپس آگئی۔ ڈر تھا کہ دھوپ میں گھومنے سے اس کی گوری رنگت جل جائے گی۔ سہ پہر سے تک وہ سنجے سے خیالی گفتگو میں مصروف رہی اور اچھے اچھے فقرے

یاد کرتی رہی۔ پھر اُس نے باتھ ٹب میں صابن کا جھاگ بنایا اُس میں روز اور جیسمین کی خوشبو ملائی۔ پھر اُس جھاگ میں گردن تک ڈوب کر بیٹھ گئی۔

ایک گھنٹہ بعد جب وہ غسل خانے سے باہر آئی تو اُس کے بدن سے مدہوش کر دینے والی خوشبو انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اُس نے بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہننے کے بعد دو آئینوں کے درمیان بیٹھ کر کنول کی صورت میں بالوں کا بڑا سا جوڑا باندھا۔ پھر ہلکے گلابی رنگ کی سنہرے بارڈر والی ساڑی پہنی اور ایسے عمدہ سلیقے سے پہنی کہ خوبصورت بدن اپنے پیچ و خم کے ساتھ نمایاں ہو گیا۔ جوڑے میں اُس نے سفید پھولوں کی وینی سجائی۔ سفید امیٹیشن پھولوں کی بڑی بڑی بالیاں کانوں میں پہنیں۔ گلے میں ہار، ہاتھوں میں کنگن اور چوڑیاں، ہونٹوں پہ لالی، آنکھوں میں کاجل اور ماتھے پر سونے کی بندیا لگائی۔ آگے پیچھے دونوں آئینے اُس کے جلووں سے بھر گئے تھے۔ اُس کے ہار سنگار سے جگمگا رہے تھے۔ اُسے اپنے حسن کی چکا چوند سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کو کہاں کہاں سے دیکھے؟ جہاں جہاں سے بھی دیکھے تشنگی رہ جائے گی اور حسن کی تعریف اسی میں ہے کہ دیکھنے والی آنکھوں کی پیاس کبھی نہ بجھے۔

وہ ٹھیک آٹھ بجے کمل ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ حالانکہ حسن کی شان یہ ہوتی ہے کہ وقت کی پابندی نہ کرے۔ تھوڑا انتظار کرائے، تھوڑا تڑپائے۔ پھر دیدار کرائے مگر وہ دل سے مجبور تھی۔ اُدھر سنجے مکرجی سے بھی نہ رہا گیا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اُس کے سامنے میز پر واٹر کا ایک بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی اخلاقاً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پریتی نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ پھر وہ میز کے اطراف ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

سنجے مکرجی نے کہا۔ "میں کھانے سے پہلے پینے کا عادی ہوں۔ اس لیے آدھ گھنٹہ پہلے آگیا۔ اگر میرا پینا ناگوار گزرے تو تم اعتراض کر سکتی ہو۔"

وہ آہستگی سے بولی۔ "مجھے اعتراض نہیں ہے۔"

"شکریہ۔ میں سمجھ رہا تھا، تم قانون کے خشک ماحول میں رہتی ہو لہٰذا خشک مزاج ہو گی لیکن تمہارا لباس اور تمہارا سنگار دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہاری تعریف کیسے کروں؟"

وہ نظریں جھکا کر مسکرانے لگی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بہت کم بولے گی اور اُسے زیادہ بولنے کا موقع دیتی رہے گی۔ کیونکہ زیادہ بولنے والے روانی میں چھپانے والی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔ وہ بڑی مزے دار باتیں کرتا تھا۔ پریتی بے اختیار مسکرانے لگتی تھی۔ اُس نے ایک دو بار ایسے لطیفے سنائے تھے کہ وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی تھی۔ میز پر کھانا لگنے تک اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ ان کے درمیان ذرا بھی اجنبیت نہیں رہی تھی اور وہ سنجے مکرجی کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے ہنس بول رہی تھی۔

لیکن ایک بات کھٹک رہی تھی۔ سنجے برابر لگاوٹ کی باتیں کر رہا تھا لیکن یہ بات چھپا رہا تھا کہ اُس کی شادی ہو چکی ہے۔ مرد بڑے مکار ہوتے ہیں۔ ہر نئی لڑکی کے سامنے کنوارے بنتے پھرتے ہیں۔ سنجے کی ہر بات اچھی لگ رہی تھی۔ اُس کی شخصیت تو حواس پہ چھا گئی تھی لیکن اپنی بیوی کو راز بنا کر دھوکا دینے والی بات ایسی تھی کہ پریتی کا دل ٹوٹ رہا تھا۔ اُس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ بس یہ آخری ملاقات ہے۔

کھانے کے دوران سنجے نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو؟ معلوم ہوتا ہے سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی ہو۔"

وہ ذرا مسکرا کر بولی۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ آپ نے اتنے احسانات مجھ پر کیوں کیے؟ آپ کی سفارش سے بڑے بڑے دولتمند مؤکل میرے پاس آنے لگے ہیں۔"

"میں چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس کوٹھی ہو، کار ہو، بہت سارا بینک بیلنس ہو۔ تمہارا مقام اتنا بلند ہو کہ لوگ تمہیں سر اٹھا کر دیکھیں تو اُن کی گردن دکھنے لگے۔ میں تمہارے لیے اور بہت کچھ کر سکتا ہوں مگر ایک مجبوری ہے......"

پریتی سمجھ گئی کہ اب وہ اپنی بیوی والی مجبوری بیان کرے گا۔ اُس لمحہ اچانک یہ خواہش پیدا ہوئی کہ...... وہ بیوی کی بات نہ چھیڑے۔ اگر چھیڑے گا تو پھر ایک بیوی والے سے مل بیٹھنا معیوب ہو جائے گا۔ ہر بات ہر چند ہر غلط ہو جائے گا۔ وہ ملاقات ناجائز ہو گی۔ ابھی وہ دھوکا دے رہا تھا اور وہ دھوکا کھا رہی تھی تو یہ اچھا ہی تھا۔ بعض حالات میں ایسے تعلقات بہت اچھے لگتے ہیں۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "پریتی! میں تمہیں بتا دوں کہ میری شادی ہو چکی ہے۔"

وہ چپ رہی۔ اُس کے چہرے سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اُسے دکھ پہنچا ہے اور وہ تذبذب میں ہے۔ وہ ایسے مردوں سے نفرت کرتی تھی جو بیویاں رکھ کر دوسری عورتوں سے دوستی کرتے ہیں۔ وہ ایسی لڑکیوں کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتی تھی جو اچھی خاصی عمر والے شادی شدہ مردوں سے دوستی کرتی تھیں۔ اب یہ آپ پر بیت رہی تھی۔ سنجے مکرجی کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ کسی حال میں اُس سے نفرت نہیں کر سکتی تھی اور اُس کے پاس بیٹھ کر خود کو نظروں سے گرا نہیں سکتی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تم سے نہیں ملنا چاہیے مگر میں تم سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پچھلے چھ ماہ کے دوران تم نے کئی بار فون کیا۔ میں نے کئی بار عہد کیا کہ تمہارے فون کال کا جواب نہیں دوں گا۔ تم اتنی سندر ہو کہ تم سے ڈر لگتا تھا۔ میں پہلے سے سمجھتا

رہا ہوں کہ ایک بار تمہارے پاس آکر وقت بتانا ممکن نہیں ہے۔"

وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ سنجے کا ایک ایک لفظ درست لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ خود پاس آکر دور بھاگنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ بات کا رُخ پھیرتے ہوئے بولی: "آپ اپنی دھرم پتنی کے بارے میں کچھ بتاتے نہیں؟"

"اُس کا نام نرملا ہے۔ ہماری شادی کو پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ بہت کم عمری میں شادی ہوئی تھی۔ اب تک کوئی اولاد نہ ہو سکی۔ شاید وہ بانجھ ہے۔"

"اولاد کی خواہش ہوتی تو ہوگی؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا: "اولاد کی خواہش کسے نہیں ہوتی؟ میرے بعد میرا نام لینے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔"

"نرملا دیوی بھی یہی چاہتی ہوں گی۔"

"ایک بانجھ عورت کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ ایک آدھ بار کہہ چکی ہے کہ میں اُسے طلاق دے کر اولاد کے لیے دوسری شادی کر لوں۔"

پریتی کو اندر سے اطمینان ہوا۔ سنجے مکرجی کی جیون ساتھی بننے کی تھوڑی سی گنجائش نکل آئی تھی۔ لیکن یہ اُسے اچھا نہ لگا کہ اس کے کارن ایک بیاہتا عورت کو طلاق ہو جائے۔ یہ نرملا پر ظلم ہوگا۔ وہ بولی: "آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کی کمی محسوس کروں گی لیکن آئندہ کبھی نہیں ملوں گی۔"

"میں بھی نہیں چاہتا کہ کبھی میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔ میں تمہاری صلاحیتوں سے متاثر ہوں۔ تمہیں بامِ عروج پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ پریتی! تمہیں میری ضرورت ہے۔ ہم روز نہیں ملیں گے مگر کبھی کبھی تو ہمیں ملنا چاہیے۔ کبھی کبھی ٹھیک رہے گا نا؟"

وہ دل میں بولی: "نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ زبان سے بول پڑی: "ٹھیک ہے۔"

✡

پہلے پریتی کے دن گزر جاتے تھے۔ اب گزارنے سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے وہی یاد آتا تھا۔ اُسے بھلانے کے لیے اُس نے اپنی ساری قوتِ ارادی صرف کر ڈالی۔ بھلانے کے دوران اکثر یہ ہوتا تھا کہ کبھی کوئی بولتا تھا تو سنجے کا لہجہ یاد آنے لگتا تھا۔ وہ کسی اجنبی کو جاتے دیکھ کر پیچھے سے سنجے کا گمان ہوتا تھا۔ کبھی ریڈیو یا اخبارات میں کوئی لیڈر تقریر کے دوران چیخ کر کہتا کہ شراب پر پابندی ہونا چاہیے تو پریتی دل ہی دل میں اُس لیڈر کی مخالفت کرتی۔ کیونکہ اُس کا سنجے شراب پیتا تھا۔

دو ہفتے بعد اچانک سنجے نے فون کیا: "ہیلو پریتی! کیا آج تمہیں فرصت ہے؟"

وہ ایک مقدمہ میں اُلجھی ہوئی تھی۔ بہت مصروف تھی مگر اُس نے کہہ دیا: "فرصت ہے۔"

اس رات اُنھوں نے ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران وہ قانون اور سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ دُنیا کو پیش آنے والے مسائل کا حل پیش کرتے رہے۔ جبکہ اندر سے اپنا ہی مسئلہ حل طلب تھا۔ وہ بظاہر رومانی گفتگو سے پرہیز کرتے رہے لیکن ابھی اتنا ہی رومانس کافی تھا کہ وہ مل رہے تھے۔

جب وہ گھر واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ بستر پر گر کر چاروں شانے چت ہو کر بڑی دیر تک چھت کو گھورتی رہی۔ اُس کی صورت دیکھتی رہی۔ اُس کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو کیسٹ کی طرح ریوائنڈ کر کے اُس کی گفتگو کے ایک ایک لفظ کو دوبارہ سنتی رہی۔ آپ ہی آپ مسکراتی رہی اور شرماتی رہی۔ یہ بھولتی رہی کہ اُس سے محبت نہیں کرنا ہے صرف دوستی کرنا ہے۔ یہ بھولتی رہی کہ دوست کو یاد تو کیا جاتا ہے مگر اُس کی یاد سے شرمایا نہیں جاتا۔

ایک ہفتہ بعد دریائے ہگلی کے ساحل پر اُن کی ملاقات ہوئی۔ وہاں کشتیوں پر ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ وہ ہگلی کی لہروں پر بہتے ہوئے کھاتے رہے اور خوب دل کھول کر باتیں کرتے رہے۔ اس بار اُن کی باتوں میں رومانس کی چاشنی پیدا ہو گئی تھی۔

پھر ایک ہفتہ بعد سنجے نے فون کیا۔ پریتی نے سمجھا، پھر ملاقات کی گھڑیاں نصیب ہونے والی ہیں لیکن اُس نے کہا: "پریتی! میں کچھ دنوں کے لیے یورپ جا رہا ہوں۔ تمہارا شہر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا مگر جانا ہے۔ بہت ضروری ہے۔"

وہ بولی: "آپ کو ضرور جانا چاہیے۔ میں آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔"

"میں جلد از جلد اپنی پریتی کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ خوشی سے لرز گئی۔ سنجے نے پہلی بار اُسے "اپنی پریتی" کہا تھا۔ اتنی سی مٹھاس جدائی کے دن گزارنے کے لیے کافی تھی لیکن اُس کے جانے کے بعد پریتی نے محسوس کیا کہ وہ اُس کے لیے بہت فکرمند ہے۔ وہ بیویوں جیسے انداز میں سوچتی تھی کہ پتہ نہیں وہ جہاں گیا ہے وہاں اُس کے کھانے پینے اور سونے کا معقول انتظام ہوگا یا نہیں؟ سنا ہے یورپ میں شراب اور شباب دونوں بہتے ہیں۔ کیا وہ شراب کے ساتھ؟ وہ سوچتے سوچتے اُن تمام لڑکیوں سے حسد کرنے اور جلنے لگتی تھی، جو تصور میں بھی سنجے کے قریب پائی جاتی تھیں۔

وہ خیال ہی خیال میں بڑبڑانے لگتی تھی: "تم کب آؤ گے؟ کیا طوطا ہو، دوسرے پر گئے ہو؟ کیا تم غیر ملکی لڑکیوں کی زبان سمجھ لیتے ہو؟ کیا تم نرملا کو اپنے ساتھ لے گئے ہو؟ کیا میں باؤلی ہو

گئی ہوں؟"

اس کے معاون کرم چند نے اُس کے دفتری کمرے میں قدم رکھتے ہوئے پوچھا: "پریتی جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ اپنے ہی آپ کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔"

پریتی نے دل ہی دل میں کہا: "ہاں میں درد میں ہوں، دوا چاہیے، ٹھنڈے پانی کا غسل چاہیے۔ مجھے سنجے چاہیے......"

وہ کرم چند سے بولی: "میں ٹھیک ہوں، ذرا تھک گئی ہوں، تم جاؤ۔"

اُس دن سے پریتی نے خود کو بہت زیادہ مصروف رکھنا شروع کر دیا۔ وہ اب روزانہ کچہری جانے لگی۔ ایک ہی مقدمہ کی فائل پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے کے لیے اُس مقدمہ پر مختلف پہلوؤں سے دماغ سوزی کرنے لگی۔ اگر وہ ایک لمحہ کو بھی ڈھیل دیتی تو وہ لمحہ سنجے کی یاد کو پکڑ کر لے آتا۔

کتنے ہی لمحے، کتنے ہی دن اُسے قتل کرتے ہوئے گزر گئے۔ پھر ایک دن اچانک فون پر اُس کی آواز سنائی دی: "میں آ گیا ہوں۔"

سنجے کی آواز سنتے ہی جیسے اُس کے اندر زلزلہ سا آ گیا۔ ایک دم سے پرواز کر کے اُس کے بازوؤں میں پہنچنے کے لیے مچل گئی۔ حالانکہ دونوں نے ابھی تک ایک دوسرے کو چھو کر نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ تصور میں دیکھتی تھی۔ اُس کے بازوؤں کی سختی میں اپنے بدن کو دبتا ہوا محسوس کرتی تھی۔ خوشی سے سہم کر سوچتی تھی کہ جانے وہ کیسا ہوگا؟ وہ سوچتی تھی۔ پھر آپ ہی شرما کر منہ چھپا لیتی تھی۔

پھر ایک ریسٹورنٹ میں اُن کی ملاقات ہوئی۔ پتہ نہیں کیوں وہ ہر ملاقات میں پہلے سے زیادہ اپنا لگتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اُسے اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ پریتی نے نہیں پوچھا کہ وہ اُسے کہاں لے جا رہا ہے؟ وہ تو اُس کے سامنے جیسے سحر زدہ سی ہو جاتی تھی۔ دل ہی دل میں اُس سے پوچھتی تھی "میرے جادوگر! کب تک عمل پڑھتے رہو گے؟ مجھے کہیں لے جا کر مار کیوں نہیں ڈالتے؟"

رات کے گیارہ بجے اُس نے پریتی کے کاٹیج کے سامنے کار لا کر روک دی۔ پھر انجن کو بند کرتے ہوئے کہا: "آج میں تمھارے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے پیوں گا۔ بشرطیکہ تم مجھے اپنے گھر میں آنے کی اجازت دو۔"

وہ مسکرا کر بولی: "یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ آجائیے۔"

وہ دونوں کار سے اُتر کر کاٹیج کے دروازے تک آئے۔ پریتی نے اپنے پرس سے چابی نکال کر دروازے کو کھولا۔ اندر تاریکی تھی۔ پریتی نے کہا: "میں ایک کمرے کی لائٹ آن کر کے یہاں سے گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے بجلی گئی ہے۔"

اُس نے اندر آ کر دروازے کے پاس والے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک سوئچ کو آن آف کیا۔ واقعی بجلی نہیں تھی۔ سنجے نے اندر آ کر پوچھا: "گھر میں موم بتی ہوگی؟"

وہ تاریکی میں تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے، صرف آوازیں سن سکتے تھے۔ وہ بولی: "موم بتی میری خواب گاہ میں ہے۔"

بولتے وقت اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ یہ احساس حاوی تھا کہ اندھیرے میں وہ بالکل سامنے کھڑا ہے۔ اُس نے پوچھا: "کیا تم اندھیرے میں اپنی خواب گاہ تک جا سکتی ہو؟"

"ہاں۔ مگر ڈر لگتا ہے۔"

"میں تمھارے ساتھ ہوں۔ آؤ۔"

اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ بدن سے کہیں لگ گیا۔ ایک دم سے بجلی دوڑ گئی۔ یہاں سے وہاں تک دنیا روشن ہو گئی۔ عجیب روشنی تھی کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور اپنے سنجے کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اندھیرے میں بڑھتے رہے اور رکتے رہے۔ بولتے رہے اور بولنے والے لبوں کو گپ چپ کرتے رہے۔ خواب گاہ میں پہنچنے کے بعد موم بتی نہیں ملی۔ یاد نہیں آیا کہ اُس نے کہاں رکھ دی تھی۔ خوب سازش تھی کہ صبح تک بجلی بھی نہیں آئی۔

وہ صبح اُن کے لیے قیامت بن گئی۔ کیونکہ اب وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونا چاہتے تھے لیکن انھوں نے تو جدائی سہنے والی محبت کی تھی۔ انھیں نہ چاہنے کے باوجود الگ ہونا تھا۔ وہ جسے محبت کہتے تھے اُسے تہذیب گناہ کہتی تھی۔ ایسی محبت صرف نادان نہیں کرتے، اُن کے جیسے باشعور بھی کرتے ہیں۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا: "تم نے ایسی مسرتیں دی ہیں کہ مجھے پہلی بار عورت اور اُس کی محبت سمجھ میں آ رہی ہے۔"

وہ شرما گئی۔ نظریں جھکا کر بولی: "عورت تو آپ کے گھر میں بھی ہے۔"

"ہاں۔ آج مجھے پتہ چلا ہے کہ میں نرملا سے صرف فرض نباہتا آیا ہوں۔ میری جان! ہم تعلیم یافتہ ہیں۔ اپنے جذبات و احساسات کو لفظوں میں بیان کر سکتے ہیں۔ تم بتاؤ کہ تمھارے احساسات کیا ہیں؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی: "میرے اندر ایسی مسرتیں بھری ہوئی ہیں کہ انھیں بیان کرتے کرتے الفاظ کے خزانے خالی ہو جائیں گے۔ بھگوان سے میری ایک ہی خواہش ہے کہ یہ وقت جو مجھے مل رہا ہے وہ ملتا رہے۔ آپ کو پانے کا یہ سلسلہ میری موت کے ساتھ ختم ہو۔"

وہ پیار بھری باتوں سے سرشار ہو کر پھر ایک دوسرے کو پانے کا یقین کرنے لگے۔ اُن کے درمیان وقت آندھی ہوا کی طرح گزرتا گیا۔ پھر سنجے نے کھڑکی کے باہر صبح کی پہلی جھلک دیکھ کر کہا: "مجھے فوراً یہاں سے جانا چاہیے۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ کسی نے پہچان لیا تو ہمارا یہ ملاپ اخبارات تک پہنچ جائے گا۔"

پریتی کے دل سے ایک آہ نکلی: "آہ! کیسے مرکے آگے تن من ہار

بیٹھی ہوں۔ اُس کی شخصیت شیشے کی طرح نازک ہے۔ اُس کے ساتھ میرا نام آتے ہی یہ چُور چُور ہو جائے گا۔"

سنجے نے جُھک کر اُسے تھپکتے ہوئے کہا: "تم اُداس ہو گئیں نہیں میری جان! ہمارے ملتے رہنے کی ایک تدبیر میرے ذہن میں ہے۔"

"کیا تدبیر ہے؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم ابھی دس بجے تک تیار ہو کر کمل ریسٹورنٹ پہنچو۔ ہم وہاں سے ایک بنگلہ کرائے پر حاصل کرنے کے لیے نکلیں گے ایسا بنگلہ جس میں موٹر گیراج ہوگا وہاں میں اپنی کار چھپا دیا کروں گا تم وہاں رہو گی۔ میں رات کو آیا کروں گا اور صبح چلا جایا کروں گا۔"

"اور تمھاری دھرم پتنی نرملا دیوی؟"

"میں نے اُسے دو ماہ کے لیے دہلی بھیج دیا ہے۔ وہ وہاں اپنے رشتے داروں کے ہاں رہے گی۔ میں رفتہ رفتہ اُسے قائل کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ جلد ہی طلاق لے لے گی۔"

پریتی کا سر جُھک گیا۔ ایک سوال پیدا ہو گیا سنجے اُس کی خاطر نرملا کو طلاق دے گا؟

ایک جواب ملا: نہیں۔ وہ اولاد کے لیے ایسا کرے گا اگر میں اُس کی زندگی میں نہ رہوں۔ تب بھی وہ اولاد کے لیے کسی نہ کسی سے شادی ضرور کرے گا۔ نرملا کی بدنصیبی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

پریتی نے اپنے ضمیر کو سمجھا لیا اور اِس دُنیا میں کون اپنے ضمیر کو اُلّو نہیں بناتا؟

○

دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ، ڈائننگ روم کا بنگلہ بہت خوب صورت تھا۔ دولت ہو تو دُنیا کی ہر خوب صورتی کو داشتہ بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔ سنجے مکرجی نے قیمتی فرنیچر اور دوسری ضروریات کا سامان خریدا تھا اور پریتی نے اُس گھر کو بڑے سلیقے سے سجایا تھا بڑی تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ کہ وہ گھر ہمیشہ سنجے کے دم قدم سے آباد رہے۔

سنجے نے اپنے دو چار جوڑے وہاں لا کر رکھے تھے۔ کیونکہ وہ ہر رات وہاں گزارتا تھا اور وہاں سے لباس بدل کر واپس جاتا تھا۔

پریتی نے وکالت کے پیشے میں رہ کر پہلے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ گھریلو عورت بنے گی مگر اب وہ اپنے مرد کی ایک ایک پسند کا خیال رکھتی تھی۔ اُس کے لیے کھانا پکاتی تھی۔ اُس کے کپڑے دھوتی اور استری کرتی تھی۔ رات کو جب وہ سو جاتا تو وہ اُسے بانہوں میں لے کر جاگتی رہتی اُسے دیکھتی رہتی۔ دماغ کے کسی گوشے میں یہ خوف تھا کہ تقدیر کبھی اُسے چھین بھی سکتی ہے۔ اس لیے اُسے جی بھر کے دیکھتے رہنے کی جتنی گھڑیاں میسر آتی تھیں وہ دیکھتی رہتی تھی اور اُس وقت تک آنکھیں کھلی رکھتی تھی جب تک کہ نیند زبردستی اُس پر غالب نہ آ جاتی۔ وہ سارے اندیشے بھول کر اُس کی پناہ میں سو جاتی تھی۔

دیوانگی ایسی تھی کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اُس سے الگ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ دن کو جب وہ نہیں ہوتا تھا تو پریتی بنگلے کے اندر اُس کی قمیص پہن کر پھرتی تھی۔ صبح وہ بستر سے اُٹھ کر جاتا تو وہ کروٹ بدل کر اُس کی خالی جگہ پہنچ جاتی تھی۔ اس جگہ وہ سنجے کی گرم گرم مہک محسوس کرتی تھی۔ والہانہ لگاوٹ ایسی تھی کہ اس کے کپڑے پہن کر پریتی کو سکون ملتا تھا۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے فلمی اور غیر فلمی محبت بھرے گیت یوں لگتے تھے جیسے وہ سب اُس کے اور سنجے کے لیے گائے جا رہے ہوں۔

اُسے ہوش نہیں تھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے اور وہ ہوش میں رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مدہوشی کا چسکا پڑا تھا۔ ہاں مگر وکالت کے پیشے میں وہ چاق و چوبند رہتی تھی۔ خود کو سنجے کے شایانِ شان بنانے کے لیے اہم مقدمات پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔ اُس کا نام اور اُس کے کارنامے بھی اخبارات میں شائع ہونے لگے تھے۔

وہ سنجے کے شانہ بشانہ رہنے کے لیے اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتی تھی۔ وہ سب کچھ کر سکتی تھی لیکن اُس کے ساتھ پبلک مقامات میں گھوم نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ سنجے سے روح کی گہرائیوں تک رشتہ ہونے کے باوجود اُس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک گالی تھی جو دونوں کے درمیان محبت سے جاری تھی۔

بس یہی سوچ کر اُس کے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ کیا بیوی کا رشتہ سب کچھ ہوتا ہے۔ محبوبہ کچھ نہیں ہوتی؟ حالانکہ وہ بیوی سے زیادہ اپنے مرد پر اعتماد کرتی ہے کسی تحریر، کسی ضمانت کے بغیر اپنی عزت، اپنا وجود اور اپنا مستقبل اس مرد کے حوالے کر دیتی ہے اور اُدھر نکاح نامے کے باوجود میاں بیوی ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ پوری سوسائٹی کی ضمانت حاصل ہونے کے باوجود کبھی میاں بیوی کو اور کبھی بیوی میاں کو چھوڑ دیتے ہیں یا قتل کر دیتے ہیں۔ پھر بھی وہ مہذب ہوتے ہیں اور محبت۔۔ کا رشتہ خلافِ تہذیب سمجھ لیا جاتا ہے۔

ایک صبح دونوں کا نام اخبارات کے پہلے صفحہ پر شائع ہوا۔ پریتی بالا نے پھر ایک بار ایک پیچیدہ مقدمے سے گزرتے ہوئے اپنی ایک ایسی مؤکلہ کو سزائے موت سے بچا لیا تھا جس نے اپنے شوہر کی بے راہ روی سے تنگ آ کر اُسے قتل کر دیا تھا۔ اس قاتلہ کو قانون کے قہر سے بچانا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اِسی لیے پریتی بالا کا چرچا ہر اخبار میں تھا۔ دوسرا نام سنجے مکرجی کا تھا۔ اُس کے متعلق خبر شائع ہوئی تھی کہ وہ آئندہ انتخابات میں اُمیدوار کی حیثیت سے نامزد ہو چکا ہے۔ اُس کی تعریف کی گئی تھی کہ اُس نے بنگال جیسے زرعی صوبہ میں صنعتی ترقی کے لیے بڑے اہم رول ادا کیے ہیں۔ اُس کی سماجی خدمات کو بھی بہت سراہا گیا تھا۔ پریتی نے اُس سے ٹیلی فون پر کہا: "میں پیشین گوئی کرتی ہوں کہ آپ عوام کے منتخب نمائندہ ہوں گے۔ کامیابی آپ کی منتظر ہے۔"

"شکریہ۔ میں ابھی تمھیں اس مقدمہ کی کامیابی پر مبارک باد

دینا چاہتا تھا، اس سے پہلے تم نے ہی مجھے فون کر لیا۔ بہرحال میں بنگلے میں سات بجے پہنچ کر بڑے پیار سے مبارک باد دوں گا۔"

اچانک پریتی کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس کے دماغ کے کسی گوشے میں ایک اندیشہ کلبلا رہا تھا، جسے وہ اُس وقت اچھی طرح نہ سمجھ سکی۔ رات کو سنجے کے بازوؤں میں بھینچنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ اندیشہ کیا ہے؟ وہ چاہتی تھی کہ اُس کا سنجے ووٹوں کی بھاری اکثریت سے جیت جائے لیکن ہار جیت کی وہ تلوار اُس محبوبہ کے سر پہ لٹک رہی تھی۔ اگر سنجے سینیٹ کا انتخاب جیتے گا تو وہ محبت کی بازی ہار جائے گی کیونکہ... سیاست میں عشق اور اسکینڈل کے لیے گنجائش نہیں رہتی۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اگر یہ بھید کھل جائے کہ اُس نے ایک داشتہ رکھی ہے تو یہ سنجے کے لیے سیاسی خودکشی ہوگی۔

اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ سنجے نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ بولی "اب اور زیادہ آپ کو محتاط رہنا ہوگا۔ مخالف اُمیدواروں کو ہمارے تعلقات کا علم ہوگا تو وہ اخلاقیات کا ڈھنڈورا پیٹ کر آپ کو عوام کی نظروں سے گرانا چاہیں گے۔"

"پریتی! یہ سچ ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ نرملا واپس آگئی ہے اور اُسے ہمارے تعلقات کا علم ہوگیا ہے۔"

اُس نے چونک کر پوچھا "کیسے؟"

"پتہ نہیں۔ میرا اندازہ ہے، گھر کی کسی نوکرانی نے اُسے بتا دیا ہے کہ میں راتیں گھر میں نہیں گزارتا تھا۔"

"پھر تو بیوی نے خوب جھگڑا کیا ہوگا؟"

"تم نرملا کو نہیں جانتیں، وہ بالکل گائے ہے گائے.... غصہ نہیں آتا۔"

"تعجب ہے۔ میں اُس کے شوہر سے ملتی ہوں۔ کیا مجھ پر بھی غصہ نہیں آیا؟"

"کیوں آئے گا؟ ہمارے درمیان طلاق ہونے والی ہے۔ اُس کے بعد میری زندگی میں کوئی بھی آئے۔"

"کیا طلاق کے لیے بات آگے بڑھی؟"

"ابھی نہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"کون؟ نرملا؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا ہے کہ ابھی تمہیں ساتھ لاؤں گا۔"

"مگر کیوں؟ میرا اُس سے ملنا کیا ضروری ہے؟"

"بس اُس کی خواہش ہے۔ پریتی! اُس سے مل کر تمہیں معلوم ہوگا۔ وہ اتنی اچھی ہے کہ میں اُس کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔"

"مگر مجھے اُس کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگے گا۔ میں اُس کے سامنے چور بن جاؤں گی۔ کیونکہ... کیونکہ میں آپ کو اُس سے چھڑاتی ہوں۔"

"یہ تمہارے فضول سے خیالات ہیں۔ میں بولنے تک اُس کا شوہر ہوں۔ تم نے اُس کا حق نہیں مارا ہے۔ چلو تیار ہو جاؤ۔"

"ٹھہریئے۔ مجھے ذرا سوچنے دیجیے۔"

"سوچنا کیا ہے؟ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولی "میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ وہ بات یہ ہے کہ... کہ ہم دونوں عورتیں یعنی کہ میں اِدھر اور وہ اُدھر آپ کی تنہائی میں رہتی ہیں۔ آپ کی موجودگی میں مجھے اُس کا سامنا کرتے ہوئے شرم آئے گی۔"

اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "او آئی سی۔ اچھا تو ایسا کرتے ہیں کہ میں تمہیں اپنی کوٹھی کے سامنے چھوڑ کر کہیں وقت گزارنے چلا جاؤں گا، تم تنہا جا کر نرملا سے ملاقات کرنا۔"

وہ لباس بدلنے چلی گئی۔ اُس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اُس نے... سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی نرملا سے سامنا ہوگا اور اب سامنا ہوگا تو وہ کیسے نظریں ملائے گی؟ روانگی کے وقت سنجے کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھتے وقت پہلی بار احساس ہوا کہ اُسے اس مرد کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا حق نہیں ہے۔ نرملا نے اگر یوں بیٹھے دیکھ لیا تو اُس پر ہنسے گی۔

سنجے نے ایک دکان کے پاس گاڑی روک کر وہاں سے فون پر نرملا کو اطلاع دی کہ وہ پریتی کو کوٹھی کے سامنے چھوڑ کر کہیں تھوڑا وقت گزارنے جائے گا کیونکہ پریتی اُس سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہے۔ اُسے اطلاع دینے کے بعد وہ پھر کار میں آ گیا۔ اُس نے پریتی کو بھی بتا دیا کہ کوٹھی کے دروازے پر نرملا اُس کا استقبال کرے گی۔

واقعی نرملا دروازے پر منتظر تھی۔ وہ احاطے کے باہر سنجے پریتی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ پریتی احاطے کے گیٹ سے داخل ہو کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اُدھر سے نرملا بڑھتی ہوئی آئی۔ قریب پہنچتے پہنچتے اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑے خلوص سے نمستے کہا۔ نرملا کے اس پیار بھرے انداز نے پریتی کی ڈھارس بندھائی۔ اُس نے دولتمند ہو کر، اتنے بڑے شخص کی بیوی ہو کر اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے نمستے کہا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نرملا نہ تو مغرور ہے اور نہ ہی اُسے سوکن سمجھ کر کوئی طنزیہ انداز اختیار کرنے والی ہے۔

اُس نے ململ کی ایک معمولی سی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ سنجیدہ، معاملہ فہم اور بھاری بھرکم شخصیت والی عورت لگ رہی تھی۔ کوٹھی کے اندرونی کمروں کی سجاوٹ سے بھی نرملا کی خوش ذوقی اور سلیقے کا پتہ چلتا تھا۔ ملاقات کی ابتدا میں پریتی نے مان لیا کہ وہ عورت دل میں بھی گھر کر لیتی ہے۔ تعجب ہے کہ سنجے اس گھر سے کیسے نکل گیا؟

⁂

وہ ڈرائنگ روم میں آئے۔ پریتی نے بہانہ کیا کہ اُسے جھجک

نہیں لگ رہی ہے۔ نرملا نے کہا: "تم بیرسٹر ہو۔ تمہیں تو کھانے پینے میں بھی وقت کی پابندی کرنا چاہیے۔ نہیں کرو گی تو شادی کے بعد سنجے کو بھی وقت پر کھانا نہیں دے سکو گی۔"

پریتی بے حد متاثر ہوئی۔ وہ بیوی جو کہ اپنے شوہر کو ابھی سے اس سے منسوب کر رہی تھی۔ دونوں کھانے کی میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ جب ملازم کھانا لگا کر چلے گئے تو نرملا نے پوچھا: "تم ان سے بہت پیار کرتی ہو۔ ہے نا؟"

پریتی نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "میں کیا کہوں۔ یہ میرے اپنے بس میں نہیں تھی۔ یہ دل بڑا پاپی ہوتا ہے۔ پتہ نہیں میں کیسے ان کی طرف مائل ہو گئی اور اب میری یہ حالت ہے کہ مر کر ہی انھیں شاید بھلا سکتی ہوں۔"

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں۔ زندگی کے بہت سے معاملات ہمارے تمہارے بس میں نہیں ہوتے۔ مثلاً میری ازدواجی زندگی میرے بس میں نہیں رہی۔ سنجے مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں میں سمجھ گئی ہوں کہ اس پیار کے پیچھے محض ایک ہمدردی ہے جو ایک بانجھ عورت سے کی جاتی ہے۔ اگر بھگوان ہمارا صرف ایک بچہ ہو جائے تو ان کے پیار کی سچائی لوٹ آئے گی۔"

نرملا کو اپنے آپ پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ بدصورت نہیں، خوب صورت تھی۔ پھوہڑ نہیں سگھڑ عورت تھی۔ صحت کے اعتبار سے بھرپور اور پرکشش تھی۔ کوئی مرد اسے پاکر چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ پریتی یقین سے کہہ سکتی تھی کہ سنجے نرملا کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ صرف ایک اولاد کی کمی عورت کے حسن اور صلاحیتوں کو اور اس سے ہونے والی چاہت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

نرملا نے درد بھرے لہجے میں کہا: "میں ان سے برابر کہتی رہی کہ مجھے چھوڑ دیں۔ دوسری شادی کر لیں لیکن وہ ہمیشہ پس و پیش میں رہے۔ شاید مجھے چھوڑنے کے لیے ضمیر ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ شاید انھیں اب تک اپنی پسند اور معیار کی لڑکی نہیں ملی تھی۔ میں نے تمہارا ذکر سنا تو دیکھنے کو دل چاہا پریتی! تم سچ مچ سندر ہو۔ سنجے کے شایانِ شان تم میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ تم عورت بھی ہو اور مرد بھی۔ بڑی بڑی عدالتوں میں بڑے بڑے بیرسٹروں کو منہ توڑ جواب دیتی ہو۔ سنجے کی طرح اخبارات میں تمہارا نام بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ تم دونوں کی جوڑی بے مثال ہے لیکن میں تمہیں نیک مشورہ دوں گی کہ شادی سے پہلے طبی معائنہ کرا لینا۔ بھگوان کرے کہ تمہارے سارے سپنے پورے ہوں لیکن۔ اگر تم بھی بانجھ نکلیں تو پھر دوسری نرملا بن جاؤ گی۔ تمہاری ساری خوبیاں اور سندرتا خاک میں مل جائیں گی۔"

نرملا نے بڑی سچی بڑی زہریلی بات کہی تھی۔ یہ بات پریتی کے دل کو لگی مگر دل پھر بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوا کہ اس سے بھی اولاد نہ ہوئی تو سنجے اسے بھی ایک دن چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ پریتی نے نرملا سے پوچھا: "کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ دو انسانوں کے درمیان کبھی بے لوث محبت نہیں ہوتی۔ محبت کے پیچھے کوئی غرض ہوتی ہے۔ وہ غرض پوری نہ ہو تو محبت میں فرق آ جاتا ہے۔"

"مجھ پر یہی گزر رہی ہے۔ اس لیے میں یہی کہہ رہی ہوں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سنجے بے وفا اور ہرجائی ہیں۔ نہیں۔ وہ تمہیں بانجھ ہونے کے باوجود چاہتے رہیں گے۔ لیکن وہ چاہت ایک فرض کے طور پر ہوگی۔ وہ محبوب نہیں، ہمدرد ہوں گے۔ ایک رومال ہوں گے ہمارے تمہارے آنسو پونچھنے کے لیے۔۔۔"

تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ پریتی لقمہ چباتے ہوئے سوچتی رہی۔ پھر نرملا نے کہا: "میری باتوں سے یہ تاثر نہ لینا کہ میں تمہیں سنجے کے خلاف بہکا رہی ہوں۔ فرض کرو اگر میں تمہیں بہکا کر سنجے کے راستے سے ہٹا دوں تو کوئی دوسری آجائے گی۔ وہ تو اولاد کے لیے ضرور دوسری شادی کریں گے۔ کسی سے بھی کریں گے۔"

"نرملا دیوی! آپ کی باتوں میں سنجیدگی اور سچائی ہے۔ میں آپ کے خلوص پر شبہ نہیں کر رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کہ آپ نے سنجے کو چھوڑنے کے لیے دل کو کیسے مضبوط بنا رکھا ہے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی: "میں اوپر سے مضبوط ہوں۔ اندر سے بہت کمزور ہوں۔ جیسے ہر عورت محبت میں ہوتی ہے۔ میں دن رات سوچتی رہتی ہوں کہ سنجے کی دھرم پتنی بنے رہنے کا کوئی بہانہ مل جائے۔ کبھی میری پرب قبول ہو ایسا کرشمہ ہو کہ میں اچانک ماں بننے لگوں اور یہ ممکن نہ ہو تو قانون اور دھرم مجھے سنجے کے قدموں میں رہنے کی اجازت دے۔ میں عجیب الٹی سیدھی باتیں سوچتی ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں۔ کاش ہم مسلمان ہوتے۔۔۔"

پریتی نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ سر جھکا کر بولی: "ہاں میں سنجے کے لیے دھرم بدل سکتی ہوں۔ اسلام میں یہ رعایت ہے کہ بیوی بانجھ ہو تو اسے طلاق دینا ضروری نہیں ہوتا۔ مرد دوسری شادی کر سکتا ہے اور بانجھ عورت کو اپنی توہین کا احساس نہیں ہوتا کہ اسے بیکار اور بنجر سمجھ کر ٹھکرا دیا گیا ہے۔ ایک زمانہ کہتا ہے کہ عورت اپنی سوکن کو برداشت نہیں کرتی۔ زندگی کے اس موڑ پر اگر میں تمہیں برداشت کر رہی ہوں تم بھی سنجے کی خاطر مجھے برداشت کر سکو گی مگر یہ میری پاگل سوچیں ہیں۔ نہ ہم مسلمان ہیں، نہ ایک مرد کی دو بیویاں بن کر رہ سکتے ہیں۔"

پریتی نے سر ہلا کر کہا: "زندگی کے ایسے موڑ پر ایسا ہی مذہب سب سے افضل ہوتا ہے جو محبت کا تحفظ کر سکے لیکن سنجے کے لیے محبت سے زیادہ سیاست اہم ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ وہ سیاست میں رہ کر آپ

کی خاطر اسلام قبول کر سکتے ہیں؟"

نرملا نے جواب دیا: "مجھے یہ خوش فہمی ہے کہ سنجے میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن اُنھوں نے مذہب بدلا تو اُنھیں ایک ووٹ بھی نہیں ملے گا۔ مجھے طلاق لے کر اس گھر سے جانا ہی پڑے گا۔"

پربتی نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا۔ بے شک ہندو دھرم میں طلاق کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پہلی بیوی کو اپنی زندگی سے نکالنے کے بعد ہی اولاد کے لیے دوسری شادی کی جا سکتی ہے اور اب نرملا کے طلاق لینے کا وقت آگیا تھا۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی: "میں سنجے کی خوشی چاہتی ہوں۔ اُسے باپ بنتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں آج ہی یہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی لیکن میں جاؤں گی تو سنجے الیکشن ہار جائیں گے۔"

پربتی کو نرملا کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ دوسرے ہی لمحے نرملا نے سمجھاتے ہوئے کہا: "طلاق دینا ایک جاہلانہ فعل ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ بیوی کے پاس پندرہ برس کی وفاداری اور سلیقہ مندی کا ریکارڈ ہو اور بانجھ ہونے میں اُس کا اپنا کوئی قصور نہ ہو۔ میں انتخاب سے پہلے طلاق لوں گی تو یہ خبر اخبارات میں آئے گی۔ مخالف اُمیدوار میری مظلومیت کو اس قدر اُچھالیں گے کہ سنجے عوام کی نظروں سے گر جائیں گے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

وہ بالکل درست کہہ رہی تھی۔ پربتی اب تک رومانی جذبات میں گھری ہوئی تھی۔ اُس نے نرملا کے نقطۂ نظر سے نہیں سوچا تھا۔ اب بات سمجھ میں آئی تو اُس نے تسلیم کر لیا کہ ابھی نرملا کو طلاق دینا سنجے کے لیے مہنگا پڑے گا۔ لہٰذا ابھی صبر کرنا ہوگا۔ الیکشن کے لیے صرف چھ ماہ رہ گئے تھے۔ ابھی نہ سہی چھ ماہ بعد اُسے سنجے کی دُلھن بننا ہی تھا۔ انتخاب میں کامیابی یقینی تھی۔ سینیٹر منتخب ہونے کے بعد سنجے نے کہا تھا کہ وہ اُسے دھرم پتنی بنا کر وہاں کی راجدھانی دہلی لے جائے گا۔ سرکاری طور پہ وہیں رہائش اختیار کی جائے گی۔

وہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے اپنے بنگلے میں واپس آئی۔ وہاں سنجے اُس کا منتظر تھا۔ اُس نے پربتی کے قریب آکر پوچھا: "نرملا سے ملاقات کیسی رہی؟"

"بہت اچھی رہی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس قدر ملنسار اور معاملہ فہم ہوگی۔ وہ آپ کو لاولد دیکھنا نہیں چاہتی۔"

وہ دُور کہیں دیکھنے لگا۔ پربتی کو آغوش میں لے کر جیسے اپنے سامنے نرملا کو قربانی کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستگی سے بولا۔

"وہ ہر حال میں میری بھلائی چاہتی ہے۔ کہتی ہے الیکشن سے پہلے طلاق لے گی تو مجھے نقصان پہنچے گا۔ وہ بڑی مخلص اور ذہین ہے۔"

"آج نرملا کی باتوں سے معلوم ہوا کہ آپ اُسے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ آپ اُس کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔ ایک بات سچ سچ بتائیں۔ کیا آپ اُسے مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں؟"

"پربتی! محبت کو ناپا اور تولا نہیں جا سکتا۔ نرملا کی سوچ کے مطابق اگر میں مسلمان ہوتا اور تم دونوں میرے پاس بیویوں کی حیثیت سے رہ سکتیں تو میں دونوں سے برابر محبت اور انصاف کرتا۔ اپنے موجودہ حالات میں یقین آجاتا ہے کہ دو بیویاں رکھنے والا شخص کیسے دونوں سے انصاف نباہ کرتا ہوگا؟ اسی لیے کہ محبت نباہ کراتی ہے۔ میں تم دونوں سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ تم میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا۔"

اُس نے حیرانی سے پوچھا: "آپ نرملا کے انداز میں سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ اُس کی خاطر اپنا دھرم چھوڑ سکتے ہیں؟"

اُس نے جواب دیا: "صرف نرملا کا نام لے کر نہ پوچھو۔ میں تم دونوں کی محبت کی خاطر دین و ایمان سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ محبت ذات پات دین دھرم کچھ نہیں دیکھتی۔ لیکن ہم سیاستداں اور عوامی لوگ ہیں۔ ہم ایسی شہرت حاصل کرتے رہے ہیں کہ گمنام لوگوں کی طرح اپنے ارادے اور اپنا دھرم نہیں بدل سکتے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنا فضول ہے۔"

اُنھوں نے موضوع بدل دیا۔ جذبوں کی زبان سے باتیں کرنے لگے۔ اُنھیں ایک دوسرے کا جیون ساتھی بننے کے لیے چھ ماہ گزارنے تھے۔ وہ مہینے گزرنے لگے۔ سنجے کی مصروفیات اتنی بڑھ گئیں کہ وہ پربتی کے ساتھ بڑی مشکلوں سے ہفتے میں ایک رات گزارتا تھا۔ روزانہ اخبارات میں اُس کے زوردار بیانات شائع ہوتے تھے۔ ریڈیو سے اُس کی تقریریں نشر ہوتی تھیں۔ ٹی وی کے اسکرین پر وہ اکثر کسی نہ کسی تقریب میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے نظر آتا تھا۔ خبر آتی تھی کہ وہ صبح دہلی میں ہے۔ شام کو بمبئی پہنچ گیا ہے۔ کبھی مدراس، کبھی مدھیہ پردیش، کبھی اُتر پردیش، کبھی بہار، اڑیسہ اور کبھی مشرقی پنجاب اور راجستھان۔ وہ روز اپنی پارٹی کے سیاسی جلسوں میں تقریریں کرتا تھا مگر ایک بات ہے۔ وہ بھارت کے جس گوشے میں بھی جاتا تھا وہاں سے ٹرنک کال پر پربتی سے ضرور باتیں کرتا تھا۔ اُس کی باتوں کا لبِ لباب یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی پربتی کے بغیر خود کو خالی خالی محسوس کرتا ہے۔ ایک بار اُسے پتہ چلا کہ انتخابی مہم کے دوران نرملا اُس کے ساتھ دہلی گئی ہے۔ اُس سمے پربتی کے دل میں یہ شدید آرزو پیدا ہوئی کہ کاش وہ اُس وقت اُس کی بیوی ہوتی اور اعلانیہ اُس کے ساتھ انتخابی مہم میں حصہ لیتی۔ ہائے کاش!

•

وہ انتخابی مہم کے دوران جس شہر میں پہنچتا تھا وہاں اُس کا شاندار استقبال ہوتا تھا۔ وہاں کے بڑے بڑے سرمایہ دار اُس کی بہترین رہائش کا انتظام کرتے تھے۔ دہلی پہنچ کر نرملا نے پوچھا: "آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ پھر طلاق کے بعد میرے بغیر کیسے رہ سکیں گے؟"

"سمجھ میں نہیں آتا کیسے رہوں گا۔ یوں تو پربتی سے بہت پیار

لے گا۔ شاید وہ میرے بچے کی ماں بھی بن جائے۔ وہ میرا دل اور میرا گھر جیت لے گی لیکن میں تمھیں ہار جاؤں گا۔ تم بچھڑنے کے بعد اور یاد آؤ گی۔"

"میں دن رات اس مسئلہ پر سوچتی رہتی ہوں۔ ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ پرتی آپ کی محبوبہ ہے۔ آپ سے جب تک بیوی کا درجہ نہ ملے، وہ محبوبہ کے طور پر ہی مطمئن رہے گی۔ مجھے بیوی کا غرور اور سہاگن کا باعزت سماجی رتبہ مل چکا ہے۔ میں اس رشتے سے گر کر آپ کی داشتہ بن کر نہیں رہ سکوں گی۔"

"پھر بات کیا سمجھ میں آئی؟"

"یہی کہ مجھے اور پرتی کو اپنے اپنے ہی مقام پر رہنا چاہیے۔ اسی طرح آپ دونوں سے اپنی محبت اور جائز اور ناجائز رشتوں کو بحال رکھ سکتے ہیں۔ ایسا کوئی بیوی نہیں کرے گی۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ پرتی کو ہر حال میں برداشت کروں گی۔"

"نرملا! میں نے اکثر یہی سوچا ہے کہ ابھی جس طرح معاملہ چل رہا ہے چلتا رہے لیکن اولاد کا کیا ہوگا؟"

"میں ایک آخری کوشش کروں گی۔"

"وہ کوشش کیا ہوگی؟"

"میں بتاؤں گی۔ آپ میری کسی بات سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ کیا آپ میرے کہنے پر ایک دو دن کے لیے انتخابی مہم کی سرگرمیاں بند کر سکتے ہیں؟"

"میری جان! میں تمھارے کہنے پر الیکشن لڑنے سے باز آ سکتا ہوں۔ بولو کیا چاہتی ہو؟"

"ہم دہلی آگئے ہیں۔ اجمیر یہاں سے دور نہیں ہے۔ آپ ایک دن کے لیے میرے ساتھ وہاں چلیں؟"

"وہاں جا کر کیا ہوگا؟"

"میں خواجہ بابا سے پرارتھنا کروں گی۔ بس ایک بچہ مانگوں گی۔ سیکڑوں سال سے سب مانتے ہیں کہ ان کے دربار سے کوئی سوالی خالی نہیں جاتا۔"

"نرملا! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دولت مانگنے والوں کو کہیں راستے میں روپے سے بھری تھیلی مل جائے لیکن بچہ مانگنے والی بانجھ کے پیٹ میں بچہ کہاں سے آسکتا ہے؟ تم تعلیم یافتہ اور ذہین ہو۔ جاہل عورتوں جیسا عقیدہ کیوں رکھتی ہو؟"

"عقیدہ رکھا نہیں جاتا۔ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ جہاں انسان کی تمام شعوری کوششیں تھک ہار کر ناکام ہو جاتی ہیں، وہاں وہ تمام عقلی دلائل کو بھول کر کسی ان دیکھی امداد پر بھروسہ کرتا ہے۔ میں بھی خواجہ بابا پر بھروسہ کرتی ہوں۔"

سنجے اس کے عقیدے کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اجمیر تک جانے کے لیے راضی ہو گیا۔ اس نے اپنی مصروفیات میں سے ایک دن نرملا کے لیے وقف کیا۔ اسی رات وہ دونوں ٹرین کے ذریعہ اجمیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے لیے فرسٹ کلاس کا ایک کمپارٹمنٹ ریزرو تھا۔ جدھر ٹرین جا رہی تھی، ادھر اجمیر تھا۔ نرملا ادھر منہ کیے فرش پر پلتھی مار کر بیٹھ گئی تھی اور اجمیر کی سمت دونوں ہاتھ جوڑ کر خاموشی سے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے آنسو دعا کی طرح بہہ رہے تھے۔

سنجے کو بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ دعا بچے کے لیے ہے مگر رونا اپنے مرد کے لیے ہے۔ اس بیوی کو آنے والی جدائی کے دن ابھی سے رلائے جا رہے تھے۔ کیا ضروری ہے کہ دعا قبول ہو؟ سنجے آگے بڑھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ "نرملا! دنیا میں کتنے ہی لوگ بغیر اولاد کے جی لیتے ہیں۔ مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ ایک بچے کے بدلے پرتی نہیں چاہیے۔ میں صرف تمھیں چاہتا ہوں۔"

لیکن وہ ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایسا کہنے کا وقت گزر چکا تھا۔ کیونکہ وہ نرملا کی طرح پرتی کو بھی محبت کا روگ لگا چکا تھا۔ اگر بچھڑنے کی بات ہوتی تو اس محبوبہ کے آنسو اور شکوے کے سامنے بھی وہ ندامت محسوس کرتا۔ اسے کسی طرف قرار نہیں تھا۔ وہ کمپارٹمنٹ کے ایک برتھ پر منہ ڈھانپ کر سو گیا۔

دوسری صبح نرملا نے اسے جگایا۔ "اٹھ جائیے۔ ہماری منزل قریب آرہی ہے۔"

وہ اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ اشنان کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا۔ نرملا نے ملازم سے کہا کہ وہ سامان لے کر اجمیر کے ایک ہوٹل میں جائے۔ وہ اپنے پتی کے ساتھ بعد میں آئے گی۔ سنجے نے پوچھا۔ "ہم بعد میں کیوں جائیں گے اور ابھی ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

اتنے میں گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ نرملا نے سنجے سے کہا۔ "اب آپ جوتے چپلیں یہیں چھوڑ کر گاڑی سے اتر جائیں۔"

"یعنی کہ ننگے پاؤں پلیٹ فارم پر جاؤں؟ آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

وہ گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر چلی گئی تھی۔ سنجے کو بھی اس کے پیچھے اترنا پڑا۔ وہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ گاڑی فوراً ہی چل پڑی۔ سنجے نے کہا۔ "ارے یہاں کیوں کھڑی ہو۔ کیا گاڑی میں نہیں بیٹھنا ہے؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "ہم یہاں سے پیدل اجمیر جائیں گے۔"

"کیا پیدل؟" سنجے نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔ "اجمیر یہاں سے پچیس میل دور ہے۔"

وہ اپنے پتی کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "شہنشاہ اکبر اولاد مانگنے کے لیے آگرہ سے فتح پور سیکری تک پیدل گئے تھے اور ننگے پاؤں گئے تھے۔ آپ بھی چلیں۔"

سنجے اس کے سامنے ہار کر اسے خوش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ

پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ پھر اجمیر جانے والے راستے کی سمت دیکھ کر بولا۔ "یا خواجہ غریب نواز! میں اس جلتی دھوپ میں پیدل تیرے در تک آرہا ہوں تو اس کوکھ جلی کے عقیدے کی لاج رکھنا۔"

وہ چل پڑا۔ نرملا ٹرین کے سفر میں تمام راستے بیٹھی ہوئی بیٹھی رہی تھی اور دونوں ہاتھ جوڑے پوجا کے انداز میں اُس نے رات بسر کر دی تھی۔ اس وقت بھی وہ پچیس میل کا راستہ اپنے شوہر کے ساتھ طے کرنے کے دوران اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھی۔ اُس کا چہرا نظر نہیں آرہا تھا مگر نیبے سمجھ رہا تھا کہ وہ گھونگھٹ کے پیچھے روتی جارہی ہے۔

○

پربھتی نے جب سے نرملا سے ملاقات کی تھی تب سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ نرملا سے متاثر ہوتی جارہی ہے۔ اُس کی باتوں میں اُس کے دکھ رکھاؤ میں اور اُس کی شخصیت میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں کہ وہ اپنے ملنے والوں کو جیت لیتی تھی۔ پربھتی نے یہ مان لیا تھا کہ وہ ایک مثالی بیوی ہے۔

اب وہ اکثر سوچتی تھی کہ مرد نرملا جیسی بیویوں کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ آخر اُن کے لیے محبت کیا چیز ہے؟ کبھی وہ حسن کو چاہتے ہیں کبھی جوانی کو، کبھی وہ اداؤں پر قربان ہوتے ہیں کبھی چہرے کے ایک ننھے سے تل پر مر جاتے ہیں اور پندرہ برس تک جی جان سے محبت کرنے کے بعد صرف بچہ نہ ہونے کے سبب اُس محبت کو طلاق دے دیتے ہیں۔ آخر اُن کے پیار کی کسوٹی کیا ہے؟

نرملا سے ملنے کے بعد پربھتی نے اکثر سوچا: "اگر شادی کے بعد میں بھی بچے کی ماں نہ بن سکی تو کیا ہوگا؟"

یہ سوچ کر وہ پریشان ہو جاتی تھی۔ جب وہ پندرہ سال... کی رفیقہ حیات کو چھوڑ سکتا تھا تو اُس سے بھی منہ موڑ سکتا تھا۔ نرملا نے بڑی فراخ دلی سے پربھتی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے اپنا طبی معائنہ کرالے۔ ورنہ بانجھ ہونے کی صورت میں اُس کا انجام بھی نرملا جیسا ہوگا۔

اب اُس کے اندر ایک کشمکش تھی کہ اُسے اپنا طبی معائنہ کرانا چاہیے یا نہیں؟ ایک تو یہ کہ وہ دُنیا کی نظروں میں کنواری تھی ایسا معائنہ بیاہتا عورتوں کا ہوتا ہے۔ اگر اُس کا معائنہ ہو بھی جاتا اور نتیجہ میں وہ بانجھ ثابت ہوتی تو کیا وہ ایسی دل توڑنے والی حقیقت کو برداشت کر لیتی؟

نہیں۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں نیبے کی دُلھن بننے سے پہلے اُسے کھو نہ دے۔ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ صبح ہوتے ہی مر جائے گا تو مارے ہیبت کے اُس سے رات گزاری نہیں جائے گی۔ وہ رات کے ایک ایک لمحہ میں جینے مرنے کے بجائے مرتے مرتے صبح مر جائے گا مگر اُسے موت کی خبر نہ ہو تو وہ رات کو شکم سیر ہو کر کھائے گا۔ گائے گا بجائے گا۔ خوب بولے گا بے فکری کی نیند سوئے گا اور صبح تک سہانے خواب دیکھے گا اُس کے بعد بلا سے موت آجائے۔

پربھتی بھی سہانے خواب دیکھتے ہوئے سہاگ کی سیج پر پہنچنا چاہتی تھی۔ بعد میں بلا سے وہ بانجھ عورت کی سیج ثابت ہو جائے۔ بہرحال وہ بیرسٹر تھی۔ دل کی عدالت میں وہ ایک عورت کی حیثیت سے نرملا کی حمایت کرتی تھی کہ اُس بانجھ عورت سے اُس کا شوہر نہیں چھوٹنا چاہیے۔ ورنہ یہ ایک مرد کا بہت بڑا ظلم ہوگا لیکن دل کی ایک عدالت میں جذباتی فیصلے بھی ہوتے ہیں۔ ایک فیصلہ یہ تھا کہ یہ مرد کا ظلم نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اولاد کے لیے ایک کو چھوڑ کر دوسری شادی کرے گا۔

پربھتی بڑی کشمکش میں دن گزار رہی تھی۔ نیبے شہر شہر گھوم کر جب بھی واپس آتا تھا تو ایک رات اُس کے ساتھ ضرور گزارتا تھا۔ جب انتخاب کے لیے صرف دو ہفتے رہ گئے تو وہ مصروفیات کے باعث اُس سے دُور ہوتا چلا گیا۔ یہ اُس کی مجبوری تھی۔ انہی دنوں ایک لیڈی ڈاکٹر اُس کی موکلہ رہ چکی تھی۔ مقدمہ جیتنے کی خوشی میں اُس نے ایک شاندار پارٹی دی۔ اُس پارٹی میں پربھتی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئی۔ وہاں پُر تکلف کھانا اور ناچ گانا سب کچھ تھا۔ کھانا بہت لذیذ تھا لیکن پربھتی نے دو لقمے کھائے تو ناگواری سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا کہ اندر کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اگر تیسرا لقمہ منہ تک لے جائے گی تو اُبکائی ہونے لگے گی۔

وہ کھانا چھوڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی لیڈی ڈاکٹر کی خواب گاہ میں گئی۔ وہاں سے ملحقہ باتھ روم میں پہنچی۔ پھر واش بیسن کے پاس پہنچتے ہی اُسے قے ہونے لگی۔ قے برائے نام تھی۔ مگر متلی ہو رہی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے بیسن پر جھکی رہی۔ اُس کا سر بھولے ہوئے چکرا رہا تھا کمزوری لگ رہی تھی۔ اُسے اپنی پیٹھ پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ لیڈی ڈاکٹر اُس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔

پھر وہ اُسے سہارا دے کر اپنی خواب گاہ کے بستر پر لے آئی۔ وہاں اُس کی بگڑی ہوئی طبیعت کو سمجھنے کے لیے اُس کا معائنہ کیا۔ پھر حیرانی سے اُسے دیکھنے لگی۔ اُس نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

لیڈی ڈاکٹر نے آہستگی سے رازدارانہ انداز میں کہا: "آپ ماں بننے والی ہیں۔"

پربھتی نے چونک کر اُسے دیکھا پہلے تو اُسے یقین نہ آیا۔ وہ یقین کرنے کے لیے لیڈی ڈاکٹر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا: "آپ کی شادی نہیں ہوئی۔ یہ کیسے ہو گیا؟"

وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرا کسی جذبے کی فراوانی سے تمتما رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اُس کے شانہ کو تھپک کر کہا: "آپ

نے مقدر جیت کر میری عزت رکھ لی تھی۔ میں آپ کو بدنام نہیں ہونے دوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں پالیٹی ختم ہونے کے بعد اس بچے کو..."

پریتی بستر پر پیچھے کھسکتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر سے دُور ہوتے ہوئے تقریباً چیخ کر بولی "نہیں۔ خبردار! اِس بچے کے لیے کوئی منحوس بات زبان سے نہ نکالنا۔ یہ میرا بچہ ہے۔ یہ اُن کا بچہ ہے۔ وہ سنیں گے تو خوشی سے ناچنے لگیں گے۔"

"کون؟" لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا۔

وہ مسرتوں کے ہجوم میں بڑبڑا رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر کا سوال سُن کر سنبھل گئی۔ الیکشن سے پہلے اور شادی سے پہلے وہ سنجے کا نام لے کر اُسے بدنام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے کہا "یہ نہ پوچھو۔ جب شادی ہوگی تو انھیں دیکھ لینا۔"

وہ حیرانی سے بولی "آپ اتنی بڑی بیرسٹر ہیں۔ کیا اتنا نہیں سمجھتیں کہ مطلب نکلنے کے بعد مرد کسی کا نہیں ہوتا۔ شادی سے پہلے آپ ماں بننے کے لیے اتنی خوش ہو رہی ہے مگر وہ باپ بننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔"

"کیوں نہیں ہوگا؟ وہ تو پندرہ برس سے باپ بننے کے لیے..."

وہ کہتے کہتے ٹھٹھک گئی۔ اُسے خیال آگیا کہ اس طرح باتوں کی روانی میں سنجے کا نام آجائے گا۔ وہ بولی "بس اِس موضوع پر اب میں بات نہیں کروں گی۔"

لیڈی ڈاکٹر اُسے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی لیکن وہ آرام سے لیٹ نہیں سکتی تھی۔ اُس کے اندر بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ جلد از جلد سنجے کو یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی۔ اُس نے ریسیور اُٹھا کر سنجے کی کوٹھی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف نِرملا سے رابطہ قائم ہوا۔ اُس نے کہا "ہیلو میں پریتی بول رہی ہوں۔ کیا آپ اُن سے بات کرا سکتی ہیں؟"

نِرملا کا مسرور لہجہ سنائی دیا "اوہ پریتی! کتنے دِنوں بعد تم سے رابطہ قائم ہوا ہے۔ وہ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ کوئی پیغام دے سکتی ہو تو دے دو۔"

"وہ کہاں مِل سکتے ہیں؟"

"وہ خود نہیں جانتے کہ ایک پل میں یہاں ہیں تو دُوسرے پل کہاں رہیں گے۔ پریتی! میرا ایک مشورہ مانو گی؟"

"ضرور۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ جو چاہیں منوا لیں۔"

"الیکشن کے لیے صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔ اب تم اُن سے نہ ملو۔"

"لیکن ہم تو بہت محتاط ہو کر ملتے ہیں۔"

"پریتی! مخالف اُمیدوار کو احمق نہیں سمجھنا چاہیے۔ اُس کے آدمی سنجے کی کوئی بہت بڑی کمزوری معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں گے۔ میں نے سنجے سے وعدہ لیا ہے کہ وہ الیکشن کا نتیجہ ظاہر ہونے تک تم سے نہیں ملیں گے اور نہ ہی فون پر گفتگو کریں گے۔"

پریتی کو یہ بات بُری لگی۔ جب سے ماں بننے کے آثار پیدا ہوئے تھے، تب سے سنجے پر اُس کا حق زیادہ ہوگیا تھا۔ وہ اُس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا۔ اب وہ سنجے کو بڑے پیار سے حکم دینے والی تھی کہ الیکشن ختم ہوتے ہی فوراً شادی کی جائے تاکہ بچے کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے لیکن نِرملا نے اُن کے درمیان دیوار کھڑی کر دی تھی۔

ویسے یہ بات بُری لگنے کے باوجود پریتی نے ذہانت سے سوچا کہ نِرملا دُرست کہہ رہی ہے۔ سنجے کی کامیابی کے لیے احتیاط لازمی ہے۔ اگر وہ پانچ چھ دن اُس سے ملاقات نہ کرے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ تو جس دن بچے والی خوش خبری سُنے گا اُس دن نِرملا کو طلاق دے کر اُس سے شادی کرے گا۔ "آہ بیچاری نِرملا..." پریتی کو اب بھی اُس بانجھ عورت سے ہمدردی تھی۔

دوسری طرف سے نِرملا کی آواز سنائی دی "کیا سوچ رہی ہو؟ کیا تم کچھ روز خاموش نہیں بیٹھ سکتیں؟"

"ہاں۔ مگر میں انھیں ایک خوش خبری سنانا چاہتی ہوں۔"

"مجھے سنا دو۔ میں اُنھیں سنا دوں گی۔"

"وہ خوش خبری سُن کر آپ کو دُکھ پہنچے گا۔"

"میرے پتی کی خوشی سے مجھے کبھی دُکھ نہیں پہنچے گا۔"

"آپ ضد کر رہی ہیں تو سُن لیں۔ میں سنجے کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

دوسری طرف چُپ لگ گئی۔ پریتی انتظار کرتی رہی۔ پھر کئی سیکنڈ کے بعد اُس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا تمھیں یقین ہے کہ تم؟"

پریتی نے محسوس کیا جیسے نِرملا کی آواز آنسوؤں سے بھر گئی ہو۔ وہ بولی "ہاں۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنے کے بعد مجھے یقین دلایا ہے۔"

"لیڈی ڈاکٹر نے بچے کے باپ کو پوچھا ہوگا؟"

"ہاں۔ میں نے اُسے نہیں بتایا۔ مجھے سنجے کی عزت اور شہرت اپنی عزت سے زیادہ عزیز ہے۔"

"تم بہت اچھی ہو پریتی! میں کس منہ سے تمھارا شکریہ ادا کروں۔"

"آپ شکریہ ادا کرنے کے بدلے ایک مہربانی کردیں۔ سنجے تک یہ خوش خبری پہنچا دیں۔"

"میں انھیں بتا دوں گی۔"

اتنا کہتے ہی رابطہ ختم ہوگیا۔ شاید نِرملا نے اپنا ریسیور رکھ دیا تھا۔ پریتی کی بے چینی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ جلد سے جلد یہ خوش خبری سنجے تک پہنچانا چاہتی تھی۔ بلکہ اُسے اپنی زبان سے سنانا چاہتی تھی

اور جلد میں اُس کی خوشیاں دیکھنا چاہتی تھی لیکن یہ سب کچھ اُس کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا۔

اُس نے وہ رات بستر پر لیٹتے ہوئے اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے گزاری۔ صبح ہوئی تو الیکشن کے لیے چار دن رہ گئے۔ اُس نے سوچا، یہ ٹھیک ہے کہ ابھی سنجے سے نہیں ملنا چاہیے۔ مخالف اُمیدوار کی چالوں سے بچ کر رہنا چاہیے لیکن دماغ میں ایک سوال پیدا ہوا کہ نرملا نے فون پر سنجے سے باتیں کرنے پر بھی پابندی کیوں لگا دی؟ فون پر باتیں کر لینے سے کوئی اُن کے تعلقات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

اُس نے پھر کوٹھی کے نمبر پر سنجے کو کال کیا۔ نرملا نے جواب دیا۔ "وہ نہیں ہیں۔"

"آپ نے بچے والی بات بتائی تھی؟"

وہ ذرا چپ رہی۔ پھر بولی۔ "نہیں۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ سنجے... بچے کی بات سُنیں گے تو اُن کا دھیان بٹ جائے گا۔ وہ انتخابی مہم پر پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔"

پریتی نے ذرا غصے سے کہا۔ "شریمتی نرملا دیوی! آپ باتیں بنا رہی ہیں۔ یہ بچہ میری اور سنجے کی محبت اور شادی کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ ہم دونوں کو زندگی کی سب سے بڑی خوشی اسی بچے سے مل رہی ہے۔ سنجے کا دھیان نہیں بٹے گا وہ اور زیادہ لگن سے انتخابی مہم پر توجہ دیں گے۔ آپ خاموش کیوں ہیں۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے چھپانے سے حقیقت چھُپ جائے گی؟ آپ ذہین اور معاملہ فہم ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ...."

وہ بولتے بولتے اچانک رُک گئی۔ اُسے پتہ چلا کہ وہ روانی میں بولتی چلی جا رہی ہے اور نرملا نے بہت پہلے ہی ریسیور رکھ دیا ہے۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ اُس نے ریسیور کو پٹخ دیا۔ جھنجلاہٹ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ ذرا دیر بعد اُس نے اچانک ہی قہقہہ لگایا۔ "اوہ۔ میں تو خواہ مخواہ جھنجلا رہی ہوں۔ جھنجلاہٹ میں تو نرملا دیوی مبتلا ہوں گی۔ وہ کتنا ہی چھپاتی رہیں۔ سنجے کو تو میں جیت رہی ہوں۔"

وہ ذرا مطمئن ہو گئی۔ اُس کوٹھی کے باہر سنجے کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہ تھا۔ وہ کہیں بھی پہنچ کر اُسے خوش خبری سُنا سکتی تھی مگر اب سرِ عام اُس سے مل کر ایک اسکینڈل کو ہوا دینا دانشمندی نہیں تھی۔ ابھی ذرا صبر سے وہ خوش خبری سنانے میں بھلائی تھی۔

اُس نے شام کو اور رات کو بھی کوٹھی کے نمبروں پر سنجے کو آواز دی۔ نرملا نے وہی جواب دیا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چوبیس گھنٹے ٹیلی فون کے پاس بیٹھی رہتی ہے اور سنجے کو ریسیور اُٹھانے کا موقع نہیں دیتی ہے۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ اب الیکشن میں تین دن رہ گئے تھے۔

وہ اپنے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک ہی سنجے کی... کال آئی۔ پریتی نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر چیخ کر کہا۔ "ہیلو سنجے! آپ کہاں ہیں۔ میں دن رات کوٹھی کے نمبروں پر آپ کو پوچھتی رہتی ہوں۔"

دوسری طرف سے ریسیور کے ذریعہ بہت شور سُنائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ کسی اجلاس میں شرکت کرنے کے دوران بول رہا ہو۔ "پریتی! میں اِس قدر مصروف ہوں کہ اچھی طرح کھانے اور سونے کا وقت نہیں مل رہا ہے۔ تم سے بہت کچھ کہنا ہے مگر صبر کر رہا ہوں۔"

"آپ صبر کریں مگر میں یہ خوش خبری سُنا کر رہوں گی کہ...."

سنجے نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ "بس رُک جاؤ۔ فون پر کچھ نہ کہنا۔ مجھے نرملا نے بتا دیا ہے۔ پریتی! میں بڑی اُلجھنوں میں ہوں۔ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ چار دن تک صبر سے بیٹھی رہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری مجبوریاں سمجھ رہی ہو گی۔"

دوسری طرف سنجے کے علاوہ اور کسی شخص کی آواز سُنائی دی۔ اُس سے دُور اور کتنے ہی لوگ بول رہے تھے۔ سنجے نے ریسیور رکھ دیا۔ پریتی اپنے ہاتھ میں ریسیور پکڑے سوچتی رہ گئی۔ ٹیلی فون پر مختصر سی گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ نرملا نے بچے کے متعلق سنجے کو بتا دیا ہے لیکن وہ اس قدر مصروف ہے کہ بچہ کوئی خاص خوش خبری کا باعث نہ بن سکا۔ وہ مجبوریاں اور اُلجھنیں بھی ظاہر کر رہا تھا۔ یوں بھی پریتی سمجھتی تھی کہ جسے پوری طرح کھانے اور سونے کی فرصت نہ مل رہی ہو اُسے کس قدر ذہنی پریشانیاں ہوں گی اور ذہنی پریشانیوں کے دوران خوشیاں کوئی خاص رنگ نہیں جماتی ہیں۔

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ سنجے کی مجبوریوں کو سمجھتی تھی اِس کے باوجود اُس کے اندر کی بے چینی نہیں جا رہی تھی۔ وہ اپنے وجود کے اندر سنجے کے بچے کو پالنے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سب مل کر دیوانوں کی طرح خوشیاں منائیں۔ دھرم اور سماج اب اُسے ماں بننے کا ادھیکار دے۔ کیونکہ وہ اُس دیش کے لیے سنجے جیسے ذہین اور قابل سیاستدان کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔

شام کو دل کی بے کلی نے گھر سے باہر جانے پر مجبور کیا۔ اُس وقت رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اُس نے سوچا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے سنجے سے نہیں ملنا چاہیے لیکن میں نرملا سے مل سکتی ہوں۔ ایک عورت دوسری عورت سے ملے تو کوئی اسکینڈل نہیں بنائے گا۔ میں نرملا سے ملنے جاؤں گی اور وہاں سنجے مل جائیں گے۔ کوٹھی کے اندر کون دیکھنے آئے گا کہ میں کسی سے مل رہی ہوں۔"

وہ اپنے ہی سامنے اُس کوٹھی میں جانے کا جواز پیش کرتی ہوئی۔ اپنے ہی آپ کو قائل کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ نرملا پہلے تو اُسے دیکھتے ہی پریشان ہوئی پھر وہ مسکراتی ہوئے بولی۔ "آؤ اندر آ جاؤ۔"

پریتی نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اندر جانے والے دروازے کی طرف دیکھا۔ نرملا نے کہا۔ "وہ اندر نہیں ہیں۔ کل سے گھر نہیں آئے

ہیں۔ شاید ابھی آجائیں۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ پریتی نے محسوس کیا کہ نرملا پریشان اور فکرمند ہے۔ اس نے پوچھا: "سیٹھ کل سے کیوں نہیں آئے؟"

نرملا نے جواب دیا: "یوں تو مصروفیات بہت زیادہ ہیں انھیں گھر آنے کی بھی فرصت نہیں ملتی لیکن وہ کل تک تھوڑی دیر کے لیے ضرور آتے تھے۔ جب سے میں نے بتایا ہے کہ تم ان کے بچے کی ماں بننے والی ہو تو وہ باہر اور زیادہ مصروف ہو گئے ہیں۔ شاید انھیں اس گھر سے دور رہ کر سکون مل رہا ہے۔"

پریتی اندر ہی اندر خوشیوں سے بھر گئی۔ اس کے ہونے والے بچے نے سیٹھ کو نرملا سے دور کر دیا تھا۔ اس نے سوچا: "واقعی وہ میرے پاس آنے اور بچے کی خوشی میں مجھے گلے لگانے کے لیے بےتاب ہوں گے لیکن حالات سے مجبور ہیں۔ اب وہ اس گھر میں بھی نہیں آتے۔ ایک بانجھ بیوی کی قربت ناگوار گزرتی ہو گی۔ بچے سے خالی گھر کو دیکھ کر وحشت سی ہوتی ہو گی۔"

سوچنے کے دوران ملازمہ نے آکر کہا کہ میز پر کھانا لگا دیا گیا ہے۔

نرملا نے پریتی سے کھانے کے لیے کہا۔ پریتی نے جواب دیا: "میں اُن کا انتظار کروں گی۔"

"وہ مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ کبھی کھانے پر اُن کا انتظار نہ کیا جائے۔ وہ آج کل باہر سے.... کھا کر آتے ہیں۔ تم کھانے کے بعد بھی اُن کا انتظار کر سکتی ہو۔"

پریتی صوفے سے اُٹھ گئی۔ ڈائننگ ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے نرملا نے کہا: "میں ابھی اپنے کمرے سے آتی ہوں۔"

وہ جلدی سے راستہ بدل کر اپنی خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔ پریتی کھانے کی میز کے پاس آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سیٹھ کے گھر میں آکر اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ مگر وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جیسے صدیوں سے بچھڑا ہوا تھا۔ دس منٹ کے بعد نرملا واپس آئی۔ پریتی نے دیکھا۔ وہ زرد پڑ گئی تھی۔ اس کے بالوں کا جوڑا کھل گیا تھا اور وہ بڑی کمزور سی لگ رہی تھی۔

پریتی نے پوچھا: "کیا بات ہے؟ کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"ہاں۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

یہ کہہ کر نرملا نے کھانے کی میز پر سے ایک چاندی کی کٹوری اٹھائی۔ پھر اُسے اپنے سامنے رکھ کر اس میں سے اچار کا ایک ٹکڑا نکال کر چاٹنے لگی۔ پریتی کے منہ میں پانی آگیا۔ ایسے وقت عورت کھٹے کے لیے للچاتی ہے۔ اس نے چاندی کی دوسری کٹوری اٹھا کر اپنے پاس رکھی پھر اس نے بھی اچار کا ایک ٹکڑا نکالا اُسے اپنی زبان پر رکھا۔ پھر ایک دم سے چونک کر نرملا کو دیکھتے ہوئے بولی: "آ... آپ رات کو اچار کھا رہی ہیں۔ یہ کھٹا کھانے کا کوئی وقت نہیں ہے۔"

"پھر تم کیوں کھا رہی ہو؟"

"میں تو بچے کی ما...."

پریتی کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ نرملا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "میں بھی ماں بننے والی ہوں۔"

"نہیں۔" پریتی چیخ کر کھڑی ہو گئی۔ "آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ بانجھ ہیں۔ پندرہ سولہ برس سے بانجھ ہیں۔"

"اب نہیں رہی۔ بعض بانجھ عورتیں بیس برس کے بعد بھی ماں بن جاتی ہیں۔ قدرت کے تماشوں کو ہم تم نہیں سمجھ سکتے۔ بیٹھ جاؤ۔"

وہ کبھی نہ بیٹھتی لیکن حالات کے اس ڈرامائی انداز سے سر چکرا رہا تھا۔ اس لیے بیٹھ گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نرملا کو دیکھتی رہی اب بھی اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ سامنے والی عورت ماں بن سکتی ہے۔ سامنے والی عورت نے اثبات میں سر ہلا کر کہا: "یقین کر لو۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے میرا بھی معائنہ کیا ہے۔ میں نے تم سے پہلے یہ خوش خبری اُن کو سنائی تھی۔ وہ بہت خوش تھے۔ مصروفیات کے باوجود صبح، دوپہر اور شام کو کھانے کے لیے ضرور آتے تھے۔ کل جب انھیں پتہ چلا کہ تم بھی...."

وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ جیسے آنسو حلق میں آکر اٹک گئے ہوں۔ پھر وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی: "جب میں بانجھ تھی تو اُن کا جھکاؤ تمھاری طرف زیادہ تھا۔ جب لیڈی ڈاکٹر نے میرے حاملہ ہونے کی تصدیق کی تو انھوں نے خوش ہو کر مجھے گلے لگا لیا۔ میرے ہونے والے بچے نے اس بات کی ضمانت دے دی تھی کہ مجھے طلاق نہیں ہو گی مگر تمھارے ہونے والے بچے نے میرا اطمینان ختم کر دیا ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ ایک میز کے اطراف ایک دوسرے کے رُو بہ رُو تھیں۔ دونوں اپنی کوکھ میں ایک ہی مرد کا بچہ لیے بیٹھی تھیں۔ پتہ نہیں وہ مرد کس کی طرف جھکنے والا تھا؟ کس کے حق میں فیصلہ دینے والا تھا۔

نرملا نے کہا: "وہ کل سے میرے پاس نہیں آئے۔ وہ مجھے چاہتے ہیں۔ تمھیں بھی چاہتے ہیں اور اب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ اب اولاد کو بنیاد بنا کر مجھے طلاق دینے اور تم سے شادی کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب صاف طور سے انھیں کہنا ہو گا کہ وہ ہم دونوں میں سے کسے زیادہ چاہتے ہیں؟ کس کی ضرورت زیادہ سمجھتے ہیں؟"

پریتی سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ نرملا کی آنکھوں سے آخر آنسو اُبل ہی پڑے۔ وہ روتے ہوئے بولی: "میں جانتی ہوں کہ میں پندرہ برس پُرانی ہو چکی ہوں اور تم ابھی تر و تازہ ہو۔ بیوی کے حقوق قانونی ہوتے ہیں لیکن مرد محبوبہ کو حقوق زیادہ دیتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم دونوں قانون داں ہو۔ مجھے طلاق دینے کے کتنے ہی قانونی نکتے نکال لو گے۔"

پریتی نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "میں عورت ہوں۔ اپنے ہاتھوں ایک عورت کا گھر برباد نہیں کر سکتی لیکن میں خود برباد ہو چکی ہوں۔ پہلے صرف میری محبت کا مسئلہ تھا اب میرے بچے کے مستقبل کا سوال ہے۔ میں آپ کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں مگر اپنے بچے کے باپ کا نام کسی کو نہیں دے سکتی۔"

وہ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی: "دیوی جی! یہ ہمارا نہیں بچوں کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ کو طلاق مل جائے۔ تب بھی آپ کا بچہ قانونی ہوگا اور اُس کے باپ کا نام سنجے مکرجی ہی رہے گا مگر سنجے سے میری شادی نہ ہوئی تو میرا بچہ کہیں کا نہ رہے گا۔ آپ کو صرف اپنے بچے سے ہمدردی نہ ہو۔ تھوڑی سی ہمدردی میرے بچے سے بھی ہو تو آپ سوچیں کہ انصاف کس بچے سے ہونا چاہیے؟"

اِس بار نرملا کا سر جھک گیا۔ پریتی نے کہا: "انصاف کرنے والے میرے بچے کو ناجائز کہہ سکتے ہیں لیکن بچے کبھی ناجائز نہیں ہوتے۔ حرامی وہ نہیں ہوتا، اُس کے ماں باپ کی حرکتیں۔۔۔ ہوتی ہیں۔ سزا کے طور پر مجھے اور سنجے کو سولی پر چڑھایا جا سکتا ہے لیکن میرے بچے کو ہر حال میں اُس کے باپ کا نام ملنا چاہیے۔"

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کرسی ایک طرف ہٹا کر جانے لگی۔ پھر ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ اُس نے پلٹ کر نرملا کو دیکھا اور کہا: "ہم عورتوں کے سوچنے اور کسی فیصلے تک پہنچنے سے کیا ہوتا ہے؟ تہذیب کی ابتدا سے ہماری تقدیر مرد کی مٹھی میں رہی ہے۔ ہم دونوں سنجے کے فیصلے کی محتاج ہیں اور میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ کس انداز میں فیصلہ کریں گے۔"

نرملا نے مضطرب ہو کر پوچھا: "وہ کس انداز میں فیصلہ کریں گے؟"

پریتی نے جواب دیا: "انھیں فرض آپ کی طرف لے جائے گا لیکن محبت میری طرف کھینچ کر لاتی رہے گی۔ میں کچھ اور وضاحت سے کہہ دوں کہ اگر سنجے الیکشن میں جیت جائیں گے تو میں ہار جاؤں گی۔ کیونکہ وہ عزت اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر ایک حاملہ داشتہ کی خاطر اپنی حاملہ بیوی کو طلاق نہیں دے سکیں گے۔"

خود کو داشتہ کہتے وقت پریتی کے دل کو ٹھیس پہنچی لیکن وہ بولتی رہی: "اگر وہ الیکشن میں ہار جائیں گے تو میں جیت جاؤں گی۔ وہ میری خاطر سیاسی اور سماجی سرگرمیاں چھوڑ کر مجھ سے شادی کریں گے اور میرے بچے کو اپنا نام دیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے پلٹ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ پھر اُس نے گھوم کر کہا: "یہ الیکشن صرف سنجے اور اُن کے مخالف اُمیدوار کے لیے نہیں ہے۔ اِس الیکشن میں میں اور آپ سنجے کی اُمیدوار ہیں۔ وہ جیت کر آپ کے ہوں گے اور ہار کر میرے بن جائیں گے۔ آپ سمجھ لیں کہ یہ الیکشن ہم دو عورتیں لڑ رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر چلی گئی۔

○

پریتی نے دفتر میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ دو ہفتے تک وہ کوئی مقدمہ ہاتھ میں نہیں لے گی۔ اِن دو ہفتوں میں جن مقدمات کی پیشی کے لیے عدالت سے تاریخیں دی گئی تھیں۔ انھیں آگے بڑھانے کے لیے اُس نے عدالت میں درخواست دے دی تھی۔ ابھی دل اور دماغ قابو میں نہیں تھے۔ اُس نے سوچا تھا کہ اگر سنجے کو ان دنوں میں جیت لے گی تو شادی کے بعد ہنی مون منانے کے لیے دو ہفتوں کی چھٹی لازمی ہوگی اور اگر اُسے ہار جائے گی تب بھی رونے، ماتم کرنے اور سنبھلنے کے لیے دو ہفتے کی مہلت ضروری ہوگی۔

کوئی کام نہ کرنے کے باوجود وہ اِس خیال سے دفتر آئی تھی کہ شاید پھر سنجے کا فون آ جائے اور دوسرے دن فون آ ہی گیا۔ اُس نے ریسیور اُٹھا کر اُس کی آواز سُنی تو دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا: "پریتی! پچھلی رات میں نے نرملا کو فون کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ تم وہاں گئی تھیں۔ میں دو دنوں سے بہت پریشان ہوں۔ کل رات تم نے نرملا سے جو کچھ کہا۔ اُسے سُن کر میری پریشانیاں کچھ کم ہو گئیں ہیں۔"

پریتی نے کہا: "میں نے نرملا دیوی سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ میری کس بات سے آپ کی پریشانیاں کم ہو گئیں؟"

اُس نے جواب دیا: "یہی کہ میں جیتنے کے بعد نرملا کا ہی ہوں گا اور ہارنے کے بعد تمھارا بن جاؤں گا۔ تم نے اپنے خیال کے مطابق نرملا کو۔۔۔ یہ فیصلہ سنایا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر انداز میں میں فیصلہ نہیں کر سکوں گا۔"

پریتی نے پوچھا: "میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ کیا آپ کو یہ سُن کر خوشی نہیں ہوئی؟۔۔"

"میں اپنی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ یقین کرو کہ اس الیکشن سے میری دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔ میں ہار جانا چاہتا ہوں۔ میں صرف تمھیں جیتنا چاہتا ہوں تم سے ہونے والے بچے کو مکمل تحفظ دینا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی: "الیکشن میں آپ کی کامیابی سے مجھے اور بچے کو نقصان پہنچے گا۔ پھر بھی میں آپ کی کامیابی چاہتی ہوں۔ کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ میں ناکامی سے مر جاتی مگر میرے بچے کو آپ کا نام مل جاتا۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے پریتی! میں سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ تم سے شادی نہ کر سکا تو ساری عمر تمھاری اور بچے کی بدنامی کا باعث بنا رہوں گا۔"

"ہم سے بڑی سنگین غلطی ہو گئی۔ ایسی غلطی کی سزا کسی کو نہیں ملتی اور کسی کو ملتی ہے۔ میں انتظار کروں گی کہ مجھے کیا ملتا ہے اور کیا نہیں ملتا؟ ایک بات آپ یاد رکھیں۔ اگر فیصلہ نرملا دیوی کے حق میں ہوا تو پھر آپ میری طرف کبھی رُخ نہیں کریں گے۔ کبھی اپنی

آواز بھی مجھے نہیں سنائیں گے۔"

"ایسا نہ کہو پریتی! میں سوچ رہا ہوں کہ بیوی نہ بنا سکا تو ممبر بننے کے بعد تمہیں پرسنل سیکریٹری بنا کر اپنے قریب رکھوں گا۔"

"پرسنل سیکریٹری کے بچے کا کیا بنے گا؟ آپ یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں بیوی نہ بن سکی تو سیکریٹری کے بہانے داشتہ بن کر رہوں گی۔ کیا اتنے عرصہ میں آپ نے یہی میرے مزاج کو سمجھا ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ میں بیوی بننے کا خواب دیکھتے ہوئے خود کو آپ کے حوالے کرنے کی حماقت کرتی رہی۔ اس حماقت کی سزا مجھے ہی ملے گی۔ آپ مجھے داشتہ بنائے رکھنے کی بات کہہ کر میری توہین تو نہ کریں۔"

"سوری پریتی! میں تمہیں قریب رکھنے کی کتنی ہی الٹی سیدھی تدبیریں سوچتا رہتا ہوں۔ صرف تمہاری محبت میں ایسی غلط بات کہہ گیا۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔"

"ہماری زندگی میں آئندہ تین دن ہی رہ گئے ہیں۔ تین دن بعد یا تو آپ ہمیشہ کیلئے مجھے اپنا لیں گے یا پھر کبھی اپنی صورت نہیں دکھائیں گے۔ ابھی آپ وعدہ کریں۔"

ایک طویل سانس چھوڑنے کی آواز آئی۔ پھر اُس نے کہا۔ "اچھا وعدہ کرتا ہوں۔ مجھے اب اجازت دو اور الیکشن میں میری ناکامی کی دعا مانگتی رہو۔"

سلسلہ منقطع ہوگیا۔ پریتی ریسیور رکھ کر سنجے کو تصور میں دیکھنے لگی۔ اس سے جو گفتگو ہوئی تھی اس پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اُس نے نرملا کے متعلق بات کی مگر اُس سے ہونے والے بچے کو نظر انداز کرتا رہا اور پریتی سے ملنے والے بچے کے تحفظ کی بات کرتا رہا۔ یعنی نرملا اُس کے بچے کی ماں بن کر بھی اُسے جیت نہیں سکتی تھی۔ اُس کے دل و دماغ پر پریتی کی حکومت تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ الیکشن میں کامیابی کے بعد وہ نرملا کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جاتا۔

یہ بات درست تھی کہ وہ الیکشن وہ عورتیں لڑ رہی تھیں۔

آخر الیکشن کا دن طلوع ہوگیا۔ وہ صبح سے پریشان رہنے لگی۔ آج رات تک اُس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اس نے پروگرام بنایا تھا کہ مکمل نتیجہ نشر ہونے تک وہ اپنی خواب گاہ میں رہے گی اور ٹی وی کو آن رکھے گی۔ ہاں ووٹ ڈالنے کیلیے البتہ باہر جانا پڑا۔

ووٹرز بوتھ کے اندر جاتے وقت اُس کے ہاتھ میں ایک قیمتی ووٹ کی پرچی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک دھڑک کر سمجھا رہا تھا۔ "پریتی! ذرا سوچ سمجھ کر۔ اگر تم سنجے کے حق میں ووٹ دو گی تو وہ ووٹ تمہارے خلاف ہوگا۔ تم سنجے کے مخالف اُمیدوار کو ووٹ دے کر کامیاب ہو سکتی ہو۔"

لیکن محبت مجبور سے ہوتی ہے۔ مجبور کے طرح سے ہوتی ہے؟

زمل سے نہیں ہوتی۔ وہ سنجے کے حق میں اور اپنی مخالفت میں ووٹ دے کر بوتھ سے باہر آگئی۔ اب وہ انجام کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ جو ہونا ہے وہ ہو تا رہے گا۔ اُس نے سوچا کہ وہ کچھ نہیں سوچے گی۔ اور کچھ نہیں سوچنے کی بات سوچتی رہی۔

وہ اپنی خواب گاہ میں کبھی اُٹھ رہی تھی۔ کبھی بیٹھ رہی تھی اور کبھی ٹہل رہی تھی۔ ٹھیک سات بجے شام کو ٹی وی کے اناؤنسر نے کہا۔ "ناظرین! جیسا کہ آپ جانتے ہیں حلقہ نمبر۲ میں سنجے سکھر جی اور گوپال کھوٹے کے درمیان مقابلہ ہے۔ ہم اُس کا تجزیہ پیش کر رہے ہیں۔"

پریتی صوفہ پر بیٹھ گئی۔ صوفہ کے ہتھوں کو اُس نے دونوں طرف مضبوطی سے جکڑ لیا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اناؤنسر ..... لاکھوں ناظرین اور کروڑوں سامعین کو ایک کنواری ماں کی تقدیر کا فیصلہ سنا رہا تھا کہ آج کے بعد اُس کا بچہ جائز کہلائے گا۔ یا پھر ماں کی کوکھ ہی اس بچے کا مقبرہ بن جائے گی۔

اناؤنسر نے کہا۔ "ابتدائی نتیجے کے مطابق شری مان گوپال کھوٹے نے اب تک دو لاکھ اکیس ہزار تین سو پچھتر ووٹ حاصل کیے ہیں اور شری مان سنجے سکھر جی کے حصے میں دو لاکھ چودہ ہزار آٹھ سو پچاس ووٹ آئے ہیں۔ اس گنتی کے مطابق شری مان گوپال کھوٹے نے تین فیصد ووٹ زیادہ حاصل کیے ہیں۔"

پریتی کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی تقدیر کا فیصلہ فیصد کے حساب سے سنایا جا رہا ہو اور لاکھوں کروڑوں لوگ آ کر ایک ایک ووٹ کی بھیک دے رہے ہوں۔ دیکھ کر دیکھ رہا ہے ہوں کہ سنجے کے ساتھ وہ رہے گی یا نرملا؟

سنجے تین فیصد ووٹوں سے ہار رہا تھا۔ یہ بات کا اُسے دکھ ہوا لیکن یہ تقدیر کا فیصلہ تھا۔ پریتی کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اُتر گیا تھا۔ اُس کے اندر ایک انگڑائی ٹوٹنے لگی۔ اُس نے انگڑائی لی تو بھوک لگنے لگی۔ یاد آیا کہ اُس نے فکر اور پریشانی میں صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ گھر میں ڈبل روٹی رکھی ہوئی تھی۔ وہ ٹی وی کا ساؤنڈ بڑھا کر انڈا پھینٹ کرنے کیلیے کچن میں چلی گئی۔

ٹی وی کی آواز کچن تک پہنچ رہی تھی۔ کبھی گانے اور ہنسی مذاق کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا اور کبھی الیکشن کے نتائج پیش کیے جاتے تھے۔ رات کے دس بجے بھی گوپال کھوٹے تین فیصد کی برتری حاصل کر رہا تھا۔ پریتی بے اختیار گنگنا رہی تھی۔ وہ خوش نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن مقدر اُسے خوش کر رہا تھا۔

رات کے ایک بجے تک اسی فیصد ووٹ گنے جا چکے تھے گوپال کھوٹے اب بھی ڈھائی فیصد کی برتری حاصل کر رہا تھا۔ سنجے سکھر جی کی

شکست مل چکی تھی۔ پرتیی لباس تبدیل کرنے لگی۔ اُس نے سنگھار کیا۔ بہترین ساڑھی پہنی۔ آخری نتیجہ سنتے ہی وہ سنجے سے اپنی کامیابی کی مبارک باد حاصل کرنے کیلئے اُس کی کوٹھی کی طرف جانے والی تھی۔

دو بج کر چالیس منٹ پر اچانک ہی اناؤنسر چیخنے لگا۔

"بھارتی پارلیمنٹ کے انتخابات میں یہ حیرت انگیز مقابلہ ہے۔ دہلی سے موصول ہونے والے آخری نتیجے کے مطابق مسٹر سنجے مکرجی نے مسٹر گوپال کھوتے کو ایک فیصد ووٹوں سے شکست دے دی ہے۔ ہم مسٹر سنجے مکرجی کو کامیابی کی مبارک باد دیتے ہیں۔"

فیصلہ ہو گیا۔ پرتیی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اسکرین پر سنجے کی تصویر دکھائی جا رہی تھی لیکن پرتیی کی آنکھوں میں اتنے آنسو تھے کہ وہ تصویر، وہ ٹی وی اور آس پاس کی دُنیا دھندلا رہی تھی۔

اُس نے آہستہ آہستہ ساڑھی اُتار دی۔ تقدیر نے اب اُسے کنگال کر دیا تھا۔

اُس نے جوڑا کھول دیا۔ جوانی کی بھول اب بال کھول کر رُلائے گی۔

ٹی وی کو بند کر دیا۔ کیونکہ سنجے کی صورت آئندہ نہ دیکھنے کی بات طے پا چکی تھی۔ اب وہ کیسے زندگی گزارے گی؟ اب اس بچے کا کیا بنے گا؟ اب یہ سارے مسائل اُس کے اپنے تھے۔ اُسے بچے کے ساتھ جینا تھا۔ یا مرنا تھا۔ یہ فیصلے دوسرے دن بھی ہو سکتے تھے۔ ابھی سنجے کی اچانک جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ دل کٹ رہا تھا۔ وہ آخری بار اپنے محبوب سے لپٹ کر رونا چاہتی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میلے کپڑوں کی باسکٹ کے پاس گئی۔ وہاں سے اُس نے سنجے کی قمیص اور پاجامہ نکال کر پہن لیا۔ کپڑے پہن کر دوڑتی ہوئی آئی اور بستر پر اوندھے منہ گر کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

☆

وہ اچانک ہی تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔ اب آنے والے دن اُس کے منہ پر تھوکتے ہوئے گزرنے والے تھے۔ وہ ایک بیرسٹر کی حیثیت سے بڑی محنت اور ذہانت سے اپنا کیریئر بناتی آئی تھی۔ اب اُس کے تمام کیریئر پر ایک گناہگار کے منہ کی طرح کالک پھرنے والی تھی۔ وہ بچہ جو پیار کا انعام ہوتا۔ وہ اب گالی بن کر اُس کی کوکھ سے جنم لینے والا تھا۔

اُس رات وہ روتے روتے سو گئی۔ دن کے دس بجے آنکھ کھلی تو دل کو دھچکا لگا۔ اُس کا بستر سنجے کے بھاری بھرکم وجود سے خالی تھا۔ اور اب ہمیشہ خالی رہے گا۔ ایک دم سے یوں لگا جیسے وہ بستر کی طرح اندر سے بالکل خالی ہو گئی ہے۔ سنجے اس بستر کے سارے اور اُس کے سارے سپنے اُس کے اندر سے نوچ کر لے گیا ہے۔ ایک بن بیاہی عورت کیلئے یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ اُس سے اُس کی پیچ کے سارے سپنے چھین لیے جائیں۔

وہ پھر رونے لگی۔ پتہ نہیں کہیں رونا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ جیسے اوپر سے کوئی بوجھ اُتر رہا ہو۔ وہ کبھی آہیں بھر کر چپ ہو جاتی اور کبھی پھر رونا شروع کر دیتی۔ دوپہر تک یہ سمجھ میں آ گیا کہ کوئی اُس کے آنسو پونچھنے نہیں آئے گا بلکہ آنسو دیکھنے بھی نہیں آئے گا۔ جب وہ چند ماہ بعد گھر سے نکلا کرے گی تو لوگ اُس کے آنسو نہیں اُس کا پیٹ دیکھا کریں گے۔

وہ بے اختیار اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کے وجود کے اندر سنجے کی نشانی کہیں چھپی ہوئی تھی اور وہاں وہ پرورش پا رہی تھی۔ ابھی پیٹ پر ہاتھ رکھنے سے اُس کا سراغ نہیں مل سکتا تھا۔ ابھی تک صرف ایک ہی لیڈی ڈاکٹر نے سراغ لگایا تھا کہ بچہ ہے اور وہ بچہ اب صرف پرتیی کا تھا۔ اُسے کسی باپ کا نام نہیں ملنے والا تھا۔

وہ یہ سوچتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی کہ رونا تو ساری زندگی کا ہے لیکن سب سے پہلے اُس بچے کا تحفظ ضروری ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے اشارتاً کہا تھا کہ وہ اُس بچے کو ضائع کر سکتی ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور پرتیی کی عزت رہ جائے گی۔ وہ پھر سے غیر شادی شدہ کہلائے گی۔

سنجے نے محبت کی ایسی مار ماری تھی کہ اب غیر شادی شدہ کہلانے کا شوق نہیں رہا تھا۔ وہ محبوبہ کی حیثیت سے ہار چکی تھی۔ لیکن ماں کی حیثیت سے اولاد کو ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بچہ اُس کی ہاری ہوئی محبت کا سرمایہ تھا۔ اب وہ اسی طرح جیت رہی تھی کہ سنجے جانے کے باوجود اُس کے اندر سے نہیں گیا تھا۔ وہ ہر حال میں اُس بچے کا تحفظ چاہتی تھی۔ اُسے جنم دے کر دوسرا سنجے بنانا چاہتی تھی اور ایسا کرنے کیلئے اُس بچے کو ایک باپ کا نام دینا ضروری تھا۔

تو پھر اُسے کس باپ کا نام ملے گا؟ کیسے ملے گا؟ اگر ملے گا تو اُسے بچے کا باپ بنانے سے پہلے اپنا شوہر بنانا پڑے گا اور یہ بات ایسی تھی کہ سوچنے سے اُس کے عورت پن کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ ایک تو اُس نے ستائیس برس تک شادی کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ملک کی نامور بیرسٹر بننا چاہتی تھی۔ ناموری کے لیے سنجے کا سہارا لیا تو اُس کے آگے سب کچھ ہارتی چلی گئی۔ وہ کوئی بازاری عورت تو تھی نہیں کہ ایک کے بعد دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ وہ سنجے کے بعد اپنی ذات پر کسی کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اسی سوچ میں سارا دن ساری رات گزر گئی کہ شادی کے بغیر اُس کے بچے کو باپ کا نام اور دُنیا میں جائز مقام کیسے ملے گا؟ اُسے جلد سے جلد فیصلہ کرنا تھا۔ وہ سوچنے میں جتنے دن ضائع کرتی، اپنی اور بچے کی بدنامی مقدر بناتی جاتی۔ بیکس اُسے یوں لگ رہا تھا کہ

اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں۔ اگر وہ کسی سے مشورہ نہیں لے گی تو ذلت کی پستیوں میں گرتی چلی جائے گی۔

وہ اپنی اُس خوکلا لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی۔ وہی ایک عورت اُس راز کو جانتی تھی۔ اُس نے پریتی کی ساری بپتا سننے کے بعد کہا: "پریتی جی! میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ یہ مرد کس کے؟ مطلب نکلا کھسکے۔ میں جھوٹ نہیں بولتی میرے پاس آئے دن ایسے درجنوں کیس آتے ہیں اور میں ان لڑکیوں کو ماں بننے سے نجات دلا دیتی ہوں۔"

پریتی نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ جلدی سے بولی: "مانا آپ بہت بڑی بیرسٹر ہیں اور میں قانون کے خلاف ایسے کام کرتی ہوں مگر یہ تو سوچیں کہ میں کتنے گھرانوں کی عزت رکھ لیتی ہوں۔ میرے سینے میں ہزاروں راز دفن ہیں اور آپ کا راز بھی میرے ساتھ میری چتا تک جائے گا۔"

پریتی نے ٹھوس لہجے میں کہا: "میں یہاں اپنی ممتا کا گلا گھونٹنے نہیں آئی ہوں۔ میں اِس بچے کی سلامتی کے لیے تم سے مشورہ لینے آئی ہوں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا: "آ۔ آپ اُسے ضائع نہیں کریں گی؟ آپ اُسے جنم دیں گی؟"

"ہاں۔ ہر حال میں جنم دوں گی۔"

"پریتی جی! آپ کوئی گمنام ہستی نہیں ہیں۔ آپ کی عزت ہے، شہرت ہے۔ یہاں سے دلی تک عدالتوں میں آپ کے نام کا رعب اور دبدبہ ہے۔ کیا آپ۔۔۔۔"

پریتی نے بات کاٹ کر کہا: "میں یہ سب کچھ داؤ پر لگا دوں گی۔ تم عورت ہو۔ یہ سوچو کہ اپنی آبرو دے کر جس بچے کو حاصل کیا ہے وہ میرے لیے کتنا اہم ہوگا۔"

لیڈی ڈاکٹر بدستور حیرانی سے اُس کا منہ تک رہی تھی۔ وہ بولی: "میں تم سے مشورہ لینے آئی ہوں کہ میرے بچے کو ایک باپ کا نام کیسے ملے گا؟ میں بہت اُلجھی ہوئی ہوں۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا ہے۔"

"آپ مجھے اُس آدمی کا نام بتائیں جس نے آپ کو تباہ کیا ہے۔"

"اُس کا نام میرے ساتھ میری چتا تک جائے گا۔"

"اوہ۔ آپ اب بھی اُس کی عزت رکھ رہی ہیں۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آپ اُسے اس قدر چاہتی ہیں۔"

"میں چاہت کا حساب کرنے نہیں اپنے بچے کی سلامتی کیلئے کوئی راستہ ڈھونڈنے آئی ہوں۔"

"ایک ہی راستہ ہے آپ جلد سے جلد شادی کر لیں۔ جو بھی شوہر ہوگا، وہ حقیقت کو سمجھ نہیں پائے گا۔ ایک مرد نے آپ کو دھوکا دیا۔ آپ دوسرے مرد کو دھوکا دینے کا حق رکھتی ہیں۔ ہم اپنی دنیا میں فریب کھائے اور فریب دیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ایک کے بعد دوسرے مرد کا سایہ بھی مجھے ناگوار گزرے گا۔ کیا اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی؟"

لیڈی ڈاکٹر اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے سوچنے لگی اور بڑبڑانے لگی: "بڑی مشکل ہے۔ شادی کے بغیر بچہ جائز نہیں ہوگا۔ آپ سُندر ہیں۔ جوان ہیں اور مرد بڑے ندیدے ہیں۔ اگر کوئی آپ سے ہمدردی کے لیے تیار بھی ہوا تو آپ کو آپ سے وصل کیے بغیر اُس بچے کا باپ بننے کیلئے راضی نہیں ہوگا۔ پھر یہ کہ کسی کو بتانا ہی نہیں ہے کہ آپ پہلے سے حاملہ ہیں اور آپ کسی مرد کو۔۔۔ اپنے پاس بھٹکنے نہیں دینا چاہتیں۔ بڑی مشکل ہے۔ بات کیسے بنے گی؟"

وہ بڑبڑانے کے دوران رک گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی: "ایک تدبیر ہے کسی بہت ہی بوڑھے اور بالکل ہی ناکارہ آدمی سے آپ شادی کر سکتی ہیں۔ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

پریتی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "دنیا والے ایسے بھی احمق نہیں ہیں جو بالکل ہی بوڑھا اور ناکارہ ہوگا۔ اُس سے شادی کے بعد کوئی ماں کیسے بن سکے گی؟"

"ہاں۔ یہ دنیا والے سوچ سکتے ہیں۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ "پھر کیا کیا جائے؟ اچھا کسی ایسے شخص سے شادی کریں جو سخت بیمار ہو اور اُس کے بچنے کی کوئی اُمید نہ ہو۔"

پریتی نے پوچھا: "ایسا شخص اپنی زندگی کی فکر میں ہوگا۔ جس کی نبض ڈوب رہی ہو۔ وہ لگن منڈپ میں سات پھیرے بھی نہیں لگا سکے گا۔ بیٹھے سے گر کے مر جائے گا۔ تم تو مجھ سے بھی زیادہ بے تکے انداز میں سوچ رہی ہو۔"

لیڈی ڈاکٹر اچانک صوفے سے اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ خوش ہو کر بولی: "آ گئی تدبیر۔ فرسٹ کلاس تدبیر ہے۔ آپ بیرسٹر ہیں نا۔ آپ جانتی ہوں گی کہ ہفتے دو ہفتے کے اندر کتنے مجرم پھانسی پانے والے ہیں۔ بس کسی ایک پھانسی پانے والے سے شادی کر لیں۔ وہ شوہر بنے رہنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔"

پریتی نے اپنی پیشانی پہ ہاتھ مار کر بیزاری سے کہا: "ڈاکٹر شیلا! بھگوان کے لیے مجھے گڑھے میں گرنے کا مشورہ نہ دو۔ اوّل تو ایک پھانسی پانے والے سے ہونے والی شادی مضحکہ خیز بن جائے گی۔ پھر یہ کہ میں اپنے بچے کو کیا ایک قاتل باپ کا نام دوں گی؟ نہیں کبھی نہیں۔"

ڈاکٹر شیلا نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "پریتی جی! ایسے ہی لوگوں کے متعلق سوچا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی شریف آدمی ناجائز بچے کا باپ بننا یا آپ کا دکھاوے کا شوہر بننا پسند نہیں کرے گا۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر شیلا نے فون کے پاس جا کر ریسیور اُٹھایا پھر کسی سے باتیں کرنے لگی۔ پریتی سوچ میں ڈوب گئی۔

اب اُس کے ساتھ یہ ہو رہا تھا کہ وہ بچے کا مسئلہ حل کرنے کے لیے جب بھی سوچنا شروع کرتی تو نیچے نگاہوں کے سامنے آ کر مسکرانے لگتا۔ پہلے وہ مسکراتا تھا تو پرتیتی کے لبوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ پھر وہ چونک کر آس پاس دیکھنے لگی تھی کہ کوئی اُسے تنہائی میں خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اب وہ تصور میں آ کر مسکراتا تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو آنے لگتے۔ اُس نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا کہ کہیں ڈاکٹر شیلا نے اُس کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں دیکھ لیے۔

ڈاکٹر شیلا فون پر باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ پتہ نہیں اُس کی گفت گو کے دوران کون سا ایسا لفظ آیا کہ پرتیتی کو اُس لفظ کے حوالے سے ایک مقدمہ یاد آ گیا۔ وہ ایک جوان عورت کا مقدمہ تھا۔ عورت اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی تھی اور شوہر اُسے چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر عورت نے بھری عدالت میں کہہ دیا تھا کہ وہ شوہر بننے کے قابل نہیں ہے۔

مرد کی گردن شرم سے جھک گئی تھی۔ اُس کے وکیل نے کہا تھا کہ عورت جھوٹ کہتی ہے۔ میرے مؤکل کا طبّی معائنہ کرایا جا سکتا ہے۔ وکیل کے اس دعوے پر وہ شخص پریشان ہو گیا تھا اور اُس نے طبّی معائنہ کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس مقدمہ کی تفصیل یاد آتے ہی پرتیتی اُٹھ کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر شیلا نے بات ختم کرنے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹھیے کہاں جا رہی ہیں؟"

پرتیتی نے اُسے اُس مقدمہ کی رُوداد سنانے کے بعد کہا۔ "مجھے اُس شخص سے شادی کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر شیلا نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ اگر وہ دوبارہ شادی کے لیے راضی ہو جائے تو شوہر کے بجائے سہیلی بن کر رہے گا۔"

"شیلا! میرے ساتھ ابھی دفتر چلو۔ وہاں کسی فائل میں اُس شخص کا پتہ موجود ہے۔ مجھے یاد آیا اُس کا نام راجیش ہے۔ تم چاہو تو اُسے شادی کے لیے راضی کر سکتی ہو لیکن اُسے یہ نہ معلوم ہو کہ یہ پیشکش میری طرف سے ہے۔"

"پرتیتی جی! میں اتنی نادان نہیں ہوں۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اُسے اُلّو بنا کر آپ کے ساتھ سات پھیرے لگوا دوں گی۔"

اُن دونوں نے اُسی وقت دفتر جا کر راجیش کا پتہ نوٹ کیا۔ پھر ڈاکٹر شیلا نے کہا۔ "آپ یہیں دفتر میں بیٹھیں۔ میں راجیش کے پاس جا رہی ہوں۔ کہیں سے فون کر کے بتاؤں گی کہ اُس کے ساتھ میری ملاقات کیسی رہی۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ پرتیتی اپنے دفتر میں بیٹھ کر ٹیلی فون کی طرف حسرت سے دیکھنے لگی کیونکہ اُسی ٹیلی فون پر نیچے سے باتیں ہوتی تھیں اور اُس سے ملاقات کا وقت اور مقام مقرر ہوا کرتا تھا۔ جب گفت گو ختم ہو جاتی تو وہ رابطہ ختم کرنے سے پہلے اُدھر ریسیور کو چومتا، اِدھر یہ شرما جاتی۔

وہ سوچتے سوچتے سب کچھ بھول کر شرمانے لگی۔ اچانک ہی فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ وہ گھبرا کر آس پاس دیکھنے لگی۔ کسی نے اُسے شرماتے تو نہیں دیکھا ہے؟ نہیں دفتر میں کوئی نہ تھا۔ اُس نے ریسیور اُٹھا کر کہا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے نیچے کی آواز سنتے ہی کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ریسیور ہاتھ سے چھوٹنے ہی والا تھا مگر وہ سنبھل گئی۔ ریسیور سے آواز آ رہی تھی۔ "پرتیتی! یہ تم ہو نا؟"

وہ چپ رہی۔ اُس نے التجا کی۔ "بولو پرتیتی! میں تمہارے لیے فکرمند ہوں۔ تم نے مجھے بدنام نہ کر کے جو احسان کیا ہے اُس کے آگے میری گردن جھک گئی ہے۔"

پرتیتی نے دل میں کہا۔ "آہ! میں اپنی محبت کو رسوائی سے بچا رہی ہوں اور یہ غیروں کی طرح احسان مان رہے ہیں۔ اُف! یہ مرد کتنی جلدی پرائے بن کر بولنے لگتے ہیں۔"

وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔ وہی بول رہا تھا۔ "میں جانتا ہوں تم کیسے فولادی ارادے کی مالک ہو۔ اُس بچے کو سلامت رکھو گی۔ اگر تم میری ایک تجویز مان لو تو میں تم اور نرملا تینوں مل کر اس بچے کی پرورش کریں گے۔ بولو میری تجویز مان لو گی؟"

بڑی دیر بعد وہ بولی۔ "میں نے کہا تھا کہ آئندہ آپ اپنی آواز بھی نہیں سنائیں گے۔"

"میں تمہیں مخاطب کرنے پر مجبور ہوں۔ سنو! میں نے اور نرملا نے بڑی اچھی پلاننگ کی ہے۔ اگر تم ایک سال کے لیے یہ شہر چھوڑ دو تو نرملا فوراً ایک علاقہ میں تمہاری رہائش کا انتظام کر دے گی۔ پھر وہ خود اپنی زچگی کے وقت تمہارے پاس آ جائے گی۔ اُس کے حساب سے دو تین ہفتے کے وقفہ سے تم اور نرملا بچوں کو جنم دو گی پھر وہاں سے ہم اپنے رشتے داروں کو اطلاع بھیجیں گے کہ نرملا نے دو بچوں کو جنم دیا ہے۔"

"اچھا اِس طرح وہ میرے بچے کو بھی لے کر چلی جائیں گی؟"

"ہاں۔ اِس طرح تمہارا فائدہ ہے۔ ایک تو اُس بچے کو میرا نام مل جائے گا۔ دوسرے تم بدنامی سے بچ جاؤ گی۔"

"اور آپ کے خیال میں سارے مسائل حل ہو جائیں گے؟"

"ہاں پرتیتی! تم خود غور کرو۔"

"آپ غور کریں۔ آپ نے میرے خوابوں کی تعبیر چھین لی۔ میرا اچھوتا پن چھین لیا۔ اب میرے بچے کو بھی چھین کر نرملا دیوی کی گود میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ میرے پاس ایک جان رہ گئی ہے۔ اسے بھی کیوں نہیں لے لیتے۔"

"پرتی میں تمھاری عزت کی خاطر..."

"میری عزت ہے کہاں؟ آپ نے تو اُس کی دھجیاں اُڑا دیں۔ آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو میری عزت کی خاطر نہیں محبت کی خاطر کریں۔ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ محبت میں جو قربانیاں ہیں نے دی ہیں۔ کیا آپ دے سکتے ہیں؟ میں مانتی ہوں کہ آپ ذہین سیاست داں ہیں مگر میرے بچے کو مجھ سے چھین لینے کی سیاست پر عمل نہ کریں۔ آپ کو مایوسی ہوگی۔"

یہ کہہ کر اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ اُسے بچے سے بڑی مایوسی ہوئی تھی کیونکہ اُس نے اُس کے ہونے والے بچے کو اپنا نام اور اپنا تحفظ دینے کی تدبیر سوچ لی تھی لیکن پرتی کے احساسات و جذبات کو بالکل بھول چکا تھا۔ پہلے اُس نے مجبوریوں کی محبت کو کچلا۔ اب اُس سے بچے کر اُس کی ممتا کو کچلنا چاہتا تھا۔

فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اُس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ سنجے بول رہا تھا "پرتی! میں مجبور ہوں کہ تم سے براہِ راست مل نہیں سکتا اور فون پر تمھیں سمجھا نہیں سکتا کہ میں کس قدر خلوصِ دل سے تمھیں بدنامی سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں خود غرض نہیں ہوں۔ میں..."

"آپ زیادہ نہ بولیں۔ میں خود کو بدنامی سے بچانا جانتی ہوں۔ میں اپنے بچے کے ساتھ عزت سے زندہ رہ کر دکھا دوں گی۔ میں اور میرا بچہ آپ کے محتاج نہیں رہیں گے۔ آپ محبت نہیں دے سکتے۔ میں بھیک نہیں لے سکتی۔ بھگوان کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیجیے۔ آئندہ آپ کو فون پر میری آواز سنائی نہیں دے گی۔"

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ ذرا سی دیر میں پھر گھنٹی سنائی دی۔ اُس نے ریسیور اٹھا کر آواز سنی۔ سنجے بول رہا تھا۔ اُس نے کچھ سنے اور جواب دیے بغیر پھر ریسیور رکھ دیا۔ اُس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پرتی بڑی دیر تک سوالیہ نظروں سے ٹیلی فون کو گھورتی رہی۔ پھر وہ بے اختیار ریسیور کو اٹھا کر چومنے لگی۔ اُسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ساری عمر کا رونا ہو تب بھی کوئی آنکھوں سے رو نہیں سکتا۔ رونے تھک جاتا ہے۔ پرتی تھک کر چپ ہوگئی۔ دو گھنٹے کے بعد پھر ٹیلی فون نے شور مچایا۔ پھر دل کی دھڑکنیں پاگل ہونے لگیں۔ اُس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ڈاکٹر شیلا رازدارانہ انداز میں بول رہی تھی۔ "پرتی جی! آج رات میں نے راجیش کو کھانے پر اپنے ہاں بلایا ہے۔ آپ ابھی سے میرے ہاں پہنچ جائیں۔ میں وہاں اطمینان سے ساری باتیں بتاؤں گی۔"

پرتی نے پوچھا "کچھ معلوم تو ہو کہ میرا کام بنے گا یا نہیں؟"

"بنے گا۔ وہ تو آپ کی بڑی عزت کرتا ہے۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ کچھ رومانی انداز میں آپ کو چاہتا ہے۔ سچ بولتی ہوں۔ ایک دم بانس کی طرح سیدھا ہے۔ بڑی جلدی شیشے میں اُتر جائے گا۔ بس اب آپ آئیں گی تو باتیں ہوں گی۔"

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ راجیش کے متعلق سوچنے لگی "کیا وہ اتنی جلدی شادی کے لیے راضی ہو جائے گا؟ وہ تو کہے گا اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ چار چھ ماہ بعد دھوم دھام سے شادی ہو سکتی ہے۔ تب میں کیا کہہ سکوں گی؟"

ایک گھنٹہ بعد اُس نے ڈاکٹر شیلا کے ہاں پہنچ کر اُس سے یہی سوال کیا۔ شیلا نے جواب دیا "پرتی جی! میں نے راجیش سے پوچھا تھا کہ کورٹ میں طلاق ہونے کے بعد اُس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ اُس نے جواب دیا کہ اس طلاق کے مقدمے کے بعد اُس کی بڑی بدنامی ہوئی ہے۔ اُس کی برادری اور جان پہچان والوں میں کوئی اُسے لڑکی نہیں دیتا ہے۔"

پرتی نے پوچھا "جب وہ شادی کے قابل نہیں ہے تو شادی کیوں کرنا چاہتا ہے؟"

"اپنا بھرم رکھنے کے لیے۔" شیلا نے تلخی سے کہا "یہ دنیا اوپر سے ڈھول ہے۔ اندر سے پول ہے۔ میرے پاس ایسے کھوکھلے مریض علاج کے لیے آتے ہیں، جو اوپر سے بالکل نارمل اور صحت مند نظر آتے ہیں اور رازداری کے سلسلہ میں بھاری فیس ادا کرتے ہیں۔ میں آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ راجیش سے شرمانے یا جھجکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ آج ہی اپنی شرائط پر شادی کی بات چھیڑ دیں۔"

"ہیں۔ مگر میں اپنی زبان سے اپنی شادی کی بات کیسے کر سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں کر سکتیں۔ بھئی وہاں شرمایا جاتا ہے جہاں سچ مچ کسی کو شوہر بنانا ہوتا ہے۔ وہ تو ایک ڈمی ہوگا۔ اپنی پچھلی بھول کو چھپانے کے لیے وہ ایک پردہ ہوگا۔ پردے سے کیا پردہ کرنا؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر عجیب سا لگتا ہے۔ میری ہمت نہیں پڑے گی۔"

"پرتی جی! اگر آپ نے ہمت نہ کی اور راجیش ہاتھ سے نکل گیا تو اپنے بچے کو جائز بنانے کے لیے ایسا آدمی کہیں نہیں ملے گا۔ سوچ لیں ابھی وقت ہے۔"

وہ سوچتی رہی۔ خود کو بے شرمی سے باتیں کرنے پر آمادہ کرتی رہی۔ اپنے آپ کو سمجھاتی رہی کہ عورت عورت سے بے دھڑک باتیں کر لیتی ہے۔ وہ بھی تو ایک سیل جیسا ہوگا۔ بھلا اُس سے کیا شرمانا؟

جب وہ رات کو کھانے پر آیا تو پرتی اُسے دیکھتے ہی ذرا مرعوب ہوگئی کیونکہ وہ ایک قد آور صحت مند اور خوبرو جوان تھا چونکہ مرد تھا۔ اس لیے صنفِ مخالف کو متاثر کرنے والا مرد ہی نظر آ رہا تھا۔ خواہ وہ حقیقتاً کتنا ہی کھوکھلا کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر شیلا نے دونوں کو ایک

ڈوکٹر سے متعارف کرایا۔ پھر انھیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

راجیش نے پوچھا: "شریمتی جی! آپ نے مجھے پہچانا؟ میں وہی راجیش ہوں جس کی سابقہ بیوی ارونا کی وکالت آپ نے کی تھی اور میری مخالفت میں آپ وہ مقدمہ لڑتی رہی تھیں۔ آخر طلاق ہو ہی گئی۔"

"مجھے یاد ہے۔ اس ایک سال میں آپ کافی بدل گئے ہیں۔ اچھے صحت مند ہو گئے ہیں۔"

پریتی نے موضوع بدلنا چاہا مگر راجیش نے کہا: "عدالت میں ارونا نے جو بیان دیا تھا اس سے میری بڑی بدنامی ہوئی۔ میرا کیریئر تباہ ہو گیا۔"

"آپ مرد ہیں۔ پھر سے اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔ آپ شادی کرلیں۔ ساری بدنامی دھل جائے گی۔"

"اب مجھ سے کوئی شادی نہیں کرے گی۔"

"آپ خوبرو اور اسمارٹ ہیں۔ کوئی شادی کیوں نہیں کرے گی؟"

اس سوال پر وہ ذرا ہچکچایا پھر جھجکتے ہوئے بولا: "کیا میں آپ سے شادی کی درخواست کر سکتا ہوں؟"

"آں۔ مم۔ مجھ سے؟"

پہلے پریتی کے لیے یہ مسئلہ تھا کہ خود ہی شادی کی بات کیسے چھیڑے؟ اب راجیش نے خود ہی بات چھیڑ دی تو وہ بے اختیار جھینپنے لگی۔ آخر عورت تھی۔

"جی ہاں۔" راجیش نے کہا: "دیکھیے نا ابھی آپ نے اپنی زبان سے میری تعریف کی ہے کہ میں خوبرو اور اسمارٹ ہوں جب میں اتنا اچھا ہوں تو آپ کو انکار نہیں ہونا چاہیے۔"

اس نے بے اختیار اپنے سر پر آنچل رکھ لیا۔ پھر سوچنے لگی۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ میں کیوں شرما رہی ہوں۔ اس سے کوئی شرمانے کا رشتہ تو نہیں ہے۔ اگر رشتہ ہوگا۔ تب بھی یہ شوہر نہیں محض ایک سائن بورڈ ہوگا۔"

وہ بولا: "شاید آپ سوچ رہی ہوں گی کہ پہلی ہی ملاقات میں شادی کی بات نہیں ہوتی۔ مانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا لیکن میرے حالات میں ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔ جس نے بھی میرے سامنے دوسری شادی کا ذکر چھیڑا۔ میں نے اس سے یہی کہا کہ مجھ سے شادی کرلو۔ یا کہیں کرادو۔ اور آپ کی بات تو سب سے مختلف ہے۔ پہلی بار عدالت میں آپ کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا۔ کاش میری بیوی ارونا کی جگہ آپ ہوتیں۔"

"آپ نے ایسا کیوں سوچا تھا؟"

"مجھے آپ کے چہرے سے آپ کے دل کی گہرائی کا اندازہ ہوا تھا۔ آپ کی شخصیت اور صلاحیتوں نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ آپ بہت گہری ہیں۔ میں ایسی عورت کو پسند کرتا ہوں جو اپنے مرد کے راز کو راز رکھے۔ ارونا کی طرح بھری عدالت میں کیچڑ نہ اچھالے۔"

پریتی نے اپنے یقین کے لیے پوچھا: "کیا آپ کو یقین ہے کہ میں آپ کے راز کو ہمیشہ چھپا کر رکھوں گی؟"

"ہاں ہمارے دیس میں آپ جیسی عورتیں زیادہ ہیں جو خود پر الزام لے لیتی ہیں مگر اپنے مرد پر الزام نہیں آنے دیتیں۔"

وہ چونک کر راجیش کو دیکھنے لگی۔ کیونکہ اس نے اتنی سی بات میں پریتی کے کردار کی خصوصیات پیش کر دی تھی۔ اس نے سنجے پر الزام نہیں آنے دیا تھا۔ پریتی کو شبہ ہوا۔ کیا راجیش کو اس کے اور سنجے کے تعلقات کا علم ہے؟ کیا وہ بچے کے بارے میں جانتا ہے؟

راجیش کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے اندازے سے یہ بات کہہ دی تھی۔ ڈاکٹر شیلا نے آ کر کہا: "کھانا تیار ہے۔ آپ دونوں میز پر آجائیں۔"

وہ تینوں ڈائننگ روم میں آ کر میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ راجیش نے کھانا شروع کرتے ہوئے شیلا سے کہا: "ڈاکٹر! میں نے پریتی جی سے شادی کی درخواست کی ہے۔ کیا آپ میری سفارش کریں گی؟"

شیلا نے کہا: "کمال ہے۔ پریتی جی خود بھی شادی کے متعلق سوچ رہی تھیں مگر فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔"

"فیصلے میں کیا ہچکچاہٹ ہے؟"

شیلا نے جواب دیا: "یہی کہ پریتی جی کے پاس اتنے مقدمات ہوتے ہیں کہ انھیں شادی کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بڑی مشکل سے انھوں نے دو ہفتے کی فرصت حاصل کی تھی جس میں سے پانچ دن گزر گئے۔ اب نو دن کے اندر یہ کسی سے شادی کے لیے کہیں گی تو یہ دوسرے کے لیے مضحکہ خیز بات ہوگی۔"

راجیش نے کہا: "میرے لیے یہ بات مضحکہ خیز نہیں ہوگی۔ کیونکہ میں خود جلد سے جلد شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے اپنی بدنامی اور برداشت نہیں ہوتی۔"

شیلا نے پوچھا: "کیوں پریتی جی! آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آں؟" وہ پریشان ہو کر بولی: "میں کیا کہوں؟ یہ کیسی بچوں جیسی بات لگتی ہے کہ ابھی ملاقات ہوئی۔ اتنی جلدی ایک دوسرے کو پسند کیا اور ابھی شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو جائے۔ میں کچھ سوچنا سمجھنا چاہتی ہوں۔"

راجیش نے کہا: "جو لوگ سوچنے سمجھنے کے بعد اور ایک عرصہ تک ایک دوسرے کو پسند کرنے کے بعد شادی کے خواب دیکھتے ہیں

تھا۔ تو آدمی کی شادی نہیں ہوتی اور ہوتی ہے تو ناکام ہو جاتی ہے۔"

پرتیتی بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ اُس نے بھی ایک عرصہ تک شادی کا خواب دیکھا تھا۔ راجیش نے کہا: "میری اور ارونا کی مثال سامنے ہے اور محبت کی شادی ایک جوا ہے۔ ایسی کتنی شادیوں کو میں ناکام ہوتے دیکھ چکا ہوں۔ میاں بیوی کو زندگی گزارنے کے دوران ہار جیت کا پتہ چلتا ہے۔ جیت گئے تو دونوں آباد ورنہ برباد...."

شیلا نے حمایت کی: "راجیش ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ ہاں کہہ دیں۔"

پرتیتی نے کہا: "ایک موقعہ پر جو بات ٹھیک لگتی ہے دوسرے موقعہ پر وہی بات غلط ہو جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح سوچ لینے دو۔ تاکہ میں خود کو بعد میں الزام نہ دوں کہ میں نے اچھی طرح غور نہیں کیا تھا۔ میں کل تک جواب دے دوں گی۔"

سوچنے کے لیے اُس نے ایک دن کی مہلت لے لی۔ وہ تو راجیش کے حالات ایسے تھے کہ وہ دُنیا والوں کا منہ بند کرنے کے لیے جلد از جلد شادی کرنا چاہتا تھا ورنہ ایسی جلد بازی کی شادیاں مختصر ہی لگتی ہیں۔ راجیش کے جانے کے بعد شیلا نے اُسے سمجھایا: "آپ خواہ مخواہ سوچنے میں ایک دن ضائع کر رہی ہیں۔ کیا آپ جلد سے جلد بچے کا تحفظ نہیں چاہتی ہیں؟"

"چاہتی ہوں مگر یہ مرد بڑے شکی ہوتے ہیں۔ میں فوراً ہی راضی ہو جاتی تو وہ سوچتا کہ اُسے پھانسا جا رہا ہے۔"

"اُس کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ اُلٹے یہ تو اُس کی خوش قسمتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک بچے کا باپ بن جائے گا۔"

"اگر اُس نے بچے کے باپ کا کھوج لگایا تو؟"

"تو صاف صاف کہہ دینا کہ کام نہ دیکھو نام دیکھو۔ تمہارا ہی نام ہوتا رہے گا۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ جب یہ بات چلے گی تو میں ایسا ہی جواب دوں گی۔ پہلے سے بولنا مناسب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ باپ کی حیثیت سے اپنا نام نہ کرنا چاہے اور بھڑک جائے۔ اس طرح بنتا ہوا کام بگڑ جائے گا۔"

وہ اپنے گھر جانے کے لیے وہاں سے اُٹھ گئی۔

شادی کے بغیر بچے کا مسئلہ حل نہ ہوتا۔ اُسے راجیش کو جیتی بنانے کے لیے ہاں کہنا ہی تھا۔ دوسرے دن اُس نے ہاں کہہ دی۔ پھر راجیش کے ماں باپ اور بہنیں آئیں۔ انھوں نے پرتیتی کو اتنا پسند کیا کہ اُسے گلے لگا لیا۔ بزرگوں نے اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ راجیش نے اپنے گھر والوں کو سمجھایا کہ ایک ہفتہ کے اندر شادی نہ ہوئی تو پرتیتی کو دو سال تک مصروفیات۔۔۔ سے فرصت نہیں ملے گی۔ گھر والے راضی ہو گئے۔ انھوں نے جیوتشی مہاراج کے ہاں جا کر شبھ گھڑی نکالی اور پانچویں دن شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

وہ پانچ دن، پرتیتی کے لیے قیامت بن گئے۔ اُس کے اندر عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ جیسے اندر دھواں بھر گیا تھا باہر نہیں نکل رہا تھا۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر کر رہی تھی۔ وہ نجے کے علاوہ کسی کو پسند نہیں کر سکتی تھی لیکن راجیش کو جیون ساتھی بنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر شیلا اور اُس کے گھر والے دلہن کی طرف سے شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ دلہن کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔

کئی بار پرتیتی کے دل میں آیا کہ اس شادی کی خبر نجے تک پہنچائے مگر اُس نے ضبط سے کام لیا۔ نجے اب کون لگتا تھا کہ شادی کی خبر بھیجی جاتی پھر یہ کہ اگر وہ خوشامد کرتا۔ محبت کا واسطہ دیتا کہ وہ شادی نہ کرے۔ اُس کے بچے کو دوسرے باپ کا نام نہ دے تو شاید وہ پگھل جاتی۔ شاید راجیش سے شادی کرنے کا فیصلہ کمزور پڑ جاتا۔ اس طرح بچے کا مستقبل پھر تاریک نظر آنے لگتا۔ اس لیے اُس نے نجے کو اطلاع نہیں دی۔

لیکن وہ چار دنوں تک دفتر میں جا کر ضرور بیٹھتی تھی۔ دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ نجے کو کسی طرح پتہ چلے گا تو وہ ضرور فون پر اس سلسلے میں کچھ باتیں کرے گا۔ چوتھے دن اخبار پڑھنے سے معلوم ہوا کہ نجے اپنے عہدے کا حلف اُٹھانے کے لیے دہلی گیا ہوا ہے۔ پرتیتی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

٭

وہ سہاگ کی سیج پر گھونگھٹ نکالے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ نرم و گرم سیج پر یہاں سے وہاں تک تازہ پھول مہک رہے تھے اور وہ باسی تھی۔

اُسے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ وہ دلہنوں کی طرح کیوں بیٹھی ہے۔ راجیش سچ مچ کا دولہا بن کر ابھی ضرور آئے گا لیکن وہ سچ مچ کا شوہر نہیں ہوگا۔ اُس کا اُس سے میاں بیوی کا رشتہ نہیں ہوگا۔ پھر یوں بیٹھے رہنا سراسر حماقت ہے۔

اُس کا گھونگھٹ اُٹھانے والا نجے نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے ہاتھوں سے گھونگھٹ اُٹھا کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اپنے اطراف سر گھما کر دیکھنے لگی۔ دولہا دلہن کا کمرہ بڑی خوب صورتی سے اور بڑے مہنگے آرائشی سامان سے سجایا گیا تھا۔ پرتیتی کے ضمیر نے ملامت کی۔ راجیش نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی۔ اپنی دولت پانی کی طرح بہا دی تھی۔ وہ جیسا بھی ہو اُسے بیوی بنا کر رکھنے کے لیے ہی شادی کا جشن منا رہا تھا اور پرتیتی اُسے کسی حال میں شوہر کا مقام دینا گوارا نہیں کرتی تھی۔

وہ سیج سے اُتر کر نیچے آ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر کی تازہ ہوا اُس کے چہرے

کو چھونے لگی۔ وہ کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ کھڑکی کے باہر رنگ برنگے قمقمے روشن تھے۔ شامیانے کے سائے میں ناچنے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں کوئی طوائف مجرا پیش کر رہی تھی۔ پریتی نے سوچا: "اچھا ہے کہ راجیش نہ آئے۔ ساری رات دوستوں کے درمیان بیٹھ کر طوائف سے بہلتا رہے اور میں سہاگن بن کر راجیش کی سیج پر لیٹ کر جاگتی آنکھوں سے بچے کا سپنا دیکھتی رہوں گی۔"

لیکن راجیش آ گیا۔ پریتی نے دروازے کے پاس آہٹ سنی تو دل دھک سے رہ گیا۔ کچھ بھی ہو پہلی بار دلھن بنی تھی وہ عورتوں والی گھبراہٹ ضرور ہوتی تھی۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ایک دم سے ساکت ہو کر کھڑکی کے باہر منہ کیے آہٹیں سنتی رہی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی تھی پھر قالین پر قدموں کا بھاری پن محسوس ہوا۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔

"پریتی!" اس نے پیار بھری سرگوشی میں پکارا۔

وہ چپ رہی۔ جیسے پتھر کی ہو گئی ہو۔ راجیش کھڑکی کے پاس آ کر اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا: "شاید گھونگھٹ میں تمہیں گھٹن سی ہو رہی تھی۔ اس لیے یہاں آ گئیں۔"

"نہیں" وہ بڑی آہستگی سے بولی: "مجھ پر گھونگھٹ نہیں سجتا۔ اس لیے میں نے خود ہی اٹھا دیا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی کہہ رہی ہوں جو ہمارے رشتے کا تقاضہ ہے۔" وہ چل کر کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر بولی۔ "ارونا نے بھری عدالت میں تمہارا...... مذاق اڑایا تھا۔ اس کے بعد تمہیں کہیں رشتہ نہیں ملتا تھا۔ میں نے تم سے شادی کر کے تمہارا بھرم رکھ لیا۔ تم بھی اسے اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ہمارے درمیان صرف بھرم رکھنے والا رشتہ ہے۔"

"بھرم رکھنے والا رشتہ؟" راجیش نے پہلے تو حیرانی سے پوچھا۔ پھر کہا: "اوہ سمجھا تم نے دنیا والوں کے سامنے ارونا کی بات کو جھوٹ ثابت کرنے کے لیے دوسرے لفظوں میں میرا بھرم رکھنے میری عزت رکھنے کے لیے مجھ سے شادی کی ہے۔"

"ہاں یہی بات ہے۔"

"اوہ پریتی! پھر تو تم عظیم ہو۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ ایسے آدمی سے شادی کر کے ساری زندگی خواہشوں کی آگ میں جلتی رہو گی۔ تم نے انسانی ہمدردی کی بہت بڑی مثال پیش کی ہے۔ تمہاری جتنی بھی عزت کی جائے وہ کم ہے۔"

پریتی جھکے ہوئے انداز میں سیج کے کنارے بیٹھ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ وہ سہاگ کی سیج نہیں ایک اسٹیج ہے جہاں وہ دونوں جھوٹ موٹ میاں بیوی کا رول ادا کریں گے اور ایک ندی کے...... دو کنارے بن کر زندگی گزاریں گے۔

وہ قریب آتے ہوئے بولا: "لیکن اب تم میری دھرم پتنی بن گئی ہو۔ اس لیے سچ بتا دوں کہ ارونا نے عدالت میں جھوٹ کہا تھا۔"

پریتی نے چونک کر پوچھا: "کیا مطلب؟ وہ بھلا جھوٹ کیسے کہہ دیتی اور اگر کہا تھا تو تم نے اتنے بڑے جھوٹ کو کیسے تسلیم کر لیا تھا؟"

وہ بستر کے کنارے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا: "مجبوری تھی۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا: "ایسی بھی کیا مجبوری تھی کہ تم نے مرد ہو کر اس کا اتنا بڑا الزام اپنے سر لے لیا؟"

"پریتی! میرے پاس بیٹھو تم میری بیوی ہو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

"نہیں پہلے بتاؤ۔ یہ کیسا بھیانک مذاق ہے۔ کیا عدالت میں وہ مقدمہ بازی بھی ایک مذاق تھی؟"

"نہیں۔ وہ سچ مچ طلاق لینا چاہتی تھی اور اس نے لے لی۔ میں اسے بہت چاہتا تھا میرے ماتا پتا بھی کہتے تھے کہ...... بہو خاندان کی عزت ہے۔ طلاق لے گی تو بڑی بدنامی ہو گی لیکن وہ بضد تھی۔ مقدمہ شروع ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک امیر زادے کی محبت میں گرفتار ہے اور مجھ سے نجات حاصل کر کے اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

اس نے سیج پر پڑے ہوئے ایک پھول کو اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا: "دنیا والوں کی موجودگی میں قانونی شادی کے باوجود مرد عورت کا رشتہ پائیدار نہیں ہوتا۔ عورت پرائے مرد کی طرف اور مرد پرائی عورت کی طرف جھک جاتے ہیں۔ ارونا کو بہکانے والے پر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس امیر زادے کے پاس پہنچ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا: "[illegible]! تو میرے گھر میں آگ لگا رہا ہے۔ ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے کسی کو طلاق نہیں دی اور تو ذلیل کمینے......"

میں اسے بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں ارونا وہاں پہنچ گئی۔ اس نے اپنے پریمی کی حمایت میں کہا: "جب بات عدالت تک پہنچ گئی ہے تو تم ہماری محبت پر اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟"

اس کے پریمی نے کہا: "ارونا! اس نے مجھے گالیاں دی ہیں۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو میرے سامنے ایسی گالیاں دو کہ یہ ساری زندگی یاد کرے۔ تم اسے جھوٹ دو گی تو میں طلاق کے بعد تم سے شادی نہیں کروں گا۔"

ارونا نے نفرت سے کہا: "میں کل عدالت میں اسے بتاؤں گی۔ اس نے صرف تمہاری نہیں ہماری محبت کی بھی توہین کی ہے۔ تم جاؤ میں راجیش سے ایک آخری فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ارونا نے اپنے پرس میں سے ایک کاغذ نکال کر مجھے پڑھنے کو دیا۔ وہ ایک محبت نامہ تھا اور اُسے میری چھوٹی بہن نے اپنے محبوب کے نام لکھا تھا۔ اُسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ ہمارے خاندان کی عزت مٹی میں ملنے والی ہے۔ میری بہن بدنامی کی حد تک عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔

ارونا نے کہا: "تمہاری بہن میری سہیلی بنی رہی۔ میں اُسے بدنام نہیں کروں گی۔ اس کے لکھے ہوئے تمام خطوط واپس کر دوں گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تمہیں عدالت میں میری گالی سن کر اُسے تسلیم کرنا ہوگا۔ نہیں کرو گے تو تمہاری بہن کو پورے خاندان کے لیے ایک بدترین گالی بنا دوں گی۔"

وہ چلی گئی۔ پرتی! تم اس کی وکالت کر رہی تھیں۔ تم نے بھی دیکھا کہ اس نے مجھے کیسی گالی دی۔ میں مجبور تھا۔ میں نے گالی کو برداشت کرتے ہوئے طبی معائنے سے انکار کر دیا۔ ارونا اپنی زبان کی دھنی نکلی۔ طلاق کے بعد اس نے میری بہن کے لکھے ہوئے تمام خطوط واپس کر دیے۔ ان خطوط کو جلا کر ہم نے دو ماہ کے اندر ہی بہن کی شادی کر دی۔ ہمارا خاندان بدنامی سے بچ گیا لیکن میں آج تک بدنام ہوتا آیا ہوں۔ پرتی! اب تمہیں پا لینے کے بعد یہ بدنامی بھی ڈھل جائے گی۔"

پرتی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ حیرانی اور پریشانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجیش کو دیکھنے لگی۔ اس نے کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلا؟ کیا ہماری دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی بہن کے لیے اپنے خاندان کے لیے ڈھال بننے کے لیے بظاہر گالی بن جاتے ہیں۔

راجیش عظیم تھا اور قابلِ پرستش ہو تھا۔ کوئی رشتہ نہ ہوتا تو پرتی اس کی پوجا کرتی مگر وقت ایسا ہو چکا تھا کہ اب وہ بدحال ہو رہی تھی۔ اس نے سرکس کے رنگ ماسٹر کی طرح یہ سمجھ کر شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ دانت نہیں ہوں گے مگر وہ دانت والا نکلا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے پسینے میں نہا گئی۔

راجیش نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے پوچھا: "کیا بات ہے تم بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی ہو؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے گھبرا رہی ہو، کترا رہی ہو۔"

"آں۔ ہاں۔" وہ بڑی مشکل سے تھوک نگل کر بولی: "مم میں نے شادی کرنے کے لیے شادی نہیں کی ہے۔"

"اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"وہ۔ میں نے سمجھا تھا کہ تمہیں اپنا بھرم رکھنے کے لیے ایک رازدار بیوی کی ضرورت ہے اور مجھے بھی ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو صرف دکھاوے کا شوہر بن کر رہے۔ میں میں سچ مچ کسی کی بھی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔"

اب راجیش حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا: "کیا تم نے مجھے ڈھال بنا کر رکھنے کے لیے شادی کی ہے؟"

پرتی نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر جھکا لیا۔ وہ بولا: "تم قانون داں ہو کر ایسا کر رہی ہو۔ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ صرف ڈھال بنایا جاؤں۔"

وہ منہ پھیر کر بولی: "مجھے نہیں معلوم تھا کہ جسے ڈھال بنا رہی ہوں، وہ تلوار ہے۔ یہ سب کچھ غلط فہمی میں ہوا ہے۔"

راجیش نے پوچھا: "اب کیا ہوگا؟"

پرتی پریشان ہو کر سوچنے لگی: "اب کیا ہو سکتا ہے؟ پھر راجیش پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ مجھے بھی شادی کی رات طلاق دے گا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا اور میں ایسی کم ظرف نہیں ہوں کہ اس کی مزید بدنامی کا سبب بن جاؤں۔ پھر یہ کہ مجھے اپنے بچے کی قانونی سلامتی چاہیے۔ میں کیا کروں؟ اسے چھوڑ کر اور کتنی شادیاں کروں؟ کیا تماشہ بن جاؤں؟"

اُسے سوچ میں غرق ہوتے دیکھ کر راجیش نے پوچھا: "کیا ارونا کی طرح تم بھی کسی سے محبت کرتی ہو؟"

وہ راجیش کو دیکھنے لگی۔ جواب دینے سے ہچکچانے لگی۔ ارونا نے بیوی بن کر دوسرے سے عشق کیا تھا۔ پرتی سوچنے لگی: "میں بھی بیوی بن کر دوسرے کے عشق میں مبتلا ہوں۔ یہ بات راجیش کا کلیجہ چھلنی کر دے گی۔ آخر وہ انسان ہے۔ کتنی بے وفائیاں برداشت کرے گا؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی: "نہیں۔ میں کسی سے محبت نہیں کرتی مگر مجھ سے ایک غلطی ہو چکی ہے۔"

"کیسی غلطی؟"

وہ ذرا چپ رہی لیکن چپ رہنے سے وہ غلطی چھپ نہیں سکتی تھی۔ آج نہیں تو کل اُسے ظاہر ہونا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی: "میں۔ میں ماں بننے والی ہوں۔"

راجیش ایک قدم پیچھے ہٹنے کے وقت لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بستر کے سرے پر بیٹھ گیا۔ تمام باتیں اس کی سمجھ میں آگئی تھیں کہ پرتی نے اُسے ڈھال سمجھ کر کیوں قبول کیا تھا۔ وہ ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا اور وہ منہ چھپائے رو رہی تھی۔ آہ! وہ سہاگ رات اپنے اعمال کے حساب کی رات بن گئی تھی۔

وہ دونوں بہت دیر تک خاموش رہے پھر وہ بولا: "پرتی! بیٹھ جاؤ۔ تھک جاؤ گی۔ میں نے کہا تھا نا کہ شادی ایک جوا ہے۔ میاں بیوی کی زندگی گزارنے کے بعد ہار جیت کا پتہ چلتا ہے اور میں دوسری بار بھی ہار گیا ہے۔"

وہ ایک صوفے پر سمٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی: "میں شرمندہ ہوں۔

میں نے تمہیں غلط سمجھا اور تمہارے لیے ایک مصیبت بن گئی۔ تم خاندانی لوگ ہو۔ میری بھی عزت اور شہرت ہے۔ طلاق ہم دونوں کے لیے بہت زیادہ بدنامی لائے گی۔"

"میں ارونا کو طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ تمہیں بھی نہیں دوں گا۔ مجھ میں اب ذلت اور رسوائی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے اور اگر تم طلاق لینا چاہو گی تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

"میں طلاق نہیں لوں گی مگر میرے بچے کا کیا ہو گا؟"

"تم طلاق نہیں لے کر مجھ پر احسان کرو گی۔ میں بچے کا باپ بن کر احسان کا بدلہ چکاؤں گا۔"

پریتی نے کہا۔ "ہمارے درمیان یہ سمجھوتہ ایک راز بن کر رہے گا۔ کسی تیسرے کو اس کا علم نہیں ہو گا۔"

"تیسرے کو علم ہے۔" راجیش نے کہا۔ "اور وہ تیسرا شخص بچے کا اصل باپ ہے۔ جب ہم رازدار ہی ٹھہرے تو کیا تم اس شخص کا نام بتاؤ گی؟"

پریتی کی نگاہوں کے سامنے سنجے مسکرانے لگا۔ ہائے وہ کیسا شخص تھا۔ اپنی شخصیت کی چھاپ لگا کر اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا لیکن میں اس کی عزت رکھوں گی۔

راجیش نے اسے سوچتے دیکھ کر پوچھا۔ "اگر تم نہیں بتانا چاہتیں، نہ بتاؤ۔"

وہ بولی۔ "اس کا نام لینے سے میرا دل دکھے گا اور تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور اس کی جھوٹی شرافت کا بھرم رہ جائے گا۔ راجیش! کچھ ایسے مرد ہوتے ہیں جن کی عزت عورتوں کی عزت سے زیادہ نازک ہوتی ہے۔ نام لیتے ہی چکنا چور ہو جاتی ہے۔"

وہ سنجے کو تصور میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیوں ٹھیک ہے نا؟"

راجیش نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اب میں نام نہیں پوچھوں گا۔"

اس وعدے کے ساتھ وہ کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اس کے اندر جو ایک آگ بجھنے والی تھی اب وہ اور بھڑکنے لگی تھی۔ کھڑکی کے باہر سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں اسے بجھا نہیں سکتی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ شراب کی بوتل کھول کر بیٹھ جائے پھر اس قدر پیتا رہے کہ سہاگ رات کو بھول جائے اور شوہر بنا کر جذبات کا مذاق اڑانے والی ارونا اور پریتی صبح تک یاد نہ آئیں۔

لیکن وہ شادی کا گھر تھا۔ اگر وہ پینے کے بعد صبح دیر تک پڑا سوتا رہتا تو یہ بھید کھل جاتا کہ اس نے صرف شراب کی بوتل کے ساتھ رات گزاری ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سہاگ کے اس قیدخانے سے کیسے باہر نکلے؟ باہر رشتے داروں کا پہرہ تھا اور اندر قیامت کی رات گزارنا تقریباً ناممکن تھا۔

وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس نے پریتی سے کہا کہ

منگنی سے چند لمحوں قبل دوستوں نے محمد آنسو کو دیکھا کہ انتہائی پریشان ہیں چہرا اترا ہوا ہے۔ پسینوں پر پسینے آ رہے ہیں۔

پوچھا۔ کیا بات ہے دوست؟ تم نے منگنی کی انگوٹھی تو نہیں کھو دی؟"

"نہیں۔" آج محمد آنسو نے جواب دیا۔ "میرا ہوش و حواس کھو گیا ہے۔"

وہ سو جائے لیکن وہ صوفہ پر سر جھکائے بیٹھی رہی اور راجیش کی بے چینی کو سمجھتی رہی۔ اس بے چارے پر جو ظلم ہو رہا تھا، اس کی ذمہ دار خود کو سمجھتی رہی۔ اس نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا کہ وہ وہاں سے سنجے کو ہٹا کر راجیش کو بٹھا سکتی ہے یا نہیں؟ وہ راجیش کو جگہ دے سکتی تھی لیکن سنجے وہاں سے نہیں ہٹ رہا تھا۔ محبت کے گہرے نقش کو اتنی جلدی مٹانا آسان نہیں ہوتا۔ البتہ راجیش کے متعلق بھی سوچنے اور ذرا متاثر ہوتے رہنے کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔

آخر قیامت کے انتظار کے بعد صبح ہو گئی۔ راجیش کمرے سے باہر جانے لگا تو پریتی نے کہا۔ "سنو! آج میں نے تمہاری شرافت دیکھی ہے۔ ہو سکے تو اپنا حوصلہ بھی دکھاؤ اور باہر جا کر ہنستے بولتے رہو۔ ورنہ بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

اس نے کہا۔ "ارونا کے دیے ہوئے صدمات ایسے تھے کہ میں دنیا والوں کے سامنے رو سکتا تھا۔ آج سے تمہاری دی ہوئی زندگی کے صدمات ایسے ہیں کہ میں رو بھی نہیں سکتا۔ اطمینان رکھو میں ہنستا رہوں گا۔ کسی کو شبہ نہیں ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پریتی نے دروازے کو اندر سے بند کر کے سہاگ کی سیج کی جانب دیکھا۔ اس سیج کو دیکھ کر سنجے کا خیال آیا۔ ضمیر نے ملامت کی۔ "پریتی! تجھے شرم نہیں آتی۔ جو تجھے بدنامی کی دلدل میں چھوڑ گیا تو اس کا تصور کر رہی ہے اور جو تجھے نیک نامی کی سیج پر لایا تو اسے ساری رات تڑپاتی رہی۔ تیرے جیسی بے حس اور ظالم اور کوئی نہ ہو گی۔"

پریتی نے اس ملامت سے گھبرا کر سنجے کو دماغ سے باہر جھٹک دیا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سیج پر آئی۔ وہاں چادر بے شکن تھی۔ سسرال والے وہاں آ کر دیکھتے تو شبہ کرتے۔ پریتی نے چادر کو ادھر ادھر سے کھینچ کر شکنیں پیدا کیں۔ وہاں اس پر بکھری ہوئی کلیوں اور پھولوں کو مسل کر سرہانے سے پائنتی تک بکھیر دیا۔ وردانے کے پاس جا کر آہستگی سے چٹخنی گرائی۔ پھر واپس آ کر سارے زیورات اتار کر تکیے کے نیچے رکھ دیے اس کے بعد گھونگھٹ سر پہ ڈال کر سہاگ کی سیج پر بیٹھ گئی۔

دو منٹ کے بعد ہی اس کی ساس، نندیں اور دوسری لڑکیاں ہنستی بولتی اُس کمرے میں داخل ہونے لگیں۔ وہاں اب شبہ کرنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ نندیں اپنی پریتی بھابی کو غسل کرانے لے گئیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ناشتے کی میز پر دلہن کے ساتھ سسرالی لوگ اور دوسرے رشتے دار موجود تھے۔ راجیش بچوں کو چھیڑ رہا تھا۔ بھابیوں سے مذاق کر رہا تھا اور پریتی کی تعریفیں کر رہا تھا۔

اور پریتی ندامت سے جھکی جا رہی تھی۔ راجیش یہ ناٹک کیوں کھیل رہا تھا؟ کیا اس لیے کہ وہ دوسری بیوی کو بھی طلاق دے کر اپنے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا؟ لیکن نہیں جب یہ ثابت ہو جاتا کہ پریتی نے پاپ کیا ہے اور وہ اس خاندان میں ایک ناجائز بچے کو جنم دینے آئی ہے تو اُس خاندان کی کبھی بدنامی نہ ہوتی۔ سارا سنسار، دنیا پریتی اور اُس کے بچے پر تھوکنا شروع کر دیتی۔ یہ راجیش کی عظمت تھی کہ وہ ایک ڈھال بن گیا تھا اور ہنس ہنس کر اُسے نیک نامی دے رہا تھا۔

وہ خود کو اُس کے سامنے حقیر محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے راجیش نے اُسے جوتی بنا کر پہن لیا ہے اور اب وہ اُس کے پاؤں سے نہیں نکل سکے گی۔ ویسے اپنے بچے کی خاطر جوتی بن کر رہنا بھی منظور تھا۔ سسرال میں اس کے دن گزرنے لگے۔ شادی کے چار دن بعد ہی وہ دفتر میں بیٹھنے لگی۔ مقدمات پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے لگی۔ راجیش شام کو کار میں آتا تھا اور اُسے دفتر سے گھر لے جاتا تھا۔ دن تو مصروفیات میں گزر رہے تھے مگر راتیں اُن دونوں کی جان لے کر گزرتی تھیں۔ کیونکہ ایک ہی کمرے میں وہ الگ الگ سوتے تھے۔ راجیش غم غلط کرنے کے لیے تھوڑی سی پی لیتا تھا۔ اُسے نشے میں نیند آ جاتی تھی۔ پریتی بھی آدھی رات کے بعد مطمئن ہو کر سو جاتی تھی۔

ایک ماہ کے اندر ہی سسرال والوں کو یہ خوش خبری ملی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس اطلاع پر کئی من مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ ساس تو اپنی بہو پر قربان ہوئی جا رہی تھی۔ کمال راجیش کا تھا۔ اُس نے اب تک بچے کے باپ کا نام نہیں پوچھا تھا اور اپنے آپ پر جبر... کر کے مسرتوں کا بھرپور اظہار کر رہا تھا۔

چند ماہ اور گزر گئے۔ پریتی نے اپنے مؤکلوں کو دوسرے وکیلوں کے پاس بھیج دیا۔ کیونکہ وقت قریب آ رہا تھا اور وہ ایسی حالت میں نہ تو مقدمات پر توجہ دے سکتی تھی اور نہ ہی عدالت میں حاضر ہو سکتی تھی۔ ایک رات وہ اپنی خواب گاہ میں تھی اور راجیش بیٹھا پی رہا تھا۔ پریتی نے پوچھا "کیا تم شراب نہیں چھوڑ سکتے؟"

"کیا تم شراب بھی چھڑانا چاہتی ہو؟"

"ہاں یہ بُرائی کی طرف لے جاتی ہے۔ میں نے آج تمہیں ایک سوسائٹی گرل کے ساتھ دیکھا ہے۔"

"تم نے آج دیکھا ہے۔ حالانکہ شادی کے دوسرے ہی دن سے یہ سلسلہ ہے۔ پہلے میں نے کبھی کسی لڑکی سے دوستی نہیں کی۔ آج بھی میں یہ برائی شراب نے پیدا نہیں کی۔ یہ دوسری شادی کا نتیجہ ہے۔"

پریتی کا سر جھک گیا۔ وہ بولا "میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میرے پینے سے تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو بولو ابھی آزمالو۔ میں پینا بھی چھوڑ دوں گا۔"

وہ بدستور سر جھکائے ہوئے بولی "میرے بچے پر آپ کی پرورش کا اثر ہوگا۔ وہ آپ کو باپ سمجھتا رہے گا۔ آپ جیسا ہوتا رہے گا اور آپ ہی کی عادتیں سیکھتا رہے گا۔"

"بس میں سمجھ گیا میرے نام سے پلنے والا بچہ کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ پھر اُس نے بوتل اور گلاس کو اٹھا کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا "یہ لو۔ آج سے کوئی بُری چیز اس گھر میں داخل نہیں ہوگی۔"

راجیش کی اس حرکت نے پریتی کو اس قدر متاثر کیا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اُس کے پاس دوڑ کر جانا چاہتی تھی اور اُس کے قدموں سے لپٹ کر اُس کی عظمت کا اعتراف کرنا چاہتی تھی لیکن ٹھیک اُسی وقت خواب گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک نند کہہ رہی تھی "بھابی آپ کی ٹیلی فون کال ہے۔"

پریتی کو کسی ٹیلی فون کال سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ راجیش کے قدموں تک پہنچنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اتنے میں پھر نند کی آواز آئی "فون کرنے والے صاحب کا نام سنجے مکرجی ہے۔ کیا آپ بات کریں گی؟"

پریتی کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ راجیش کی طرف سے پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگتی ہوئی گئی۔ دوسرے ہی لمحہ وہ دروازہ کھول کر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں ٹیلی فون کے پاس ساس اور سسر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بیچارے کیا جانتے تھے کہ بہو کے لیے عشقیہ کال ہے۔ معزز گھرانوں میں ایسا سوچا بھی نہیں جاتا۔ اس لیے وہ دونوں بوڑھے وہاں بیٹھے رہے۔ پریتی نے ریسیور اٹھا کر دھڑکتے ہوئے دل سے "ہیلو" کہا۔

"ہیلو پریتی!" دوسری طرف سے سنجے کی آواز سنائی دی "شاید اب مجھے پریتی کہنے کا حق نہیں رہا۔ یہاں آ کر سنا کہ تم مسز راجیش بن گئی ہو۔"

وہ کن انکھیوں سے ساس سسر کو دیکھتے ہوئے بولی "آپ جیسے بڑے آدمی شادی کی..... (مبارکباد) دے رہے ہیں۔ میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔"

"ایں مبارکباد؟" سنجے نے حیرانی سے پوچھا۔ پھر کہا "اوہ سمجھا۔
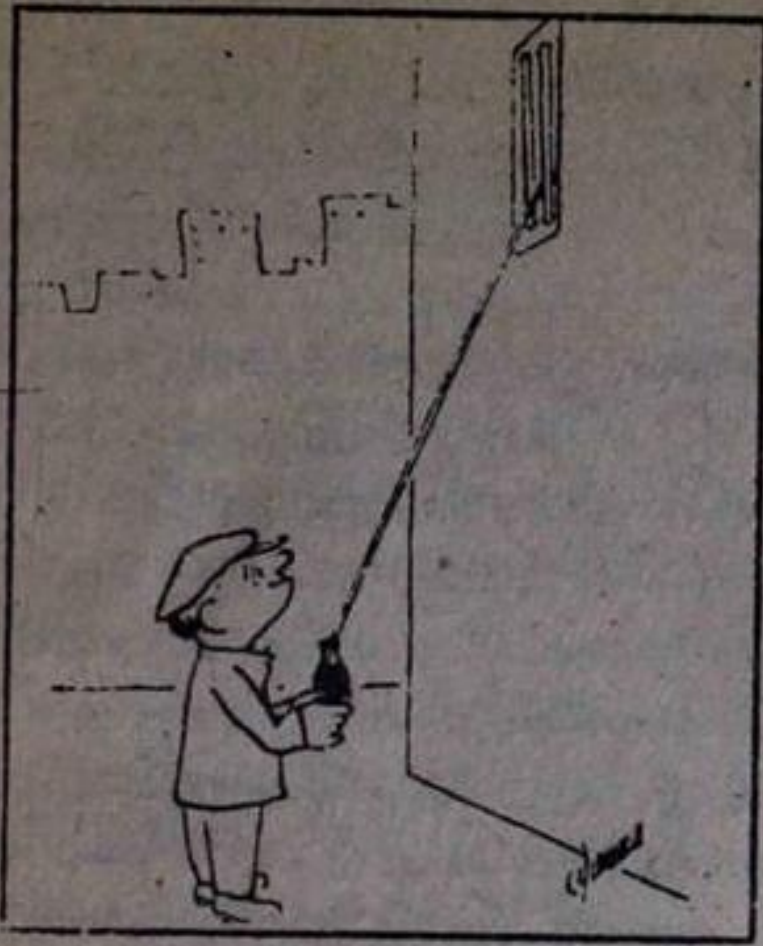
ٹیلی فون کے پاس تمہارے شوہر یا سسرال والے بیٹھے ہیں۔"

وہ بولی: "ہاں آپ سمجھدار ہیں۔ ابھی میری شادی کو چند ماہ گزرے ہیں۔ میں کوئی کیس ہاتھ میں نہیں لوں گی۔"

"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں اپنے گھر میں بیٹھ کر ٹیلی فون پر کسی کیس پر بات نہیں کر سکتی۔"

"تو باہر کہیں ملاقات کرو۔"

"سوری۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"پھر میں تمہیں اور راجیش کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دوں گا۔"

"نرملا دیوی کیسی ہیں؟"

"میں اُسے دہلی میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ وہ زچگی تک وہیں رہے گی۔"

"پھر تو آپ کے ہاں دعوت مناسب نہیں رہے گی۔ ذرا ہولڈ آن کریں۔"

راجیش ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا دور سے پریتی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پریتی نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر راجیش کو دیکھا۔ پھر اپنی ساس کو مخاطب کرتے ہوئے بولی: "ماں جی! شاید آپ لوگوں نے سُنا ہوگا۔ نیچے مکرجی صاحب ایم پی ہیں۔ اُن کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ وہ میری شادی کی خوشی میں مجھے اور راجیش کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔"

راجیش نے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: "جب انہوں نے تم پر احسانات کیے ہیں تو میں اُن کی دعوت ضرور قبول کروں گا۔"

پریتی نے اُس کی باتوں کے پیچھے ہلکے سے طنز کو محسوس کیا یا پھر اُس کے دل میں چور تھا، اس لیے وہ ایسا محسوس کر رہی تھی۔ وہ بولی: "لیکن میں قبول نہیں کروں گی۔"

ساس نے پوچھا: "کیوں بیٹی؟"

"ماں جی! مکرجی صاحب کی دھرم پتنی دہلی میں ہیں۔ وہاں دعوت قبول کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں مکرجی صاحب کو کل یہاں کھانے پر بُلا لوں۔"

"بیٹی! یہ تمہارا گھر ہے جسے چاہے بُلا سکتی ہو۔"

پریتی نے راجیش کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا: "ماں جی کہتی ہیں، کہ گھر تمہارا ہے میں کہتا ہوں کہ میں بھی تمہارا ہوں۔ میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ دعوت دے ڈالو۔"

وہ گھر والوں کے سامنے بڑی شوخی سے بولتا تھا۔ پریتی نے اُسے احسان مندی سے دیکھا۔ پھر ریسیور کے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر بولی: "ہیلو مکرجی صاحب! راجیش کی خواہش ہے کہ آپ کل رات ہمارے ہاں کھانے پر آئیں۔"

"پریتی! میں نے بڑی مشکلوں سے تمہاری سسرال کا ٹیلی فون نمبر معلوم کیا۔ میں تنہائی میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے سسرال والوں کے سامنے مجھے کہنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

وہ بولی: "دیکھیے! اگر یہ کیس اتنا ہی بگڑ گیا ہے تو کل آپ یہاں آ کر مجھے کیس کی تفصیل سُنا دیں۔ آپ اطمینان رکھیں یہاں سب تعلیم یافتہ ہیں۔ ہماری گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کریگا۔"

"پریتی! تم کتنی اچھی ہو۔ تمہارے دل میں ابھی تک میرے لیے جگہ ہے۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کا وقت گزر چکا ہے۔ میں اس کیس کے سلسلے میں صرف مشورہ دے سکوں گی۔ آپ کنفرم کریں۔ کیا کل آ رہے ہیں؟"

"آؤں گا۔ کل تک بڑی بے چینی سے وقت گزار کر آؤں گا۔"

پریتی کا دل دھڑک رہا تھا اور ہاتھ لرز رہا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور رکھ کر وہاں سے اُٹھ گئی۔ پھر سر پہ آنچل رکھتی ہوئی خواب گاہ میں چلی آئی۔ ذرا دیر بعد راجیش نے آ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ پریتی اپنے بستر کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ راجیش نے کہا: "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ بچّے کے باپ کے متعلق کچھ نہیں پوچھوں گا لیکن اب سوچتا ہوں کہ مجھے اُس کے متعلق کچھ نہ معلوم ہو گا تو یہ میرے ساتھ ناانصافی ہو گی۔"

پریتی نے پوچھا: "ناانصافی کیسے ہو گی؟"

"ایسے کہ میں اُس شخص سے انجان ہوں لیکن وہ مجھے جان رہا ہے۔ میں اندھا ہوں اُسے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ کہیں بیٹھا مجھے دیکھ رہا ہے۔ میری بے خبری پر ہنس رہا ہے کہ باپ وہ ہے اور نام

میں کر رہا ہوں۔"

"وہ ایسا شخص نہیں ہے۔ وہ تم پر کبھی نہیں ہنسے گا۔"

"تمہیں اُس پر بہت زیادہ اعتماد ہے؟"

"ہاں۔ میں اُس کے مزاج کو سمجھتی ہوں۔"

"تعجب ہے۔ تم مزاج کو سمجھ کر بھی دھوکا کھا گئیں۔"

"یہ ضروری نہیں کہ کوئی دھوکا دے۔ یا کوئی دھوکا کھائے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ہم دھوکے باز نہیں ہوتے اور تقدیر دھوکا دے دیتی ہے۔"

"ہم کا مطلب یہ ہوا کہ تم دونوں دھوکے باز نہیں تھے۔ اس شخص کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بے وفا ہرجائی نہیں ہے۔ یعنی دونوں طرف سے وفا آج بھی ہے۔"

پریتی چونک گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔ راجیش نے پوچھا "تم نے تو کہا تھا کہ تم سے غلطی ہوگئی تھی۔ تمہیں کسی سے محبت نہیں ہے اور اب تم اُس کی حمایت میں بول رہی ہو؟"

وہ سنبھل کر بولی "حمایت میں بول رہی ہوں۔ محبت میں نہیں بول رہی ہوں۔ وہ مجبور تھا۔ وفا نہ کر سکا۔ یہ الگ سی بات ہے۔ اُس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وفا نہ کرنے والے مجبور شخص سے میں محبت کر رہی ہوں۔"

جھوٹ بولتے وقت پریتی کا دل اندر سے ڈوب رہا تھا۔ وہ سچ بول کر راجیش کو یہ صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی تھی کہ وہ ارونا کی طرح ایک عاشق پال رہی ہے اور ایک دن وہ عشق اُس کی بدنامی کا باعث بنے گا۔ دُنیا ہنسے گی کہ اس گھر کی بہو راجیش کی بیوی۔۔۔۔ دوسرے کے لیے آہیں بھرتی ہے۔

راجیش نے پھر کوئی بات نہیں چھیڑی۔ اپنے بستر پر جا کر سو گیا۔ پریتی بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی مگر بڑی رات تک سو نہ سکی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے سنجے اور راجیش آکر کھڑے ہو جاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ اُن میں سے کون محبت کا حق دار ہے؟ کیا وہ جس نے اُسے سماج میں بدنام ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ یا وہ جو اُسے بدنامی سے بچا رہا تھا؟

بے شک راجیش محبت کا حق دار تھا لیکن سنجے کے ساتھ گزری ہوئی اندھی جوانی کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ وہ شعوری طور پر سنجے سے کترا رہی تھی مگر غیر شعوری طور پر خیال ہی خیال میں اپنے ایک ایک لمحہ کا حساب اس سے چاہتی رہی تھی۔ اُس کے باوجود عقل سمجھا رہی تھی کہ اب وہ کسی کی بیوی اور ایک شریف گھرانے کی بہو ہے۔ جہاں اُس کے بچے کو تحفظ مل رہا ہے وہاں کے لوگوں سے بے ایمانی نہیں کرنا چاہیے۔ عقل یہی سمجھا کر اُس کی نیند اُڑا دیتی تھی۔

✡

سنجے مکرجی اپنے وعدے کے مطابق پریتی کے ہاں دعوت پر پہنچ گیا تھا۔ پریتی نے اپنے سسرال والوں سے اس کا تعارف کرایا۔ راجیش نے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "مکرجی صاحب! آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔"

سنجے نے پوچھا "وہ کیسے؟"

"ایسے کہ میری دھرم پتنی کل رات سے ہی آپ کے آنے کی اس مبارک گھڑی کا انتظار کر رہی تھیں۔ پریتی جس کا انتظار کرے وہ بھاگوان کیا بھگوان بن جائے۔"

اِس بات پر سب نے قہقہہ لگایا اور راجیش کی بات ہنسی میں اُڑ گئی۔ ویسے وہ برابر زندہ دلی کا ثبوت دے رہا تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ پرلطف باتیں کر کے سب کو ہنساتا رہا۔ پریتی جبراً ہنس دیتی تھی۔ یہ سچائی اُسے کھٹکتی تھی کہ وہ کتنے سارے صدمات کے الاؤ میں جل کر ہنستا رہتا ہے۔

کھانے کے بعد چائے کا دَور چلنے والا تھا۔ راجیش نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا "پریتی! تم جانتی ہو کہ اِس وقت میں چائے نہیں پیتا۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ ہمارے بیڈروم کے ساتھ والا کمرہ تمہارے اور مکرجی صاحب کے لیے مناسب رہے گا۔ وہاں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ چائے اُسی کمرے میں منگوا لو۔"

وہ ڈائننگ روم سے نکل کر اپنے بیڈروم میں آگیا۔ کمرے کے اندر آکر اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ آج دن کو اُس نے اپنی الماری میں کپڑوں کے نیچے ایک اسپیکر چھپایا تھا۔ برابر والے کمرے میں چھت سے جو فانوس۔۔۔ لٹک رہا تھا۔ وہاں اُس نے ایک مائیک رکھ دیا تھا اور اٹس کر کے سوئچ بورڈ کا کنکشن اپنے بیڈروم سے کر دیا تھا۔ وہ اسپیکر اُٹھا کر سوئچ بورڈ کے نیچے میز کے پاس آیا اور اُس کے تار کو سوئچ بورڈ سے نکلے ہوئے ایک تار سے منسلک کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسپیکر سے آوازیں آنے لگیں۔

برابر والے کمرے میں فانوس کے نیچے ایک سینٹر ٹیبل تھا۔ اُس کے اطراف صوفے تھے۔ سینٹر ٹیبل پر کبھی پیالیاں رکھنے اور کبھی پیالیوں میں چمچ چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر پریتی کی آواز آئی۔ وہ ملازم سے کہہ رہی تھی "تم جاؤ۔ دروازہ بند کر دینا۔ مجھے ضرورت ہوگی تو بلا لوں گی۔"

ذرا دیر بعد دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ملازم چلا گیا تھا۔ اب وہ دونوں کمرے میں تنہا تھے اور بالکل خاموش تھے۔ فانوس کے درمیان چھپا ہوا مائیک اتنا حساس تھا کہ ہلکی سی آہٹ کو بھی دوسری طرف نشر کر دیتا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ آخر پریتی نے پوچھا "آپ فون پر مجھ سے کچھ کہنا چاہتے
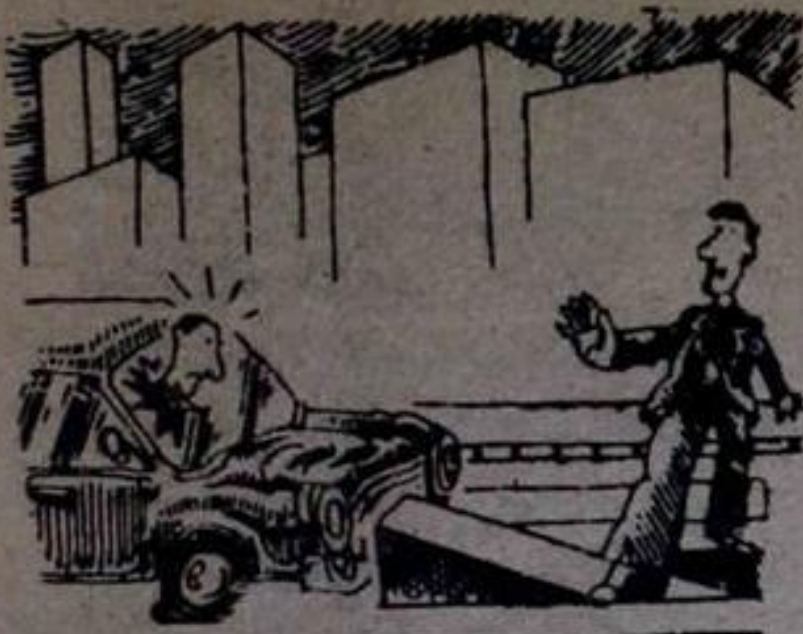
تھے۔ اب خاموش کیوں ہیں؟"

سنجے نے کہا: "میں کیا کہوں؟ راجیش بہت ہی زندہ دل نظر آتا ہے۔ اُس نے تمھیں جیت لیا ہوگا۔ اب میرے کہنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟"

وہ بولی: "راجیش انسان نہیں دیوتا ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بچہ اُن کا نہیں ہے پھر بھی وہ باپ بن کر اس بچے کو سماجی حقوق دیں گے۔"

سنجے نے حیرانی سے پوچھا: "کیا راجیش کو تم نے بتا دیا ہے کہ وہ بچہ میرا....."

"وہ بچہ آپ کا نہیں ہے۔" پریتی نے سخت لہجے میں کہا: "وہ صرف میرا ہے۔ اگر آپ کی دُنیا میں بچوں کو ماؤں کے نام سے پکارا جاتا تو میں اس معصوم کو صرف اپنا ہی نام دیتی۔ کسی مرد کی محتاج نہ ہوتی۔ مہربانی کر کے آپ کبھی اس بچے کا ذکر بھی زبان پہ نہ لائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس کا ذکر کبھی نہیں کروں گا۔"

پریتی کا دل دھڑکنے لگا۔ سنجے کتنی جلدی اس بچے سے خود کو دُور کر رہا تھا۔ کیا وہ پیدا ہونے والے بچے سے منہ پھیر سکتا تھا؟ نہیں اس کے لیے پیدا ہونے والا بچہ ہی سب کچھ تھا۔ سماج اور قانون کے کسی کھاتے میں پریتی کے بچے کا نام نہیں آ سکتا تھا۔ پھر وہ بچے کے سامنے کیوں جھجک رہی تھی؟ محبت کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ محبوب کا چہرہ ننگا ہو چکا تھا۔ اب وہ سنجے سے کیا آس لگا رہی تھی؟

سنجے نے پوچھا: "میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ اب بھی تمھارے دل میں میرے لیے کچھ جگہ ہے یا نہیں؟"

"اب اپنے سوال کا جواب خود دو۔ میرے دل میں کس کے لیے جگہ ہونا چاہیے۔ اُس کے لیے جس نے مجھے ذلّت کی پستی میں گرانا چاہا یا اس کے لیے جس نے مجھے گرنے سے پہلے ہی بچا لیا؟ آپ بتائیں۔ کیا اب بھی آپ میرے دل میں رہنا چاہتے ہیں؟ لیکن کس منہ سے رہنا چاہتے ہیں؟"

"پریتی! تم جانتی ہو کہ میں کس قدر مجبور ہوں۔"

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ مجبوریوں سے گزرنے کا نام ہی آزمائش ہے اور آزمائش کے بغیر محبت نہیں ہوتی۔"

وہ ایک لمبی سانس چھوڑ کر بولا: "مجھے صرف سیاستداں اور قانون داں ہونا چاہیے تھا لیکن تمھاری محبت کا روگ ایسا ہے کہ مرتے دم تک اُس کا علاج نہ تم سے ہو سکے گا، نہ مجھ سے۔ یہ دل ایک ضدی بچے کی طرح صرف تمھارے لیے مچلتا ہے۔"

"آپ دل کو سمجھائیں کہ پریتی کو بچے کے ساتھ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے تو عشق کا بخار ٹھنڈا ہو جائے گا۔ سنجے صاحب! پریتی اب وہ الھڑ اور نادان لڑکی نہیں رہی جو آپ کی زبان سے محبت کا ایک لفظ سن کر اپنا سب کچھ ہار جاتی تھی۔ بڑے چرکے دیے ہیں سنجے صاحب آپ نے بڑے چرکے دیے ہیں۔"

"تم جتنی باتیں بھی سناؤ، وہ کم ہے۔ میں تمھارا مجرم ہوں جتنا بخار نکال سکتی ہو نکال لو۔"

وہ چند لمحوں تک چپ رہی۔ پھر بولی: "میں پچھلی باتیں کروں گی تو وہ بخار نکالنا ہی کہلائے گا۔ کیوں نہ ابھی کی بات کی جائے؟"

"ہاں۔ جو ہو چکا ہے اُسے نظر انداز کر دینا دانش مندی ہے۔ یہ سمجھو کہ اب بھی میں دیوانہ وار تمھیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور اب مجھے آپ سے شدید نفرت ہے۔"

"پریتی! یہ، یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ کہتے کہ ابھی آپ مجھے میرے بچے کے ساتھ لینے آئے ہیں تو میں خوشی سے مر جاتی مگر آپ کے دماغ کے کسی گوشے میں وہ مظلوم بچہ نہیں ہے۔ صرف میری جوانی ہے۔ میں ایسی ہوس پرستی پر لعنت بھیجتی ہوں۔ آپ کی شخصیت کا جو مینار میرے سامنے تعمیر ہوا تھا۔ وہ گر چکا ہے۔ آج یہاں سے جانے کے بعد آپ یہ سوچ کر جائیں کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ آئندہ آپ فون پر بھی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سنجے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا: "اگر یہ ہوس پرستی ہوتی تو کہیں بھی پوری ہوتی رہتی۔ صرف تمھاری آرزو نہ ہوتی۔"

"یہ کیسی آرزو ہے کہ آپ ایک بیاہتا عورت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ اخلاقی پستی نہیں ہے؟ میں راجیش کا اعتماد ہوں، اُن کے گھرانے کی عزت ہوں۔ میں مر جاؤں گی مگر کبھی اس خاندان کی

رسوائی کا سبب نہیں بنوں گی۔"

"اگر یہ عزم ہے تو پھر کیوں رو رہی ہو؟"

"اس بات پر رو رہی ہوں کہ آپ کی محبت نے مجھے کس قدر کمزور بنا دیا ہے۔ میں اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آپ سے التجا کرتی ہوں کہ میری بات مان لیں۔ آئندہ کبھی ملاقات نہ کریں۔ کبھی اپنی آواز نہ سنائیں۔ عورت ہی کو بدنام بنتے دیں کہ اس نے آدم کو جنت سے نکالا تھا۔ آپ مجھے اس شریف گھرانے کی جنت سے نکال کر یہ اعزاز حاصل نہ کریں۔"

"اچھی بات ہے اگر تم مجھے دیکھ کر میری آواز سن کر بہک جاتی ہو تو میں نہیں بہکاؤں گا۔ آنسو پونچھ لو۔ باتھ روم میں جا کر منہ دھولو۔ ورنہ... گھر والے کیا سوچیں گے؟"

خاموشی چھا گئی۔ پریتی نے کچھ نہیں کہا۔ شاید باتھ روم میں چلی گئی تھی کیونکہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ راجیش خوش ہو گیا تھا۔ پریتی کی باتیں سن کر اس کے چہرے پر تازگی آ گئی تھی۔ بلاشبہ اس عورت نے بہت ہی اچھے کردار کا ثبوت دیا تھا۔ راجیش اسپیکر کے کنکشن کو الگ کر کے اسے دوبارہ الماری میں رکھنے کے بعد اپنی خواب گاہ سے باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پریتی بھی سنجے کے ساتھ دوسرے کمرے سے باہر آئی۔ راجیش ان دونوں کے ساتھ کوٹھی کے باہر آیا۔ پھر سنجے نے رخصتی مصافحہ کیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ راجیش نے کہا: "مکرجی صاحب اچھے آدمی ہیں۔ کیا کیس کے سلسلے میں باتیں ہو گئیں؟"

پریتی نے اُسے دیکھا۔ پھر نظریں جھکا کر بولی: "جی ہاں۔ بڑا الجھا ہوا کیس تھا۔ میں نے مشورے دیئے ہیں۔ اُن پر عمل کریں گے تو اُلجھنیں دُور ہو جائیں گی۔"

"میری دعا ہے کہ اُلجھنیں دُور ہو جائیں۔ آؤ اپنے کمرے میں چلیں۔"

وہ جانے کے لیے گھوم گیا۔ پریتی نے کہا: "سنو!" وہ رُک گیا۔ اُسے دیکھنے لگا۔ پریتی نے بڑے پیار سے پوچھا: "تم مجھ پر بھروسہ کیوں کرتے ہو؟"

"انسان ایک دوسرے پر بھروسہ نہ کرے تو یہ دُنیا نہ چلے۔ لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہیں۔"

"میں تمہاری بات پوچھ رہی ہوں۔"

"پریتی! تم عدالتوں میں قانون کے سہارے جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ ثابت کرتی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا کی سب سے بڑی عدالت ضمیر کی عدالت ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے دل کی عدالت میں اپنا مقدمہ آپ لڑتی رہتی ہو۔ اسی لیے میں بڑے صبر سے بھروسہ کر رہا ہوں۔"

پریتی نے اُسے مسکرا کر دیکھا۔ پھر کوٹھی کے اندر جانے سے پہلے اپنا دایاں ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ راجیش نے حیرت سے اور مسرت سے اُس ہاتھ کو دیکھا۔ کیونکہ آج تک اُس نے اسے اپنا ہاتھ پکڑنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب چاہتی تھی کہ وہ اُسے چھو لے۔ راجیش نے بڑے پیار سے مسکراتے ہوئے اُس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے شانہ بشانہ کوٹھی کے اندر چلے گئے۔

☆

سنجے نے پھر کبھی کسی طرح بھی پریتی سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ ماہ دو ماہ چار ماہ گزر گئے۔ اُن کی محبت ماضی کا فسانہ بن کر رہ گئی۔ تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ پریتی رفتہ رفتہ راجیش پر توجہ دے رہی تھی۔ ایک وفا شعار بیوی کی طرح تن من سے اُس کی خدمت کرتی تھی اور اُس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی۔ پھر اُس کی زندگی میں وہ وقت آ گیا، جب اُس نے ایک خوب صورت سے بیٹے کو جنم دیا۔

راجیش نے اس بچے کو سینے سے لگا کر کہا: "تقدیر نے اِس بچے کے بہانے تمہیں میری بیوی بنا دیا۔ بیوی بننے کے بعد بھی پہلے تم مجھ سے دُور دُور رہتی تھیں لیکن تمہارے دل کی عدالت میں مَیں مقدمہ جیتنے والا ہوں۔ پہلے تم نے اپنا ہاتھ مجھے دیا، پھر توجہ دینے لگیں۔ اُس کے بعد خدمت گزاری میں لگ گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اگلے ایک دو سال میں تم میرے بچے کو جنم دو گی۔"

پریتی نے اپنا ہاتھ چہرے پر رکھ کر اپنے تاثرات چھپا لیے۔ راجیش نے کہا: "اِس بچے نے ہمیں ملایا ہے۔ ہمارے رشتے کو امر روانی اکیا ہے۔ ہمیں پیار کے سنگم پر پہنچایا ہے۔ میں اس کا نام امر سنگم رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بہت ہی خوب صورت نام ہے۔" پریتی نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کا ہلکا ہلکا سا پانی جھلک رہا تھا۔ اس پانی کو آنسو نہیں کہہ سکتے کیونکہ آنسو، غم اور صدمات کی علامت ہوتے ہیں اور آنکھوں کا پانی حیا کی علامت ہوتا ہے اور ابھی پریتی کی آنکھوں کا پانی نہیں مرا تھا۔

امر کے جنم پر اُس کے سسرال میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ساس اُس پر واری جا رہی تھی۔ سسر اپنی برادری میں سینہ تان کر رہنے لگا۔ کیونکہ بھری عدالت میں اُس کے بیٹے پر جو شرمناک الزام لگایا گیا تھا، اُس الزام کو اس بچے نے غلط ثابت کر دیا تھا۔ ہماری دُنیا میں ایسے تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ بچہ تہذیب کے منہ پر سچی کالک تھا اور راجیش کے منہ سے جھوٹی کالک دھو رہا تھا۔ عجیب عبرت کا مقام ہے یہ دُنیا۔

پریتی نے اگرچہ شعوری طور پر سنجے کو اپنے تحت الشعور کی قبر میں دفن کر دیا۔ تاہم بچے کو جنم دینے کے بعد اُس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایک بار وہ اپنے بچے کو دیکھ لے۔ عورت جب لمحہ لمحہ درد سہتے سہتے اور اپنی جان دیتے دیتے بچے کو جنم دیتی ہے تو چاہتی ہے کہ بچے کا باپ اس ننھے کو ہاتھوں میں لے کر چومے۔ اس تخلیق کی تعریف کرے۔ تب وہ سب کچھ بھول جاتی ہے۔

وہ دل کو تسلی دیتی: "سنجے بدنصیب ہیں کہ امر جیسے بیٹے کو ہاتھوں میں نہیں لے سکتے۔"

دوسرے لمحے خیال آتا کہ وہاں نرملا نے بھی کسی بچے کو جنم دیا ہوگا اور وہ بچہ سنجے کی گود میں کھیل رہا ہوگا۔ اُس باپ کو اپنے دوسرے بچے کا خیال کبھی نہیں آئے گا۔ آہ! محبت، رشتے اور بچے کی آرزوؤں کی جو داستان بڑے پیار سے کبھی شروع ہوئی تھی وہ کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ محبت کی آگ بالکل ہی بجھ گئی تھی۔ صرف یادوں کا دھواں اٹھ رہا تھا اور ایک اُمید کا عذاب رہ گیا تھا کہ سنجے کبھی تو اُسے ڈھونڈ کر پچھتائے گا۔

جو اُمید بر نہ آئے وہ عذاب بن جاتی ہے اور ہر نئی اُمید کے ساتھ وہ اپنے عذاب کو قائم رکھتی ہے۔ سنجے اب اُس شہر میں نہیں رہتا تھا۔ حالانکہ وہاں اُس کی کوٹھی، دوسری جائداد اور کاروبار موجود تھے مگر وہ سرکاری طور پر دہلی شہر میں نرملا اور اپنے بچے کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اب اس بات کا امکان بھی نہیں تھا کہ ایک شہر میں رہنے سے کبھی نہ کبھی اتفاقاً کہیں سامنا ہو جائے لیکن پریتی کے دل میں اُس سے سامنا کرنے کی آرزو ایسی شدید نہیں تھی۔ بس ایک ہی تمنا تھی۔ وہ ایک بار اپنے بچے کو اسے دکھانا چاہتی تھی۔

اُس کا بیٹا امر ایک برس کا ہو گیا۔ اب وہ کیس لینے اور عدالت میں جانے لگی تھی۔ روز اپنے دفتر میں بیٹھ کر اپنے مؤکلوں سے باتیں کرتی تھی۔ راجیش نے بالآخر اُسے جیت لیا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی بڑی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پریتی بالا اور سنجے مکرجی کی داستانِ عشق کی کتاب بند ہو کر گزرے ہوئے وقت کے طاقچے پر گرد آلود ہو گئی ہے اور اب آنے والا وقت کبھی اُس کتاب کو کھول کر نہیں پڑھے گا۔

ایک روز وہ دفتر میں بیٹھی ایک فائل کا مطالعہ کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ فون کی گھنٹی تو روز ہی کئی کئی بار چیختی تھی۔ پریتی دن میں کتنے ہی لوگوں سے فون پر باتیں کرتی تھی۔ اُسے اب کسی اہم کال کا انتظار نہیں رہتا تھا۔ اُس نے فائل پر نظریں مرکوز کیے ایک ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

جواب میں بھاری بھرکم آواز سنائی دی: "پریتی!"

وہ ایک دم سے چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔ محبت کبھی کبھی چابک کی طرح لگتی ہے اور سیدھا بٹھا دیتی ہے۔ وہ اُس آواز کو بے ہوشی کے عالم میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: "میں وعدے کے خلاف تمہیں مخاطب کر رہا ہوں۔ ریسیور نہ رکھنا۔ پہلے میری بات سن لینا۔"

وہ جانے کیوں بولتے وقت کانپنے لگی: "مکرجی صاحب! میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ میری مرضی کے خلاف مجھ سے باتیں کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

یہ کہتے ہی اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب سنجے کی آواز نہیں آ سکتی تھی لیکن پریتی کے کان بج رہے تھے جو کچھ وہ بول گیا تھا، وہی بولی اُس کے کان میں گونج رہی تھی۔ وہ ٹیلی فون کی طرف دیکھنے لگی۔ اُسے توقع تھی کہ گھنٹی پھر بجے گی۔ وہ پھر پیار سے مخاطب کرے گا تو۔ تو اب۔ اب کی بار وہ کیا کرے گی؟

وہ جوابی کارروائی کے متعلق سوچنے لگی۔ اُسے خیال آیا کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔ سنجے نے دوبارہ فون نہیں کیا ہے۔ شاید اچانک سلسلہ منقطع کرنے سے اُس کی انا کو ٹھیس پہنچی ہے۔ وہ اپنی توہین محسوس کر رہا ہوگا اور اب کبھی اُسے فون نہیں کرے گا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پہلے وہ چاہتی تھی کہ دوبارہ فون نہ آئے اور اب اُدھر سے خاموشی تھی تو اِدھر بے نام سی بے چینی شروع ہو گئی تھی۔ وہ اپنی میز کے سامنے ٹہلنے لگی۔

اُس وقت شام کے چار بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ راجیش روز شام کو دفتر آ کر اُسے اپنے ساتھ گھر لے جاتا تھا اور اپنے ساتھ آیا اور بچے کو بھی لاتا تھا تاکہ دن بھر کی تھکی ہوئی ماں اپنے بیٹے کو دفتر میں ہی پیار کر کے..... تازہ دم ہو جائے۔ اُس روز راجیش اور امر کا انتظار نہ ہوتا تو پریتی وقت سے پہلے ہی دفتر سے چلی جاتی۔ سنجے کی فون کال نے اُسے اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد ایک کار دفتر کے سامنے آ کر رکی۔ راجیش پانچ بجے آیا کرتا تھا مگر آج بیس منٹ پہلے آ گیا تھا۔ پریتی نے کھڑکی کے پاس جا کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ سنجے کار سے اُتر کر دفتر میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ جسے بھول جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی یاد دلانے بنفسِ نفیس آ رہا تھا۔

اب تو سامنا کرنا ہی تھا۔ لہٰذا سامنا ہو گیا۔ وہ دفتر کے دوسرے کمروں کو عبور کرتا ہوا پریتی کے چیمبر میں آ گیا۔ چند ساعتوں تک دونوں ایک دوسرے کے سامنے گم صم رہے۔ پھر سنجے نے کہا: "میں جانتا تھا کہ تم مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرو گی۔"

"اور آپ جبراً بات کرنے آئے ہیں۔"

"جبر کی بات نہیں ہے۔ میں ایسے حالات سے دوچار ہو رہا ہوں کہ اب ان حالات میں تم ہی میرا ساتھ دے سکتی ہو۔ میں۔

بہت مجبور ہو کر آیا ہوں۔"

"آپ جیسے بڑے آدمی بھی مجبور ہوتے ہیں جن کے پاس دھن دولت، خدمت گزار بیوی اور خوب صورت بچہ..."

"بچہ نہیں ہے۔" وہ بڑے کرب سے بولا۔ "میں ابھی تک بے اولاد ہی ہوں۔"

"کیا؟" پریتی حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگی اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سنجے نے وہی کہا ہے جو ابھی اُس نے سُنا ہے۔

وہ کہہ رہا تھا: "نرملا سیڑھی سے گر پڑی تھی۔ چھ ماہ کا حمل ضائع ہو گیا اور وہ صدمے سے پاگل ہو گئی ہے۔"

پریتی پتھر کے بُت کی طرح ساکت کھڑی رہی۔ نرملا کا وہ بچہ مر گیا، جس کے لیے سنجے نے اُس کے بچّے کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ کوئی خوشی کی بات نہیں تھی۔ ایک بچّے کی موت آئی تھی وہ مر گیا۔ اس کی جگہ پریتی کا بچہ بھی دُنیا سے اُٹھ سکتا تھا۔ پریتی نے خیال ہی خیال میں اپنے بچّے کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اُسے اِس بات کی خوشی تھی کہ اُس کا بچہ محفوظ ہے۔

"مجھے یہ سُن کر افسوس ہو رہا ہے۔ آپ نرملا دیوی کو سمجھائیں وہ آیندہ بھی ماں بن سکتی ہیں۔"

"وہ اب کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے۔ اُس کے اندر کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔"

"اوہ۔" پریتی بیٹھ گئی۔ اب کچھ کچھ اُس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ سنجے اُس کے دروازے پر کیوں آیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ تقدیر نے پریتی کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ راجیش کا سہارا نہ لیتی تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ اتنے دُکھ اور پریشانیوں سے گزرنے کے باوجود اُس نے نرملا اور اُس کے بچّے کو کبھی بددعا نہیں دی تھی۔ یہ تقدیر اب سنجے کو بگاڑ رہی تھی۔

"کیا واقعی نرملا دیوی پاگل ہو گئی ہیں؟"

"وہ آٹھ ماہ تک پاگل خانہ میں رہی۔ مینٹل ہسپتال میں علاج ہوتا رہا۔ پچھلے ایک برس سے وہ بظاہر نارمل ہے لیکن کسی بچّے کو دیکھ کر، ریڈیو سے کسی بچّے کی آواز سُن کر یا اخبار اور رسالوں میں تصویریں دیکھ کر دماغی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ اپنے بچّے کو پکارنے اور ڈھونڈنے لگتی ہے۔"

پریتی کا دل نرملا کے لیے ہمدردی سے بھر گیا۔ وہ بولی "تقدیر نرملا دیوی پر بڑے ظلم کر رہی ہے۔ کاش میں اُن کے لیے کچھ کر سکتی۔"

"کئی ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نرملا کی گود میں ایک بچہ ہونا چاہیے۔ تب ہی ذہنی حالت درست ہو گی۔"

"اور اب وہ ماں بننے کے قابل نہیں رہیں؟"

"ہاں ڈاکٹر یہی کہتے ہیں۔"

"تو پھر نرملا دیوی کسی رشتے والے کے بچّے کو گود لے سکتی ہیں۔"

"کسی پرائے بچّے کو کیوں؟ میرا اپنا بچہ تمھارے پاس ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مجھے اپنے بچّے کی سخت ضرورت ہے۔"

پریتی نے غصّے سے پوچھا "بچّے کی ضرورت ہے۔ بچّے کی محبت نہیں ہے؟"

"محبت ہے اسی لیے صرف اپنا بچہ نرملا کی گود میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میرے پاس آپ کا بچہ نہیں ہے۔ اُس کے باپ کا نام راجیش ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

"یہ جھوٹ بڑا بندہ پرور ہے۔ جو سچ تھا۔ وہ میرے بچّے کو پیدا ہونے سے پہلے قتل کر چکا ہے۔"

"پریتی! سچ کبھی کبھی جھوٹ سے بدتر ہو جاتا ہے۔ میں راجیش سے بدتر ہوں۔ تمھارا دیا ہوا ہر الزام درست ہے۔ میں تمھیں انسانی ہمدردی کا واسطہ دیتا ہوں۔ میرا بچہ مجھے دے دو۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔ اِسی لیے ایک ماں سے اُس کا بچہ مانگ رہے ہیں۔"

"پلیز، وہ صرف تمھارا نہیں میرا بھی ہے۔ ہم دونوں کا ہے۔ ہم دونوں نرملا کی زندگی بچا سکتے ہیں۔"

"میں انسانی ہمدردی میں اپنا خون دے سکتی ہوں، اپنے جگر کا ٹکڑا نہیں دے سکتی۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ "تم سمجھتی ہو گی کہ میں صرف نرملا کے لیے اُسے لینے آیا ہوں۔ یقین کرو جب سے نرملا کی طرف سے بے اولاد ہونے کا یقین ہوا ہے تب سے تمھارا بیٹا میرا بیٹا خیالوں میں آ کر مجھے تڑپاتا ہے۔ اب میری یہی ایک اولاد ہے اور میں ایسا بدنصیب باپ ہوں کہ اُسے دُنیا کے سامنے اپنی اولاد نہیں کہہ سکتا۔"

وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔ "یہی ایک ایسا موقع ہے کہ میں اُسے نرملا کی گود میں دے کر دُنیا والوں کے سامنے اپنا بیٹا کہہ سکتا ہوں۔"

"اور میں کبھی سب کے سامنے اُسے اپنا نہیں کہہ سکوں گی۔"

"تم سب سے چھپ کر روز میرے گھر آ کر بچّے کو پیار کر سکتی ہو۔"

"آپ نے اسی بچّے کو کبھی چھپ کر بھی اپنانے کی بات نہیں کی تھی۔ جو چوری آپ نہ کر سکے، وہ مجھے نہ سکھائیں۔ جب اُس بچّے کو ایک باپ کی ضرورت تھی اُس وقت میں آپ کی بڑی سے بڑی بات مان لیتی لیکن اب میں اپنے لال پر آپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ بہتر ہے کہ آپ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔ آخری سانس تک میں اپنے بیٹے کو اپنے سے دُور نہیں کروں گی۔"

سنجے کا سَر جھک گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا: "میں اِس وقت ایسا بھکاری ہوں جس کے پاس بھیک مانگنے کے لیے متاثر کرنے والے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ایسا کیا کر گزروں کہ تم ایک دم سے پگھل کر بیٹے کو میری گود میں دے دو۔ بس اب بھگوان سے تمہارا دل موم ہو جانے کی دعا کرتا ہوں۔"

"میں نے بھی ایک عرصہ تک آپ کے موم ہو جانے کی دعائیں مانگی ہیں۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت رہ گئی ہے کہ میری دعاؤں کے جواب میں آپ میرے لیے گالی بنتے رہے۔"

سنجے نے دروازے پر پہنچ کر اُسے دیکھا۔ پھر سَر ہلا کر کہا: "ہاں میری سنگدلی بالا پرواہی اب میری سمجھ میں آ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے جیسے آخری بار التجا آمیز نظروں سے دیکھا لیکن پریتی نے منہ پھیر لیا۔ وہ چیمبر سے باہر آ گیا مگر دوسرے کمرے سے گزرتے وقت ٹھٹھک گیا۔ وہاں راجیش بچے کو گود میں لیے کھڑا تھا۔ بچے کو دیکھ کر یکبارگی سنجے کا دل سینے میں اُچھلنے لگا جیسے لپک کر اِس ننھے کو لے لینا چاہتا ہو۔ وہی تو ایک بیٹا رہ گیا تھا۔

امر دو برس کا ہو گیا تھا۔ سنجے اُسے دیکھ کر جیسے اپنے بچپن کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ آج بھی البم میں اُس کے بچپن کی تصویریں موجود تھیں۔ امر ہو بہو ویسا ہی تھا۔ راجیش نے مسکرا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا: "ہیلو مکرجی صاحب! میرے بیٹے کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

سنجے نے چونک کر بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "بیٹا بہت خوب صورت ہے۔ اِسے گود میں لے کر پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

راجیش نے خوش دلی سے کہا: "آپ ہی کا ہے۔ ضرور گود میں لے کر پیار کریں۔"

اُس نے امر کو سنجے کی طرف بڑھایا۔ سنجے نے اُسے گود میں لینے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اُسی وقت پریتی چیختی ہوئی بولی: "نہیں نہیں۔" دوڑتی ہوئی آئی: "یہ میرا ہے۔ یہ میرا ہے۔" اُس نے سنجے کے ہاتھوں میں پہنچنے والے امر کو چھین لیا۔ پھر وہاں سے بھاگ کر واپس اپنے چیمبر کے دروازے پر آئی۔ سہمے ہوئے انداز میں سَر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں دوں گی۔ میں اپنے بچے کو نہیں دوں گی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ جاؤ۔ جاؤ۔"

اُس کی چیخیں سُن کر دفتر کے دوسرے لوگ اُس کمرے میں آ گئے تھے۔ پریتی کی اس اضطراری حرکت سے سنجے بوکھلا گیا تھا۔ دوسروں کی سوالیہ۔۔۔ نظروں سے گھبرا کر تیزی سے باہر چلا گیا۔ راجیش نے ہاتھ جھٹک کر دفتر کے ملازموں سے کہا: "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم لوگ جاؤ۔ جاؤ بھیڑ نہ لگاؤ۔"

وہ سب حکم کے بندے تھے۔ اپنے اپنے طور پر سوچتے ہوئے چلے گئے۔ راجیش نے پریتی کے قریب آ کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "اپنے ہوش و حواس میں رہو۔ تم نے تو امر کو ایسے چھین لیا جیسے مکرجی صاحب اِسے لے کر بھاگنے والے ہوں۔ بیچارے بہت شرمندہ ہو کر گئے تھے۔"

وہ اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے بولی: "اچھا ہے پھر کبھی نہیں آئیں گے۔"

وہ پلٹ کر چیمبر میں آ گئی۔ اپنے بیٹے کو جی بھر کے چومنے لگی۔ راجیش نے کہا: "ہر شخص اپنے حالات سے مجبور ہوتا ہے۔ مجھے مکرجی کی دھرم پتنی سے ہمدردی ہے۔"

پریتی نے چونک کر دیکھا۔ تب اُسے خیال آیا کہ بہت دیر پہلے ہی راجیش کے یہاں آنے کا وقت ہو چکا تھا اور وہ بہت دیر پہلے ہی امر کو لے کر یہاں پہنچ گیا تھا اور سنجے کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو سُن لی تھی اور اس طرح اُس نے اپنے بیٹے امر کے باپ کو پہچان لیا تھا۔

راجیش نے اُس کے چونکنے کے انداز کو سمجھتے ہوئے کہا: "امر صرف میرا بیٹا ہے اور اِسے ہم سے کوئی چھین کر نہیں لے جا سکے گا۔"

وہ راجیش سے لپٹ گئی: "تم کتنے اچھے ہو۔ تم محافظ نہ بنتے تو نہ جانے میرا انجام کیا ہوتا؟"

"ہمارا انجام بخیر ہو گا۔ ہمیں اپنے آپ پر اعتماد رکھنا چاہیے۔"

"مجھے اپنے سے زیادہ آپ پر اعتماد ہے۔"

"تو پھر امر کو نرملا دیوی کے پاس لے جاؤ۔"

## فنکار

ایک شخص قصبے کے واحد سبزی فروش کے پاس گیا اور بولا: "میں تمہاری دُکان کے تمام ٹماٹر اور انڈے خریدنا چاہتا ہوں۔" دکاندار نے حیرت سے کہا: "سب؟"

"ہاں ۔۔۔ جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے؟" اچانک دکاندار ہنس دیا:

"اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ آپ یہ سب چیزیں اپنے ساتھ ٹاؤن ہال میں لے جائیں گے اور اُس احمق، بے سُرے اور بے تُکے فنکار کے سَر پر ماریں گے جو آج اپنے گانے سُنانے والا ہے۔"

وہ شخص بولا: "نہیں ہرگز نہیں۔ تم غلط سمجھے ہو۔ میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی بھی شخص اُس فنکار پر انڈے اور ٹماٹر نہ پھینک سکے کیونکہ وہ فنکار میں ہی ہوں۔"

*

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو کر بولی۔ "نہیں وہاں کبھی نہیں لے جاؤں گی۔"

"تم کتنی ہو کر اپنے بیٹے کو بہت بڑا آدمی بناؤ گی۔ اس سے بڑا پن اور کیا ہوگا کہ امر اتنی سی عمر میں ایک نیم پاگل عورت کو نئی زندگی دے گا۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "کیا تم میرے بچے کو مجھ سے چھین کر سوتیلے باپ ہونے کا ثبوت دے رہے ہو؟"

"نہیں پریتی! میں امر کو ہمیشہ کے لیے اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو اپنے ماں باپ کو کیا جواب دوں گا۔ وہ اپنے پوتے کا مطالبہ کریں گے۔"

تب پریتی کو خیال آیا کہ امر صرف اُسی کا نہیں بلکہ پورے خاندان کا لاڈلا ہے اور کوئی اُسے نرملا کی گود میں دینا منظور نہیں کرے گا۔ اُس نے پوچھا۔ "پھر تم اُسے نرملا کے پاس کیوں پہنچانا چاہتے ہو؟"

"ہم خود اسے لے جائیں گے۔ وہاں دیکھیں گے اگر اُس عورت کی ممتا کا زخم بھرے گا تو ہم اُس کے نارمل ہونے تک روز امر کو اتنی دیر وہاں رکھیں گے جتنی دیر تم اپنے دفتر اور عدالت میں مصروف رہتی ہو۔ فرصت کے وقت تمہارا بیٹا تمہارے ہی پاس رہا کرے گا۔"

"نہیں راجیش نہیں۔ میں مصروف رہا کرتی ہوں۔ وہاں امر کو زیادہ پیار ملے گا اور وہ اُسے بہلائیں گے پھسلائیں گے تو وہ انہی کا ہو کر رہ جائے گا۔"

"تم ماں ہو تمہارے دل میں ہزاروں خدشات جنم لیں گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ امر اُن کی طرف زیادہ مائل ہوگا تو ہم اُسے وہاں نہیں لے جائیں گے۔ بلکہ کچھ دنوں کے بعد ہی حکیم جی صاحب کو مشورہ دیں گے کہ کسی یتیم خانے سے کوئی بچہ گود لے لیں۔"

"میں آج ہی اُنھیں یہ مشورہ دوں گی۔ چلیے میں تیار ہوں۔"

پریتی نے ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا۔ دوسرے ہاتھ میں پرس لیا۔ پھر راجیش کے ساتھ باہر آ کر کار میں بیٹھ گئی۔ تمام راستے وہ امر کو سینے سے لگائے رہی۔ کوئی ایسا بہانہ سوچتی رہی کہ راستہ بدل کر اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے گھر پہنچ جائے۔ نرملا کی طرف نہ جانے کی کوئی معقول وجہ پیدا ہو جائے لیکن اُن کی کار سنجے کی کوٹھی کے احاطہ میں پہنچ گئی۔

سنجے ابھی تک گھر واپس نہیں پہنچا تھا۔ شاید غم غلط کرنے کے لیے کہیں بار میں بیٹھ کر پی رہا ہوگا۔ پریتی نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر راجیش کو وہاں بیٹھنے کے لیے کہا اور امر کو گود میں لیے نرملا کی خواب گاہ میں گئی وہاں رشتے کی کچھ عورتیں تھیں۔ نرملا بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ پریتی اور بچے کو دیکھ کر اٹھنے لگی وہ بہت بیمار تھی اُس میں اٹھنے کی بھی سکت نہ تھی۔ پریتی نے قریب جاتے ہوئے کہا۔ "آپ آرام سے لیٹی رہیں۔ میں اپنے بیٹے کو خود ہی لا رہی تھی۔"

نرملا نے کہا۔ "نہیں۔ یہ ۔۔۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ تم اسے کہاں لے گئی تھیں؟"

پریتی ٹھٹک گئی۔ پہلے تو جی میں آیا کہ اپنے بیٹے کو لے کر واپس بھاگ جائے۔ پھر خیال آیا کہ نرملا ممتا کی ماری ہے۔ اپنے حواس میں نہیں رہتی ہے۔ اسے بچے کی صورت دکھا کر واپس نہیں لے جانا چاہیے۔ پریتی کو سوچ میں دیکھ کر نرملا نے نقاہت سے کہا۔ "آہ! مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دوسروں کے بچوں کو اپنا کہہ کر ان کی ماؤں کو پریشان کر دیتی ہوں۔ پریتی! میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر پتہ نہیں کیسے میں آپ ہی آپ ایسا کرنے لگتی ہوں مجھے معاف کر دو۔ یہ بچہ تمہارا ہی ہے۔"

پریتی نے فوراً ہی مطمئن ہو کر اپنے بیٹے کو اس کے پاس پلنگ پر بٹھا دیا۔ نرملا نے امر کو ادھر اُدھر سے چھو کر دیکھا جیسے اس میں اپنے شوہر کو دیکھ رہی ہو۔ پھر وہ اُسے ٹھہر ٹھہر کر چومنے اور اس کی تعریفیں کرنے لگی۔ اتنے میں سنجے آگیا۔ وہ خوش ہو کر بچے کو نرملا کے پاس دیکھ رہا تھا پھر وہ قریب آ کر احسان مندی سے بولا۔ "پریتی! میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟"

نرملا نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "سب لوگوں کو یہاں سے جانے کے لیے کہہ دیں۔ میں پریتی سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

سنجے نے تمام رشتہ داروں کو خواب گاہ سے باہر جانے کے لیے کہا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو نرملا نے سنجے سے کہا۔ "آپ بچے کو گود میں لے کر وہاں میرے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ پریتی تم سنجے کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔"

سنجے نے بچے کو گود میں لیا۔ پھر پلنگ کی پائینتی جا کر نرملا کی نگاہوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پریتی بھی جھجکتی ہوئی سنجے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ نرملا نے ایک گہری سانس چھوڑ کر کہا۔۔۔۔

"ایک وقت آپ مجھے طلاق دینا چاہتے تھے۔ اب بھی میں ماں نہیں بن سکتی۔ پریتی میں تم سے ۔۔۔ (التجا) کرتی ہوں کہ سنجے کو اس بچے سے محروم نہ کرنا۔ تم چاہو تو طلاق لے کر سنجے سے شادی کر سکتی ہو۔ میں ۔۔۔۔ میں اپنی زندگی سے طلاق لے کر جا رہی ہوں۔"

"نرملا! ایسا نہ کہو۔ یہ بچہ صرف ہمارا نہیں تمہارا بھی ہے۔ تم زندہ رہو گی اور یہ بچہ تمہاری گود میں پروان چڑھے گا۔"

پریتی نے کہا۔ "نرملا دیوی! آپ عورت ہونے کے ناتے سمجھ سکتی ہیں کہ میں خواہ مخواہ راجیش سے طلاق نہیں لوں گی۔ آپ میری خاطر اپنے شوہر کو چھوڑ سکتی ہیں تو میں آپ کی خاطر اپنے بیٹے کو آپ کے پاس چھوڑ سکتی ہوں۔ دنیا میں آ کر بہت کچھ سہنا پڑتا

ہے۔ آپ زندگی کو ہارنے کی بات نہ کریں۔"

نرملا کی آنکھیں سنجے اور امر کو دیکھتے دیکھتے ساکت ہو گئیں۔ پریتی نے اُسے آواز دی: "دیوی جی! امر آپ ہی کو ماں سمجھے گا۔ آپ اسے آواز دیں۔ یہ گود میں آ جائے گا۔"

سنجے نے پوچھا: "نرملا چپ کیوں ہو؟ امر کو آواز دو۔"

دونوں باری باری نرملا کو پکارتے رہے۔ پھر سنجے امر کو پریتی کی گود میں دے کر اس کے پاس پہنچا۔ تب پتہ چلا کہ وہ اپنے بانجھ مقدر پر تھوک کر اس دنیا سے جا چکی ہے۔ سنجے نے سر اٹھا کر کہا: "نرملا... نرملا نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے پریتی!"

پریتی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو اپنے سینے کے ساتھ زور سے بھینچ لیا۔ پھر سر جھکا کر وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ خوابگاہ سے باہر چلی گئی۔

○

سنجے کئی ماہ تک سوگ مناتا رہا۔ نرملا سے سترہ سال تک رفاقت رہی تھی۔ وہ سوگ نہ منا کر دوسری شادی کی فکر کرتا.... تو برادری والے بُرا مانتے۔ پھر سیاست میں بھی کچھ یوں الجھنا پڑ گیا کہ مصروفیات میں ایک برس بیت گیا۔ تاہم اس نے ایک برس میں چار مرتبہ پریتی سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ دو بار وہ فون اٹینڈ کرنے کے لئے موجود نہیں تھی۔ تیسری بار اس نے اٹینڈ کیا تو سنجے نے کہا: "پریتی! میں شادی کے بندھن سے آزاد ہو گیا ہوں۔ اب میرے آگے پابندیاں نہیں ہیں۔"

وہ بولی: "میں شادی کے بندھن میں ہوں۔ میرے آگے پابندیاں ہی پابندیاں ہیں۔"

چوتھی بار اس نے فون پہ کہا: "پریتی! یاد کرو نرملا کی آخری خواہش کیا تھی؟ وہ مجھے تمہیں اور امر کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی تھی۔ اب بھی اس کی آتما (روح) ہمیں ساتھ دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گی۔"

"سنجے! زندہ لوگوں کی آتمائیں بھی بے چین ہوتی ہیں۔ اگر ان سے بے وفائی کی جائے۔ میں راجیش کی جیتی جاگتی دنیا میں رہتی ہوں۔ کسی سے بے وفائی میرا شیوہ نہیں ہے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر ایک دن راجیش نے بتایا کہ سنجے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے رات کو کھانے کی دعوت دی ہے۔ پریتی نے کہا: "میں تو نہیں جاؤں گی۔"

"میں وعدہ کر چکا ہوں۔ تم انکار کرو گی تو میری زبان جھوٹی پڑے گی۔"

"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر وعدہ کیوں کیا؟"

"پریتی! صاف بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم مکرجی صاحب کا سامنا کرو۔ ایک بار نہیں دس بار ملو۔ اور دس بار اپنے

## ایک بٹا دو

تین دیہاتی بس میں سوار ہوئے۔ بس میں رش کی وجہ سے ان میں سے ایک چھت پر چڑھ گیا۔ کنڈکٹر نے باقی جو دو بس کے اندر تھے۔ پوچھا: "کتنی سواری؟"

ایک دیہاتی نے جواب دیا: "ایک بٹے دو"

کنڈکٹر نے حیران ہو کر پوچھا: "وہ کیسے؟"

دیہاتی پھر بولا، "ایک اوپر اور دو نیچے۔"

مرسلہ، مسعود افضل (کراچی)

دل کو ٹٹولو۔ یہ دیکھو کہ دل کے کسی گوشے میں اب بھی کہیں مکرجی صاحب رہ گئے ہیں یا نہیں؟"

"نہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولی: "میں تمہاری پتنی ہوں۔ اب میرے سینے میں کسی نادان تجربہ کا نہیں، تمہاری پتنی کا دل ہے۔ ایسی باتیں کہہ کر میری توہین نہ کرو۔"

"جب ایسی بات نہیں ہے تو پھر چلو! اور یہ سمجھ کر چلو کہ امر ان کا بیٹا بھی ہے اور وہ کبھی کبھی اسے دیکھنے کا حق رکھتے ہیں۔"

"راجیش! تمہاری یہ بات اگر امر کے دماغ میں بیٹھ گئی تو اس پر کیا اثر ہو گا؟"

"سوری پریتی! آئندہ یہ بات میری زبان پر نہیں آئے گی۔ اب تو چلو۔"

وہ دونوں رات کے آٹھ بجے سنجے کی کوٹھی میں پہنچے۔ وہ ان کا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت فکر مند رہنے لگا ہے۔ وہ تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے اس نے پوچھا: "آپ لوگ امر کو نہیں لائے؟"

"وہ اس وقت سوجاتا ہے۔"

سنجے نے اٹھتے ہوئے کہا: "آئیے پہلے کھانا کھا لیں۔"

پریتی نے کہا: "مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں آج آخری بار یہ پوچھنے آئی ہوں کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

اس نے پریتی کو دیکھا۔ پھر بیٹھتے ہوئے کہا: "میں نے محبت سے جو کچھ چاہا۔ وہ مجھے نہیں ملا۔ اس میں میری غلطی اور مجبوریاں بھی ہیں لیکن اب جبکہ میں ڈھلنے کی منزل پر آیا ہوں۔ تو کچھ پالینا چاہتا ہوں۔"

پریتی نے پوچھا: "صاف لفظوں میں کہئے۔ آپ کیا پانا چاہتے ہیں؟"

وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچانے لگا۔ راجیش نے کہا: "اگر میری وجہ سے ہچکچاہٹ ہے تو میں تھوڑی دیر کے لئے باہر

چلا جاؤں؟"

"نہیں راجیش! میرا اور پریتی کا ماضی تم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں تم سے ہی پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اپنے بندھن سے پریتی کو آزاد کر سکتے ہو؟"

پریتی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر چیخ کر بولی۔ "میں آزاد نہیں ہونا چاہتی۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے راجیش سے الگ کرنے والے؟"

راجیش نے کہا۔ "پریتی! بیٹھ جاؤ۔"

"میں نہیں بیٹھوں گی۔ میں عورت ہوں کھلونا نہیں ہوں کہ پہلے ایک کے پاس پھر دوسرے کے پاس اور پھر پہلے کے پاس۔ کیا میں بازاری ہوں؟ آپ دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ میرے متعلق ایسی باتیں کریں۔"

راجیش نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک شوہر کی حیثیت سے حق پہنچتا ہے کہ میں تمہاری پچھلی محبت کا حساب کروں۔ سنو پریتی! دل میں جگہ بنانے والی جتنی چیزیں ہیں۔ ان میں سب سے گہری جگہ بنانے والی چیز محبت ہے۔ یوں بھی یہ سچ ہے کہ عورت اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھولتی۔"

پریتی نے کہا۔ "بے شک یہ سچ ہے۔ بشرطیکہ مرد بھی سچا ہو۔ ایسا جھوٹا اور بزدل نہ ہو کہ اپنے بچے کو اپنا نام نہ دے سکے۔"

سنجے نے عاجزی سے کہا۔ "تم میری مجبوریاں جانتی ہو۔"

"جانتی تھی۔ جب راجیش نے حوصلہ دکھایا۔ جو کام آپ نہ کر سکے اور انہوں نے کر دکھایا تو فرق معلوم ہوا کہ آپ مجبور نہیں۔۔ بزدل تھے۔"

"حالات انسان کو بزدل بنا دیتے ہیں۔ راجیش کی زندگی میں بھی بزدلی کے مواقع آ سکتے ہیں پریتی! یہ تمہیں طلاق دے سکتے ہیں جیسا کہ میں نرملا کو طلاق دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ ایک مرد کے لئے ایک عورت کو چھوڑ دینا آسان ہوتا ہے۔ لیکن بچہ چھوڑا نہیں سکتا۔ راجیش! تم امر کو چھوڑنا چاہو گے تو تمہارے ماں باپ جو دادی دادا بن گئے ہیں۔ وہ تمہارا محاسبہ کریں گے۔ بہو تو آنی جانی چیز ہوتی ہے۔ تمہیں سارے خاندان کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اگر تم امر کو چھوڑنا چاہو گے۔ کیونکہ وہ تمہاری اولاد سمجھا جا رہا ہے۔ تم اسے اولاد ماننے سے انکار کرو گے۔ تو عدالت میں ارونا کی دی ہوئی بدنامی لوٹ آئے گی۔ اس موقع پر تم بھی بزدل کی طرح خاموش رہنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میں نے اس بچے کا باپ بن کر پریتی کے ساتھ جو نیکی کی ہے۔ اسے دنیا نہیں سمجھے گی۔ اسے میری بے غیرتی اور نامردی سمجھے گی۔ پھر ایک بار میرے چاروں طرف بدنامی کے دروازے کھل جائیں گے۔ بے شک میں بھی مجبور اور بزدل ہوں۔"

کیسی دنیا ہے یہ؟ بزدلوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ سچ کو سچ کہہ سکے۔ پریتی کے دائیں طرف راجیش کھڑا تھا اور بائیں طرف سنجے سکڑ رہا تھا۔ امر ایک کا بیٹا نہیں تھا مگر وہ اسے بیٹا کہنے پر مجبور تھا۔ امر دوسرے کا بیٹا تھا۔ مگر وہ باپ کے رشتے سے انکار کرنے پر مجبور تھا۔ مہذب لوگوں کے درمیان مجبوریوں کے رشتے زیادہ ہوتے ہیں۔

پریتی نے دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔ "اگر اسی طرح انسان حالات کا غلام ہوتا ہے تو آپ دونوں غلام میرے لئے برابر ہیں۔ میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ مجھے تو اسی خاندان میں رہنا ہے، جہاں میں اب رہتی ہوں۔ ویسے آپ دنیا کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ میرے بچے کے سلسلے میں کون سینہ ٹھونک کر سچ کہہ سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں کے درمیان سے نکل کر جانے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ ذرا ٹھہر گئی۔ دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "سماج میں خود کو معزز اور جائز بنا کر رکھنے کے لئے ایک ننھے سے بچے کو ناجائز کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آپ لوگوں کے پاس ذرا سی بھی عقل ہے تو سچ کو پہچانیں اور سچ یہ ہے کہ میرا بچہ جائز ہے۔ اور آپ دونوں کی تہذیب ناجائز ہے۔"

وہ پلٹ کر جانے لگی۔ راجیش نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "رک جاؤ پریتی! اگر تم چیلنج کے انداز میں بولو گی تو میں پھر بدنامی مول لے کر تمہیں اور امر کو چھوڑ سکتا ہوں۔"

سنجے نے کہا۔ "تم چھوڑ دو۔ میں پریتی کو اپنا لوں گا۔"

وہ بولی۔ "اونہہ، نہ تم مجھے چھوڑ سکتے ہو اور نہ سنجے اب مجھے اپنا سکتے ہیں کیونکہ آپ دونوں حالات سے مجبور ہو جاتے ہیں اور اب حالات یہ ہیں کہ میں راجیش کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

راجیش دھپ سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کا بچہ جنم لینے والا تھا۔

سنجے صوفے پر گرا اور اس میں دھنس کر رہ گیا۔ اب اگر وہ پریتی کو اپنانے کی بات کرتا تو پریتی کے ساتھ دوسرے کا بچہ اس کے گھر پیدا ہوتا۔ جیسے اس کا بچہ دوسرے کے گھر ہوا تھا۔

ان سب کے پیروں میں پھر حالات کی زنجیریں پڑ گئی تھیں۔

کہتے ہیں پرانی کہاوت ہو گئی کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لیکن اس کہاوت کا مفہوم کبھی پرانا نہیں ہوگا۔ اس بار محی الدین نواب کا قلم کہتا ہے کہ آپ میں سے کتنے ہی لوگ ابھی دریافت / ایجاد نہیں ہوئے ہیں کیونکہ آپ نے انسانوں کے بازار میں اپنی اہمیت یا اپنی ضرورت کا سکہ نہیں جمایا ہے۔ جب لوگ آپ کی ضرورت محسوس کریں گے تو آپ کو دریافت کرتے کرتے بام عروج تک پہنچا دیں گے۔ لیکن لوگ آپ کی ضرورت کب محسوس کریں گے؟ اس سوال کا جواب اس کہانی میں موجود ہے۔

پچھلے ماہ محی الدین نواب کی شائع ہونے والی کہانی "سدابہار" کو بے حد سراہا گیا لیکن دو چار خطوں میں یہ شکوہ تھا کہ کہانی واقعاتی اعتبار سے تو بہت دلچسپ تھی لیکن محی الدین نواب کا مخصوص انداز بیان نہ تھا۔ دلچسپ فقرے اور طنز کے زہر میں بجھے نشتر جو نواب کی تحریر کا طرۂ امتیاز ہیں، اس سے قارئین محروم رہے۔

یہ شکایت کسی حد تک درست ہے لیکن ہمیشہ ایک ہی انداز بیان کی توقع رکھنا مناسب نہیں ہے۔ کبھی نواب کا بھی دل چاہتا ہے کہ اپنے انداز سے ہٹ کر کچھ کہے۔ ویسے آپ کی پسند اور آپ کی خوشی مقدم ہے۔ زیر نظر کہانی "ضرورت" میں نواب نے آپ کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھا ہے۔ نواب لاکھوں قارئین کی ضرورت ہے۔ آپ بھی اس کی ضرورت پڑھیں اور حسب ضرورت میں اپنی آراء سے نوازیں۔

**نور بیگم** کے چہرے پہ نام کو نور نہیں تھا۔ شاید ماں باپ نے بھی اس کالی کلوٹی کا مذاق اڑانے کے لیے اس کا یہ نام رکھ دیا تھا یا پھر جیسا کہ کہا جاتا ہے اولاد گوری ہو یا کالی ماں باپ کے لیے وہ چاند کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ بہرحال وجہ تسمیہ جو کچھ بھی ہو وہ بے چاری اپنی کالی صورت دیکھتی تھی اور کسی کو اپنا نام نور بیگم بتاتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔

اس کے نصیب بھی کالے تھے۔ اس کی پیدائش کے چھ ماہ بعد باپ مر گیا۔ ماں اسے طعنے دیتے ہوئے پرورش کرتی رہی کہ اس چڑیل نے پیدا ہوتے ہی باپ کو کھا لیا ہے اور کسی دن ماں کو بھی کھا جائے گی۔ جب وہ آٹھ برس کی ہوئی تو ماں نے بیماری کی حالت میں وہی طعنہ دیا اور طعنہ دینے کے چند سیکنڈ بعد ہی مر گئی۔

نور بیگم کو آٹھ برس کی عمر میں پہلی بار یقین آیا کہ وہ سچ مچ چڑیل ہے۔ اس روز وہ خوب روئی۔ اسے ماں کی موت سے زیادہ اپنے چڑیل ہونے کا دکھ تھا۔ وہ اس دنیا سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی حالانکہ موت سے پہلے کوئی دنیا سے دور نہیں جا سکتا۔ ابھی وہ یہ باتیں نہیں سمجھتی تھی۔

جب محلے کے لوگ اس کی ماں کی تجہیز و تکفین کے لیے چندہ کر رہے تھے، اس وقت وہ وہاں سے بھاگ گئی۔

بھاگتے بھاگتے اس نے دیکھا کہ دنیا کہیں ختم نہیں ہو رہی ہے۔ ہر جگہ انسان اور حیوان نظر آ رہے تھے جو اسے چڑیل سمجھ کر اس سے دور بھاگ سکتے تھے۔ آخر وہ تھک ہار کر ایک جگہ گر پڑی۔ پہلے بھاگنے کے دوران ڈوبتی ہوئی شام کا اجالا تھا۔ اب اس کے چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جب لوگ چھوٹ جائیں، باپ کے بعد ماں بھی بچھڑ جائے، روشنی بھی ساتھ چھوڑ دے۔ اس دنیا کی کوئی چیز آس پاس نظر نہ آئے، تب وہ تاریکی سمجھاتی ہے کہ ہم دنیا سے دور ہو چکے ہیں۔

وہ رونے لگی: "اماں۔ اماں جی! کہاں ہو تم؟"

اب وہ دنیا سے دور نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ دور رہنے سے ایسا کھا جانے والا اندھیرا ہوتا ہے۔ اس اندھیرے میں کہیں سے دھپ دھپ کی آواز سنائی دی جیسے ہاتھی اپنے بھاری قدم زمین پر

مارتا آرہا ہو۔ اس نے ایک کہانی میں سنا تھا کہ تاریکی میں دیو پریوں کو پکڑنے آتے ہیں۔ وہ کون سی حور پری تھی کہ کوئی دیو اسے پکڑنے آتا۔ مگر اس نے سہم کر دیکھا۔ ایک دیو اچانک ہی کہیں سے آکر اس کے سامنے دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس کا قد کوئی ساڑھے چھ فٹ رہا ہوگا۔ بدن چٹان کی طرح سخت اور سیاہ تھا۔ اس کی مناسبت سے چہرہ بھی کالا تھا۔ اندھیرے میں سفید دیدے اور اجلے دانت چمک رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ دیدوں کے ہتھیار سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرے گا اور دانتوں سے چبا چبا کر کھا جائے گا۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہوئی کہ چیخنے کی بھی جرأت نہ کر سکی۔

دیو کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی "کون ہو تم؟"

اس نے نور بیگم کا ایک ہاتھ کھینچ کر اسے ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ دیو کا ہاتھ وہ بنا اور ہتھیلی ایسی پھیلی ہوئی تھی کہ اس ہتھیلی کی گرفت میں وہ چیونٹی لگتی تھی۔

اس نے پوچھا "کیا گھر سے بھاگ کے آئی ہے؟"

اس نے ہاں کے انداز میں اوپر نیچے سر ہلایا۔

"گھر سے کچھ چرا کے لائی ہے؟"

اس نے نہیں کے انداز میں دائیں بائیں سر ہلایا۔

"میرے ساتھ چلے گی؟"

وہ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔ انکار میں سر ہلانے لگی۔ دیو نے ایک ہاتھ سے اس کی پتلی سی گردن کو جکڑ کر کہا "حرامزادی! یہیں گلا دبا کے مار ڈالوں گا۔ زندہ رہنا چاہتی ہے تو ذرا بھی آواز نہ نکالنا۔"

یہ دھمکی دے کر اس نے اسے اٹھا کر اپنی بغل میں داب لیا۔ ایک ریڑھے پر مویشیوں کا چارہ لدا ہوا تھا۔ اس نے نور بیگم کو چارے پر پھینک دیا۔ پھر ریڑھے کو دھکیلتے ہوئے ایک کچی سڑک پر جانے لگا۔ وہ چپ چاپ سہمی ہوئی چارے پر پڑی رہی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ اس کا ہاتھ کتنا بڑا اور سخت ہے۔ گردن کو ذرا پکڑنے سے دم نکلنے لگا تھا۔ وہ مرنے سے ڈرتی تھی۔ اس لیے دل ہی دل میں اس دیو کے مرنے کی دعائیں مانگتی رہی۔

پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ وہ فاصلوں کا حساب نہیں جانتی تھی کہ اپنی مرحوم ماں سے کتنی دور چلی آئی ہے۔ جب اس دیو نے اسے چارے پر سے اتار کر زمین پر ڈالا تب اس نے کسی گاؤں کے کچے مکان کے سامنے خود کو پایا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں ایک بوڑھی عورت نے اسے دیکھ کر دیو سے پوچھا "ارے صمدو! اس بچی کو کہاں سے اٹھا کر لے آیا ہے؟"

"ارے ماں! یہ بچی نہیں ہے۔ قد میں تیرے برابر ہوگی۔ دو چار برس میں جوان ہو جائے گی۔ پھر میں اسے جورو بناؤں گا۔"

وہ چارہ اٹھا کر باڑے میں جا رہا تھا جہاں بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں صمدو کا چہرہ اور بھیانک لگ رہا تھا۔ وہ ریڑھے سے چارہ اٹھا اٹھا کر ایک طرف ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا "ماں! تیرے نصیب میں گوری اور خوبصورت بہو نہیں ہے۔ حسین لڑکیوں کے ماں باپ مجھے دیکھ کے ٹھٹھک جاتے ہیں۔ پھر جو لڑکیاں ذرا خوبصورت ہوتی ہیں وہ نخرے زیادہ دکھاتی ہیں۔ یوں ٹھیک ہے نا؟"

ماں نے نور بیگم کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر زمین پر سے اٹھایا۔ وہ آٹھ برس کی تھی مگر قد میں اس بوڑھی کے برابر تھی۔ اس نے کہا "بیٹی! اپنے گھر واپس جانا چاہو گی تو میں پہنچا دوں گی۔ میرے پاس رہو گی تو ماں کا پیار دوں گی۔"

نور بیگم کو وہ عورت اپنی ماں سے زیادہ اچھی لگی۔ وہ کوئی جواب نہ دے کر اس ماں سے لپٹ گئی۔ اس کی ماں نے کئی بار کہا تھا کہ اس کالی اور بے ڈھنگی سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ کوئی اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ لیکن صمدو نے اسے پسند کیا تھا۔ اس سے بیاہ رچانے کے لیے اسے شہر سے اٹھا کر لایا تھا۔ بعض ٹھکرائی ہوئی لڑکیاں اس طرح بھی اپنی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتی ہیں کہ کوئی انہیں اٹھا کر لے جائے۔ اس لیے صمدو اسے اچھا لگا حالانکہ وہ بچگانہ ذہن سے سوچ رہی تھی۔ تاہم بچپن میں بھی عورت پن ضرور ہوتا ہے۔

رفتہ رفتہ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی۔ اگرچہ صمدو سخت مزاج تھا۔ اسے کبھی گالیاں دے کر اور کبھی مار مار کر بھینسوں کی خدمت کرنا سکھاتا تھا۔ پھر بھی وہ اچھا لگتا تھا۔ نور بیگم نے جلد ہی گوبر کے کنڈے بنانا، بھینسوں کو نہلانا اور ناند میں ان کے لیے چارہ بنانا سیکھ لیا۔ دراصل ہر چیز کی اپنی ایک مناسب جگہ ہوتی ہے۔ حسین لڑکیاں ہیرے جواہرات سے سجائی جاتی ہیں۔ شاعروں کی محفل میں موضوعِ سخن بنتی ہیں۔ بدصورت لڑکیاں گوبر کے اپلے تھاپتی ہیں اور اپنے رنگ کی مناسبت سے بھینسوں کی صحبت میں زندگی گزارتی ہیں۔

صمدو ڈیل بھینسا تھا۔ صبح چار بجے سے ہی لنگوٹ کس کر ڈنڈ بیٹھک میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس نے شہر جا کر بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑا تھا۔ کتنی ہی بار بڑے بڑے کپ، شیلڈ اور نقد رقم جیت کر لایا تھا۔ نور بیگم بھی بھینسوں کی دیکھ بھال کے لیے صبح اٹھ جایا کرتی تھی۔ بھینسوں کے باڑے میں کام کرنے کے دوران اسے دیکھتی تھی اور سوچتی تھی۔ اتنا اونچا پورا دیو اس کا دولہا بن کر کیسا لگے گا؟ مجھے تو یہ اچھا بھی لگتا ہے اور اس سے ڈر بھی لگتا ہے۔ پتہ نہیں دولہا بن کر اور کیسی مار مارا کرے گا؟

وہ اپنے اکھاڑے سے گرج کر بولتا تھا "اسے اتنی دور سے گھور گھور کے نظر لگا رہی ہے۔ اگر اگلی کشتی ہار گیا تو تیرا کچومر نکال دوں گا۔"

وہ سر جھکا کر جلدی جلدی اپنا کام کرنے لگی۔ اسے صمدو کی ڈانٹ ڈپٹ اچھی لگی تھی۔ دراصل وہ بچپن ہی سے جھڑکیاں سننے کی عادی ہو گئی تھی۔ اس لیے صمدو اچھا لگتا تھا اور صمدو کی ماں بھی کچھ زیادہ اچھی لگتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ ایک ماں کی طرح پیار و محبت سے پیش آتی تھی

اور اسے اردو انگریزی کی کتابیں پڑھایا کرتی تھی۔

انگریزی کی دوسری اور اردو کی پانچویں کتاب ختم کرتے کرتے وہ بارہ برس کی ہو گئی۔ اتنی قد آور ہو گئی کہ صمدو کے سینے تک پہنچنے لگی۔ وہ اس سے عشق تو نہیں کرتا تھا لیکن اسے ایک بیوی کی ضرورت تھی، جو پچھلے چھ سال سے نہیں مل رہی تھی۔ وہ ایسا سیاہ فام اور ہیبت ناک پہلوان تھا کہ نازک اندام عورتیں اس کی پہلوانی سے اور خوبصورت عورتیں اس کی بدصورتی سے گھبرا کر دور ہی سے کترا جاتی تھیں۔

اس بات نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ عورتوں سے وہ بڑی نفرت کرتا تھا۔ لیکن نفرت کے باوجود ایک بیوی لازمی تھی تاکہ وہ تمام عورتوں کا غصہ اس پر اتار سکے۔ جب اسے کوئی نہ ملی تو وہ آٹھ برس کی نور بیگم کو پال پوس کر جورو بنانے کے لیے اٹھا لایا۔ ماں نے اسے سمجھایا: "لڑکی زیادہ بدصورت نہیں ہے صرف کالی ہے۔ اس سے محبت سے پیش آنا۔ نہیں تو کسی دن بھاگ جائے گی۔"

لیکن صمدو پہلے ہی دن سے اس پر غصہ اتارنے لگا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے جھڑک دیتا تھا۔ کبھی کبھی دو چار ہاتھ جما دیتا تھا۔ پہلے وہ روتی تھی، پھر تین وقت کے کھانے کی طرح مار کھانا بھی ایک معمول بن گیا تو وہ ڈھیٹ بن گئی۔ مار کھاتے ہی "اونہہ" کہہ کر ماں جی کے پاس بھاگ جاتی تھی۔

بارہ برس کی عمر میں وہ بگڑی عورتوں جیسی نظر آنے لگی تھی۔ صمدو نے چار برس کے دوران پہلوانی ہاتھ دکھا دکھا کر اس لڑکی کو پتھر بنا ڈالا تھا۔ اس کے بدن کی کھال اتنی موٹی اور سخت ہو گئی تھی کہ موسم سرما میں بھینسوں کی طرح اسے سردی نہیں لگتی تھی۔ جسمانی لحاظ سے وہ انسان نما بھینس تھی۔ جب وہ آنکھوں میں کاجل لگا کر صمدو کو دیکھ کر مسکراتی تو وہ طنز کرتا: "ایسی ایک تو کوّے کی طرح کالی ہے، دوسرے کاجل لگاتی ہے۔ تجھے تو چونا قلعی کرانا چاہیے۔"

"میں کالی ہوں تو تو کون سا گلفام ہے۔ یہ تو میں ہوں کہ تیرے پاس رہ گئی۔ کوئی گوری چمڑی والی تجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گی۔"

نور بیگم نے اسے پہلی بار ایسا طعنہ دیا تھا۔ اس روز صمدو نے اس کی خوب پٹائی کی۔ ماں گھر پر نہیں تھی۔ وہ مار سے بچنے کے لیے گھر سے نکل کر بھاگتی ہوئی بھینسوں کے باڑے میں گئی۔ صمدو نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ "حرامزادی بچ کے کہاں جائے گی؟ آج میں تیرا کچومر نکال ڈالوں گا۔"

وہ کبھی اس بھینس کے اور کبھی اس بھینس کے پیچھے بھاگتی رہی۔ صمدو بھینسوں کی رکاوٹیں پار کرتا رہا۔ پھر وہ بھاگتے ہوئے چارے کے ڈھیر پر جا گری۔ صمدو اسے گرفت میں لینے ہی والا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے پکڑتے پکڑتے وہ بھی اس کے ساتھ گر پڑا۔ چارے کی سیج پر بے چاری کو دو چار زبردست ہاتھ پڑے۔ وہ مار سے بچنے کے لیے ایک دم سے لپٹ گئی۔

صمدو اس کمبل کو نوچ کر پھینک دینے کی کوشش میں ادھر سے ادھر لوٹ گیا۔ پھر اچانک ہی جیسے اسے بجلی کا جھٹکا پہنچا ہو وہ یکبارگی تھم گیا۔ جہاں تھا وہیں جم گیا۔ حیرانی سے نور بیگم کو یوں دیکھنے لگا جیسے پہلی بار کسی لڑکی کے دھوکے میں عورت کو سمجھ رہا ہو۔

وہ کالی کالی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کاجل کی دھار صمدو کے دل میں اتر رہی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا: "تو... تو بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

وہ انتظار میں تھی کہ وہ ابھی غصہ اتارے گا لیکن اس کے منہ سے پہلی بار اپنی تعریف سن کر وہ خوشی سے لرز گئی۔ پھر ایک بار وہی بات سننے کے لیے بولی: "چل ہٹ۔ جھوٹ بولتا ہے۔"

"ایمان سے کہتا ہوں تو میرے دل میں گھسی آ رہی ہے۔ اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ تجھے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"ایسی میں کیا ہو گئی ہوں؟ کیا رنگ صاف ہو گیا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے دیکھا، رنگ تو ویسا ہی کالا تھا۔

اس نے پھر پوچھا: "کیا میرا ناک نقشہ بدل گیا ہے؟"

"نہیں، جیسے پہلے تھی ویسی ہی ابھی بھی ہے۔"

"پھر میں اچھی کیوں لگ رہی ہوں؟"

یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب صمدو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی کسی کو اچھا کیوں لگتا ہے؟

بارہ برس کی عمر میں وہ قد آور تو تھی مگر ایسی بھرپور نہیں تھی کہ اس کی جسمانی تبدیلیاں نگاہوں کو اچھی لگتیں۔ اس میں ایسی کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ اچھی کیوں لگ رہی تھی۔

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ آدمی اپنی بھوک سے مجبور ہے۔ اسے مہنگا کھانا نہیں ملتا تو سستا کھا لیتا ہے۔ سستا بھی نہ ملے تو باسی پر گزارا کر لیتا ہے اور خدا کا شکر بھی ادا کرتا ہے کہ اسے ایک نعمت عطا کی گئی ہے۔ اسے خوبصورتی کے مہنگے بازار سے خالی ہاتھ واپس آ کر نور بیگم بہت بڑی نعمت لگ رہی تھی۔

یہ نفسیاتی باتیں ہیں جو پہلوان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھیں۔ اس کے دماغ میں پہلے دن سے یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ نور بیگم اس کی بیوی بنے گی۔ چار برس کے دوران وہ انجانے پن میں نور بیگم کا عادی بن گیا تھا۔ عادت عمر کے حساب سے پکی ہی تھی اور بتدریج جوان ہوتی جا رہی تھی۔ اس لیے نور بیگم اچھی لگ رہی تھی۔

وہ بے بسی سے بولا: "پتہ نہیں کیوں اچھی لگ رہی ہے۔ میں اماں سے بولوں گا کہ اب ہماری شادی کرا دیں۔"

نور بیگم خود کو ایک جھٹکے سے چھڑا کر الگ ہوئی۔ پھر شرما کر بھاگنے لگی۔ صمدو نے تڑپ کر آواز دی: "نور بی!"

وہ آنگن میں بھاگنے والی کے قدم رک گئے۔ زندگی میں پہلی بار

اسے پہلے سے نوری کہہ کر پکارا گیا تھا۔ کیسا سُریلا نام تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ صمد و کے ہونٹوں پر وہ نام ایک سنگیت بن جائے گا۔ نوری نے ذرا جھوم کر ذرا گھوم کر اس پہلوان سنگیت کار کو دیکھا اور پھر ایک بار شرما کر وہاں سے بھاگتی ہوئی ایک کمرے میں گھس گئی۔

شام کو صمد و نے روٹی کھاتے وقت ماں سے کہا "اماں! نوری بالکل تیار ہو گئی ہے۔"

ماں نے پوچھا "تو نے کس بات کے لیے اسے تیار کیا ہے؟"

"میں نے نہیں، خدا کی قدرت نے تیار کیا ہے۔"

"کیا بک رہا ہے؟"

"اماں! میں کیسے سمجھاؤں۔ اللہ میاں جیسے درختوں میں پھل تیار کرتے ہیں، ویسے ہی نوری کو شادی کے لیے تیار کر دیا ہے۔"

ماں نے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ شادی کے قابل ہو گئی ہے؟"

"میں کیا بتاؤں، بس اندازہ کیا ہے۔"

"ارے تیری کھوپڑی میں تو پہلوانوں کے داؤ پیچ ہوتے ہیں تو عورت کو کب سے سمجھنے لگا؟"

"اماں! اب میں ایسا نادان بھی نہیں ہوں۔ لڑکی شرمانے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تیار ہے۔"

"چولھے میں گئی تیری تیاری۔ کمبخت تجھے بولنا بھی نہیں آتا ہے خبردار آئندہ کبھی ایسی باتیں نہ کرنا۔ میں تجھ سے زیادہ جانتی ہوں۔ ابھی وہ بچی ہے۔ تین چار برس کے بعد شادی کے قابل ہو گی۔"

"تین چار برس؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔ چھوٹی عمر میں شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے سے اس کی صحت خراب ہو جائے گی۔ بچے بھی روگی پیدا ہوں گے۔ تو کچھ پڑھا لکھا ہوتا تو یہ باتیں تیری سمجھ میں آتیں۔ بس اب مجھ سے بحث نہ کرنا۔"

اُس دن ماں نے اسے قیامت کے انتظار میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جو چیز ہمارے ہاتھ نہیں آتی ہم اس کے لیے للچاتے ہیں۔ ماں نے نوری کو اس کی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا مگر اس سے دور رکھا تھا۔ اس لیے صمد و کی نگاہوں میں نوری کی قدر و قیمت آپ ہی آپ بڑھنے لگی تھی۔

نوری کمرے میں تنہا کام کرتی رہتی تو ماں صمد و کو اس کمرے میں جانے نہیں دیتی تھی۔ رات کے وقت نوری کو اپنے پاس سُلاتی تھی۔ کسی کام سے باہر جاتی تو اسے ساتھ لے جاتی۔ ان باتوں نے پہلوان کو عشقیہ ہتھکنڈے سکھا دیے۔ وہ ماں کی نظریں بچا کر نوری کو اشارے کرتا تھا۔ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے آ کر اسے دیکھتا تھا۔ جیسے جیسے عمر کروٹیں بدل رہی تھی، ویسے ویسے صمد و کی نگاہوں کی آنچ سے نوری کا بدن تپ رہا تھا۔ نگاہوں کی انگلیاں بڑی شریر ہوتی ہیں۔ دنیا کو خبر نہیں ہوتی اور وہ چھیڑتی چلی جاتی ہیں۔ اسی چھیڑ چھاڑ میں وہ پندرہ برس کی ہو گئی۔

ایسی کچی عمر میں لڑکیوں کا ذہن بڑا پکا ہوتا ہے۔ اس عمر میں وہ ایک ایک لمحے کو یاد رکھتی ہیں جو اپنے چاہنے والوں کی چھیڑ چھاڑ سے گزرتے ہیں۔ ان کوری کنواریوں کی یادداشت میں پہلی چاہت کے واقعات نقشِ اوّل بھی ہوتے ہیں اور نقشِ آخر بھی۔ صمد و صرف اپنی لگی جانتا تھا۔ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس طرح نوری کی رگ رگ میں اتر چکا ہے۔

ماں چوبیس گھنٹے پہرے دار بن کر نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک بار یوں ہوا کہ صمد و علی الصبح شہر چلا گیا۔ ماں جانتی تھی کہ شام سے پہلے اس کی واپسی نہیں ہو گی۔ لہٰذا وہ مطمئن ہو کر اپنے دور کے رشتہ داروں کے ہاں چلی گئی۔ نوری کو بھینسوں کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ گئی۔ ماں کی واپسی دوپہر سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ کیونکہ ان رشتہ داروں کے ہاں کسی لڑکی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گھر میں تنہا رہ جانے والی اپنے کام میں لگ گئی۔

صبح سے شام تک بہت سارے کام ہوتے تھے۔ بھینسوں کو نہلانا، ان کے لیے چارہ تیار کرنا، کھانا پکانا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا۔ گھر کی ایک ایک چیز کو جھاڑتے پونچھتے رہنا۔ غرض یہ کہ صبح سے رات ہو جاتی تھی اور کام جاری ہی رہتا تھا مگر اسے پتہ نہیں چلتا تھا سارے کام کیسے نمٹ جاتے ہیں؟ اس کے تصور میں ہر لمحہ صمد و رہتا تھا جیسے وہ طلسمی چراغ کا دیو تھا۔ اس کے دماغ میں رہ کر اس کے سارے کام آسان کر دیتا تھا۔

اس روز وہ پہلی بار گھر میں تنہا رہی۔ اسے عجیب سا لگا۔ وہ ماں جی اور صمد و کی عادی ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا۔ کاش وہ شہر نہ جاتا۔ کاش وہ راستے سے واپس آ جاتے۔ وہ بڑی حسرت سے دعائیں مانگنے کے انداز میں سوچتی رہی کہ بس وہ آ ہی جائے۔ نہیں تو یہ تنہائی اسے مار ڈالے گی۔

اور وہ آ گیا۔ اسے اچانک دیکھتے ہی نوری کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ عجیب بات تھی کہ وہ اس مرد سے ڈرتی بھی تھی اور اس پر مرتی بھی تھی۔ وہ اسے خیالوں میں پکارتی پھر رہی تھی۔ جب وہ آ گیا تو اسے دیکھتے ہی چولھے کے پاس بیٹھے بیٹھے سمٹ گئی۔ ذرا خوش ہو کر ذرا سہم کر بولی "تو شہر گیا تھا؟"

"اماں کو چکر دینے راوی تک گیا تھا۔"

نوری نے سر کو جھکا لیا۔ اتنا تو سمجھتی ہی تھی کہ یہ چکر بازی اس کے لیے ہے۔ عورت خوش ہوتی ہے جب کوئی اسے چاہتا ہے۔ اس کے لیے چکر چلاتا ہے اس کے لیے جھوٹ بولتا ہے اور دنیا کو دھوکے

دیتا ہے۔ اگر ابتدا سے حساب کیا جائے تو مرد اب تک عورت کے لیے سب سے زیادہ جھوٹ بولتا آیا ہے اگر وہ نوری کے قدموں میں سارے جہاں کی دولت لا کر ڈال دیتا تو وہ اتنا خوش نہ ہوتی جتنا کہ اس کی خاطر ماں سے جھوٹ بولنے پر ہو رہی تھی۔ عورتوں کی نفسیاتی ہسٹری یہی ہے۔

وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ صمد بھی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ ہرنی کی طرح بدک کر دور ہو گئی۔ اس نے قریب آ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی۔ صمد بھی اس کے پیچھے کمرے میں گھس گیا۔ یہ سب کچھ بڑی خاموشی سے ہوتا رہا تھا۔ بعض حالات میں کچھ کہنا ضروری نہیں ہوتا۔

باورچی خانہ خالی ہو گیا تھا۔ چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی تھی اور چولہا اسے پکار رہا تھا۔ پکنے کا عمل یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہانڈی کا بدن گرم ہوتا ہے پھر اس کے اندر آنچ پہنچتی ہے۔ قریب رہنے والا ہانڈی سے اٹھنے والی سنسناہٹ کو سن سکتا ہے۔ پانی زیادہ ہو تو حرارت سے بلبلے اٹھنے اور پھوٹنے لگتے ہیں۔ اسی انداز میں وہ ہانڈی آہستہ آہستہ پکتے پکتے ابل پڑی۔ نوری اسے چولہے پر سے اتارنے نہ آ سکی۔ ہانڈی سے ابل کر گرنے والے پانی نے آپ ہی چولہے کو بجھا کر ٹھنڈا کر دیا۔

دوپہر کو ماں واپس آئی تو صمد وہاں سے جا چکا تھا۔ نوری کچھ بیمار سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ماں نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا ہوا بیٹی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

نوری کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ چہرے کی زردی عارضی سی تھی۔ وہ مسکرا کر بولی "ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں ماں جی!"

بھید کھل نہ جائے، اس لیے وہ ماں کے پاس سے ہٹ گئی کمرے میں جا کر بستر پر گر پڑی۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں، اس کی سانسوں میں اور اس کی سوچ میں صمد ہی صمد و بسا ہوا تھا۔ اس کے سوا اور کچھ سوچنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اب ایک ہی تمنا تھی کہ ماں پھر چلی جائے۔ صمد پھر آ جائے۔

اس دن سے صمد نوری کا دیوانہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے پھر ماں سے ضد کی "اماں! اب نوری سے شادی ہو جانا چاہیے۔"

"تو شادی کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ پہلے تو صرف پہلوانی کی دھن میں رہتا تھا اب شادی کی دھن سوار ہے۔ اب کے میلے میں شیدا پہلوان سے مقابلہ ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تو ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ کیا کشتی ہارنے کا ارادہ ہے تو؟"

"نہیں میں تو صبح و شام چار پہلوانوں سے زور کرتا ہوں۔ تیرے بیٹے کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ بس تو شادی کرا دے۔"

"میلہ گزر کے آئے گا، تب شادی ہو گی۔"

"اس کے لیے تو آٹھ مہینے باقی ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟ نوری بھاگی نہیں جا رہی ہے۔"

صمد کا جی چاہتا تھا کہ نوری کو بھگا کر لے جائے۔ آٹھ ماہ تک وہ نوری کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور ماں اپنا فیصلہ بدلنے والی نہیں تھی۔ وہ کئی دنوں تک دور ہی دور سے نوری کو اشارے کرتا رہا۔ راتوں کو آہستہ سے اٹھ کر ماں کے کمرے میں جھانکتا تھا۔ نوری ماں کے برابر دوسری چارپائی پر سوتی تھی بلکہ وہ بھی جاگتی رہتی تھی۔ صمد اسے اٹھ کر آنے کے لیے اشارے کرتا تھا لیکن ماں کی نیند بڑی کچی تھی چارپائی پر اٹھنے بیٹھنے کی ہلکی سی آواز بھی ہوتی تو بوڑھی عورت کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

وقت پر سونے جاگنے اور ورزش کرنے کے معمول میں فرق آ گیا تھا وہ راتوں کو جاگتا تھا اور دن کو سوتا تھا۔ ماں اسے برا بھلا کہتی رہتی تھی۔ اس کے ایک شاگرد نے کہا "استاد یہی حال رہا تو تم کشتی نہیں جیت سکو گے۔"

"مجھے نوری مل جائے گی تو میں کشتی جیت لوں گا۔"

بہت سوچ بچار کے بعد شاگرد نے مشورہ دیا "ہمارے ہاں کے ڈاکٹر کے پاس نیند لانے والی دوائیں ہیں۔ ماں کو وہ دوا کھلا دیا کرو صبح تک راستہ صاف رہے گا۔"

صمد نے ایسا ہی کیا۔ ڈاکٹر کے پاس سے خواب آور گولیاں لا کر ان کا سفوف تیار کیا۔ ماں دودھ نہیں پیا کرتی تھی۔ اس رات اس نے ضد کی "اماں! اب میں تجھے اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا کروں گا۔ تیری صحت گرتی جا رہی ہے۔"

"یہ اچانک تجھے میری صحت کا خیال کیسے آ گیا؟ اور تو جانتا ہے کہ میں دودھ نہیں پیتی۔"

"میری خوشی کے لیے تو زہر بھی پی سکتی ہے۔"

"اسے خوشی کہاں ہے کی۔ کچھ معلوم تو ہو؟"

"جس طرح ماں بچوں کو کھاتا پیتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے اسی طرح بچے بھی ماں کو کھلا پلا کر خوش ہوتے ہیں۔ بس اب پی جا..."

ماں نے دودھ سے بھرا ہوا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا "مجھے سوچ کھا لینے دے اس کے بعد پی لوں گی۔"

اسی وقت اس کے شاگرد اس سے ملنے آئے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے باہر گیا۔ شہر سے شیدا پہلوان کا ایک پروموٹر آیا تھا۔ سلام کلام کے بعد اس نے صمد سے کہا۔

"پہلوان! ہمارا شیدا پہلوان ذرا کشتی لڑنا چاہتا ہے۔ یعنی کشتی سے پہلے طے ہو جانا چاہیے کہ کون جیتنا چاہتا ہے اور کون ہارنا۔"

صمد نے کہا "یہ تو میں نے پہلے سے سنا ہے کہ شیدا ایمانداری سے کبھی جیت نہیں سکتا۔ اس نے آج تک ذرا کشتی لڑتے ہوئے اتنی شہرت حاصل کی ہے۔ میں اس کی جھوٹی شہرت کو خاک میں ملا دوں گا۔"

پروموٹر نے کہا "تم اس کے بارے میں ایسا کہتے ہو اور وہ تمہیں

اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ تم بھائی بن کر رہو گے تو انہیں بہت فائدہ پہنچے گا۔"

"کیسا فائدہ؟"

"دیکھو، جیتنے والے کو پچاس ہزار روپے دیے جائیں گے۔ شیدا کشتی سے پہلے اپنے پلے سے تمہیں پچاس ہزار روپے دے گا۔ کشتی میں ہار جیت ہوتی ہی رہتی ہے۔ اس بار تم ہار جانا۔"

"ارے بکواس مت کرو۔ ہار گیا تو اماں مجھے گھر میں گھسنے نہیں دے گی۔ میں نوری کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جاؤ یہاں سے، یہ سودے بازی مجھ سے نہیں چلے گی۔ شیدا سے کہو کہ مردوں کی طرح مقابلہ کرے، یا پھر مقابلہ ملتوی کرا دے۔ اسی میں اس کی بھلائی ہے۔"

اس نے کھرا جواب دے کر پرو موٹر کو رخصت کر دیا۔ پرو موٹر نے وہاں سے دور ہو جانے کے بعد پلٹ کر اس کے گھر کی سمت دیکھا اور اپنے ایک حواری سے پوچھا "یہ نوری کون ہے جسے یہ صمدو فاتح بن کر منہ دکھانا چاہتا ہے؟"

حواری نے جواب دیا "ایک کالی بھجنگ سی لڑکی ہے۔ یہ پہلوان اس کا دیوانہ ہے۔ اگر کوئی گوری خوبصورت محبوبہ ہوتی تو پتہ نہیں کیا کرتا؟"

دوسرے حواری نے کہا "بھلا کون حسین عورت اس بد ہیبت ناک پہلوان سے عشق کرنے کی حماقت کرے گی۔ اگر کرے گی تو یہ خوشی سے مر جائے گا۔"

"ہونہہ!" پرو موٹر نے ایک لمبی ہوں کے ساتھ کہا "یہ خوشی سے ہی مرے گا۔"

وہ سب فیصلہ کن انداز میں وہاں سے چلے گئے۔ صمدو کی دیوانگی ایسی تھی کہ دبی زبان سے اس کا چرچا دور دور تک پھیل رہا تھا لیکن یہ چرچا بدنام کرنے کے لیے نہیں تھا۔ ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ بھلا بدنامی کیا ہوتی؟ صمدو نے رات دس بجے سے نوری کے کمرے میں تاک جھانک شروع کر دی تھی۔ ماں گیارہ بجے تک جاگتی رہی پھر آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ نوری بھی سو گئی تھی۔ صمدو بے چینی سے انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ آنکھ کھول کر دیکھے گی۔ لیکن وہ بے حسی کا مظاہرہ کرتی رہی۔

بارہ بجے اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بلی کی آواز نکالی۔ خیال تھا کہ وہ آنکھ کھول کر کھڑکی کی طرف دیکھے گی۔ اس نے دوسری بار پھر بلی کی آواز نکالی۔ ماں نے نیند میں کسمسا کر کہا "ہشت۔ مردار بھاگ یہاں سے......"

یہ کہہ کر وہ پھر گہری نیند میں ڈوب گئی۔ صمدو پھر گھنٹے بھر تک اس الجھن میں رہا کہ ماں سو چکی ہے یا آنکھیں بند کیے جاگ رہی ہے۔ اس نے ایک چھوٹا سا کنکر اٹھا کر تاک کر مارا۔ نشانہ درست رہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کے دل میں آیا کہ کھڑکی پر ایک گھونسہ رسید کرے۔ چوری کی نیت سے آنے والے غصہ نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے اس نے غصہ کو ضبط کر لیا۔

رات کے ایک بجے وہ ہمت کر کے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا پہلوان دل اماں کے ڈر سے دھک دھک کر رہا تھا۔ خواہشات اس خوف کو دبا رہی تھیں۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا آہستہ آہستہ سانس لیتا ہوا نوری کی چارپائی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے سونے والی کو ہولے سے جھنجھوڑا مگر اس نے آنکھ نہیں کھولی۔ وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیا کرے؟ کمرے میں گھس آیا تھا۔ اماں کی بیداری کا اندیشہ تھا اور وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

وہ نوری پر جھک گیا۔ بڑی آہستگی سے اس نے اسے دونوں بازوؤں میں پھولوں بھری ٹہنی کی طرح اٹھا لیا۔ یہ پہاڑ تھا وہ تنکا تھی۔ پہاڑ کی ہتھیلی پر وہ کس طرح چارپائی سے بلند ہوئی اور کیسے کمرے سے باہر آئی، اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ نیند کی مستی میں ڈوبی رہی۔ اسے چرا کر لانے والے نے پہلے سوچا کہ اپنے کمرے میں لے جا کر اسے نیند سے جگائے لیکن پاس والا کمرہ ماں کا تھا، وہ جاگ جاتی۔ لہٰذا وہ اسے اٹھائے ہوئے مکان کے سامنے احاطہ میں آیا۔ وہ کھلی جگہ تھی اس لیے وہ بھینسوں کے باڑے میں اسے لے کر آیا۔ پھر چارے کے ڈھیر پر اسے پھینکتے ہوئے بولا "سالی نے قیامت تک سونے کی قسم کھا لی ہے۔"

وہ چارے پر اوندھے منہ پڑی رہی۔ صمدو نے جھک کر اسے سیدھا کیا۔ وہ چاروں شانے چت ہو گئی۔ اس نے پاس بیٹھ کر اسے جھنجھوڑنا اور ہولے ہولے پکارنا شروع کیا۔ کبھی غصہ بھی دکھایا۔ ایک ہلکا سا طمانچہ بھی رسید کیا۔ وہ پہلوان اس پہلو سے نہیں سوچ رہا تھا کہ نوری نے اماں کے حصے کا دودھ پی لیا ہوگا۔

وہ تھک ہار کر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا "نوری اٹھ جا سالی کیوں تڑپا رہی ہے؟"

اس نے جھک کر اسے پیار کیا۔ نوری نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ صمدو کو ڈر لگا "ارے تو تو ہلتی بھی نہیں ہے کہیں مر تو نہیں گئی؟"

وہ اس کے برابر لیٹ گیا۔ اس کے سینے پر کان رکھ کر سننے لگا۔ سونے والی کا دل ہولے ہولے دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھی۔ ڈرنے کی بات نہیں تھی۔ سوچنے کی بات تھی کہ وہ اتنی گہری نیند کیوں سو رہی ہے۔ اس کی بات کا جواب بھی نہیں دے رہی تھی۔ زبردستی پھر سو کر لیٹنے لگتی تھی۔ صمدو کو یقین تھا کہ جس دودھ میں خواب آور دوا ملائی گئی تھی، اسے ماں نے پیا ہے، جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔

بوڑھی ماں اپنی عادت کے مطابق کچی نیند سو رہی تھی۔ نوری کی چارپائی ذرا بھی کراہتی تو ماں کی آنکھ کھل جاتی۔ صمدو اسے تنکے کی طرح اٹھا کر لے گیا تھا۔ چارپائی کو احتجاج کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اس لیے ماں سو رہی تھی اور صمدو خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس سنگ ظالم سماج

کو گہری نیند سُلا دیا ہے۔

صبح چار بجے تک وہ خوابیدہ شباب کے کبھی پاؤں پڑتا رہا، کبھی ہاتھ جوڑتا رہا۔ اسے نیند سے جگانے کے لیے پیار بھرے منتر پڑھتا رہا۔ تمام بھینسیں خاموش کھڑی اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھتی رہیں۔ نوری سے تمام رات محبت کرنے کے لیے اس نے کتنے پاپڑ بیلے تھے۔ ساری محنت اکارت گئی تھی۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ اسے واپس چارپائی پر جا کر ڈالنا ضروری تھا۔ اس نے غصہ میں اسے ایک الوداعی طمانچہ رسید کیا۔ نوری نے نیند میں رسنے والی آواز نکالی۔ پھر سو گئی۔ صمد اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر واپس کمرے میں لے گیا۔

ایسے ہی موقعوں پر کہتے ہیں، "حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔" وہ نوری کو بستر پر چھوڑ کر کمرے سے باہر آیا تو اس کا غنچۂ آرزو مرجھا چکا تھا۔ اکھاڑے میں جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ مگر وہ نڈھال سا ہو کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ نوری سے کہہ رہی تھی کہ روز صبح خود ہی اٹھ جاتی ہے آج ابھی تک کیوں پڑی سو رہی ہے؟

نوری کا جواب نہیں سنائی دے رہا تھا۔ ماں کی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اسے جھنجھوڑ بھی رہی ہے۔ پھر وہ صمد کو آوازیں دیتی ہوئی باہر آئی۔ اسے دیکھ کر بولی: "تو یہاں بیٹھا ہے۔ اکھاڑے میں کیوں نہیں گیا؟"

"دل نہیں چاہتا۔"

"تیرا دل چاہتا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یہ بتا مجھے کیوں پکار رہی تھی؟"

"ارے ہاں، وہ نوری کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ ایک دم بیہوشی کی نیند سو رہی ہے۔"

وہ چڑ کر بولا: "مر گئی ہو گی۔"

"مریں اس کے دشمن۔ تو ایسا چڑچڑا کیوں ہو گیا ہے؟"

وہ وہاں سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا اکھاڑے کی طرف چلا گیا۔ اکھاڑے میں اس کے سات پٹھے ڈنڈ بیٹھک میں مصروف تھے۔ وہ ایک طرف سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے رازدار پٹھے نے پاس آ کر پوچھا: "کیا ہوا استاد! کام نہیں بنا کیا؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولا: "سالا اپنا مقدر ہی خراب ہے۔ ماں کو دوا کھلائی تھی مگر نوری ابھی تک سو رہی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ضرور تم نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ ماں نے تمہارے سامنے وہ دوا پی تھی؟"

"نہیں، میں پردو موڑ سے باتیں کرنے آیا تھا۔ واپس گیا تو دودھ کا گلاس خالی ہو چکا تھا۔"

"پھر تو تمہاری ماں نے نوری کو وہ دودھ پلایا ہو گا۔ تم نے کہا تھا کہ اماں دودھ کبھی نہیں پیتی ہیں۔"

صمد اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے اب اس پہلو پر غور کرنے لگا۔ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ پہلے کیوں نہیں غور کیا۔ خواہ مخواہ بے چاری کو کئی طمانچے مار دیے۔ اس کا دل اس مظلوم کے لیے محبت سے بھر گیا۔ جی میں آیا کہ دوڑ کے جائے اور اس سونے والی کو کلیجے سے لگا لے۔ شاگرد نے پوچھا: "دودھ میں ایک ہی گولی ملائی تھی نا؟"

"نہیں، میں نے سوچا ایک گولی میں اماں صبح تک نہیں سوئے گی۔ رات کو کسی وقت جاگ گئی تو مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میں نے دو گولیوں کا سفوف بنایا مگر اطمینان نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ گولیاں دال کے دانے کے برابر چھوٹی چھوٹی سی تھیں۔ بھلا وہ کیا نیند سونے والی کو گہری نیند کیا سُلاتیں۔ اس لیے میں نے تین گولیوں کا سفوف بنا کر دودھ میں حل کیا تھا۔"

"ارے مار ڈالا استاد تم نے۔ اگر اماں وہ دودھ پی لیتیں، تو قیامت تک سوتی رہ جاتیں۔ تمہاری نوری کی صحت اچھی ہے وہ بچ تو جائے گی مگر خدا کے لیے پھر کبھی نیم حکیم نہ بننا۔ نہیں تو کسی کی جان لے کر رہو گے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی حماقت سے نوری زندگی اور موت کے درمیان سو رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا ڈاکٹر کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اور دل میں کہتا جا رہا تھا: "نوری! میری نوری! میں تجھے مرنے نہیں دوں گا۔ تو مر گئی تو میں بھی مر جاؤں گا۔"

❁

نوری کی زندگی تھی اس لیے زندہ رہ گئی۔ اس واقعہ کے بعد دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی محبت اور شدید ہو گئی۔ اب ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔ ان امتحانات کے بعد ہی ان کے دعوے کی صداقت کو سمجھا جا سکتا تھا۔

ایک صبح وہ اکھاڑے میں ورزش کر رہا تھا کہ دس گز کے فاصلے پر سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ وہاں ایک بے حد حسین عورت کھڑی ہوئی تھی۔ گورا گورا رنگ کالی کالی آنکھیں، لانبے لانبے بال، اونچا پورا قد اور بھرا بھرا بدن دیکھ کر صمد و بیٹھک لگاتے لگاتے بیٹھ گیا۔ اپنے شاگرد سے پوچھا: "یہ کون ہے رے۔ پہلے تو یہ کبھی نظر نہیں آئی؟"

"استاد! شہر والی لگتی ہے۔ کیسے جم کے دروازے پر کھڑی ہے۔ شرماتی بھی نہیں ہے۔"

صمد و نے ادھر سے منہ پھیر کر کہا: "آؤ زور لگائیں۔"

وہ اپنے چار پٹھوں کے ساتھ اکھاڑے میں اتر گیا۔ زور آزمائی کا تماشہ بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ ایک پہلوان کو اس کے شاگرد متحد ہو کر

گرانے کی کوشش کرتے ہیں اور پہلوان مضبوط چٹان کی طرح جم کر شاگردوں کے داؤ پیچ سے بچتا ہے اور اپنے داؤ پیچ آزما کر انہیں گراتا یا دور پھینکتا رہتا ہے۔ صمدو نے زور آزمائی کے دوران دیکھا۔ وہ شہر والی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اکھاڑے کی حد بندی تک آگئی تھی اور بڑی حیرت اور مسرت سے وہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔

ایک بار صمدو سے اس کی نظریں ٹکرائیں۔ وہ فوراً ہی داؤ پیچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسری بار نظریں ملتے ہی وہ مسکرائی۔ صمدو کے قدم اکھڑ گئے۔ شاگردوں نے اسے گرا دیا۔ وہ حسین عورت کے سامنے گرنے والی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً ہی سنبھل کر ایسے داؤ استعمال کیے کہ شاگرد اِدھر اُدھر گرتے چلے گئے۔ وہ شہر والی خوش ہو کر تالیاں بجانے لگی۔

وہ سب زور آزمائی بھول کر اس کی تالیاں سننے لگے۔ گاؤں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ... کسی عورت نے پہلوانوں کی ٹولی میں آ کر اس طرح مسرت کا اظہار کیا ہو۔ وہ صمدو کو ایسے دیکھے جا رہی تھی جیسے وہاں اور کوئی چیز دیکھنے کی نہ ہو۔ اس نے کہا: "سوری، مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ سنا ہے اکھاڑے میں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ کیا میں چلی جاؤں؟"

سب اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار عورت کو دیکھ رہے ہوں۔ اُن پہلوانوں نے آفات سے اور خصوصاً عورتوں سے بچ کر رہنے کے لیے اپنے گلے میں یا بازوؤں میں تعویذ باندھ رکھے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی لنگوٹ اتارے بغیر اپنے اپنے لباس پہن لیے، تاکہ ان کے کسرتی بدن کو نظر نہ لگے۔ اگر کوئی گاؤں کی عورت اُدھر سے گزرتی تو وہ لوگ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتے۔ مگر اس شہر والی سے سب ہی متاثر ہو گئے تھے۔

وہ بولی: "میری وجہ سے تم لوگ اپنا اکھاڑہ چھوڑ رہے ہو۔ میں چلی جاتی ہوں۔ مگر پہلوان جی! میں اکیلے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

صمدو کے اندر عجیب سی ہلچل مچ گئی۔ اتنی حسین عورت، وہ بھی شہر والی اس سے تنہائی میں پتہ نہیں کیا کہے گی؟ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے کتنی ہی حسین عورتوں کو دل میں بسانا چاہا تھا مگر سب نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ بولی: "میں شہر کے ہنگاموں سے گھبرا کر یہاں آئی ہوں، کل واپس چلی جاؤں گی۔ یہ سامنے والے مکان نے مجھے دو دن کے لیے مہمان بنا رکھا ہے۔ ہم پڑھے لکھے شہر کے رہنے والے دل کی بات نہیں چھپاتے۔ میں بھی نہیں چھپاؤں گی۔ سچ بولنے میں شرم کیسی؟ تمہیں دیکھنے کے بعد یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا ہے۔"

صمدو کا منہ حیرانی سے کھل گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بولا: "یہ سب آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"آپ نہیں، مجھے تم کہو۔"

"اچھا۔ مگر میں تو کالا ہوں۔ صورت بھی اچھی نہیں ہے۔ تم میرا مذاق تو نہیں اڑا رہی ہو؟"

"میں مذاق اڑانے والوں پر لعنت بھیجتی ہوں۔ بے شک تم کالے ہو۔ مگر عورت رنگ اور صورت نہیں دیکھتی ہے۔ یہ پہاڑ جیسا قد، چٹان جیسا سینہ، فولاد جیسے بازو۔ ہائے ابھی تم ان پہلوانوں کو کیسے اٹھا اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ ایسا طاقتور آدمی میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ میں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کیا ہو رہا ہے۔"

اس کے دل کا حال وہ جانتی ہو گی۔ صمدو کے سینے میں اپنا دل الٹ پلٹ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محبت بھری باتوں کے جواب میں کس طرح محبت بھرے مکالمے ادا کرے۔ وہ بولی: "تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ دستور ہے کہ کسی سے محبت ہو جائے تو اس کے منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ پھر وہ محبت کرنے والے ملتے رہتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے رہیں۔ ایک دوسرے کو آزماتے رہیں۔ جب آزمائش پوری ہو جاتی ہے، تو پھر شادی ہو جاتی ہے۔ اوہ میں بھی کتنی نادان ہوں۔ یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تمہارا نام کیا ہے؟ میرا نام شازیہ ہے۔"

"میرا نام عبدل صمد خان ہے۔ لوگ مجھے صمدو کہتے ہیں۔"

"میں بھی صمدو کہوں گی۔ ہائے کتنا پیارا نام ہے۔"

"تمہارا نام بھی بہت اچھا ہے۔" وہ زندگی میں پہلی بار کسی حسین عورت کی تعریف کرتے وقت ہانپنے لگا۔

اس نے پوچھا: "میں تم سے ملنے تمہارے گھر آؤں؟"

"آں۔ ہاں ضرور۔ مگر اماں کو سمجھانا ہو گا۔" وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا۔

"میں سمجھا دوں گی۔ تمہاری اماں سے بولوں گی کہ اخبار میں تمہارا انٹرویو شائع کرانے آئی ہوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پچھلے سال کشتی جیتنے پر اخبار میں میری ایک چھوٹی سی تصویر اور انٹرویو چھپا تھا۔ پھر تو اماں تم سے مل کے بہت خوش ہو گی۔"

"اچھا میں جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔"

شازیہ نے قربان ہو جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر پلٹ کر وہاں سے جانے لگی۔ وہ ایسے مٹک کر چل رہی تھی کہ صمدو کی نگاہیں اِدھر سے اُدھر ہونے والے کولہوں پر جم گئی تھیں۔ اس نے شہر میں ایسی چال چلنے والیوں کو دیکھا تھا مگر شازیہ تو گاؤں میں آ کر اس کے سینے پر قدم رکھ رکھ کر چل رہی تھی۔ سامنے والے مکان کے دروازے پر پہنچ کر اس نے صمدو کو پلٹ کر دیکھا۔ اپنے سانسوں بھرے

سینے پر ہاتھ رکھ کر ہائے کے انداز میں سانس لی۔ پھر مکان کے اندر چلی گئی۔

صمد کی تو کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ہیں۔ آسمان مہربان ہو گیا تھا۔ اتنی بڑی خوش بختی کی تو وہ توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شہر سے ایکسپورٹ ہو کر آنے والا سارا کا سارا شباب اس کی ملکیت ہونا چاہیے گا۔ شازیہ کی مسکراہٹ اس کی چال، اس کی ادائیں اور پیار بھری نگاہیں سب پہلوان کے لیے تھیں۔ پہلوان یہ سوچ سوچ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

وہ اپنے گھر کی طرف تیزی سے جانے لگا۔ گھر چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ نوری اسے یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی کہ ماں گھر پر نہیں ہے۔ حکیم صاحب کا بچہ مر گیا ہے وہاں گئی ہوئی ہے۔ راستہ بالکل صاف ہے لیکن صمد گھر میں داخل ہوتے ہی اسے گرما گرم نظروں سے دیکھنا بھول گیا۔ اس نے ماں کو پوچھا۔

نوری نے اپنی دانست میں وہی خوشخبری سنائی۔ صمد نے کہا۔

"وہ نہ سہی۔ چل تو جلدی سے بستروں کی چادریں اور تکیے کے غلاف بدل دے۔ گھر کی ایک ایک چیز کو سلیقے سے رکھ دے، وہ آنے والی ہے۔"

"کون آنے والی ہے؟"

وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صمد نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھا کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ "بحث نہ کر، جو کہتا ہوں جلدی جلدی کرتی جا۔"

وہ جلدی جلدی احکام کی تعمیل کرنے لگی۔ سوچنے لگی یہ ہیں آج یہ کس دھن میں ہے۔ وہ بستر پر چادر بچھاتے ہوئے بولی۔ "اماں ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی۔"

وہ اس کے دل میں چھپی ہوئی خواہش کو یاد دلانا چاہتی تھی۔ صمد نے کہا۔ "ماں نہیں آئے گی تو تو ناشتہ اور لسی لا کر رکھ دینا۔"

نوری نے پھر بات سے بات نکالی۔ "ہاں لسی کی بات پر یاد آیا۔ اس روز تو نے دھوکے سے نشے والا دودھ پلا دیا تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ آخر تو اماں کو وہ دودھ کیوں پلانا چاہتا تھا؟"

آہ! یہ دوسرے سے چاہے جانے کی تمنا مار ڈالتی ہے۔ نوری کیسے کیسے بہانوں سے اپنی چاہت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ وہ جاہلانہ انداز میں اس سے کام کرا رہا تھا۔ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا رہا تھا۔ چلو ہاتھ نہ لگائے مگر باتوں سے اور نگاہوں سے چھیڑ تو سکتا تھا۔ وہ تو چھیڑنا بھی بھول گیا تھا۔

بستر پر نئی چادر بچھانے کے بعد وہ شرماتے ہوئے اس پر بیٹھ گئی۔ خیال تھا کہ اب وہ چھیڑے گا۔ اس نے ایک ہاتھ اس کے سر پر جماتے ہوئے کہا۔ "چل اٹھ یہاں سے۔ یہ تیرے لیے نہیں اس کے لیے بچھوایا ہے۔ وہ آ کر بیٹھے گی۔"

نوری کے سر پر ایسا ہاتھ پڑا تھا کہ تارے ناچنے لگے تھے۔ صمد نے اسے کھینچ کر بستر سے ہٹا دیا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس گھر میں بھلا اور کون آ کے بیٹھے گی؟"

"وہ شہر سے آئی [illegible]۔ ہمارے گھر آنے والی ہے۔ میرا انٹرویو لے گی۔ میری تصویر اخبار میں چھاپے گی۔"

"ارے تو ایسے بول نا۔ جب وہ تیرے لیے اتنا کرے گی تو میں اس کی خوب خاطر کروں گی۔ مگر تو مجھے مارتا کیوں ہے؟ کیا شہر والی کو دیکھ کے دل پھر گیا ہے؟"

صمد کے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ شازیہ نے ایسا جادو کیا تھا کہ نوری اتنی دیر سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اور اب نظر آئی تو ایک دم سے چڑیل لگ رہی تھی۔ کہاں شازیہ کہاں وہ؟ کہاں چاندنی کہاں کالی رات؟ وہ حیرانی سے سوچنے لگا کہ آخر کیا دیکھ کر وہ نوری کا دیوانہ بن گیا تھا؟ اس نے یہ کیوں نہ سوچا کہ اس کی پہلوانی کی شہرت دور دور تک ہے۔ کتنی ہی حسین عورتیں اسے خواب میں پہلوانی کرتے دیکھتی ہوں گی۔ کیسی حماقت ہوئی کہ سوچا نہ سمجھا۔ دیکھا نہ بھالا اور ہڑبڑا کر اس کلوٹی پر عاشق ہو گیا۔

ماں اس وقت موت پر گئی ہوئی تھی۔ نوری جانتی تھی کہ صمد اس کا دیوانہ ہے۔ اسے تنہائی میں اور دیوانہ بنانے کے لیے اس نے سنگار کیا تھا۔ بالوں میں سرسوں کا تیل لگا کر کنگھی چوٹی کی تھی۔ ذرا سا تیل دونوں ہتھیلیوں پر مل کر سیاہ چہرے پر لگایا تھا تاکہ دھوپ میں چمکتی رہے۔ آنکھوں کا کاجل ایسا ہی تھا جیسے اندھیری رات کو سرمہ لگایا گیا ہو۔ صمد نے جھڑک کر کہا۔ "چل بھاگ یہاں سے۔"

وہ مرجھا گئی۔ فریادی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "میں ابھی سے تجھے سمجھا دیتا ہوں۔ جب وہ شہر والی آئے گی تو تو اس کمرے

میں نہ آنا۔ نہیں تو دہ تجھے دیکھ کے ڈر جائے گی۔"

نوری کو یکبارگی یاد آیا کہ اس کی اپنی ماں کبھی اسے چڑیل کہتی تھی۔ آج آٹھ برس کے بعد صمد نے بھی یہی کہا تھا کہ دوسرے اسے دیکھ کر ڈر جائیں گے۔ یعنی آٹھ برس میں وہ ذرا بھی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اسے ذرا سا بھی حسن نہیں ملا تھا۔ کہتے ہیں محبت ہر شے کو خوبصورت بنا دیتی ہے اور صمد اس کے وجود سے محبت کی اس خوبصورتی کو نوچ رہا تھا۔ نقاب اٹھا کر دکھا رہا تھا کہ وہ چڑیل ہے چڑیل ہی رہے گی۔

وہ دل برداشتہ وہاں سے چلی گئی۔ باورچی خانہ میں جا کر بیٹھ گئی۔ دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ صمد و بلائے گا تب بھی نہیں جائے گی۔ وہ چھیڑے گا تو ذرا بھی نہیں مسکرائے گی۔ اسے خوب خوب تڑپائے گی۔ ابھی تک وہ خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ ایسے پیارے لمحے اس کی زندگی میں پھر آئیں گے۔

تھوڑی دیر بعد اسے باہر کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ جواب میں صمد نے کچھ کہا۔ نوری کان لگا کر سن رہی تھی۔ صمد کی آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ شہر والی کے آگے بچھا جا رہا ہے۔ نوری کے دل کو جیسے کوئی مٹھی میں لے کر مسلنے لگا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ صمد کے بلانے پر بھی نہیں جائے گی۔ مگر وہ بے اختیار اٹھ گئی۔ اس کے دماغ میں شبہات شور مچا رہے تھے کہ اگر وہ اپنے حق کے لیے نہیں اٹھے گی تو وہ آنے والی اس کی دنیا لوٹ کرلے جائے گی۔

شازیہ کمرے میں آکر بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ صمد ایک چھوٹی سی چوکی پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ شازیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یہاں بیٹھو۔ ہمارے ہاں ایک ساتھ بیٹھنے کو برا نہیں سمجھا جاتا۔"

گورے گورے خوبصورت ہاتھوں نے اسے پکڑا تھا۔ وہ تھر تھرانے لگا۔ شازیہ کے وجود میں ایسی چکناہٹ تھی کہ وہ پھسل کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت نوری وہاں پہنچ کر چیخ پڑی۔ "یہ کیا بے حیائی ہے؟"

صمد ایکدم سے گھبرا کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی گناہ کیا ہو۔ نوری کی آواز کوڑے کی طرح لگی تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں سمجھا ماں آئی ہے پھر نوری کو دیکھ کر غصہ آ گیا۔ شازیہ نے جلتی پر تیل چھڑکنے کے لیے کہا۔ "ہائے پہلوان جی! یہ چھپکلی تم پر رعب جما رہی ہے کیا بیوی ہے یہ؟"

صمد نے دروازے پر پہنچ کر نوری کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے کہا۔ "یہ سالی میری کوئی نہیں ہے۔ ماں نے بچپن سے اسے پالا ہے۔ اب یہ میرا کھا کر مجھ ہی پر غراتی ہے۔"

وہ بال پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ "حرامزادی میں نے سمجھایا تھا کہ ہمارے بیچ میں نہ آنا۔ تو ہوتی کون ہے مجھے اس کے پاس بیٹھنے سے روکنے والی؟"

اس نے تڑاتڑ پٹائی شروع کر دی۔ وہ رو رہی تھی، اور بول رہی تھی۔ "مجھے نہ مار۔ میں نے تجھے اپنی عزت دی ہے۔ میں خوبصورت نہ سہی مگر عزت تو ہر ایک کی خوبصورت ہوتی ہے۔ خدا کی قسم صمد! میرے پاس وہی ایک حسن تھا۔ اس کے بدلے مجھے پیار دے، مار نہ دے۔"

مگر اس نے مار مار کر اس کی ہڈیاں چٹخا دیں۔ جب وہ بے جان سی ہو کر فرش پر گر پڑی تو وہ اپنے کمرے میں شازیہ کے پاس چلا گیا۔ اس نے تعریف کی۔ "صمد! تم واقعی دلیر ہو۔"

وہ بولا۔ "میں نے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔ نہیں تو عورت کو مارنا دلیری نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "یہی تو دلیری ہے۔ میں نے بڑے بڑے مرد دیکھے ہیں جو بڑے بڑے پہلوانوں کو تو چت کر دیتے ہیں مگر ان کی عورتیں انہیں پچھاڑ کر رکھ دیتی ہیں۔"

"یہ میری عورت نہیں ہے۔ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔"

"چلو اچھا ہوا کہ میں تمہاری شادی سے پہلے آ گئی۔ کیا تم مجھے پسند کرو گے؟"

وہ سر جھکا کر شرماتے ہوئے بولا۔ "اللہ قسم میں ہمیشہ خواب میں تمہارے ہی جیسی خوبصورت عورت کو دیکھتا تھا۔ آج میرا خواب سچا ہو گیا ہے۔"

"خواب کو سچا کرنے کے لیے بہت سی قربانیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"میں تمہارے لیے اپنی جان قربان کر سکتا ہوں۔"

"اس سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گی۔ تمہیں پا کر تو میں نے سارے جہان کی دولت پا لی ہے۔ مگر ایک بات ہے۔ پہلے ہم دونوں کو ہم مزاج بننا ہوگا۔"

"تم جیسا کہو گی میں ویسا ہی بن جاؤں گا۔"

"دیکھو شادی سے پہلے چھ ماہ تم میرے ساتھ شہر میں رہو گے۔ میں تمہیں شہر والوں کے طور طریقے سکھاؤں گی۔ شادی کے بعد میں تمہارے ساتھ اس مکان میں رہا کروں گی اور تمہاری ماں کی خدمت بھی کروں گی۔"

ماں واپس آ گئی تھی اور دروازے پر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "بیٹا! یہ کون ہے؟"

وہ دونوں چونک پڑے۔ پھر صمد نے کہا۔ "اماں، یہ شازیہ ہے یہ تیری بہو بننے کے لیے تیار ہے۔"

شازیہ نے سر پر آنچل رکھ کر سر کو جھکا کر سلام کیا۔ ماں نے اسے دعائیں دینے کے بعد کہا۔ "بیٹی! تم تو ہمارے خیال سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔ کہاں سے آئی ہو۔ تمہارے ماں باپ کو شادی کی بات کرنے یہاں آنا چاہیے تھا۔"

وہ بولی۔ "میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں ایک چھوٹے

جاتی وہ چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ ہمارے بہت سے مکانات ہیں۔ ان سے اتنا کرایہ آتا ہے کہ ہم عیش و آرام سے زندگی گزارتے ہیں۔"

ماں نے کہا: "میں کسی دن تمہارے گھر آؤں گی۔"

صمد نے کہا: "نہیں اماں، پہلے میں جاؤں گا۔ پھر تجھے بلاؤں گا۔"

دوسرے کمرے میں نوری کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ اپنی بے قدری اور توہین کے احساس سے دماغ سلگ رہا تھا۔ ماں بیٹے اور شہری دلہن کے باتیں کرنے کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ صمد کی طوطا چشمی دیکھ چکی تھی۔ اب ماں کے رویے کو سمجھنا چاہتی تھی اور یہ سن کر اسے تسلی ہو رہی تھی کہ ماں نے صرف ٹالنے کیلئے شازیہ کا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اسے بہو بنانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا ہے۔

شازیہ شام تک وہاں بیٹھی، ہنستی بولتی رہی۔ ماں بیٹے کو شہر کی دلچسپ باتیں سناتی رہی۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا۔ ان میں سے کوئی دوسرے کمرے میں جھانکنے نہیں آیا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ وہ صبح سے کس حالت میں وہاں پڑی ہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو شازیہ جانے لگی۔ ماں بیٹے اسے چھوڑنے مکان سے باہر آئے۔ شازیہ نے کہا: "اماں! اگر میں پسند نہیں ہوں تو ابھی سے کہہ دو۔ میں تمہارا فیصلہ سن کر جانا چاہتی ہوں۔"

ماں نے کہا: "جوانوں کے سامنے بوڑھے کیا فیصلہ کریں گے۔ بس ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم نے آج ہی میرے بیٹے کو دیکھا اور آج ہی شادی کے لیے اسے پسند کر لیا۔ یہ زندگی بھر نباہے جانے والا رشتہ پلک جھپکتے کیسے ہو سکتا ہے؟"

شازیہ نے ہنستے ہوئے کہا: "اماں تم شہر نہیں جاتی ہو۔ فلمیں نہیں دیکھتی ہو۔ دیکھو گی تو معلوم ہو گا کہ راستے میں لڑکے لڑکی ٹکراتے ہیں اور محبت ہو جاتی ہے۔ پھر دونوں مل کر گانا گاتے ہیں اور شادی ہو جاتی ہے۔"

ماں نے حیرانی سے منہ کھول کر اس کی باتیں سنیں۔ بیٹے نے بھی تائید کی کہ ایسا ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ نہ ہوتا تو فلمیں ایسی نہ بنتیں۔ تازہ ترین مثال شازیہ اور صمد کی تھی۔ انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صرف چھ ماہ کا انتظار تھا کیونکہ صمد شہری دلہن سے ٹریننگ حاصل کرنے شہر جانے والا تھا۔

شازیہ صبح آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماں کو خیال آیا کہ مغرب کا وقت گزر چکا ہے اور نوری نے ابھی تک لالٹین نہیں جلائی ہے۔ اس نے نوری کو آوازیں دے کر خود ہی لالٹین روشن کی۔ روشنی میں وہ فرش پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ ماں نے کھانے کے لیے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ صمد نے کہا: "نخرے کرتی ہے سالی شازیہ کے سامنے میری بے عزتی کر رہی تھی۔ میں پٹائی نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟"

نوری فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولی: "کیا وہ گوری چمڑی والی مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"دیکھو اماں یہ پاگل ہو گئی ہے۔ کالی چمڑی رکھ کے شازیہ سے مقابلہ کر رہی ہے۔ اری شازیہ کی کالی پرچھائیں بھی تجھ سے خوبصورت ہے۔"

"کیا تو کل تک میرا دیوانہ نہیں تھا؟"

"وہ میری بھول تھی۔"

"کیا تو نے میری عزت سے نہیں کھیلا ہے؟"

صمد ایک دم سے بوکھلا کر ماں کو دیکھنے لگا۔ ماں یہ سن کر چونک گئی تھی۔ اس نے غصے سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے پوچھا: "جواب کیوں نہیں دیتا۔ کیا تو نے منہ کالا کیا ہے؟"

وہ سر جھکا کر بولا: "وہ... مجھ سے بھول ہو گئی تھی۔"

نوری نے ہاتھ نچا کر کہا: "اس شہر والی کے آنے کے بعد آج سے پہلے جو کچھ کیا سب بھول سے کیا۔ مجھ سے انکار ہے تو ماں کے دودھ سے بھی انکار کر دے۔"

صمد مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ ماں درمیان میں آ گئی۔ اس نے نوری کی حمایت میں کہا: "یہ ٹھیک بولتی ہے۔ تو نے اسے زخمی کیا ہے یہ جتنا بولے اتنا ہی کم ہے۔ تو نے اس غریب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

ماں کی حمایت پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے پچکارتے ہوئے کہا: "آنسو پونچھ لے۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر روٹی کھا لے۔ پھر میں انصاف کروں گی۔"

"اماں مجھے بھوک نہیں ہے۔ صرف تیرا انصاف چاہیے۔"

"پہلے میری بات مان لے۔" وہ اسے ہاتھ پکڑ کر لے گئی۔ اسے منہ ہاتھ دھونے اور روٹی کھانے پر مجبور کیا۔ جب وہ کھانے لگی تو وہ بیٹے کے پاس آئی۔ وہ بولا: "میں صاف کہہ دیتا ہوں۔ شادی ہو گی تو شازیہ سے، نہیں تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گا۔"

ماں نے آہستگی سے کہا: "میں بھی ایسی گوری اور خوبصورت ناک نقشے والی بہو چاہتی ہوں مگر نوری کو غصہ دکھانے سے کام نہیں چلے گا۔ تو اس کی عزت برباد کر چکا ہے۔"

وہ بولا: "کالی عزت کی حیثیت ہی کیا ہے۔ میں نے تو اسے پوچھ بھی لیا۔ باہر کوئی دو کوڑی میں بھی اسے نہیں پوچھے گا۔"

"عزت کالی گوری نہیں ہوتی۔ ہر عورت کے لیے یہ جان سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ نوری نے یہی بات گاؤں والوں کے سامنے کہہ دی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ پنچایت میں لوگ تجھے اس سے شادی کرنے پر مجبور کریں گے۔ پھر شازیہ کو تو دلہن نہیں

بنا سکے گا۔"

صمدو پریشان ہو کر ماں کا منہ تکنے لگا۔ وہ بولی۔ "تو اطمینان رکھ میں نرمی سے اسے سمجھاؤں گی۔ تو گرمی نہ دکھانا ورنہ کام بگڑ جائے گا۔"

صمدو۔۔ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد اس جگہ کو سہلانے لگا، جہاں دن کے وقت شازیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ نوری برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔ گھر کے کاموں میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ پہاڑ جیسا محبوب چھن گیا تھا۔ گوری شازیہ نے کالی کے سینے پر ہاتھ ڈال کر کلیجہ باہر نکال لیا تھا اور اب وہ اندر سے خالی ہو کر برآمدے میں سوالی کی طرح بیٹھ گئی۔

بڑی دیر تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ نوری سر اٹھائے آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو تکتی رہی۔ اس کا چاند بہت دور ہو گیا تھا۔ ماں نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ "جب تو یہاں آئی تو بہت چھوٹی سی تھی۔ صمدو سے بہت ڈرتی تھی۔ میں نے ماں بن کر تجھے کلیجے سے لگایا۔ کبھی تیرے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں کمی نہیں کی۔ تجھے ہمیشہ کچھ دیتی رہی ہوں۔ تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج مانگتی ہوں۔"

نوری کی نگاہیں چاند سے اتر کر زمین پر آ گئیں۔ پھر ماں کے چہرے پر سوال بن کر تھم گئیں۔ ماں نے کہا۔ "میں اپنے بیٹے کی عزت مانگتی ہوں تو اسے بدنام نہ کر۔"

"اماں! میں نے کب بدنام کیا ہے؟"

"نہیں کیا ہے تو کر سکتی ہے۔ میرے بیٹے سے غلطی ہو گئی۔ تیرے دامن پر دھبہ لگ گیا تو گاؤں والوں کو یہ دھبہ دکھائے گی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"اماں! ایسا تو میں کبھی کر ہی نہیں سکتی۔ میں نے بچپن سے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اکیلا صمدو قصوروار نہیں ہے۔ تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے نا۔"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ماں نے کہا۔ "بیٹی! تو بہت اچھی ہے۔ بہت سمجھدار ہے۔ دنیا والے مرد کی غلطیوں کو بھول جاتے ہیں مگر عورت کی غلطی کو ڈھول بنا کر پیٹتے رہتے ہیں۔"

"یہاں بدنامی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں میرا حق چھینا جا رہا ہے۔ میں انصاف چاہتی ہوں۔ شاید تم یہ سوچتی ہو کہ میرے حق میں فیصلہ نہ ہوا تو میں ماں بیٹے کو بدنام کر دوں گی۔ نہیں یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں کبھی بدنام نہیں کروں گی۔ ہاں اگر صمدو کے دل میں نہ رہی تو گھر میں بھی نہیں رہوں گی۔ یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں گی۔"

"بیٹی! ایسا فیصلہ نہ کرنا۔ بے شک میں پہلے صمدو کی ماں ہوں مگر تیرے لیے بھی میرے دل میں درد ہوتا ہے۔"

"اماں! آج تو تمہیں ساس بن کر فیصلہ سنانا ہے کہ کیسی بہو پسند ہے؟"

ماں کو تھوڑا دیر کے لیے چپ لگ گئی۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی "جب تو یہاں نہیں آئی تھی، تب سے ہم ماں بیٹے کتنی ہی گورے مکھڑے والی اور خوبصورت ناک نقشے والیوں کے ہاں رشتہ مانگنے گئے اور مایوس لوٹ کر آتے رہے۔ پھر صمدو تجھے اٹھا کر لے آیا۔ ہمارے پنڈ میں بجلی نہیں آئی۔ ہم لالٹین سے گزارا کر لیتے ہیں۔ اسی طرح صمدو تجھ سے گزارا کرنا چاہتا تھا۔"

"گزارا کرنا اور بات ہے، مگر وہ تو میرا دیوانہ بن گیا تھا۔"

"اس لیے کہ بازار میں چیز ایک ہو تو اسی ایک چیز کو حاصل کرنے کی دیوانگی ہوتی ہے۔ پہلے کوئی تیرے مقابل نہ تھی۔ اس لیے وہ تیرا دیوانہ تھا۔ اب خوب سے خوب تر کی بات ہے اور شازیہ خوب ترین ہے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر ماں نے کہا: "ہاں، تجھ سے گزارا ہو جاتا، مگر جو لوگ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے ہیں وہ اچھی خوراک کا سپنا ضرور دیکھتے رہتے ہیں۔ میرا یہ برسوں کا سپنا ہے کہ بہو خوبصورت ہو اور میرے لیے خوبصورت پوتے پوتیاں پیدا کرے۔ دنیا کا ہر شخص اپنے آنگن میں خوبصورت پھول کھلانا چاہتا ہے۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شازیہ پھول کھلانے آئے گی۔ اب وہ آ رہی ہے تو ہم خوش نصیبی کو ٹھکرانے کی حماقت نہیں کریں گے۔"

ماں کا فیصلہ نوری کے منہ پر جوتے کی طرح لگا۔ اب کچھ کہنے سننے کے لیے نہیں رہ گیا تھا۔ ماں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے لیے بہت خوبصورت لڑکا تلاش کروں گی۔ بہت ہی دھوم دھام سے تمہاری شادی کروں گی۔ میں ایک حسین بہو اور خوبرو داماد لاؤں گی۔ آؤ۔ اب سو جاؤ۔ آدھی رات گزر رہی ہے۔"

ماں کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ نوری برآمدے میں اسی جگہ بیٹھی رہی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہاں سے اٹھ کر کہاں جانا ہے؟ جس گھر میں بیاہتا بننے سے پہلے سوکن آ رہی ہو وہاں وہ نہیں رہ سکتی تھی۔ جس مرد کی آغوش میں کھیل چکی تھی، وہاں کسی دوسری کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

رات کے ایک بجے اس نے برآمدے سے اٹھ کر ماں کو دیکھا وہ سو چکی تھی۔ اس نے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ صمدو بستر پر چاروں شانے چت لیٹا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ کبھی کبھی مسکرا رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے نوری کے من میں خوشی کی لہر آئی کہ وہ اسے خیالوں میں دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ دوسرے لمحے صمدو نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر اسے دیکھتے ہی کروٹ بدل کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

نوری نے پوچھا: "صمد و! کیا میرے ساتھ گزری ہوئی کوئی بات تجھے یاد نہیں آ رہی ہے؟"

وہ چپ رہا۔ وہ بولی: "میں نے تیرے پیار میں زہریلا دودھ پیا تھا صمدو۔"

وہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ خاموشی پر تلا رہا۔ اس نے ٹوٹے دل سے کہا: "میں جا رہی ہوں۔ مجھے روک لے صمدو۔ نہیں تو میں کبھی لوٹ کے نہیں آؤں گی۔"

وہ دروازے سے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی: "میں جا رہی ہوں تیرے پیار کی، تیری بے مروتی کی قسم میں جا رہی ہوں۔"

وہ دور ہوتی گئی۔ مکان کے باہر احاطہ میں آ کر اس نے انتظار کیا۔ جانے کیوں اتنی سرد مہری کے باوجود دل کہتا تھا کہ وہ آئے گا۔ وہ بھینسوں کے باڑے میں گئی۔ ایک ایک بھینس سے لپٹ کر بولتی رہی۔ "میں جا رہی ہوں۔ کیا اتنے برسوں میں کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہوئی؟"

بھینسیں صمدو کی طرح چپ رہیں۔ کوئی کتا ہوتا تو پیار سے کم از کم دم ہلاتا۔ تعجب ہے کہ آدمی آدمی کی طرح نہ سہی، کتے کی طرح بھی پیار نہیں کر سکتا۔ رات کے تین بج گئے۔ ماں سو رہی تھی۔ صمدو شرابی کے ساتھ خیالوں کی سیج پر عیش کر رہا تھا۔ کوئی اسے پوچھنے نہیں آیا۔

آخر وہ کمرے میں گئی۔ اپنا سوٹ کیس کھول کر دو جوڑے کپڑے نکالے۔ روپیہ اکٹھی کر کے اس نے اب تک ڈھائی سو روپے جمع کئے تھے۔ نوٹوں کو اس نے چولی میں ٹھونسا۔ ریز گاری اور کپڑے ایک تھیلے میں رکھے۔ پھر وہ چپلیں پہن کر گھر سے نکل گئی۔

لاری کے اڈے کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ اس وقت سے بھاگ رہی ہے، جب اس نے چڑیل بن کر اپنی ماں کو کھا لیا تھا اور اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوئے دنیا سے دور چلے جانا چاہتی تھی۔ اب بھی اسے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے دور کیسے جا سکتی ہے۔ بس وہ بھاگنے کے انداز میں چلتی جا رہی تھی۔ جب وہ لاری کے اڈے پہنچی تو ایک جگہ کھڑے ہو کر ہانپنے لگی۔ چاروں طرف سے مردوں کی نگاہیں اسے گھور رہی تھیں۔ گھر سے پہلی بار باہر آنے کے بعد پتہ چلا کہ اس میں کچھ ہے۔ کچھ ہوتا ہے جب ہی لوگ بار بار دیکھتے رہیں۔ وہ بہت ساری نگاہوں سے بچنے کے لئے بس کے اندر آ کر بیٹھ گئی۔

پھر لوگ بس کی کھڑکی کے پاس سے گزرنے لگے۔ وہ آتے جاتے ہوئے اسے دیکھتے تھے۔ کوئی کھانستا کھنکارتا تھا۔ کوئی آہیں بھرتا جاتا تھا۔ کوئی گنگنانے کے بہانے شاہ کر کے سینے نال لگنے کا مشورہ دیتا تھا۔ نوری کو یہ بازاری حرکتیں بری لگ رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ سوچ رہی تھی: "کاش کہ صمدو یہاں ہوتا۔ میں اسے بتاتی کہ تو نے میری قدر نہیں کی۔ اب دیکھ دنیا والے مجھ پر کس طرح مر رہے ہیں۔"

وہ حیران تھی کہ اس میں کیا خوبی ہے، جسے صمدو نہ دیکھ سکا۔ اور دنیا والے دیکھ رہے ہیں۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ مگر اس کی جوانی بھری ہوئی بندوق کی طرح تھی۔ ٹھائیں سے نگاہوں کو پکارتی تھی۔ لیکن اور بھی جوان عورتیں اپنے شوہر اور عزیزوں کے ساتھ سفر کرنے آئی تھیں۔ ان عورتوں کو کوئی نہیں گھور رہا تھا۔ حالانکہ وہ نوری کے مقابلہ میں حسین تھیں۔ دیکھنے والوں کا سارا زور اس کے سیاہ حسن پر تھا۔

تب یہ انکشاف ہوا کہ وہ اکیلی تھی۔ اس لئے مرد اسے مالِ غنیمت سمجھ کر نگاہوں سے لوٹ رہے تھے۔ وہ ملبوس تھی۔ مگر صمدو کے بغیر ایک ننگا گھر تھی۔ اور ایسے گھر پر کتنے ہی شریف بدمعاش شب خون مارنے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اسے خود ہی اپنا محافظ بن کر رہنا تھا۔

بس چل پڑی۔ کنڈیکٹر نے پوچھا: "کہاں جانا ہے؟"

وہ دس کا نوٹ بڑھاتے ہوئے بولی: "راولپنڈی۔"

"بی بی! یہ گڈی لاہور جا رہی ہے۔ چلو اتر جاؤ۔ استاد گڈی روکنا۔"

وہ جلدی سے بولی: "ٹھیک ہے، میں لاہور جاؤں گی۔"

کتنے ہی مسافر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جوان تھی، اکیلی تھی۔ کبھی راولپنڈی اور کبھی لاہور جانے کی بات کر رہی تھی۔ اس طرح ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے اور اس کی کوئی خاص منزل نہیں ہے۔ کنڈیکٹر نے ٹکٹ کے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا: "کوئی گل نہیں، پیسے اپنے کول رکھو، میں تینوں لاہور تک پہنچا دیواں گا۔"

ڈرائیور نے اندر والے عقب نما آئینے کا رخ بدل کر اس میں نوری کو دیکھا۔ اسی وقت نوری نے ادھر دیکھا تو ڈرائیور نے آنکھ مار دی۔ وہ ایک دم سے لرز اٹھی۔ گاؤں میں آج تک کسی نے ایسی گندی حرکت نہیں کی تھی۔ صمدو پہلوان سے سب ڈرتے تھے۔ اسے پہلوان کی جاگیر سمجھ کر دوری سے کترا جاتے تھے۔ اس کے دل میں ایک درد پیدا ہوا۔ آہ۔ اپنا مرد بھی کیا ہوتا ہے۔ اس کے آگے سارے مرد ہیچ ہو جاتے ہیں۔

نوری نے ڈرائیور کو گھور کر دیکھا تو اس نے جلدی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

"کیا بہن سمجھ کر کرایہ چھوڑ رہا ہے۔ چل پکڑ یہ نوٹ اور باقی پیسے واپس کر۔"

کنڈیکٹر نے چپ چاپ کرائے کی رقم لے کر باقی روپے واپس کر دیئے۔ گاڑی جب کچھ دور نکل گئی تو نوری نے بس کے اندر مسافروں

کا جائزہ لیا۔ وہاں عورتیں زیادہ تھیں اور ان میں سے دس عورتیں عیسائی راہبہ تھیں۔ ایک لمبی داڑھی والا پادری ان کے ساتھ تھا۔ نوری کے ساتھ ایک خوب گورے رنگ کی بوڑھی راہبہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نوری سے پوچھا۔

"بیٹی! تم اکیلی کدھر جاتی ہے؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولی: "اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے اور میرا کوئی سہارا نہیں ہے میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں شہر جا کر محنت مزدوری کروں گی۔ پھر اپنا ٹھکانہ بھی بناؤں گی۔"

"آسمانی باپ تم پر رحم کریں گا، جوان عورت ایک بچہ کا برابر ہوتی ہے۔ بچہ باپ کا انگلی پکڑ کے چلتا ہے۔ عورت اپنے آدمی کا انگلی پکڑ کے چلنے سکتی ہے۔ انگلی نہیں ہونے سے بچہ اور عورت دونوں گر جاتی ہے۔ تم ہمارا بات سمجھنے سکتی ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی: "آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں مگر میں کیا کروں، مجھے سہارا دینے والی کوئی انگلی نہیں ہے۔"

وہ نوری کے ہاتھ کو تھام کر بولی: "ہم کو مدر بولو۔ ہم تم کو اپنے پاس میں رکھے گی۔ ہمارے پاس میں بہت عورت لوگ ہے۔ مسیح کا بندگی میں صلیب کا سائے میں تم کو کھانا ملے گا۔ کپڑا ملے گا، عزت ملے گا نہیں تو یہ دنیا تم کو فنس کر دے گا، ایک دم سے ختم کر دے گا۔"

نوری نے اِدھر اُدھر بیٹھی ہوئی راہبوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا: "سمجھ گئی۔ ان عورتوں کو روٹی کپڑے اور پناہ کی ضرورت نے تمہارے سائے میں پہنچا دیا ہے۔ تم انہیں عیسائی بنا کر رکھتی ہو مگر میں مسلمان ہوں۔ اپنا ایمان نہیں چھوڑوں گی۔"

مدر نے کہا: "پاکستان غریب ملک ہے۔ جدھر غریبی مارتا ہے، ادھر ایمان کمزور ہوتا ہے۔ کتنا مسلمان لوگ عیسائی بنتا ہے۔ تم ہمارا ہاتھ پکڑو۔ خدا کا بیٹا (نعوذ باللہ) مسیح اعظم ہمارا تمہارا نجات دہندہ ہے۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی: "میرا ایمان کمزور نہیں ہے۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔"

"اچھا نہیں کرے گا۔ مگر جب تم کو کوئی جگہ نہیں ملے گا تو کوئی بھی چرچ میں آ کے مدر میریا اور فادر بنجامن کا نام پوچھو، تم کو رہنے اور کھانے پینے کا جگہ مل جائے گا۔"

وہ چپ رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ پھیر کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ وہ گھر سے باہر نئی زندگی کی نئی صبح تھی اور وہ کسی نئی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مدر نے پھر اسے عیسائیت کی طرف مائل نہیں کیا مگر نصیحتیں کرتی رہی دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتی رہی کہ لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کی عزت، جان اور ایمان سب چھین لیتے ہیں۔ جب وہ اڈے اڈے تھک جائے تو کسی بھی چرچ کے دروازے پر آ جائے عیسائیت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

لاہور کے لاری کے اڈے پہنچ کر وہ حیران و پریشان ہو گئی۔ اس نے لاہور کی بہت سی باتیں سنی تھیں اور اپنے تصور کے مطابق اسے دیکھا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ لاہور اتنا بڑا شہر ہوگا۔ اتنے بڑے آسمان کو یہاں سے وہاں تک دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر دیکھ بھی لیا تو یہ دل میں اتر جاتا ہے اور دور تک اپنی جڑیں پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ گاؤں کی طرح کسی بھی گھر میں جا کر پناہ لے سکتی ہے۔ مگر وہاں کے اونچے اونچے مکانات سے رعب طاری ہو رہا تھا۔

مدر عورتوں کی فوج کے ساتھ وہاں کھڑی ہوئی نوری کی پریشانی کا اندازہ کر رہی تھی اور آہستہ آہستہ فادر سے باتیں کر رہی تھی۔ فادر اچھی اردو بول لیتا تھا۔ صرف لہجے سے اس کے انگریز ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ وہ نوری کے پاس آ کر بولا۔

"بیٹی! کہیں اپنا ٹھکانہ بنانے تک ہمارے پاس رہو، پھر جب چاہو، چلی جانا۔ ہمارے پاس رہ کر تم مسلمان ہی رہو گی۔"

یہ کہہ کر فادر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نوری کو وہ شفقت بہت اچھی لگی۔ محمود کے پاس رہ کر اس نے ماں کی بدلتی ہوئی ممتا کو دیکھ لیا تھا۔ بچپن سے باپ کا پیار نہیں ملا تھا۔ فادر کی شفقت پا کر اس نے سوچا: "آج نہیں تو کل روٹی اور رہائش کا انتظام کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا لیکن اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ کہیں بھی عزت آبرو سے رہنے کی جگہ ملے گی۔ عزت دارالامان میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ یا پھر ان عیسائی عورتوں کے ساتھ بے خوف و خطر رہ سکتی ہوں۔"

یہ سوچ کر وہ فادر اور مدر کی ٹیم کے ساتھ چلی گئی۔ مال روڈ کے پاس ایک چرچ کے پیچھے سالویشن آرمی (مکتی فوج) کے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ جہاں وہ راہب اور راہبائیں رہتے تھے۔ وہاں کا ماحول نہایت ہی پاکیزہ تھا وہاں سب کنوارے رہتے تھے اور کتنے ہی کنوارے پن میں بوڑھے ہو گئے تھے۔ مگر کوئی کسی کو میلی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہاں جنسی خواہش اور جنسی کج روی نام کو نہ تھی۔ نوری جیسی جوان عورت ایسے ماحول میں بے شک و شبہ محفوظ رہ سکتی تھی۔

وہاں سب اس سے محبت سے پیش آتے تھے، مسکرا کر باتیں کرتے تھے۔ لڑکیاں اسے اپنے ساتھ میز پر کھانا کھلاتی تھیں۔ سونے کے لئے ہر کمرے میں چار پلنگ تھے یعنی ایک کمرے میں چار لڑکیاں رہتی تھیں۔ نوری کو بھی سونے کے لئے ایک پلنگ مل گیا تھا۔ پہلے دن وہ چرچ کے آس پاس والے علاقوں میں گئی۔ تاکہ شہری راستوں

گویا دکھ سکے اور اپنے لئے روٹی روزی کا ذریعہ بنا سکے۔ اس نے ہر بڑے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے جھاڑو دینے، برتن مانجھنے اور کھانا پکانے کا کام مانگا۔ کسی کو کام والی کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی کو ضرورت تھی مگر اس گھر والی جوان عورت کو ملازمہ بنا کر نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اسے ملازمت نہ ملنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ تنہا تھی اس کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی کوئی ضمانت دینے والا نہ تھا۔ فادر نے کہا۔

• بیٹی اگر ہم ضمانت دے دیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ گھر کے لوگوں میں بھی چور ہوا کرتے ہیں۔ چوری کسی نے کی اور الزام تم پر آیا تو ہم کیا کریں گے؟

کام کرنے کے لئے اسے کوئی ضمانت دینے والا نہ ملا۔ پھر بھی وہ کام تلاش کرتی رہی۔ وہ ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر گئی تو خلاف توقع ٹھکانہ مل گیا۔ وہ گھر والی پیٹ سے تھی اور اسے ایسی جوان عورت کی ضرورت تھی جو اس کا گھر سنبھال سکے۔ اس نے بڑے پیار سے اسے گھر میں بلا کر بٹھایا۔ پھر بولی: "تم جوان لڑکی ہو۔ رات ہونے والی ہے، کہاں بھٹک رہی ہو؟"

• میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں اپنے لئے ٹھکانہ تلاش کر رہی ہوں۔

• تم میرے پاس رہو، اگر بھوک لگی ہو تو چولہے کے پاس جا کر سالن اور روٹیاں نکال کر کھا لو۔ میں ذرا مغرب کی نماز ادا کر لوں۔

• میں رات کو دیر سے کھاتی ہوں۔ آپ نماز پڑھ لیں۔

وہ جانماز بچھا کر کھڑی ہو گئی۔ نوری نے دیکھا۔ وہ گوری گوری سی معصوم سی عورت تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں بہت دکھ اٹھاتی رہی ہے۔ نماز کے دوران دستک ہوئی تو نوری نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک ادھیڑ عمر کا صحت مند آدمی کھڑا ہوا تھا۔ نوری نے پوچھا: "کس سے ملنا ہے؟"

اس نے سر سے پاؤں تک نوری کو دیکھتے ہوئے کہا: "یہ گھر میرا ہے۔"

وہ جلدی سے سر پر آنچل رکھ ایک ...... طرف ہٹ گئی۔ وہ شخص سر جھکا کر آنگن میں آیا۔ پھر اپنی بیوی کو نماز پڑھتے دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نوری پھر مالکن کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی نوری نے محسوس کیا کہ اس دعا مانگنے والی کے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور کبھی کبھی آہیں نکل رہی ہیں۔ نوری نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا آگے بڑھ کر دیکھا۔ اس وقت تک وہ دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیر رہی تھی وہ ہاتھ منہ پر ٹھہر گئے، چہرہ چھپ گیا، وہ خدا کے سامنے منہ ڈھانپ کر سسکیاں لے رہی تھی۔

---

# دہلی کا واقعہ

محمد اعظم نے ٹی وی خریدا، جس کی گارنٹی ایک سال کی تھی جب بھی ٹی وی بگڑا محمد اعظم نے کمپنی کو فون کیا۔ مکینک آیا اور درست کر گیا۔

ایک سال بعد خراب ہوا تو اپنے علاقے کے مکینک سے رجوع کرنا پڑا۔ مکینک نے تیس روپے فیس جمع کرائی۔ شام کو آیا ٹی وی دیکھا، اینٹینا گھمایا اور چلا گیا ٹی وی کام کرنے لگا۔ ہر مہینے میں ایک دو بار ایسا ہوتا رہا۔ ایک روز اعظم نے ایک دوکان پر "ٹی وی گائیڈ" نامی کتاب رکھی دیکھی، دس روپے میں خرید لی۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ ۵ جز، ٹی وی کی خرابی صرف اینٹینا کی خرابی سے ہوتی ہے۔ آخر میں کتاب والا کا چھاپا ہوا کلر ٹی وی گائیڈ کا بھی اشتہار دیکھا، اعظم نے کلر ٹی وی گائیڈ بھی پینتیس روپے میں خرید لی اور اسے پوری توجہ سے کئی کئی بار پڑھا۔ بہت سی باتیں معلوم ہوئیں تو اعظم نے ہمت کر کے مرمت کا سامان جو ٹی وی کو چیک کرنے میں مدد دیتا ہے ستر روپے میں خرید لیا۔ اپنے ٹی وی پر ہی پہلا کام کیا اور کامیاب رہا۔ ہمت بڑھی۔ پڑوس کے لوگوں کے ٹی وی بھی درست کئے اور تین مہینے میں خود پر بھروسہ کرنے لگا۔ ایک دن دیکھا۔ اعظم کے گھر پر بورڈ لگا تھا۔

"کلر و بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی ری پیئر ہاؤس۔"
ملنے کا وقت: صبح ۸ تا ۹ بجے اور شام ۶ بجے کے بعد۔

اس طرح محمد اعظم نے اپنے لئے پارٹ ٹائم ورک حاصل کر کے اپنی آمدنی بڑھائی اور اپنے ٹی وی کی مرمت فیس سے بھی بچ گیا۔ ہر وہ انسان جو اردو پڑھنا جانتا ہو اور ٹی وی سے دلچسپی رکھتا ہو "ٹی وی گائیڈ" اور "کلر ٹی وی گائیڈ" پڑھ کر اچھا مکینک بن سکتا ہے۔

——— رام کرشن اگروال

نوری یہ منظر دیکھ کر تڑپ گئی۔ جلدی سے پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا: کیا ہوا؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

وہ چپ رہی، اپنی سسکیوں اور آنسوؤں پر قابو پاتی رہی۔ نوری نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر پھر پوچھا: "آپ کو کیا دکھ ہے، مجھے بتائیں، میں آپ کے کام آؤں گی۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی: "اللہ تعالیٰ ہی میری مشکل آسان کرسکتا ہے۔"

"ہاں اللہ تعالیٰ ہی مشکل آسان کرتا ہے۔ مگر کچھ تو بتائیے آپ کس صدمہ سے رو رہی ہیں؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی: "میں ماں بننے والی ہوں مگر نہیں بن سکوں گی۔"

"کیوں نہیں بن سکیں گی؟"

"میری تقدیر پھوٹ گئی ہے۔ جب بھی ماں بننے جاتی ہوں، میرا پیٹ گر جاتا ہے۔"

"کیوں؟"

"دو بار ایسا ہو چکا ہے۔"

نوری نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ پھر مشورہ دیا: "سنا ہے شہر میں عورتیں ڈاکٹر ہوتی ہیں۔ آپ عورت ڈاکٹر سے اپنا علاج کرائیں۔"

وہ اٹھ کر جا نماز کو تہہ کرتے ہوئے بولی: "میرا علاج کوئی نہیں کرسکتا۔ بس ایک خدا کی ذات سے امید ہے۔"

"میں دن رات آپ کا خیال رکھوں گی۔ آپ کو کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔ چلیں آپ آرام سے لیٹ جائیں اور مجھے حکم دیتی رہیں۔ میں چٹکی بجا کر سارے کام کر دوں گی۔"

"میرے نصیب میں آرام کہاں ہے۔ ابھی اپنے میاں کو چائے بنا کر پلانا ہے۔"

"آپ لیٹی رہیں۔ جب مجھے یہاں رہنا ہے تو میاں صاحب کی خدمت کرنا بھی میرا ہی فرض ہوگا۔"

اس نے جبراً بستر پر لٹا کر چائے تیار کی۔ پھر ایک کپ میں چائے انڈیل کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ میاں صاحب ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ گئے۔

"ارے تم نے تکلیف کیوں کی۔ ویسے تم ہو کون۔ کیا نام ہے؟"

"میرا نام نوری ہے۔ مالکن نے مجھے یہاں گھر کے کام کاج کے لئے رکھا ہے۔"

وہ چائے کی پیالی لیتے ہوئے بولا: "پھر تو تم اپنی ہوئیں۔ کیا رات کو بھی رہو گی؟"

ایسا پوچھتے وقت وہ نوری کو اوپر سے نیچے تک دیکھ رہا تھا۔

وہ جی ہاں کہہ کر جانے لگی۔ اس نے کہا: "سنو! تم بہت اچھی ہو، اور بہت خوبصورت ہو۔ تمہیں دیکھ کر پتہ چلا کہ خوبصورتی صرف گورے رنگ میں نہیں ہوتی۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہی جو حقیقت ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ لیلیٰ کالی تھی مگر ایک چاہنے والے قیس کے لئے دنیا کی تمام عورتوں سے زیادہ حسین تھی تم بھی ویسی حسینہ ہو۔"

نوری کمرے سے بھاگ کر آگئی۔ یہ سن کر اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا کہ کالی ہونے کے باوجود حسین ہے۔ خوشی کے ایسے موقعہ پر صمد یاد آجاتا تھا۔ اگر وہ ابھی ہوتا تو نوری اسے میاں صاحب کی باتیں سناتی: "لو سنو، شہر والے کہتے ہیں کہ حسن کالے رنگ میں بھی ہوتا ہے۔ تم ایک گوری چھنال پر مر مٹے۔ یہ نہ سوچا کہ لیلیٰ کالی تھی اور بعد حسین سمجھی جاتی تھی۔ قیامت تک کوئی گوری عورت لیلیٰ کے حسن کی مثال پیش نہیں کرسکے گی۔"

اس نے باورچی خانہ میں آکر اس کی صفائی کی۔ دن بھر کے پڑے ہوئے جھوٹے برتن مانجھ کر چمکائے۔ چولہے پر گوشت کا سالن چڑھا ہوا تھا جب سالن تیار ہوا تو میاں صاحب تندور سے جاکر گرما گرم روٹیاں لے آئے۔ مالکن نے عشاء کی نماز پڑھنا شروع کر دی تھی۔ نوری رات کا کھانا لے کر میاں صاحب کے کمرے میں پہنچ گئی۔ میاں صاحب نے کہا: "میں اکیلے نہیں کھاتا۔ آؤ میرے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔"

وہ سامنے کھانا رکھتے ہوئے بولی: "میں ابھی نہیں کھاؤں گی آپ شروع کریں۔"

وہ جانے لگی میاں صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تعریف کرنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہاتھ پکڑ لیا جائے۔ وہ ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔ میاں صاحب نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ غصّہ سے بولی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ آپ کو شرم آنا چاہئے۔"

"شرم کیسی؟ یہاں رہو گی تو عیش کرو گی۔ اچھا کھانا کپڑا ملے گا میں تمہاری تنخواہ بڑھا دوں گا۔"

"میں کام کر کے ہی تنخواہ لوں گی، عزت بیچنے کی نہیں....."

میاں صاحب اسے آغوش میں بھرنا چاہتے تھے، وہ جھٹک کر کھڑی ہوگئی: "آپ کیسے شوہر ہیں۔ آپ کی بیوی صدمہ سے نماز میں روتی بلکتی رہتی ہے اور آپ کو عیاشی سوجھتی ہے۔ کیا آپ کو افسوس نہیں ہوتا کہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ضائع ہو جاتا ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولے: "تم چاہو تو اس بار تمہاری مالکن کا بچہ ضائع نہیں ہوگا۔"

"میں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ میں نے نماز پڑھنے کے

دوران ان کے آنسو دیکھے ہیں۔ خدا مجھے توفیق دے۔ میں ایسی نیک بخت کے لئے جان بھی دے سکتی ہوں۔"

میاں صاحب نے اس کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے کر کہا: "اگر اس نیک بخت کے آنسو پونچھنا چاہتی ہو تو نیک بخت کی جگہ میرا دل خوش کرتی رہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک بچہ پیدا نہیں ہو گا۔ میں تمہاری مالکن کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔"

نوری نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ مالکن ماں بننے سے پہلے ہی دوبار اولاد سے کیسے محروم ہو گئی۔ میاں صاحب بولے۔

"نہیں سمجھیں؟ میں سمجھاتا ہوں۔ میری دو کمزوریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میری آمدنی بہت ہی محدود ہے۔ میں ہیرا منڈی نہیں جا سکتا۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ میں شریف آدمی ہوں۔ کسی کی بہو بیٹی کو غلط نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہاری جیسی تنہا اور بھٹکی ہوئی عورت کی ہی خوشامد کر سکتا ہوں۔ یا پھر اپنی بیوی پر ظلم کر سکتا ہوں۔ مجھے باپ بننے کی آرزو نہیں ہے۔ مجھے کسی بچے کی نہیں عورت کی ضرورت ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ پھڑپھڑائی پھر چیخ پڑی۔ میاں صاحب اپنی شرافت سے ڈرتے تھے۔ اس کے چیخنے پر گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے کھلے دروازے سے ٹکرائی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بھاگی۔ کمرے سے نکل کر آنگن میں بھاگتے وقت وہ ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گر پڑی۔ اس نے جلدی سے سر اٹھایا تو اس کا سر جانماز کے ایک سرے پر تھا۔ مالکن اس پر دو زانو بیٹھی نماز ادا کر رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ آنسو خدا سے پوچھ رہے تھے کہ وہ تیسری بار اپنے بچے کو سلامت رکھ سکے گی یا نہیں؟

وہ آنسو نوری سے پوچھ رہے تھے۔ کیا وہ فاضل پرزے کی طرح کام آ سکے گی؟

ایک شریف عورت ظلم سہتے سہتے مر تو سکتی ہے، مر جاتی ہے۔ دوسری شریف عورت اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی، مالکن کے آنسوؤں سے منہ پھیر کر بھاگتی ہوئی، آنگن کا دروازہ کھولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

باہر آ کر وہ رک گئی۔ ابھی نو بجے تھے۔ محلے میں رونق تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بھاگنے پر لوگ کوئی شبہ کریں۔ اس لئے وہ دروازے کے پاس رک کر ہانپنے لگی۔

جب ذرا سانس درست ہوئی تو وہ چرچ کی طرف جانے کے لئے آگے بڑھی۔ لیکن ایک قدم بڑھاتے ہی رک گئی۔ آنگن سے مالکن کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ گڑگڑا رہی تھی: "خدا کے لئے میرے حال پر رحم کریں۔ ا۔۔ میں آپ کی بات نہیں مانوں گی۔"

میاں صاحب کی دھیمی گرج سنائی دی۔ "کیسے نہیں مانو گی، چلو ....."

تڑاخ کی آواز سنائی دی جیسے مالکن کے منہ پر طمانچہ پڑا ہو پھر ان کی سسکیاں اور التجائیں دور ہوتی گئیں جیسے مرغی کو گھسیٹ کر کانٹوں پر لے جایا جا رہا ہو۔ نوری نے اس گھر سے منہ پھیر لیا۔ تیز قدم بڑھاتی ہوئی اس محلے سے نکل گئی۔ چرچ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ ہانپتے کانپتے ملکی فوج کے کیمپ میں پہنچ گئی۔

وارڈن نے اسے اتنی رات کو کہیں سے آتے دیکھا تو اسے فادر اور مدر کے پاس پہنچا دیا۔ فادر نے کہا: "میرا دل کہتا ہے کہ تم بری نہیں ہو۔ اپنا ٹھکانہ بنانے کے لئے بھٹک رہی ہو۔ مگر اتنی رات کو آؤ گی تو یہاں کی راہبائیں بدنام ہو جائیں گی۔ لوگ کیچڑ اچھالیں گے کہ یہاں سے لڑکیاں راتوں کو باہر جاتی ہیں۔"

نوری نے سر جھکا کر کہا: "فادر! میں شرمندہ ہوں۔ پھر کبھی بات کو دیر سے نہیں آؤں گی۔"

مدر نے کہا: "شاباش! بہت اچھی ہے تم، تم کو یہاں رہنے کے واسطے ادھر کا طریقہ پر چلنا ہو گا۔ تمہارا لباس تمہارا طور طریقہ ہم لوگ سے الگ ہے۔ تم کو ادھر ہم لوگ کا ساتھ میں رہنا ہو گا۔"

فادر نے مدر سے کہا: "ٹھہرو، میں سمجھاتا ہوں۔" پھر اس نے نوری سے کہا: "بیٹی! ہم تمہیں یہاں سے جانے کے لئے نہیں کہیں گے مگر جب تک یہاں رہو راہباؤں کا لباس پہن کر رہو۔ یہ بھڑکیلے لباس نگاہوں کو بھڑکاتے اور بھٹکاتے ہیں۔"

"مگر میرے پاس تو ایسے ہی لباس ہیں۔"

"کوئی بات نہیں ہم تمہیں راہبہ کا لباس دیں گے۔ دیکھو کوئی کسی کو مسلمان یا عیسائی نہیں بنا سکتا۔ اپنے اپنے عقیدے کی بات ہوتی ہے جس کا دل جدھر جھک جائے ادھر ہی کعبہ ہے۔"

فادر بہت اچھی بہت پیاری باتیں کرتے تھے، نوری ان کی باتوں اور ان کی شخصیت سے متاثر ہو جاتی تھی۔ اس نے پوچھا: "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"بیٹی! یہ عیسائی مشنری ہے، یہاں راہبہ بن کر رہو۔ تمہارا دل چاہے تو عیسائیت قبول کر لو۔ ورنہ مسلمان ہی رہو۔ لیکن یہاں رہ کر یہاں کے طور طریقے سیکھو۔ یہاں تمہیں نرسنگ کی تربیت دی جائے گی۔ ایک نرس بننے کے بعد تم ہمارے ساتھ رہو یا نہ رہو۔ لیکن آئندہ اپنے بل پر زندگی گزارنے کے قابل ہو جاؤ گی۔"

نوری نے سوچا: "میں ان سے کتراتی ہوں اور یہ میرا ایک باعزت مستقبل بنانا چاہتے ہیں۔ اور کوئی جبر نہیں ہے کہ میں

عیسائی بن جاؤں۔ میں مسلمان ہوں، مسلمان ہی رہوں گا۔

دوسری صبح اسے غسل کرنے کے لیے کہا گیا جب وہ غسل سے فارغ ہو گیا تو، راہباؤں نے اسے لباس پہنایا وہ اسے دین ایمان کی باتیں سمجھاتی رہیں۔ پھر اس کے گلے میں ایک ننھا سا صلیب پہنا دیا۔ بعض اوقات آدمی ایسے موڑ پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے روٹی کے لیے اور عزت کے لیے دو کشتیوں پر پاؤں رکھنا پڑتا ہے۔ نوری اب مسلمان بھی تھی اور ایک عیسائی راہبہ بھی۔

○

صمدو پہلوان لاہور پہنچ کر جیسے پرستان میں پہنچ گیا تھا۔ شازیہ کا مکان بہت بڑا تھا۔ وہاں اس کی دو حسین اور نوجوان بہنیں تھیں۔ پھر محلے پڑوس سے بہت سی لڑکیاں آتی تھیں۔ ان کے لباس رنگ برنگے ہوتے تھے طرح طرح کی ادائیں ہوتی تھیں۔ صمدو حیران حیران سا اُن کی باتیں اور ان کے قہقہے سنتا رہتا۔

شازیہ اسے سمجھاتی تھی کہ ہر ایک سے بے تکلف باتیں کرنا چاہیے، خود کو اس ماحول میں رنگنا چاہیے۔ اس ماحول میں کچھ لڑکیاں سگریٹ پیتی تھیں۔ صمدو کو وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شازیہ بھی سگریٹ کی عادی ہے پہلے تو اسے بہت بُرا لگا۔ اگر نوری سگریٹ کا نام بھی لیتی تو وہ اس کی خوب پٹائی کرتا۔ شازیہ جیسی حسین عورت کو وہ اس کی مرضی کے بغیر چھو بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ نوری کو بڑی شدت سے یاد کرتا تھا۔ اُس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ وہ ہمیشہ اسے گھر میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ ہاتھوں میں کھجلی ہو اور شازیہ پر غصہ آئے تو وہ نوری پر غصہ اُتار سکے۔ افسوس، وہ چلی گئی تھی۔

شازیہ نے صمدو سے کہا۔ ”ہمارے ہاں مرد کے غصے کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی بات کو پہلوان بن کر نہ سوچو۔ کبھی شاعر بن کر دیکھو۔ کہ یہ سگریٹ میرے سرخ ہونٹوں کے درمیاں کیسا جچتا ہے دیکھنے والوں کی خواہش ہوتی ہے کاش سگریٹ کی جگہ وہ خوبصورت ہونٹوں کے بیچ سُلگتے رہتے۔“

صمدو نے کہا۔ ”ہاں یہ سچ ہے۔ ایسی خواہش میرے دل میں ہوتی ہے مگر تم کہتی ہو کہ چھ مہینے کی ٹریننگ کے بعد میری خواہش پوری ہونے دو گی۔“

”بے شک تمہاری تربیت لازمی ہے۔ ورنہ شادی کے بعد تم میری سوسائٹی میں گنواروں جیسی حرکتیں کرو گے تو میری بڑی بے عزتی ہو گی۔ جتنے سبق بھی میں تمہیں پڑھانا چاہتی ہوں ان میں سے پہلا سبق یہ سگریٹ ہے۔ لو ایک کش لگاؤ۔“

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”زور کرنے والے سگریٹ نہیں پیتے۔“

”جاؤ بھی۔ ہم عورتوں سے زیادہ زور کوئی نہیں لگاتا۔ یہ میری پُرزور خواہش ہے کہ اس کے کش لگاؤ۔ اچھا اسے ہاتھ میں پکڑ دیکھو۔“

صمدو نے سگریٹ کو انگلیوں میں پکڑ کر پوچھا۔ ”اس میں دیکھنے کی کیا چیز ہے۔“

”اس میں میرے ہونٹوں کی سرخی اُتر آئی ہے۔“

صمدو کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ گوری چمڑی والی اسے گاؤں سے للچاتی چلی آ رہی تھی۔ وہ چھ ماہ تک ہاتھ نہیں آ سکتی تھی۔ بس اس کے ہونٹوں کی سرخی تھی جو ابھی مل رہی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے شرماتے ہوئے اس سگریٹ کو اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ پھر ایک ہلکا سا کش لگایا۔ شازیہ نے بتایا کہ کش کیسے لگایا جاتا ہے۔ وہ کبھی اپنے ہونٹوں میں سگریٹ لیتی تھی۔ کبھی اس کے ہونٹوں میں دیتی تھی۔ ایسے خوبصورت انداز میں سبق پڑھایا جائے تو بھلا پڑھنے اور یاد رکھنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ پہلے ہی دن سے سگریٹ نوشی اس کے دل کو لگ گئی۔

انسان پر سب سے زیادہ اثر ماحول کا ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی آگ کے پاس ہو اور اسے آنچ نہ لگے۔ شازیہ کے حویلی نما مکان میں دوپہر سے شام تک حسین لڑکیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ وہ سب اُسی محلے میں رہتی تھیں۔ شازیہ ایسی پسندیدہ شخصیت تھی کہ سب اس کے پاس زیادہ وقت گزارتی تھیں۔ اب اس کے پاس آنے کا مطلب یہ ہوا کہ صمدو کے پاس آتی تھیں اور اُسے خوب چھیڑتی تھیں۔ وہ شازیہ سے ہونے والے رشتے کے مطابق سب کا دُولہا بھائی تھا اور سب اعزازی سالیاں تھیں۔ ایسی سالیاں جو کبھی کبھی چٹکی لیتی تھیں اور کبھی اس کے ہونٹوں سے سگریٹ جھپٹ کر اپنے ہونٹوں میں دبا لیتی تھیں اور کسی بات پر قہقہے لگاتے ہوئے بے اختیار اس سے لپٹ جاتی تھیں۔ پھر اُسے آنچ کیوں نہ لگے؟

وہ شازیہ کا عاشق تھا لیکن کبھی ریشماں بھی اچھی لگتی تھی۔ نورس کوئی بات کرتے وقت ایک خاص ادا سے اس کے جسم سے لگ جاتی تو پھر اسے نورس کے سوا کوئی نظر نہ آتا۔ ان میں سب سے حسین بینا تھی۔ وہ بینا کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ جب وہ کچھ بولتی تو جیسے منہ سے سحر پھونک دیتی تھی۔ اسی بینا نے اسے پہلی بار چرس کا سگریٹ پلایا تھا۔

اگر صمدو کی ماں یا اس کے پنڈ والا کوئی بندہ اسے دیکھ لیتا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ صمدو ایک ماہ میں اتنا بدل گیا ہے۔ پہلے وہ طوائفوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ لیکن شازیہ نے جب سے اپنی من گھڑت دکھ بھری داستان سُنائی تھی تب سے وہ قائل ہو گیا تھا کہ ہر طوائف قابلِ نفرت نہیں ہوتی۔ پھر ریشماں، نورس، بینا، ٹینا، مرناز اور شہناز وغیرہ نے اسے محبت کرنا سکھا دیا تھا۔ پہلے وہ سگریٹ نوشی سے پرہیز کرتا تھا، اب سگریٹ کا پیکٹ

اس کی جیب میں رہتا تھا۔ اور دن میں کوئی نہ کوئی اسے چرس بھرا سگریٹ پلا ہی دیا کرتا تھا۔

وہ دو ماہ بعد ماں سے ملنے گاؤں گیا تھا۔ مگر شام ہوتے ہی شازیہ اور دوسری حوریں ایسی یاد آئیں کہ رات گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ رات کا کھانا کھاتے ہی وہاں سے واپس آنے لگا۔ ماں نے روکا تو اس نے کہا۔ "صبح وہاں کے اکھاڑے میں پہنچنا ضروری ہے۔ شہر کے بڑے بڑے پہلوان زور کرتے ہیں۔ میں نئے نئے داؤ پیچ سیکھ رہا ہوں۔"

وہ باتیں بنا کر چلا آیا۔ مگر اپنا جھوٹ اپنے ہی دل پر پتھر کی طرح لگا۔ اسے خیال آیا کہ شیدا پہلوان سے دنگل لڑنے کے لیے صرف پانچ ماہ رہ گئے تھے۔ اگر اب بھی اس نے صبح و شام دوسرے پہلوانوں سے زور آزمائی نہ کی تو نورا کشتی لڑنے والے شیدا سے منہ کی کھائے گا۔ شہر میں کئی پہلوانوں سے اس کی دوستی تھی۔ اس نے دوسرے دن طوطا پہلوان سے یہ طے کیا کہ وہ صبح و شام اس کے اکھاڑے میں آکر زور کیا کرے گا۔ پھر اس نے شازیہ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ "یہ تم نے اچھا کیا۔ تمہیں ابھی سے دنگل کی تیاری کرنا چاہیے۔ جب تم شیدا پہلوان کو پچھاڑ کے پچاس ہزار روپیہ جیت کر آؤ گے تو میں شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو دعوت دوں گی۔ بہترین باورچی سے کھانا پکواؤں گی۔ کھانا کھلانے کے بعد بینا، مینا، ممتاز، شہناز ایسا مجرا پیش کریں گی کہ سارے شہر میں تمہارا چرچا ہوتا رہے گا۔ لو یہ سگریٹ پی لو...!"

ممدو نے چرس کا وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "کل سے اکھاڑے میں جاؤں گا تو سگریٹ پینا چھوڑ دوں گا۔"

یہ ایسی ہی بات تھی جیسے موت کہے کہ وہ زندگی کا پیچھا چھوڑ دے گی۔ اگرچہ مستقل مزاجی ہو تو سگریٹ چھوٹ جاتی ہے لیکن چرس کا نشہ موت کی طرح پیچھا کرتا ہے۔ نشہ دماغ کو کمزور کرتا ہے۔ دماغ کمزور ہو تو مستقل مزاجی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ممدو جس روز اکھاڑے میں اترا، اس روز اس نے سگریٹ کو منہ نہیں لگایا۔ مگر چرس کی طلب ہونے لگی۔ اس رات اس کا سر بھاری ہو گیا۔ بدن اینٹھنے لگا۔ آنگن میں چارپائی بچھا کر کھلی ہوا میں لیٹنے کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آدھی رات کو شازیہ نے کہا۔ "یوں جاگتے رہے تو صبح اکھاڑے میں نہیں جا سکو گے۔ اپنی ضد چھوڑ دو اور دو چار کش لگا لو۔"

وہ دس بجے سو جانے کا عادی تھا اور اب آدھی رات گزر چکی تھی۔ تمام رات جاگنے کے بعد وہ صبح اکھاڑے میں اونگھنا نہیں چاہتا تھا۔ شازیہ نے اسے سگریٹ سلگا کر دیا۔ اس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ دو چار کش سے زیادہ نہیں لگائے گا۔ احمقانہ عہد تھا۔ پہلا کش لگاتے ہی بچھڑے ہوئے نشے میں جیسے کھوئی ہوئی جنت مل گئی۔ شازیہ اپنی دو بہنوں کے مقابلے میں عمر رسیدہ لگتی تھی۔ چرس کی سگریٹ کے دو چار کش کے بعد وہ نوخیز دوشیزہ نظر آئی۔ سر کی گرانی اور ہاتھ پاؤں کی اینٹھن ختم ہو رہی تھی۔ بہ یک وقت کتنے فائدے پہنچ رہے تھے۔ وہ مست ہو کر پیتا رہا اور شازیہ کو چھیڑتا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر وہ مستی میں رہا۔ مگر جب وہ بستر پر گرا تو بے اختیار اس کی زبان پر نوری کا نام آ گیا۔

شازیہ بہلانے دینا خوب جانتی تھی۔ وہ اسے انگلی پکڑنے دیتی تھی۔ مگر پہنچے تک پہنچنے نہیں دیتی تھی۔ وہ تڑپتا تھا۔ نوری نے جو مسرتیں اسے دی تھیں۔ شازیہ ان مسرتوں سے..... محروم کر کے اسے جھوٹی تسلیاں دے کر چلی جاتی تھی۔ تب دل سے نوری کا نام ایک آہ بن کر نکلتا تھا۔ تب اسے احساس ہوتا تھا کہ وہ اندر سے خالی ہے یا نوری کے بغیر ادھورا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی عورت مکمل نہیں کر سکتی۔

وہ رات کو دیر سے سویا تھا۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ اکھاڑے میں نہ جا سکا۔ یہ ایک دن کی بات نہیں تھی۔ اکھاڑے سے اکثر وہ غیر حاضر رہنے لگا۔ وہ جوان تھا۔ پہاڑ جیسے جسم میں بلا کی طاقت تھی اس لیے ابتدا میں چرس کے زہریلے اثرات کو نہ سمجھ سکا۔ نشے کی دیمک اسے اندر سے چاٹ رہی تھی۔ پھر ایک ماہ بعد شازیہ اچانک ہی اس پر مہربان ہو گئی۔ اپنے آپ کو جسم و جان سے اس کے حوالے کر دیا۔ اسے پھر سے بھولی ہوئی مسرتوں کا چسکا لگا دیا۔

پہلے پہل شازیہ اسے اچھی لگی۔ پھر رفتہ رفتہ عقل آئی کہ اس کا حسن اور جوانی ایک فریب ہے۔ نوری کے مقابلے میں وہ بہت بدصورت ہے۔ وہ ایک خوبصورت سرورق والی کتاب تھی۔ اس کا سرورق الٹ کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک پرانی بوسیدہ سی کتاب ہے جسے ممدو جیسے احمق کے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ایک دن اس نے نشے کی حالت میں شازیہ سے کہہ دیا۔ "تم تو بہت عمر والی ہو۔ میں سمجھتا تھا تم میرے لیے جوان ہوئی ہو۔ مگر تمہاری تو جوانی گزر چکی ہے۔"

شازیہ نے پوچھا۔ "تمہیں مجھ سے محبت ہے یا میری عمر سے؟"

اگر وہ کہتا کہ عورت کی نو عمری سے محبت ہوتی ہے تو وہ بے لوث محبت کرنے والا نہ کہلاتا۔ اگر کہتا کہ تمہاری عمر سے نہیں تم سے محبت ہے تو پھر اس کی شکایت آپ ہی آپ ختم ہو جاتی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ تم اوپر سے اتنی جوان، اتنی کم عمر کیسے نظر آتی ہو؟"

وہ بولی "تم نے نقشے میں دیکھا ہے نا کہ دُنیا گول ہے؟ مگر گول نہیں ہے۔ ذرا چپٹی ہے۔ ساری کی ساری دنیا انڈے جیسی ہوئی ہے۔ تم جب تک کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے، اسے دُور سے دیکھتے رہو گے تو وہ بے حد خوبصورت نظر آتی رہے گی۔ اور جب اسے حاصل کر لو گے تو رفتہ رفتہ تمہیں اُس کے عیب نظر آنے لگیں گے۔"

صمد اس کی باتوں سے قائل نہ ہو سکا کیونکہ اسے نوری یاد آ رہی تھی جس میں کوئی عیب نہ تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک تھا صرف رنگ کالا تھا اور اب وہی کالا رنگ دل کو چھو رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس گوری چٹی کے سامنے وہی کلوٹی یاد آتی رہتی تھی۔

نوری بستر پر لیٹی ہوئی اندھیرے میں صمد کو دیکھ رہی تھی۔ یہ محبت بڑے کمال کی چیز ہے۔ بچھڑنے والا روشنی میں نظر نہیں آتا۔ محبت تاریکی میں اس کا جلوہ دکھاتی رہتی ہے۔ وہ صمد کا چہرہ صاف دیکھ رہی تھی۔ سرد آہیں بھر رہی تھی "آہ! کیا وہ مجھے کبھی یاد کرتا ہوگا؟ کبھی تو کوئی ایسی بات ہوتی ہوگی جس کے بہانے میری یاد آتی ہوگی۔"

کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ دوسری راہبہ جو اُس کے ساتھ اس کمرے میں رہتی تھی اس وقت تاریکی میں نظر نہیں آ رہی تھی لیکن کمرے میں اس کے وجود کا احساس ہوتا تھا۔ رات کے ایک بجے راہبہ نے ہولے سے آواز دی۔ "نوری! کیا تم سو رہی ہو۔۔۔ نوری؟"

راہبہ جب بھی سرگوشی میں رازدارانہ انداز میں اسے پکارتی تو وہ تاریکی میں خاموش پڑی رہتی۔ اُسے وہ راتیں یاد آجاتی تھیں، جب وہ اماں کے پاس سوتی تھی اور صمد کھڑکی کے باہر سے سرگوشیانہ صداؤں کا سحر پھونکتا تھا۔ یہ سوچ کر گدگدیاں آنے لگتی تھیں کہ اسے چاہنے والا اسے حاصل کرنے، اسے گود میں اٹھا کر لے جانے کے لیے کیسے جتن کر رہا ہے۔

وہ لیٹے ہی لیٹے ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لینا چاہتی تھی، مگر ہاتھ اٹھاتے ہی تھم گئی۔ پاس والے بستر سے سرسراہٹ سنائی دی۔ راہبہ وہاں سے اٹھ رہی تھی۔ گہری خاموشی میں اس کے لباس کی سرسراہٹ چغلی کھا رہی تھی۔ نوری تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی مگر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی بڑی آہستگی سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ باہر کاریڈور میں بھی گہری تاریکی تھی۔ وہ دروازہ پھر کب بند ہوا پتہ نہ چلا۔ وہ باہر چلی گئی تھی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر بھرپور انگڑائی لی۔ وہاں رہبانیت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جذبات کو مردہ رکھا جاتا تھا۔ ہوس کو کچل کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ دنیا میں یکے بعد دیگرے جتنے مذاہب آئے سب ہی میں کسی نہ کسی طور نفس کو خلافِ فطرت مار ڈالنے کا درس ملتا ہے۔ ہر مذہب میں راہب، راہبہ، داسی اور برہمچاری ملتے ہیں صرف اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے خلافِ فطرت کسی بھی جذبے کو کچلنے کی اجازت نہیں دی۔ جذبوں کی تسکین کے جائز اور مہذب راستے ہموار کیے۔ سیلاب کے آگے بند باندھا جائے تو وہ بند کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ توڑ نہ سکے تو وہ سیلاب راستہ بدل کر دوسرے راستے سے گزرتا ہے۔ راہبہ راستہ بدل کر گئی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے واپس آ گئی۔ اندھیری رات میں رہبانیت کا بھرم رہ گیا۔

خرگوش کی ایک عادت ہوتی ہے۔ جب وہ کسی سے ڈر کر بھاگتا ہے تو کسی جھاڑی یا شگاف میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ شکاری سے اور ساری دُنیا کی نظروں سے چھپ گیا ہے۔ انسان بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ جب تک گناہ اور جرائم اس کی نگاہوں سے چھپے رہتے ہیں اس وقت تک وہ خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس نے اپنے معاشرے یا اپنے ماحول سے بُرائی کو ختم کر دیا ہے۔ کسی بھی ناصح اور مصلح کے پاس تاریک رات کے تاریک لمحات کا حساب نہیں رہتا۔

بہرحال کوئی سی جگہ ہو، وہ تھوڑی اچھی ہوتی ہے، تھوڑی خراب ہوتی ہے۔ نوری جہاں تھی، وہ ماحول نسبتاً بہتر تھا۔ وہاں اسے ہر طرح کا تحفظ حاصل تھا۔ وہاں اس نے ابتدائی طبی امداد پہنچانا سیکھ لیا تھا۔ اور اب نرسنگ کا کورس مکمل کر رہی تھی۔ اس کے لیے وہ دوسری راہباؤں کے ساتھ ہسپتال جاتی تھی۔ پریکٹیکل کے دوران مریضوں کی خدمت کرتی تھی۔ اس کے دن اچھے گزر رہے تھے۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ گوری اور خوبصورت راہبائیں مریضوں کا ٹمپریچر دیکھتی تھیں انہیں دوائیں پلاتی تھیں اور انجکشن لگاتی تھیں، لیکن جب کوئی مریض قے کرتا یا اس کے زخموں سے خون اور پیپ کو صاف کرنا ہوتا تو وہ نفاست پسند حسینائیں پیچھے ہٹ جاتیں اور نوری کو اس کام کے لیے آگے بڑھا دیتی تھیں۔ زچگی کے بعد جو بچہ غلاظت میں لتھڑا ہوتا تھا اس کی صفائی کے لیے اسے نوری کے حوالے کیا جاتا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ مشتعل ہوتی گئی۔ "کیا میں کالی ہوں اس لیے مجھے بھینسوں کے باڑے سے لے کر انسانوں کے باڑے تک صرف غلاظت اٹھانے کے قابل سمجھا گیا ہے کیا میں نفاست پسند نہیں ہوں؟"

ایک بار وہ مشتعل ہو کر فادر کے پاس پہنچ گئی۔ فادر نے اس کی شکایت سن کر کہا "بیٹی! ہمارا کام انسانوں کے درمیان سے غلاظتیں دُور کرنا ہے۔ جو راہبہ ایسے فرائض سے کترا کر نکل جاتی ہے اس کا محاسبہ ہونا چاہیے۔ تم راہب بنجامن کے پاس جا کر ایسی

راہباؤں کے نام پیش کرو۔ ہم ان سے ایکسپلینیشن کال کریں گے۔"

رات کے کھانے کے بعد وہ راہب بنجامن کے پاس گئی۔ وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا، موٹی سی عینک لگائے طب کی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ کسی فریادی جیسا تھا جیسے وہ اندر سے اپنے آپ کو مار رہا ہو اور اوپر سے خود کردہ ظلم کے خلاف فریاد کر رہا ہو۔ وہ نوری کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آؤ نوری آؤ۔۔۔"

وہاں کسی کے بھی نام کے ساتھ سسٹر اور برادر کا رشتہ لگایا جاتا تھا۔ اسے سسٹر نوری کہنا چاہیے تھا لیکن وہ صرف نام لے رہا تھا، بہن نہیں کہہ رہا تھا۔ نوری نے اپنی شکایت پیش کی۔ اس نے سنا مگر سننے کے دوران اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا۔ پھر وہ موٹی سی کتاب کو چھوٹی سی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے ساتھ جانے والی راہباؤں کو کال کروں گا۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے نوری کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ اب وہ بولتے وقت کانپ رہا تھا۔ "تم اس سفید لباس میں بہت خوبصورت لگتی ہو۔ تم۔ تم برا تو نہیں مان رہی ہو؟ وہ۔ وہ بات یہ ہے کہ۔ کہ خوبصورت لگ رہی ہو۔ اس لیے خوبصورت کہہ رہا ہوں۔"

نوری اس کا منہ تکنے لگی۔ ممدو سے بچھڑنے کے بعد وہ تعریف کے دو بول سننے کے لیے ترس گئی تھی۔ راہب بنجامن گورا اور سرخی مائل تھا۔ صورت بھی اچھی تھی۔ نوری نے پوچھا۔ "مجھ میں ایسی خوبصورتی کیا ہے؟ میں تو کالی ہوں۔"

"حسن کو رنگ سے نہیں پرکھا جاتا۔ تمہارا ناک نقشہ تو اچھا ہے۔ تمہارا جسم اتنا متناسب اور بھرپور ہے کہ۔ کہ میں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں دیکھ کر کیا ہونے لگتا ہے۔ تم۔ تم برا تو نہیں مان رہی ہو؟ کسی سے بولو گی تو نہیں؟"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کسی سے نہیں بولوں گی۔ مگر میرا ایک کام کرو گے؟"

"ایک نہیں ہزار کام کروں گا۔ بلکہ میں نے سوچا ہے کہ جب تم عیسائی نہیں ہو، راہبہ نہیں ہو تو تمہیں نرسنگ کورس کے دوسرے سینٹر میں جانا چاہیے۔ وہاں بورڈنگ میں تمہاری رہائش کا انتظام ہو جائے گا۔ میں سفارش کروں تو تمہیں وہاں داخلہ مل جائے گا۔"

نوری نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تم کتنے اچھے ہو۔ کتنے مہربان ہو مگر میرا ایک کام کرو گے؟"

وہ نوری کا لمس پا کر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بولا۔ "بتاؤ کیا کروں؟"

"میرے ساتھ ایک بار میرے پنڈ چلو۔ ممدو کے سامنے ایک بار بول دو کہ میں خوبصورت ہوں۔ میرے جیسی اسے کوئی نہیں ملے گی۔"

"یہ ممدو کون ہے؟"

"پہلوان ہے۔ میری اس سے شادی ہونے والی ہے۔"

راہب نے تھوک نگل کر کہا۔ "پہلوان ہے۔ ہم میڈیکل میں یہ جگہ چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ ہم اپنے ٹائم ٹیبل کے پابند ہوتے ہیں۔ ممدو کو یہاں بلاؤ۔ میں اس کے سامنے تمہاری خوب تعریفیں کروں گا۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "وہ نہیں آئیگا۔ ایک خوبصورت بلا اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

"تو پھر اس ہرجائی کو بھول جاؤ۔ میں۔ میں تمہارا ہوں۔ جب تم ہوسٹل میں چلی جاؤ گی تو میں تم سے آ کر ملتا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اچانک ہی لپٹ گیا۔ نوری ایک جھٹکے سے الگ ہو کر بولی۔ "برادر! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"تم۔ تم برا تو نہیں مان رہی ہو؟ میں تمہارے لیے۔۔۔"

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "ہاں، اب برا مان رہی ہوں۔ کیا تم نے یہی میری خوبصورتی سمجھی ہے؟ نہیں تم نہیں سمجھے۔ میں سمجھاتی ہوں سنو! میرا حسن یہ ہے کہ میں صرف اپنے مرد کی دیوانی ہوں۔ میری خوبصورتی کا راز یہ ہے کہ میں دوسروں کے لیے لاحاصل ہوں۔ آئندہ مجھے کبھی ہاتھ بھی نہ لگانا۔ میں بہت مہنگی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ برادر بنجامن نے کہا۔ "ٹھہرو۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ یہاں سے نکل کر دوسرے سینٹر میں جاؤ اور اپنا بہتر مستقبل بناؤ؟"

وہ پلٹ کر بولی۔ "میں زندگی میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ حالات نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ اس دنیا میں سب غرض کے بندے ہوتے ہیں۔ کچھ لیے بغیر کچھ دیتے نہیں۔ تم بھی دے رہے ہو۔"

"تم سمجھدار ہو۔"

"تمہاری توقع سے زیادہ سمجھدار ہوں۔ تم سے اپنا کام نکالنا جانتی ہوں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے دوسرے سینٹر میں بھیج دو۔ یہاں رہوں گی تو سسٹر روزی کو کبھی تمہارے پاس نہیں آنے دوں گی۔"

وہ ایک دم سے گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔ نوری نے کہا۔ "سسٹر روزی سمجھتی ہے کہ میں گہری نیند سوتی ہوں، کچھ نہیں جانتی ہوں لیکن میں ایک بار یہاں تک اس کا پیچھا کر چکی ہوں۔"

اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم۔ تم جانتی ہو؟"

"ہاں۔ میں تم لوگوں کی مجبوریاں سمجھتی ہوں اس لیے ہمدردی سے

چپ رہی۔ تم چاہو گے تو آئندہ بھی چپ رہوں گی۔ کیا میری شرافت کی قدر کرو گے؟"

وہ شکست خوردہ انداز میں اوپر سے نیچے سر ہلانے لگا۔

ایک ہفتے کے اندر ہی وہ دوسرے سینٹر میں بھیج دی گئی۔ وہاں کے ہوسٹل میں اس کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام تھا۔ ٹریننگ کے دوران اسے سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ اس نے برقعہ کا لباس اتار دیا تھا۔ پھر وہی شلوار کرتا پہننے لگی تھی۔ وہ بہت خوش تھی، بہت مطمئن تھی۔ اپنے پاؤں سے کسی اونچے مقام تک پہنچ کر ایک بار صمدو کے سامنے جانا چاہتی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب بھی اسے اس کے اندر کوئی خوبصورتی نظر آتی ہے یا نہیں؟

اپنی جد و جہد کے دوران ایک صبح اس نے اخبار میں پڑھا۔ درمیانی صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی کہ شیدا پہلوان نے ایک منٹ کے اندر صمدو پہلوان جیسے شہ زور کو پچھاڑ دیا۔

❁

صمدو جیسے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ ایسی شرمناک شکست کھانے کے بعد کسی کو منہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں چھپ کر شازیہ کے دروازے پر آیا تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ پڑوسیوں سے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ کسی رشتے دار کے ہاں گئی ہے۔ صبح آئے گی۔

صمدو کو اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہوا۔ کہاں تو وہ بڑے بڑے لوگوں کی دعوت کرنے والی تھی۔ کہاں یہ کہ دروازے پر تالا ڈال کر اسے بے گھر کر کے چلی گئی تھی۔ پہلی بار رنڈی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

وہ غصے سے تلملاتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ پہلے ارادہ کیا کہ پنڈ واپس جائے گا اور کبھی شازیہ پر تھوکنے نہیں آئے گا۔ پھر خیال آیا کہ اس کا تھوڑا بہت سامان شازیہ کے گھر میں پڑا ہے۔ وہ سامان وہاں سے لانا ہی ہوگا۔ وہ مجبور ہو کر رات گزارنے کے لیے طوطا پہلوان کے پاس آ گیا۔ طوطا پہلوان... نے اس کے غصے اور پریشانیوں کی وجوہات معلوم کرنے کے بعد کہا۔ "پہلوان! عورت اور نشہ یہ دو چیزیں تو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتیں پھر پہلوان کہاں رہنے دیں گی؟ شیدا ایسا شہ زور نہیں ہے۔ تمھاری بری عادتوں نے تمہیں کمزور بنا لیا ہے۔"

اس رات طوطا پہلوان کے اصرار کے باوجود اس نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ بھوک مر گئی تھی۔ نیند اڑ گئی تھی۔ بس ایک غصہ تھا شکست کھانے کا۔ اور غصہ تھا عورت کی بے وفائی کا اور غصہ تھا گھر سے بے گھر ہونے کا۔ اور سب سے زیادہ غصہ تھا کہ نوری چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔ وہ رہتی تو کم از کم اس کی پٹائی کر کے کچھ قرار آ جاتا۔

وہ چارپائی پر پڑا چاروں شانے چت لیٹا ہوا صبح تک آسمان کو تکتا رہا اور ذہن سے نوری کو جھٹکنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ غصے اور دکھ کے وقت وہ کلموہی کیوں یاد آنے لگتی ہے؟ جب کوئی اپنا نہیں ہوتا تھا تو وہ بڑی اپنی لگتی تھی۔ ایسا پیار کون دے گی کہ مار بھی کھائے گی اور آغوش میں گھستی بھی چلی آئے گی۔ صمدو کے سینے سے ایک آہ نکلی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ نوری کی پٹائی کرنے کے لیے نہیں، اس کے سینے سے لگنے کے لیے اسے یاد کر رہا تھا۔

دوسرے دن دس بجے وہ شازیہ کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں شیدا پہلوان اپنے چمچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ صمدو کو دیکھتے ہی بولا۔ "آؤ پہلوان! رات بھر کہاں رہے؟ میں نے جیت کی خوشی میں شازیہ اور اس کی بہنوں کو مجرے کے لیے بلا لیا تھا۔ تمہیں تو بڑی پریشانی ہوئی ہوگی؟"

صمدو ہونٹوں کو بھینچ کر اندر ہی اندر دانت پیسنے لگا۔ پھر اس نے شازیہ سے پوچھا۔ "شیدے سے تمھاری پہلے کی یاری ہے؟"

شازیہ نے "اونہہ" کر کے منہ پھیر لیا۔ شیدا نے کہا۔ "ہاں، بہت پہلے سے یاری ہے۔ مگر مجھ سے نہیں۔ میرے ان یاروں سے ہے۔ میں عورت اور نشہ کو منہ نہیں لگاتا۔ اگر تم لوا کشتی کے لیے راضی ہو جاتے تو میں تمہیں بھی ان حرام چیزوں کو منہ لگانے نہ دیتا۔ آخر ہم پہلوان برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو حرام کاریوں سے بچانا ہمارا فرض ہے۔"

اس نے شازیہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "اچھا۔ تو میرے ساتھ سازش ہوئی ہے؟"

شیدا نے جواب دیا۔ "اس عورت سے کچھ نہ پوچھو۔ اسے میں نے تین ہزار روپے میں تمھارے لیے خریدا تھا۔ آٹھ ماہ کے دوران یہاں تمھارے کھانے پینے میں بارہ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں۔ یعنی میں نے صرف پندرہ ہزار میں پچاس ہزار روپے کی کشتی جیت لی۔ اپنا ٹائٹل بھی برقرار رکھا۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ اپنی شہرت برقرار رکھنے کے لیے کنجریوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔"

اس دوران شازیہ نے اس کا ایک سوٹ کیس لا کر اس کے پاس پٹخ دیا تھا۔ صمدو کے بس میں ہوتا تو وہ شیدے اور شازیہ کی خوب پٹائی کرتا مگر وہاں غنڈوں کی فوج بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "شیدے! ہم پہلوان نہیں ہیں۔ پہلوانوں کے نام پر دھبہ ہیں۔ جو مرد ہوتے ہیں، شہ زور ہوتے ہیں وہ کنجری کا سہارا نہیں لیتے ہیں اور نہ ہی کنجری کے جال میں پھنستے ہیں۔ ہم تو شاید مرد بھی نہیں ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب پہلوانی نہیں کرے گا۔ اور آئندہ کبھی شہر کا رخ نہیں کرے گا۔ اپنا پنڈ اپنی جنت ہے۔ وہاں جھوٹی شان اور شہرت کے لیے کوئی کسی کو فریب نہیں دیتا۔ وہاں کوئی کنجری نہیں رہتی اور معصوم پنڈ والوں تک ابھی چرس کا نشہ نہیں پہنچا ہے۔

جب وہ ماں کے قدموں میں واپس آیا تو اس کے پاس ایک ہفتے کے لیے چرس کا اسٹاک تھا۔ شازیہ چھوٹ گئی تھی۔ کسی دن کھانا بھی چھوٹ سکتا تھا۔ اس نشہ کے بغیر یہ دنیا پھیکی پھیکی سی اجاڑی اجڑی سی لگتی تھی۔ جسم دکھتے دکھتے انداز سے جیسے پھٹنے لگتا تھا۔ اور جب وہ چرس کی سگریٹ کے کش لگانے شروع کرتا تو دنیا بدل جاتی تھی۔ ہر چیز حسین نظر آتی تھی۔ مگر اب نشہ کی مستی میں نوری شدت سے یاد آتی تھی۔

ایک ہفتہ بعد چرس کی طلب ہوئی۔ یہ لعنت شہر ہی میں مل سکتی تھی اور وہ شہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک دن اپنے آپ پر جبر کیا۔ نشہ کے بغیر چوبیس گھنٹے گزار دیے۔ لیکن وہ بستر پر سنگ گیلا وہاں سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بھوک لگتی تھی مگر کھانا بے مزہ لگتا تھا۔ پنڈ کے ڈاکٹر کو اس کی بیماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے شہر جا کر علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ صمدو نے سوچا۔ "میں شہر جاؤں گا مگر کسی عورت کے فریب میں نہیں آؤں گا۔ وہاں نوری کو تلاش کروں گا اور چرس چھوڑنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

وہ بہت کچھ سوچتا مگر کرتا کچھ نہیں تھا۔ شہر میں ایک طوطا پہلوان کے ہاں اس کا ٹھکانہ تھا۔ طوطا پہلوان نے مشورہ دیا۔ "شادی کر لو۔ بہت سی بری عادتیں چھوٹ جائیں گی۔"

"شادی کیسے کروں؟ میرا ڈیل ڈول اور صورت دیکھ کر کون مجھے پسند کرے گا۔ پنڈ کے سارے گھروں میں رشتہ مانگ کے دیکھ لیا۔ کسی نے لڑکی نہیں دی۔"

"پنڈ ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ چند گھروں میں رشتہ مانگ کر تم مایوس ہو گئے۔ ارے یہاں شہر میں تمہیں ایک سے ایک شریف گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مل جائے گا مگر پہلے تم آدمی تو بنو۔"

"آدمی کیسے بنتے ہیں؟ تم مجھے بنا دو۔ میں اچھی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے کے لیے تمہاری ہر بات مان لوں گا۔"

"پہلی بات تو یہ کہ چرس چھوڑو۔ ایک بار نہیں چھوڑ سکتے تو آہستہ آہستہ کم کرو۔"

اس نے ادھے سگریٹ کو زمین پر ڈال کر پاؤں سے مسلتے ہوئے کہا۔ "لو سمجھو کہ چھوڑ دیا۔ لڑکی کیسی ہے؟"

"میری ایک دور کی رشتے دار ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔

گورا رنگ، اونچی ناک، بڑی بڑی کالی آنکھیں، اونچا قد، لانبے بال، تم اسے دیکھتے ہی حیرت زدہ ہو جاؤ گے۔"

اس نے گہری گہری سانس لے کر پوچھا۔ "اتنی حسین لڑکی مجھ سے شادی کرے گی؟ آخر مجھ میں کیا ہے؟"

"تمہارے پاس مکان ہے، زمینیں ہیں، سو بھینسیں ہیں، مگر یہ سب شہر میں ہونا چاہیے۔ وہاں کی زمینیں بیچو اور یہاں کوٹھی خریدو۔ زیادہ سے زیادہ بھینسیں پالو۔ میں بڑے بڑے ہوٹلوں میں دودھ سپلائی کراؤں گا۔"

"مگر بیوی کا بھینسیں پالنے سے کیا تعلق ہے؟"

"میں تمہیں کاروبار سکھا رہا ہوں۔ لڑکیاں مرد کی خوبصورتی اور بدصورتی نہیں دیکھتیں۔ کاروبار دیکھتی ہیں۔ دولت اور جائیداد کا حساب کرتی ہیں۔ مرد جتنا زیادہ کماتا ہے گا، اتنا ہی خوبصورت نظر آئے گا۔"

"مجھے اس لڑکی کی ایک جھلک دکھا دو۔"

"دکھاؤں گا۔ بلکہ جب تک تم اپنی جائیداد شہر منتقل نہیں کرو گے اس وقت تک لڑکی والوں کے ہاں تمہاری رہائش کا بندوبست کرا دوں گا۔ جانتے ہو کیوں؟"

"کیوں؟ جلدی بتاؤ۔"

"اس لیے کہ وہاں رہ کر تم چرس استعمال نہیں کر سکو گے۔ کرو گے تو وہاں سے نکال دیے جاؤ گے۔ یہ نشہ چھڑانے کا بھی ایک طریقہ ہے۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "جیسا کہ تم نے بتایا ہے، اگر لڑکی ویسی ہی حسین ہے تو تمہارا طریقہ بہت ہی اچھا ہے۔ مجھے کسی کی محبت مل

جائے۔ میں زہر پینا چھوڑ دوں گا۔"

ملوطا پہلوان کی بیوی نے اسی دن سے رشتے کی بات شروع کر دی۔ ایک ہفتہ بعد لڑکی کے باپ اور بھائی اسے دیکھنے آئے، اسے پسند کر لیا۔ اور باتوں باتوں میں اسے سمجھا دیا کہ اسے شہر میں رہنا اور کاروبار کرنا چاہیے۔ لڑکیاں دیہاتوں سے شہروں میں آتی ہیں۔ شہروں سے دیہاتوں میں جانا پسند نہیں کرتیں۔ پھر انھوں نے رخصت ہوتے وقت اسے دوسرے دن شام کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔

صمدو کے لیے دوسرا دن جیسے عید کا دن تھا۔ بڑی مشکلوں سے آج کا دن گزرا اور کروٹ کروٹ رات بیتی۔ دوسرے دن شام تک وہ بڑا مضطرب رہا۔ ملوطا پہلوان کی بیوی اسے سمجھاتی رہی کہ کس طرح سسرال میں سر جھکا کر رہنا چاہیے۔ کم بولنا اور کم کھانا چاہیے، لیکن اپنی زمین جائداد کا ذکر بڑھ چڑھ کر کرنا چاہیے۔

ملوطا پہلوان کی بیوی اسے نصیحتیں کرتے ہوئے اسے اس کے سسرال لے گئی۔ اسے اندر سے بڑی بے چینی سی لگ رہی تھی۔ کچھ تو اس لیے کہ اس نے پچھلے دن سے چرس کو منہ نہیں لگایا تھا اور کچھ اس لیے کہ ایک ایسی حسین لڑکی کا دیدار ہونے والا تھا، جو اس کی بیوی بننے والی تھی۔

اس کا سسرالی مکان کچھ پرانا سا تھا۔ دیواروں کے پلاسٹر اُدھڑے ہوئے تھے، اسے ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ وہاں کا فرنیچر بہت پرانا تھا لیکن صمدو ایسے دیہاتی کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس گھر کے مکین اجڑے ہوئے اور اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں۔ شریف لوگ ہیں۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے معمولی مزدوروں کی طرح اینٹ پتھر نہیں اٹھا سکتے۔ کہیں چوری نہیں کر سکتے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر مانگ نہیں سکتے۔ وہ بے غیرت بھی نہیں تھے۔ بے حیائی کی روٹی نہیں کھا سکتے تھے۔ پھر اتنے بڑے سسرالی کنبے میں ان کا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟ کیونکہ جوان بچے پڑھتے تھے، باپ بوڑھا تھا۔ کوئی کماتا نہیں تھا۔ ہمارے ہاں بڑھتی ہوئی بے روزگاری، مہنگائی، غربت اور محتاجی نے بڑے بڑے خاندانوں کو زندہ رہنے کے عجیب و غریب ہتھکنڈے سکھا دیے ہیں۔ وہ بیچارے سسرال والے کیا تھے۔ یہ حقیقت صمدو کو آگے چل کر معلوم ہونے والی تھی۔

وہ پندرہ منٹ تک اس کمرے میں تنہا بیٹھا رہا اور محسوس کرتا رہا کہ دروازے اور کھڑکیوں سے گھر کی عورتیں اسے جھانک کر دیکھ رہی ہیں۔ پھر ساری کھڑکیاں بند ہو گئیں۔ صرف ایک دروازہ کھلا صمدو نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ کھانے کی ٹرے لے کر آ رہی تھی۔ ملوطا پہلوان نے اس کے حسن کی جو تعریف کی تھی وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ پہلوان تو کیا، کوئی شاعر بھی اس کے حسن و شباب کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کھانے کی ٹرے کو سینٹر ٹیبل پر رکھ کر کہا: "آداب۔"

"جی۔ جی ہاں جی۔۔۔" صمدو کو یاد نہیں آیا کہ آداب کے جواب میں کیا کہنا چاہیے۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا: "میں جی پڑھا لکھا بندہ نہیں ہوں۔ بھول چوک ہو جائے تو معاف کر دینا۔"

وہ زیرِ لب مسکراتی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ "کھانا شروع کریں۔ ہم لوگ ذرا آزاد خیال ہیں مگر ایسے بھی آزاد خیال نہیں ہیں کہ دوسروں کے سامنے بے پردہ چلے آئیں۔ چونکہ آپ کے ساتھ ساری زندگی کے معاملات طے کرنے ہیں اس لیے آپ کے سامنے آ گئی ہوں۔"

وہ آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے اس حسینہ کو دیکھے جا رہا تھا۔

وہ بولی: "میرا نام سائرہ ہے۔ میں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی ہوں۔ میری بڑی بہن طاہرہ سیکنڈ ایئر میں ہے۔ ایک ہمارے چچازاد ہیں۔ اُن کا نام شہزاد ہے۔ وہ ایک برس سے ملازمت تلاش کر رہے ہیں۔ اگر آپ یہاں زیادہ سے زیادہ بھینسیں پالیں گے تو شہزاد اُن کا دودھ ضرورت مندوں تک پہنچائیں گے۔ آپ کو یوں بھی اس کاروبار کے لیے دودھ سپلائر کی ضرورت ہو گی۔ شہزاد گھر کے آدمی ہیں۔ کوئی دوسرا ان سے زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ سائرہ نے کہا: "کاروبار میں آمد و خرچ کے لیے ایک منشی کی ضرورت ہو گی۔ میرے ابا یہ کام کریں گے اگر آپ کو منظور ہو۔"

وہ جلدی سے سر ہلا کر بولا: "منظور ہے۔ میرا کاروبار آپ کا کاروبار ہو گا۔ آپ کو منظور ہے تو مجھ کو بھی منظور ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی: "آپ بہت اچھے ہیں۔"

صمدو نے شرما کر سر جھکا لیا۔ پھر جھجکتے ہوئے پوچھا: "شادی کب تک ہو گی؟"

"ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔ تین سال کے بعد تاریخ مقرر کر لیں گے۔"

"تین سال کے بعد؟" اس نے پریشان ہو کر سائرہ کو دیکھا۔ ایسا تو بہ شکن حسن سامنے ہو اور تین برس انتظار کیا جائے؟ یہ تو قیدِ بامشقت سے بھی زیادہ بامشقت انتظار ہو گا۔

وہ بولی: "تین برس بہت لگتے ہیں مگر ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔ میں کوئی جاہل گونگی لڑکی تو نہیں ہوں کہ ماں باپ نے جس کے ہاتھ میں رسی پکڑا دی اس کے پیچھے چل دی۔"

"پھر بھی تین برس بہت ہوتے ہیں۔ آپ کچھ کم کریں۔"

"اس سے پہلے میری پڑھائی ختم نہیں ہو گی۔ پھر ابھی تو آپ کے یہاں کوئی زمین اور کوٹھی نہیں خریدی ہے۔ بھینسوں کی بھی زیادہ تعداد ہونی چاہیے۔ ہم روزانہ کم از کم چالیس من دودھ سپلائی کریں گے۔ اتنے

گاہک پیدا کرنے کے لیے سال دو سال لگ جائیں گے۔ دیکھیے مجھے جلدی پسند نہیں ہے۔ آپ صبر کر نا سیکھیں۔"

"بات یہ ہے کہ میں آپ کو دیکھ لینے کے بعد آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔"

"میں بھی آپ سے دور نہیں رہوں گی۔ آپ ہمارے گھر میں ادھر سامنے والے کمرے میں رہیں گے۔ اس کمرے میں طاہرہ باجی کے ہونے والے شوہر یعنی میرے دولھا بھائی رہتے ہیں آپ اُن کے ساتھ رہیں گے تو میں کبھی کبھی آپ کے سامنے آجایا کروں گی ورنہ گھر کے بزرگ آج کے بعد مجھے شادی سے پہلے آپ کے سامنے آنے نہیں دیں گے۔"

"میں آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے یہاں رہوں گا۔"

وہ بولی۔ "لیکن ایک قباحت ہے۔ میں بہت خود دار ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے گھر والے بعد میں یہ طعنے دیں کہ آپ شادی سے پہلے اپنی سسرال میں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ آپ کی عزت میری عزت ہے آپ یہاں رہنے اور کھانے کے سلسلے میں ماہانہ ایک ہزار روپے دیا کریں گے۔"

مسعود کا خون خشک ہو گیا ایک ہزار بڑی رقم ہوتی ہے مگر سائرہ کے حسن میں ایسی برائی تھی کہ وہ اس کے سامنے خود کو کنجوس ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا "ٹھیک ہے کاروبار تو شروع کرنا ہی ہے کافی آمدنی ہو گی۔ میں ایک ہزار دے دیا کروں گا۔"

"آپ نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا سالن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

وہ کھانے لگا اور بار بار دیکھنے لگا۔ اسے اپنی تقدیر پر شبہ تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنی حسین دوشیزہ اس کی بیوی بننے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ جتنی صاف گوئی سے معاملات طے ہوئے تھے، اس کے پیشِ نظر یہ امید بندھ گئی تھی کہ تین سال کے بعد وہ قیامت خیز مجسمہ اس کی آغوش میں ہو گا۔ پھر اس کی خواہش کے مطابق گورے گورے خوبصورت بچے پیدا ہوں گے۔ ماں کہتی تھی بس ایک ایسی خوبصورت بہو ہو جو خوبصورت بچے پیدا کرے۔ اس کے بعد اس خاندان کی آئندہ نسلیں خوبصورت ہوتی رہیں گی۔

سائرہ کو دیکھتے دیکھتے مسعود کو ایک بات کا احساس ہوا کہ اس حسینہ کے حصول کی خواہش اتنی شدید تھی کہ جہیز کی طلب نہیں ہو رہی تھی۔ اور وہ چڑیل نوری بھی یاد نہیں آرہی تھی۔

وہ نوجوان مریض بہت بولتا تھا۔ نوری نے اس کے منہ میں تھرمامیٹر رکھ کر کہا۔ "یہ غلط ہے کہ صرف عورتیں بہت بولتی ہیں۔ اب تم ذرا دیر چپ رہو گے۔"

وہ چپ چاپ مسکرانے لگا۔ اس کا نام وسیم احمد تھا پچھلے تین دنوں سے وہ ہسپتال کے بستر پر پڑا تھا۔ بیماری کے باوجود ہنستا بولتا رہتا تھا۔ نوری اپنی ڈیوٹی کے وقت پہلے اس سے کتراتی تھی کیونکہ وہ بڑی بے باکی سے اسے چھیڑتا تھا۔ پہلے ہی دن اس نے پوچھا تھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

نوری نے جواب دیا تھا "نرس کا ایک ہی نام ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔ سسٹر۔"

"سسٹر بہن کو کہتے ہیں۔ میں تمہیں سسٹر نہیں کہوں گا تم اتنی سویٹ ہو کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی تمہیں بھگا کر لے جاؤں گا۔"

وہ ایک دم سے پلٹ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ مسعود بھی ایک دن اُٹھا کر اسے اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وسیم ڈیل ڈول میں دیسا ہی تھا چہرے پر بڑی مردانگی تھی۔ پہلی ہی بار نوری کے دل نے کہا تھا کہ وہ اٹھا کر لے جا سکتا ہے اور کوئی بھی اس کے ساتھ بھاگ سکتی ہے۔

دوسری بار وہ اُسے دوا پلانے گئی تو اس نے پینے سے انکار کر دیا۔ نوری نے پوچھا "کیا تم صحت یاب نہیں ہونا چاہتے؟" "دوا پی لوں گا۔ پہلے مسکراؤ۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔"

"اگر میری خواہش فضول ہے تو یہاں کا بڑا ڈاکٹر بھی دوا نہیں پلا سکے گا۔"

"بڑے ضدی ہو۔ یہ لو۔"

وہ جبراً مسکرانے لگی۔ اس نے کہا "نہیں! یہ تو بہلانے والی مسکراہٹ ہے۔"

"مجھے ہنسی کہہ رہے ہو۔ ہوش میں تو ہو؟"

"تم سر سے لے کر پاؤں تک شہد ہی شہد ہو اور شہد کو ہنی کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی تک کسی نے تمہاری قدر نہیں کی۔ اسی لیے تم میرے جیسے قدردان کی قدر نہیں کر رہی ہو۔ کیا تمہیں نہیں

معلوم کہ قدردانی کے لیے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجتی ہیں۔ جان! تم بہت اچھی ہو۔"

وہ سرہانے کی میز پر جلدی سے دوا رکھ کر وہاں سے بھاگ گئی۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ دو برس کے طویل عرصے کے بعد وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ نوجوان مریض صمد کی جگہ آ کر دل میں بیٹھ رہا ہے اُسے یہی کہہ رہا ہے اسے جان کہہ رہا ہے اور اس کی جان لے رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ سرہانے کی میز پر دوا اسی طرح رکھی ہوئی تھی۔ وسیم نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ غصے والی صورت بنا کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی "یہ کیا ضد ہے؟ تم نے دوا کیوں نہیں پی؟ میں ڈاکٹر سے شکایت کروں گی۔"

"میں بھی شکایت کروں گا کہ تمھیں جیون ساتھی بننے سے پہلے مسکرانا نہیں آتا ہے۔"

وہ بے بسی سے مسکراتے ہوئے بولی "تم جیتے میں ہاری۔ لو اب پی لو۔"

اس نے بدستور مسکراتے ہوئے دوا پیش کی۔ وسیم نے ایک سانس میں اُسے حلق سے اتار لیا۔ شام کو پھر دوا پلانے کا وقت آیا تو نوری اس کی فرمائش سے پہلے ہی مسکرانے لگی لیکن اس نے دوا پینے سے انکار کر دیا۔ نوری نے پوچھا "اب کیا ہوا؟"

"اگر میں اسی طرح دوائیں پیتا رہا تو جلد صحت یاب ہو جاؤں گا۔ ہسپتال سے چھٹی ہو جائے گی۔ میں تمھیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ میں دوا نہیں پیوں گا۔"

"عجیب آدمی ہو۔ کیا میرے لیے بیمار پڑے رہو گے؟"

"ہاں۔ آزما کر دیکھ لو۔"

"تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ آخر کیا چاہتے ہو؟"

"تمھیں پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ پہلے وعدہ کرو کہ میری صحتیابی کے بعد بھی مجھ سے ملتی رہو گی۔ تب میں دوا پیوں گا۔"

وہ منہ پھیر کر بولی "اچھا ملوں گی۔"

اس نے نوری کا ہاتھ تھام کر بستر کے سرے پر بٹھا لیا۔ اس کے ہاتھوں سے دوا پی۔ اس سے دیر تک محبت میں وفاداری کی باتیں کرتا رہا۔ پھر ڈیوٹی کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ دوسری نرس آنے والی تھی اس لیے صبح آنے کا وعدہ کر کے وہ ہوسٹل کے کمرے میں آ گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا پھر آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پھر ایک بار آئینے سے پوچھ رہی تھی کہ آخر اس میں کیا خوبی ہے؟

اس بار آئینے نے سچائی سے بتایا کہ ان دو برسوں میں وہ نکھر گئی ہے۔ اپنے بل پر آزادانہ زندگی گزارنے کے اطمینان اور آسودگی نے اسے صحت مند رکھا تھا۔ کالا رنگ کبھی گورا نہیں ہوتا لیکن اس کا چہرہ نمکین ہو گیا تھا۔ چہرے پر اب ایسی رونق آ گئی تھی کہ اب کوئی بھی اسے نظریں اٹھا کر دیکھ لیتا تھا۔ دیکھ لیتا تھا اور دل میں اس کی تصویر سجا لیتا تھا۔ یہ خدا کی دین ہوتی ہے کہ کالے رنگ میں بھی بلا کی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن اکثر لوگ حسن کو سمجھ نہیں پاتے۔ اسے صرف رنگوں میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ صمد کم نصیب تھا کہ اس کو سمجھ نہیں سکا۔ اور گورے رنگوں کی چمک دمک میں بھٹکنے چلا گیا۔ آئینہ دیکھتے ہوئے نوری نے صمد کو ذہن سے نوچ کر الگ کر دیا۔ اب وسیم جیسا قدرداں پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب وہ کتنے برس صمد کے ہرجائی پن کا سوگ مناتی؟ جوانی کے کٹھن راستوں سے گزرنے کے لیے ایک نہ سہی — دوسرے کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔

دوسرے دن وسیم نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ تیسرے دن اس نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ وہ بہت اچھا لگا لیکن بعد میں نوری نے سوچا کون اچھا لگا؟ وہ کس کے سینے سے لگی تھی؟ تب پتہ چلا کہ وہ ان لمحات میں صمد کے پاس پہنچ گئی تھی۔ صمد کی دھڑکنوں سے لگی ہوئی تھی۔ ایک پل کے لیے بھی وسیم کی اپنی کوئی شخصیت نہیں تھی۔

ڈیوٹی سے واپس آ کر پریشانی سے سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ صمد کب تک اس کا پیچھا کرتا رہے گا؟ ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھ کر یوں لگ رہا تھا کہ ہسپتال کے اس بستر پر وسیم نہیں صمد پڑا رہتا ہے۔ اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر وسیم کے پاس جائے۔ ایک بار پھر اس کے سینے سے لگ کر دیکھے کہ وہ کیا لگتا ہے۔ وسیم یا صمد؟

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ ہسپتال گئی۔ ہوسٹل سے پچاس قدم کا فاصلہ تھا۔ اسپیشل وارڈ میں پہنچ کر پہلے اس نے آن ڈیوٹی نرس سے ملنا چاہا۔ نوری نے اس نرس کو بتایا تھا کہ چار نمبر کا مریض اس میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن وہ نرس اپنے کیبن میں نہیں تھی وسیم کے کمرے میں تھی۔

نوری اس کمرے کے قریب ٹھٹک گئی۔ نرس کہہ رہی تھی "تم بڑے ہرجائی ہو۔ نوری نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو۔"

وسیم نے ہنستے ہوئے کہا "ڈولی! کہاں تمھارا چاند سا چہرہ، اور کہاں وہ کالی رات؟ میں صرف تمھیں تمھارے نام سے مخاطب کرتا ہوں۔ کل نوری کہہ رہی تھی کہ میں اسے سسٹر نہ کہوں۔ سسٹر بہن کو کہتے ہیں۔ میں نے صاف کہہ دیا تم سسٹر ہو۔ میں سسٹر ہی کہوں گا۔۔۔"

نوری کے سینے پر ایک گھونسہ لگا۔ یہ کیا ہو گیا؟ ابھی تو وہ صمدو کی طرف سے وسیم کی طرف کروٹ بدل رہی تھی۔ اور بستر سے گر پڑی تھی۔ اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔ حقیقت سامنے آ گئی تھی کہ بچپن سے پال پوس کر جوان کرنے والا صمدو اسے چھوڑ گیا تھا پھر بھلا دو دن کا ریئس بخیدگی سے کیسے محبت کر سکتا ہے؟

وہ ہوسٹل کے کمرے میں آ کر دیر تک روتی رہی۔ اپنے معبود سے شکایت کرتی رہی کہ جب اسے خوبصورت نہیں بنایا تو اسے حساس کیوں بنایا۔ بدصورت کو نفرت برداشت کرنے کا حوصلہ ملنا چاہیے۔ تاکہ وہ ٹھوکریں کھا کر، طعنے سن کر بے حسی سے ہنستی رہے۔ مگر وہ حساس تھی۔ اپنے عورت ہونے کا حق مانگتی تھی اور عورت کے جائز غرور کو ٹھیس پہنچے تو تلملا جاتی تھی۔

بڑی دیر رونے کے بعد اس نے خود کو تسلی دی کہ وسیم کیا اسے ٹھکرائے گا۔ وہ تو خود وسیم کے سینے سے لگ کر صمدو کے پاس پہنچ گئی تھی اور اس طرح وسیم کی شخصیت کو ٹھکرا چکی تھی۔ اسے بڑی تسلی ہوئی۔ اس نے آنسو پونچھ لیے۔ پہلے ہی صمدو کی اہمیت پر کچھ کم نہ تھی، اب اور بڑھ گئی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کو دل مچلنے لگا۔ اس نے اسی لمحے فیصلہ کیا کہ وہ ماں سے ملنے کے بہانے پنڈ جائے گی اگر شازیہ بہو بن چکی ہوگی تو الٹے پاؤں واپس آ جائے گی۔ "آہ! دو برس بیت گئے تھے جیسے دو صدیاں بیت گئی تھیں۔ پتہ نہیں پنڈ کے اس چھوٹے سے گھر میں کیسے انقلابات آئے ہوں گے۔۔۔"

وہ ہسپتال سے چھٹی لے کر ایک دن وہاں پہنچ گئی — وہی گاؤں تھا، وہی گھر تھا مگر باڑے میں بھینسیں نہیں تھیں۔ باڑہ خالی تھا۔ نوری کو ایسا لگا جیسے اس کا سینہ خالی ہو گیا ہے۔ اسے صمدو کے بعد بھینسوں سے زیادہ محبت تھی کیونکہ وہ دن رات ان کی خدمت کرتی رہی تھی۔ ماں نے اسے اپنے دروازے پر دیکھا تو پہلے وہ پہچان نہ سکی۔ نوری شہر والی لگ رہی تھی سفید چمکتے ہوئے لباس میں وہ ڈاکٹرنی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا: "اماں میں نوری ہوں۔"

ماں حسرت اور مسرت سے لرز گئی۔ فوراً ہی آگے بڑھی۔ ڈگمگاتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ بوڑھے بازوؤں میں اسے جکڑ کر بولی: "ہائے تو کہاں چلی گئی تھی۔ کچھ تو بول کر جاتی۔"

وہ ماں کے گلے لگ کر دور ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ صمدو کو تلاش کر رہی تھی۔ ماں سے بولی: "کیا بول کر جاتی؟ کیوں بول کر جاتی؟ میں جانتی تھی کہ جاؤں گی تو کوئی میرے پیچھے ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔"

"بیٹی! شرمندہ نہ کر ہم سے بڑی بھول ہوئی ہم نے تیرا دل دکھایا ہے۔ ہمارے گھر میں کبھی گورے بچے پیدا نہیں ہوں گے۔"

"کیوں گھر میں بہو نہیں آئی؟"

"نہیں بیٹی! وہ تو کنجری نکلی میرے بچے سے پہلوانی چھڑا دی، اسے کہیں کا نہ رکھا۔"

نوری خوشی سے کھل گئی۔ اپنی مسرتوں کو چھپاتے ہوئے وہ صمدو کو پوچھنا چاہتی تھی اس لیے پوچھا: "اماں بھینسیں کہاں ہیں؟"

ماں نے ایک ہائے کے ساتھ کہا: "صمدو ساری بھینسیں شہر لے گیا ہے۔ آ، بیٹی یہاں بیٹھ۔ یہ تمہارا گھر ہے اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔"

اس نے پوچھا: "کیا بھینسوں کو شہر میں بیچنے گیا ہے؟"

"نہیں، وہ اور بھینسیں خرید چکا ہے اور شہر میں دودھ بیچنے کا کاروبار کر رہا ہے۔ اس نے یہاں کی زمین بیچ دی ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی کوٹھی اور بھینسوں کے لیے زمین خریدی ہے۔"

"اوہ! اسے شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔"

"نہیں بیٹی! آنچل کی ہوا لگی ہے پہلے کنجری سے دھوکہ کھایا۔ اب ایک شریف زادی کے گھر میں شادی سے پہلے گھر داماد بن کر پڑا ہے۔"

نوری کے سینے میں درد ہونے لگا۔ اس نے ٹوٹتے ہوئے دل سے پوچھا: "وہ بھی گوری چمڑی ہو گی؟"

"ہاں۔ بہت خوبصورت ہے۔ مگر بہت پڑھی لکھی، بہت چالاک ہے۔ صمدو مجھے وہاں لے گیا تھا۔ اس کا نام سائرہ ہے۔ جھوٹ کیوں بولوں وہ مجھے بہت پسند آئی مگر اس گھر کے طور طریقے پسند نہیں آئے۔ میں نے صمدو کو سمجھایا کہ جو لوگ شادی سے پہلے گھر داماد بنا رہے ہیں، تمہارے کاروبار پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور صحیح آمدنی کا پتہ نہیں چلنے دیتے، وہ مخلص اور دیانتدار نہیں ہو سکتے۔ مگر۔ مگر جوانی میں ماں کی نہیں جورو کی بات سمجھ میں آتی ہے۔"

"اماں! وہ نقصان اٹھائے گا۔ تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

"میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ سائرہ کو جلدی بیاہ کر گھر لے آ۔ یا اس کا گھر چھوڑ دے۔ مگر ایک برس چار مہینے گزر گئے سائرہ کی پڑھائی ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہے۔ سنا ہے ابھی دو برس اور پڑھے گی۔ صمدو ابھی اور دو برس وہاں رہے گا۔ میں سمجھتی ہوں وہ ساری عمر اسی دروازے پر پڑا رہے گا۔ پہلے مجھ سے مہینے مہینے ملنے آتا تھا۔ اب چھ مہینے سے نہیں آیا۔ میں ہی جاتی ہوں مگر اس گھر میں نہیں جاتی۔ باہر بیٹے سے کھڑے کھڑے مل آتی ہوں۔ بیٹی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اس گھر کو تیری ہائے لگ گئی ہے۔"

"نہیں اماں! ایسا نہ کہو۔ یہ میرا گھر ہے اور اپنے گھر کو اپنی ہائے نہیں لگتی۔"

اس نے رات کا کھانا ماں کے ساتھ کھایا۔ دل کہتا تھا کہ صمدو

شہر سے آئے گا ماں سے ملنے آئے گا۔ یا ایک بار اور ٹھوکر کھا کر آئے گا۔ وہ پشیمان ہو گا۔ اس کا سر جھکا ہو گا۔ اپنے گھر میں اُسے دیکھتے ہی ”ہائے نوری!“ کہہ کر سہارے کے لیے لپٹ جائے گا پھر وہ اسے اپنے سینے میں چھپا لے گی۔

وہ دو برس سے کچھ ایسے ہی خواب دیکھتی چلی آ رہی تھی۔

رات کو سونے کے وقت وہ صمد کے کمرے میں گئی۔ وہاں کی ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ بستر پر دھلی ہوئی چادر بچھائی۔ تکیے کے غلاف بدلے۔ پھر اس ہرجائی کے بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلتی رہی اور ہر آہٹ پر چونکتی رہی۔ رات کے دو بجے محسوس ہوا کہ باہر کوئی ہے اس نے بستر سے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ پھر دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

باہر برآمدے کے زینے پر بوڑھی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ ایک بار پہلے بھی ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ اور نوری برآمدے میں بیٹھی شازیہ کی آمد پر اور صمد کی بے وفائی پر رو رہی تھی۔ ماں نے بیٹے کی حمایت میں خوبصورت پوتے پوتیوں کو گود میں کھلانے کے خواب دیکھتے ہوئے نوری کے آنسوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وقت اپنے آپ کو بڑے ہی عبرتناک انداز میں دہراتا ہے۔ آج ماں آنسو بہا رہی تھی۔

نوری اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی: ”اماں صبر کرو۔ اسے پھر ٹھوکر لگے گی۔ وہ پھر واپس آئے گا۔“

ماں نے نوری کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ ”تجھے دیکھ کر رونا آ رہا ہے کہ بہو واپس آ گئی بیٹا نہیں آیا۔ اس کے انتظار میں، میں ٹھیک سے سو نہیں سکتی۔ پتہ نہیں وہ کب آ جائے۔ پتہ نہیں میری آنکھ لگ جائے تو پھر نہ کھلے۔ وہ پکارتا رہ جائے اور میں سوتی رہ جاؤں۔“

”ایسا مت کہو، وہ آئیگا تو میں تمھیں جگا دوں گی۔ آؤ، میں تمھیں سُلا دوں۔“

وہ ماں کو سمجھا بجھا کر کمرے میں لے آئی۔ ماں نے ایک سُوٹ کیس کھول کر ایک کاغذ کا ٹکڑا نکال کر دیا۔ ”بیٹی یہ صمد کا پتہ ہے شہر میں اسی جگہ رہتا ہے تم واپس جاؤ تو اس سے ضرور ملنا۔“

وہ خود جا کر ملنا نہیں چاہتی تھی۔ گاؤں میں ماں سے ملنے کے بہانے آئی تھی۔ اس نے وہ پتہ رکھ لیا۔ بوڑھی عورت کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ ماں نے کہا: ”بیٹی! تیرا سینہ بہت وسیع ہے۔ اس میں ساری دُنیا کا پیار سما سکتا ہے۔ صمد نے یہ جگہ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب وہ آئے گا تو میں اس سے جھگڑا کروں گی۔“

اس نے ماں کو تھپک تھپک کر سُلا دیا۔ خود جاگتی رہی۔ واپس نہ آنے والے کی یادوں میں کھوئی رہی۔ فجر کی اذان کے وقت اُسے ہوش آیا کہ ماں کو آہستگی سے اپنے سینے سے الگ کرنا چاہیے تاکہ آنکھ نہ کھلے۔ اس نے الگ کیا تو دل دھک سے رہ گیا۔ بوڑھا جسم بالکل ساکت تھا۔ آنکھیں کبھی نہ کھلنے کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

نوری نے اسی وقت سارے پنڈ والوں کو اس کی موت کی اطلاع دی۔ ایک شخص کو صمد کا پتہ دے کر شہر بھیجا۔ پھر تجہیز و تکفین کی تیاری ہونے لگی۔ صبح دس بجے صمد شہر سے آ گیا مگر ماں اُسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ نوری کے کانوں میں وہ بوڑھی آواز گونجنے لگی ”اس کے انتظار میں میں سو نہیں سکتی پتہ نہیں وہ کب آ جائے۔ پتہ نہیں میری آنکھ لگ جائے تو پھر نہ کھلے۔ وہ پکارتا رہ جائے اور میں سوتی رہ جاؤں۔“

صمد نے غم سے نڈھال ہو کر بڑبڑانے کے انداز میں کئی بار زیرِ لب ماں کو پکارا مگر وہ جواب دینے کے لیے سو گئی تھی۔ اسے قبر میں اتارنے کے بعد وہ گھر واپس آیا تو نوری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلے وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ پُرسا دینے والی عورتوں کی بھیڑ میں چھپی ہوئی تھی۔ اب سب جا چکے تھے۔ وہ گھر جو ماں سے خالی تھا، اب نوری سے آباد لگا۔ وہ منہ پھیر کر برآمدے کے زینے پر بیٹھ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت اُن کے لیے کھانا لائی۔ صمد اور نوری کے درمیان کھانا رکھتے ہوئے بولی: ”تیری ماں یہاں تنہائی کا عذاب سہتی رہی۔ یہاں گھر گھر جا کر روتی رہی کہ تو شہر والیوں میں جا کر پھنس گیا ہے۔ بیٹا! اب بھی عقل سے کام لے۔ اپنی نوری سی اچھی تجھے کہیں نہیں ملے گی۔“

وہ سر جھکائے باتیں سنتا رہا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ وہ بوڑھی عورت بولتے بولتے تھک کر چلی گئی۔ اس کے بعد نوری کمرے میں گئی اس نے لباس بدلا، اٹیچی اٹھائی پھر برآمدے میں آ کر بولی: ”دُنیا ٹھیک کہتی ہے بھینس کے آگے بین نہیں بجانا چاہیے۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ احاطے سے گزرنے لگی۔ صمد نے سر اٹھا کر دیکھا اور سوچا: ”کیسی بھرپور ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں چہرے میں بھی کہاں سے اتنی کشش آ گئی ہے، شاید میں دو برس بعد دیکھ رہا ہوں اس لیے یہ اچھی اور نئی نئی لگ رہی ہے۔“

نوری نے احاطے کے باہر آ کر پلٹ کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ صمد نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ نوری نے اس سے دور جاتے ہوئے اپنے دل کو سمجھایا: ”اس پر حُسن کا جادو چل رہا ہے۔ میں ایسی گئی گزری نہیں ہوں کہ محبت کی بھیک مانگوں، میں اسے محبت کے بغیر زندہ رہ کر دکھاؤں گی۔“

وہ چلی گئی۔ صمد اُسے حدِ نظر تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی، تب اُس نے سوچا کہ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ دو برس کے بعد ملی اور اس سے باتیں بھی نہ کر سکا۔ کیوں نہ کر سکا؟

اس لیے کہ میں گوری چمڑیوں سے ہلتا جا رہا ہوں اور نوری کے سامنے جھینپ رہا ہوں۔ امید ہے کہ سائرہ میری دلہن بن جائے گی پھر میری جھینپ ختم ہو جائے گی۔ اس وقت میں نوری کے سامنے خم ٹھونک کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے ایک حسین عورت مل گئی ہے۔

وہ حسین سائرہ کے تصور میں کھو گیا۔ وہ شہر میں اس کے ہاں یوں رہتا تھا کہ رہائش کے لیے سامنے والا ایک کمرہ مل گیا تھا۔ اس کمرے میں ایک امجد صاحب رہتے تھے۔ سائرہ کی بڑی بہن طاہرہ سے امجد کی شادی ہونے والی تھی۔ امجد کا ایک چپلوں کا کارخانہ تھا۔ اچھی خاصی آمدنی تھی۔ وہ بھی صمد کی طرح اس گھر میں ایک ہزار روپیہ ماہانہ دیتا تھا۔ مگر جب سے دودھ فروشی کا کام پھیل رہا تھا اور آمدنی بڑھ رہی تھی، تب سے صمد ڈھائی ہزار روپے ہر ماہ دے رہا تھا۔ سائرہ نے کہا تھا کہ اس کی خوراک زیادہ ہے۔ وہ ایک وقت میں چھ سات روٹیاں، دو سیر گوشت کھاتا تھا اور صبح و شام پانچ سیر دودھ پیتا تھا۔

صمد نے کبھی پیسے پیسے کو اہمیت نہیں دی۔ اہمیت صرف سائرہ کی تھی۔ وہ اخراجات کے لیے جتنی رقم مانگتی تھی، وہ دے دیتا تھا۔ لیکن اس کے بھائی شہزاد سے نفرت کرتا تھا کیونکہ وہ دودھ کی آمدنی میں ہیرا پھیری کرتا رہتا تھا۔ سائرہ نے سمجھایا کہ وہ شہزاد کو ابھی کچھ نہ کہے ورنہ وہ ان کی شادی میں رکاوٹیں پیدا کرے گا۔ یہ اچھی بلیک میلنگ تھی۔ سائرہ کو دلہن بنانے کے لیے وہ شہزاد کی کاروباری بے ایمانی برداشت کر رہا تھا۔

اصل بات جو چیز جتنی نایاب ہوتی ہے اس کی اتنی ہی طلب بڑھتی ہے۔ سائرہ ایک تو حسین تھی، دوسرے نایاب تھی۔ ایک ہی گھر میں رہ کر بھی عید کے چاند کی طرح نظر آتی تھی۔ وہاں پردے کی سخت پابندی تھی۔ سائرہ کالا برقعہ پہن کر کالج جاتی تھی اور طاہرہ سرمئی رنگ کا برقعہ پہنتی تھی۔ جس کمرے میں وہ امجد کے ساتھ رہتا تھا، وہاں ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ جب سرمئی رنگ کا برقعہ جھلکتا تو امجد کھڑکی کے پاس دیدار کے لیے جاتا تھا۔ جب کالے رنگ کا برقعہ وہاں سے گزرنے والا ہوتا تو صمد کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ سائرہ کبھی کبھی نقاب کو ذرا سا ہٹا کر جلوہ دکھاتی تھی پھر بجلی گرا کر چلی جاتی تھی۔

سائرہ کی ادائیں شازیہ کی طرح بازاری نہیں تھیں۔ اس میں بڑی سنجیدگی تھی۔ چہرہ اداس اداس سا نظر آتا تھا۔ کبھی وہ صمد سے باتیں کرتی تو یوں لگتا جیسے وہ جبراً بول رہی ہو۔ کوئی اس کی پیٹھ پر چابک مار رہا ہو کہ بولو اور وہ بولتی جاتی ہو۔ ایک ادھ بلاس کی طرف دیکھ کر صمد کو یوں لگا جیسے وہ ابھی رونے کے بعد آنکھیں پونچھ کر آ رہی ہو۔ کئی بار وہ پوچھنے سے رہ گیا کہ اسے کیا دکھ ہے۔ اگر وہ اس گھر میں مظلوم ہستی ہے تو وہ اسے وہاں سے بھگا کر لے جائے گا۔ اس کا حسن عجیب ماتمی سا تھا۔ دل کو گرفت میں لے لیتا تھا۔ صمد اس کی صورت دیکھ دیکھ کر وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔

اس گھر کے دوسرے لوگ سائرہ سے بالکل مختلف تھے۔ وہ ایسے بدمزاج تھے کہ محلے کے کسی گھر میں نہ جاتے تھے۔ اور نہ اپنے ہاں کسی کو بلاتے تھے۔ صمد اور امجد پر بھی زور دیتے تھے کہ وہ محلے میں کسی سے دوستی نہ کریں۔ شہزاد کچھ دادا قسم کا آدمی تھا۔ محلے والے اس سے ڈرتے تھے۔ وہ صمد اور امجد سے بھی ذرا تڑی دے کر باتیں کرتا تھا۔ امجد اسے برداشت کر لیتا تھا لیکن صمد سینہ تان کے بولتا تھا۔ اُس پر شہزاد کی دھونس نہیں تھی۔ تاہم وہ بھی سائرہ کی خاطر ایک بزدل کی طرح اسے برداشت کر رہا تھا۔

ان حالات کی روشنی میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ سائرہ سے شادی ہو سکے گی یا نہیں۔ ہو گی تو کب ہو گی؟ جب ہو گی، تب تک وہ شہزاد کو برداشت کر سکے گا یا نہیں؟ اگر اس نے کسی دن شہزاد کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے تو، تو انجام کیا ہو گا؟ ایک حسین دلہن کی سیج پر پہنچنے کا سپنا ٹوٹ جائے گا۔

وہ رہٹ کے زینے پر بیٹھا حسرت سے اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جدھر نوری جاتے جاتے نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اُسے ایک عورت کی سخت ضرورت تھی۔ وہ ایک ساتھی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ نوری اُسے چٹکی بجاتے ہی حاصل ہو جاتی۔ وہ ابھی آئی تھی۔ ابھی اس کے گلے لگ جاتی مگر وہ دو برس سے شازیہ اور سائرہ جیسی حسیناؤں کے لیے چٹکی بجا رہا تھا۔ اب تھک رہا تھا اور پچھتاوے کے لمحات میں شدت سے نوری کو یاد کرتا تھا۔

اُس وقت بھی وہ پچھتا رہا تھا اور وہ آنے والی آ کر جا بھی چکی تھی۔

◯

انسان کی زندگی میں خوشی کا حصہ کم ہوتا ہے اور جتنی بھی خوشیاں ملتی ہیں اُن میں یاد رہ جانے والی خوشی چند لمحوں کی ہوتی ہے۔ نوری کی زندگی میں یاد رہ جانے والی خوشی اتنی ہی تھی جتنی دیر کبھی صمد اس کا دیوانہ رہا تھا۔

سارے گاؤں میں چرچا تھا کہ نوری اس کی منگیتر ہی نہیں، محبوبہ بھی ہے، اور وہ نوری کا دیوانہ ہے۔ بعض لوگ اس کی دیوانگی یوں بیان کرتے تھے کہ وہ ڈنڈ پیلتے اور ڈنڈ لگاتے وقت ہانپتے ہوئے ہر سانس میں نوری نوری کہتا ہے، جیسے مجنوں لیلیٰ لیلیٰ کہا کرتا تھا۔

نوری نے شہر واپس آکر یہ طے کر لیا تھا کہ جو راستہ صمدو کی طرف جاتا ہے اس راستے پر اب کبھی نہیں جائے گی۔ کبھی وہ بے مروت اس کا دیوانہ تھا۔ بس اتنی ہی مختصر سی خوشی کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھ کر جی لے گی۔ اور اپنی خوشیاں اور خدمات بیماروں اور دکھی انسانوں کو دیتی رہے گی۔

اس عزم کے ساتھ اس نے اور دو برس گزار لیے۔ اس نے صمدو کو بھول جانے کی کوششیں کر ڈالیں۔ کبھی بیتے دنوں کو یاد کیا تو اس طرح کہ وہ تین برس آٹھ ماہ سے تنہا زندگی گزار رہی ہے (یعنی صمدو سے بچھڑے تین برس آٹھ ماہ گزر چکے ہیں) جب وہ ایک برس آٹھ ماہ کے بعد بنڈ گئی تھی تو اماں کا انتقال ہوا تھا (وہاں صمدو سے سامنا ہوا تھا) اب اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ سائرہ نے شادی کر لی ہو گی (صمدو کے ساتھ) مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی کو یاد کرنے کی؟ (صمدو کو یاد کرنے کی)

وہ کچھ اسی طرح یاد نہ کرتے ہوئے، یاد کرتے کرتے زندگی گزار رہی تھی۔ ایک شام وہ ہسپتال میں ڈیوٹی کے لیے آئی تو ڈیوٹی کا چارج دینے والی نرس نے بتایا۔ آگ میں جلا ہوا ایک مریض دس نمبر کے بیڈ پر ہے پہلے اسے ایک انجکشن لگایا جائے۔ وہ انجکشن تیار کر کے سرنج لے کر وہاں پہنچی تو یکبارگی دل دھڑکنے لگا بستر پر صمدو پہلوان لنگوٹ پہنے بازو شانے چت پڑا ہوا تھا۔

وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ صمدو آنکھیں بند کیے گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اس کے سینے، پیٹ، پسلیوں، رانوں اور بازوؤں پر آبلے پڑے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی ذرا سا جھلس گیا تھا۔ بدن کے متاثرہ حصوں پر برنال جیسی دوا لیپ دی گئی تھی۔ نوری نے اس کے بازو میں انجکشن لگایا تو اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

کمرے میں بلب کی روشنی تھی۔ صمدو کو سفید لباس میں سب سے پہلے ایک نرس نظر آئی۔ نرس نے سر اٹھایا! تو نوری سامنے آ گئی۔ وہ ایک آہ کے ساتھ بولا۔ "آہ نوری! یہ تم ہو۔ نہیں، میں۔ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔"

نوری کے دل میں خوشیاں بھر گئیں۔ مگر اس نے بظاہر سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا تم نوری کو خواب میں دیکھتے ہو؟"

صمدو نے آنکھیں بند کر لیں جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ پھر وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولنے لگا۔ "میں حسین عورت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں لیکن جب سوتا ہوں تو خواب میں نوری کے سوا کوئی نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے نوری میری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ میں اوپر سے دوسری عورتوں کے پیچھے دوڑتا ہوں۔ اندر سے وہ لہو کی طرح میری رگوں میں دوڑتی رہتی ہے۔"

نوری نے پوچھا۔ "کیا سائرہ نے بھی تم سے شادی نہیں کی؟"

صمدو نے آنکھیں کھول کر دیکھا پھر حیرانی سے بولا۔ "تو۔ تو نوری ہے۔ کیا تو نرس بن گئی ہے؟"

"ہاں۔ تو اتنا بے مروت ہے کہ دیکھ کر بھی نہیں پہچانتا۔"

"مگر تو تو بہت مل گئی ہے۔ نرس کے لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

"میں اپنی تعریف نہیں سننا چاہتی میرے سوال کا جواب دے کیا تیرے عشق کی آگ نے تجھے اس طرح جلا ڈالا ہے؟"

"ہاں۔ اس گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ سائرہ شعلوں میں گھر گئی تھی۔ میں اسے وہاں سے نکال کر لاتے ہوئے جل گیا۔"

"سائرہ کہاں ہے؟"

وہ تھوک نگلنے کے انداز میں بولا۔ "میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ پانی۔۔۔۔"

سرہانے دودھ اور پانی رکھا ہوا تھا۔ نوری نے گلاس میں ڈال کر اسے پلانے کے لیے سہارا دیا۔ اس کے سر کے پیچھے ہاتھ لے جا کر اٹھنے میں مدد دی۔ ایک طویل عرصے کے بعد دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مس ہو رہے تھے۔ نوری کے سینے میں دل کی دھڑکنیں پاگل ہو رہی تھیں۔ وہ دودھ پی رہا تھا اور دودھ کی طرح اس کے اندر اتر رہا تھا اور دور تک پھیل رہا تھا۔

اتنے میں ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی ہسپتال کے ایک ڈاکٹر کے ساتھ وہاں پہنچے۔ ڈاکٹر نے انسپکٹر کو بتایا۔ "یہی وہ مریض ہے۔"

انسپکٹر نے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارا نام صمد خان ہے؟"

وہ نوری کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ہاں جی! میرا ہی نام ہے کیا آپ لوگوں نے سائرہ کو جیل پہنچا دیا ہے؟"

"نہیں۔ اسے پولیس ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں وہ تفصیلی بیان دینے کے بعد مر گئی۔"

"اوہ۔ بیچاری۔۔۔" صمدو نے آنکھیں بند کر لیں۔

انسپکٹر نے کہا۔ "ہم اس کے بیان پر تصدیقی دستخط چاہتے ہیں۔"

"بیان کیا ہے مجھے کچھ معلوم ہونا چاہیے۔"

انسپکٹر نے فائل کھولتے ہوئے کہا۔ "میں پڑھ رہا ہوں، غور سے سنو۔"

وہ پڑھنے لگا، نوری بھی توجہ سے سن رہی تھی۔ سائرہ نے خود تحریری بیان دیتے ہوئے لکھا تھا۔ "میں سائرہ زوجہ شہزاد صدیقی بری طرح آگ میں جل جانے کے باوجود ہوش و حواس میں رہ کر یہ بیان قلمبند کر رہی ہوں۔ میرے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ میرے چچا انور صدیقی نے میری پرورش کی۔ میں اور چچا کا لڑکا شہزاد بچپن ہی سے ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ جوانی میں ہماری شادی ہو گئی۔

شہزاد میں ایک بڑی خرابی تھی۔ وہ نکما تھا۔ کوئی کام نہیں کرتا تھا

شادی کے بعد بھی اس کی بدحواسی نہ گئی۔ چچا محنت مزدوری کے قابل نہیں تھے۔ اس مہنگائی کے دور میں بھوکوں مرنے کی نوبت آ گئی۔ شہزاد نے ایک آدھ بار چوری کی۔ میں اسے بہت چاہتی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا۔ ایسا کام نہ کرو۔ پکڑے جاؤ گے تو جیل بھی جاؤ گے اور خاندان کی عزت بھی مٹی میں مل جائے گی۔ چچی اپنے بیٹے کو بہت چاہتی تھیں، وہ مجھے طعنے دیتی تھیں کہ میں پڑھی لکھی ہوں، میں ملازمت کر کے گھر کا خرچ کیوں نہیں چلاتی۔

میں ملازمت کی تلاش میں گھر سے باہر جانے لگی۔ ایسے وقت امجد علی میرا پیچھا کرنے لگا۔ دو دن کے بعد ہی ایک بوڑھی عورت امجد علی کے لیے میرا رشتہ مانگنے آئی۔ وہ لوگ مجھے کنواری لڑکی سمجھ رہے تھے۔ بوڑھی مشاطہ نے بتایا کہ امجد علی کا چپلوں کا بہت بڑا کاروبار ہے اور وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ اس روز گھر والوں نے اس مشاطہ کو ٹال دیا اور آپس میں سر جوڑ کر اس نکتے پر غور کرنے لگے کہ اگر گھر کی بہو کو کنواری لڑکی بنا کر پیش کریں تو فائدے اور نقصانات کے کیا امکانات ہیں۔ میں نے یہ سنا تو شہزاد سے روتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم مجھے اپنے نکاح سے خارج کرنا چاہتے ہو؟"

وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا۔ "دیکھو، میں تو ویسے بھی تمھارا چچا زاد ہوں۔ تم امجد کے سامنے مجھے چچا زاد کہو گی، تو نکاح ٹوٹ نہیں جائے گا۔"

چچی نے کہا۔ "ہم اس سے تمھاری شادی نہیں کر رہے ہیں۔ تم روتی کیوں ہو؟"

چچا نے کہا۔ "ہم اسے شادی کا جھانسا دیں گے۔ امجد سے کہیں گے کہ تم چار سال تک تعلیم حاصل کرو گی اور وہ چار سال تک ہمارے ہاں رہے گا۔"

"مگر وہ ہمارے ہاں رہنے کے لیے کیوں راضی ہو گا؟"

شہزاد نے کہا۔ "تم اتنی حسین ہو کہ تمھیں دیکھتے رہنے کی آرزو میں وہ صرف یہاں رہے گا ہی نہیں بلکہ یہاں کے اخراجات بھی پورے کریگا۔ یہ تم ہم پر چھوڑ دو کہ اسے کیسے بیوقوف بنایا جائے گا۔"

"لیکن شہزاد! محلے والے بتا دیں گے کہ میں اس گھر کی بہو ہوں۔ یہ تم لوگ کیسا ناٹک کھیل رہے ہو؟"

"جیسا بھی ناٹک ہے، تمھیں اس میں اہم رول ادا کرنا ہے۔ ہم ایک ہفتے کے اندر یہ محلہ چھوڑ دیں گے۔ دوسرے محلے میں گھر لیں گے۔ اس گھر میں تم بہو نہیں، بیٹی کہلاؤ گی۔ ہم وہاں کسی سے زیادہ تعلق نہیں رکھیں گے۔"

"لیکن چار سال تک اسے جھانسا دینے کے بعد انجام کیا ہو گا؟ وہ شخص شادی کے لیے ضد کرے گا۔"

شہزاد نے جواب دیا۔ "چار سال بہت دور ہیں۔ چار سال بعد ہم اسے راستے سے ہٹا دوں گا۔ کتنی ہی لڑکیاں اپنی عزت کا سودا کر کے گھر کے اخراجات پورے کرتی ہیں۔ ہم تمھاری عزت کا سودا نہیں کر رہے ہیں۔ تم میری بیوی ہو۔ میری پناہ میں رہ کر نہایت شرافت سے امجد کو دھوکا دیتی رہو گی۔ اور اس گھر میں تمھارا نام سائرہ نہیں طاہرہ ہو گا۔"

میں مجبور ہو گئی۔ مجھے میری سسرال والے یا ساری دنیا والے مجبور نہیں کر سکتے تھے لیکن رات کو شہزاد نے اپنی آغوش میں لے کر خوب پیار کیا اور مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑنے کی قسم کھائی تو میں امجد کو بیوقوف بنانے پر راضی ہو گئی۔

امجد علی ہماری توقع سے زیادہ بیوقوف نکلا۔ چچا ٹھیک ہی کہتے تھے کہ دنیا میں بیوقوفوں کی کمی نہیں ہے انہیں بے وقوف بنانے والا چاہیے۔ دوسرے محلے میں امجد ہمارے ہاں رہنے لگا۔ گھر والے کبھی کبھی عادت سے مجبور ہو کر مجھے سائرہ کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک دن امجد نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ سائرہ کون ہے؟ میں نے بات بنائی کہ سائرہ میری چھوٹی بہن ہے۔

میرا یہ جھوٹ میری سسرال والوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ تقریباً ایک سال بعد شہزاد کے ایک دوست طوطا پہلوان کے ذریعے صمد و پہلوان کا رشتہ میرے لیے آ گیا۔ ہم نے صمد و پہلوان کو بھی اسی طرح پھانس لیا۔ ایک برس کے اندر پہلوان کے دودھ کا کاروبار خوب چلنے لگا۔ شہزاد اس کاروبار کے منافع سے ہر ماہ ہزاروں روپے غائب کر دیا کرتا تھا۔ صمد و ناراض ہوتا تھا مگر میرے سمجھانے پر موم ہو جاتا تھا۔

چار برس کے دوران میں بڑی مشکلات سے دوچار ہوتی رہی۔ بیک وقت طاہرہ اور سائرہ کا رول ادا کرتی رہی۔ سرمئی برقعہ پہن کر امجد کے سامنے جاتی تھی اور کالے برقعہ میں صمد و کو اپنا چہرہ دکھاتی تھی۔ میں ڈرتی تھی کہ کسی دن بھید کھلے گا تو کیا ہو گا؟

دوسری طرف میری سسرال والے انجام سے بے پروا ہو کر دولت سمیٹ رہے تھے۔ شہزاد کی عادتیں اور بگڑ گئی تھیں۔ وہ جوا کھیلنے اور شراب پینے لگا تھا۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ وہ دوسری عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکی۔ کوئی بھی عورت جو اپنے مرد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دیتی ہے، وہ قربانیوں کے صلے میں صرف اتنا چاہتی ہے کہ اس کا مرد صرف اسی کا رہے۔ کسی دوسری عورت کی قربت سوتاپے کی آگ لگا دیتی ہے۔

اس بات پر آئے دن ہمارے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ ایک رات شہزاد نے مجھے آغوش میں لے کر سمجھایا۔ "چار سال پورے ہونے والے ہیں۔ میں جلد ہی امجد کو کہیں لے جا کر ٹھکانے لگا دوں گا۔ صمد و پہلوان ہے وہ آسانی سے میرے قابو میں نہیں آئے گا۔ میں پھر دوسرے محلے میں مکان لے رہا ہوں تم وہاں اسی کے ساتھ رہو گی۔

ہم یہاں صمود کے سامنے پریشانی ظاہر کریں گے کہ تم گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو یا تمہیں کسی نے اغوا کر لیا۔ صمود تمہارا دیوانہ ہے وہ چیخ و پکار کے ذریعے تمہیں بدنام نہیں کرے گا۔ ہم اسے سمجھائیں گے کہ پولیس میں رپورٹ لکھوانے سے خاندان کی بدنامی ہو گی لہٰذا چپ چاپ اسے تلاش کیا جائے، وہ زندگی بھر تمہیں تلاش کرتا رہے گا۔"

میں چاہتی تھی کہ ناٹک اب ختم ہو جائے لیکن مجھے کسی بے گناہ کی ہلاکت منظور نہ تھی۔ میں نے کہا۔ "امجد کے خون سے ہاتھ نہ رنگنا ورنہ میں ساتھ نہ دوں گی۔"

شہزادے نے مجھے تسلی دی کہ اسے ہلاک نہیں کرے گا لیکن ایک دن امجد اچانک لاپتہ ہو گیا۔ میں نے شہزاد کو جھنجھوڑ ڈالا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ اب میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔"

اس نے جھڑک کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ تم اسے چار برس تک بے وقوف بناتی رہیں۔ اس کے گم ہونے میں صرف میرا نہیں تمہارا ہاتھ بھی سمجھا جائے گا۔ سائرہ عقل سے کام لو۔ ہمارا یہ دھندا بڑا ہی منافع بخش ثابت ہوا ہے۔ میں دوسری شادی کروں گا ایک لڑکی سے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح ویسا ہی ناٹک کھیلا کرے گی۔"

دوسری شادی کا ذکر سن کر میں آپے سے باہر ہو گئی۔ اس بے مروت کو گالیاں دینے لگی۔ اس رات اس نے میری خوب پٹائی کی۔ میں مار کھا کھا کر دو بار بے ہوش ہوئی۔ دوسری بار جب ہوش آیا تو صبح ہو رہی تھی۔ شہزاد اور اس کے ماں باپ ایک کمرے میں بیٹھے صلاح مشورے کر رہے تھے۔ اس کمرے کا ایک ہی دروازہ تھا میں نے اس دروازے کو باہر سے بند کیا۔ وہاں سے گیراج میں گئی میرے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ میں پٹرول کا ٹن اٹھا کر اس کمرے تک آئی۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے کمرے کے اندر پٹرول چھڑکنے لگی۔ پٹرول کی بو پا کر وہ تینوں دروازے کی طرف دوڑے میں نے اسی وقت ماچس کی تیلی سلگا کر کمرے میں پھینکی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کے اندر چاروں طرف آگ پھیل گئی۔

وہ تینوں چیخ رہے تھے۔ دروازہ پیٹ رہے تھے۔ کھڑکیوں میں لوہے کی جالیاں تھیں۔ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں بھی پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ میں نے انتقام لے لیا مگر میں اب بھی شہزادے سے محبت کرتی ہوں اس کے بغیر جینا نہیں چاہتی لیکن صمود مجھے آگ کے شعلوں سے نکال کر لے آیا۔ اس نے اچھا ہی کیا چند گھنٹے اور زندہ رہنے کی مہلت دے دی۔ یہ مہلت پا کر میں یہ بیان بہ قلم خود لکھ رہی ہوں اور تا دم تحریر ہوش و حواس میں ہوں۔ ہم انسان عجیب ہیں، عبرتناک انجام کو سمجھنے کے باوجود جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پھر اپنی سزا کو پہنچ کر دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں۔ میری بھی نصیحت اور دعا ہے کہ خدا کسی کو ایسا انجام نہ دکھائے۔ فقط راقم الحروف، سائرہ شہزاد۔"

انسپکٹر نے فائل بند کرتے ہوئے صمود کو دیکھا۔ تھوڑی دیر تک ہسپتال کے کمرے میں گہرا سکوت طاری رہا پھر صمود نے پوچھا۔ "کیا وہ مر گئی؟"

"ہاں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کیا تم اس بیان کو درست سمجھتے ہوئے دستخط کرو گے؟"

"ہاں جی میرے بارے میں سائرہ نے درست لکھا ہے۔ اپنے بارے میں بھی غلط نہیں لکھ سکتی تھی۔ میں اس کا ماتمی چہرہ دیکھ کر سوچتا تھا کہ وہ بڑے صدمے اٹھا رہی ہے۔ بیچاری۔۔۔ میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا۔ کاغذ لایئے، انگوٹھا لگا دوں گا۔"

اس نے انگوٹھا لگا دیا۔ انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر نے نوری سے کہا۔ "تم اتنی دیر سے ایک ہی مریض کے پاس موجود ہو۔ تمہیں دوسرے مریضوں کو بھی اٹینڈ کرنا چاہیے۔"

وہ ڈاکٹر کے ساتھ باہر جاتے ہوئے بولی۔ "آج میں دوسروں کو اٹینڈ کروں گی مگر کل سے مجھے لمبی چھٹی چاہیے۔ میں یہ چھٹی صمود کی تیمارداری میں گزاروں گی۔"

"کیا یہ تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کون ہے یہ؟" ڈاکٹر نے چلتے چلتے رک کر سوال کیا۔

وہ ذرا ہچکچائی۔ پھر سر جھکا کر بولی۔ "میرا منگیتر ہے۔"

ڈاکٹر سر ہلا کر چلا گیا۔ اس دن سے نوری نے تیمارداری کی انتہا کر دی۔ اس نے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ چوبیس گھنٹے صمود کے بستر سے لگی رہتی۔ کھانے پینے، نہانے دھونے کے لیے ذرا جاتی تھی، پھر آ جاتی تھی۔ رات کو صمود کے کمرے کے ایک بستر پر سوتی تھی، اور ذرا سی آہٹ پر اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ صمود اس کی خدمت گزاری دیکھ رہا تھا اور ندامت سے مرا جا رہا تھا۔

اس کے جسم کے آبلے پھوٹ رہے تھے۔ زخم بھر رہے تھے۔ یہ سب کچھ رفتہ رفتہ ہو رہا تھا پھر ایک رات نوری نے بتایا کہ دوسرے دن ہسپتال سے اس کی چھٹی ہو جائے گی۔

اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اپنے ساتھ کیوں لے جائے گا؟"

"تو میری ہے۔ اب تیرے بغیر میری زندگی نہیں گزرے گی۔"

"تو نے پہلے بھی یہی کہا تھا۔ اب میری تمنا کرنے سے پہلے تجھے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیے کہ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے جس سے تیری کمی پوری ہو سکتی ہے؟ میں خوبصورت نہیں ہوں پھر

میری چاہت کیوں پیدا ہو گئی ؟"
"میں بتا نہیں سکتا کہ تجھ میں کیا بات ہے، بس تُو مجھے دُنیا کی ساری عورتوں سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہے۔"
وہ ٹھہر ٹھہر کر پتھر جیسے لہجے میں بولنے لگی۔ "صمدو! مجھے اتنے عرصہ میں یہ معلوم ہوا کہ ہم انسانوں میں کوئی خوبصورت نہیں ہوتا۔

کیونکہ تجھے پنڈ کے کسی گھر سے دلہن نہیں مل رہی تھی، میں تیرے لیے دنیا کی حسین عورت تھی۔ حالانکہ میں خوبصورت نہیں تھی۔ صرف تیری ضرورت تھی۔
پھر میں تیرے گھر سے بھاگ کر لاری کے اڈے پہنچی۔ وہاں میں اس لیے خوبصورت تھی کہ بالکل اکیلی تھی۔ وہ مجھے آسانی سے چھیڑ سکتے تھے اور آسانی سے مجھے حاصل کر سکتے تھے یعنی مجھ سے ضرورت پوری ہو سکتی تھی۔ لہٰذا میں بدصورت نہیں تھی۔
اگر کسی کی بیوی بیمار ہو یا پورے دن سے ہو اور میں اس کی جگہ کسی کے کام آ سکوں تو میں خوبصورت ہوں۔
جب یہ پورا معاشرہ بیمار ہو اور اُسے ایک مسکرانے والی نرس کی ضرورت ہو اور میں ان بیماروں کی خلوت میں محبوبہ اور جلوت میں سسٹر (بہن) بن کر رہوں تو میں ایسے حرامی اور دوغلے سماج میں ایک خوبصورت عورت سمجھی جاؤں گی
یہاں کسی کے پاس حُسنِ نظر بھی نہیں ہے۔ لوگ اپنی اپنی نظر سے نہیں اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کسی کو خوبصورت اور بدصورت سمجھتے ہیں۔ صمدو! اب میں پھر تیری ضرورت بن گئی ہوں اس لیے پھر خوبصورت لگ رہی ہوں۔"
"نوری! تو جو سمجھتی ہے سمجھ لے مگر اب میں تجھ سے شادی کروں گا۔"
"میں شادی نہیں کروں گی۔"
اُس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تیرے دل سے میری محبت ختم ہو گئی ہے؟"
"نہیں۔ میں مر سکتی ہوں مگر دل سے تیری محبت کو مار نہیں سکتی۔"
"نوری! ایک ایک کر کے سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کیا تُو... بھی چھوڑ دے گی؟"
"تیرا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ کبھی تو مجھ سے ملنے آیا کرنا۔ کبھی میں تیرے گھر آیا کروں گی۔ ہمارے درمیان گہری دوستی، گہری محبت اور نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہو گا لیکن تو مجھے کبھی ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔"
"یہ تو ظلم ہے۔ میں تجھے سینے سے لگا کر خوب پیار کرنا چاہتا ہوں۔"
"تصور میں تو جتنا مجھے پیار کرے گا، میں اتنی ہی خوبصورت نظر آؤں گی۔"
وہ بڑی دیر تک بحث کرتا رہا۔ نوری اُسے جواب دیتی رہی دوسرے دن ہسپتال سے چھٹی ہوئی تب بھی صمدو نے اسے لے جانے کی ضد کی۔ آخر اس کے مسلسل انکار سے جھنجھلا کر چلا گیا۔ اب اُس کا دودھ کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ وہ اپنے شہر کے مکان میں رہتا تھا۔ اس نے غصے میں سوچا تھا کہ اب کبھی نوری سے نہیں ملے گا، مگر وہ مجبور تھا۔ نوری کسی نہ کسی بہانے اس سے ملنے گئی تو وہ بھی کبھی کبھی اس کے ہوسٹل جا کر اس سے ملاقات کرنے لگا۔
ایک سال بعد اُس نے نوری سے مایوس ہو کر ایک شریف گھرانے کی عورت سے شادی کر لی۔ دو برس کے بعد وہ ایک بچے کا باپ بن گیا۔ پھر ہر دو سال چار سال کے بعد بچے ہونے لگے۔۔۔ خاندان بڑھنے لگا۔ اس کے تمام بچے نوری کے ہاتھوں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سب کی دائی ماں تھی۔ اس کی ضد پر صمدو تمام بچوں کو تعلیم دلا رہا تھا۔ گھر کا کوئی بھی مسئلہ ہوتا تو وہ اس سے ضرور مشورہ لیتا تھا اور اسی بہانے وہ نوری سے ملتا بھی رہتا تھا۔
اُس نے کتنی ہی بار اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ نوری نے بڑے پیار سے اُسے ٹال دیا۔ ایک بار اُس نے زبردستی اسے سینے سے لگانا چاہا۔ نوری چیخ کر بولی۔ "خبردار! آگے بڑھے گا تو میں چیخنا شروع کر دوں گی۔ یہاں سے تجھے بھاگنا پڑے گا، پھر میں تجھ سے کبھی نہیں ملوں گی۔"
صمدو کو اس پر بڑا غصہ آتا تھا، اور جتنا غصہ آتا تھا، اتنی ہی وہ پرکشش نظر آتی تھی۔ وہ خیال ہی خیال میں اسے جھنجھوڑتا رہتا تھا۔ اس طرح حقیقت کی دُنیا میں جسے جھنجھوڑ نہیں سکتا تھا، اس کی اہمیت بڑھ جاتی تھی۔
رفتہ رفتہ غصہ سرد پڑنے لگا کیونکہ بڑھاپا آ گیا تھا۔ بچے جوان ہو گئے تھے۔ نوری نے کہا۔ "اب ہمیں کبھی کبھی ملنا چاہیے۔ تم ہفتہ میں ایک بار میرے گھر آیا کرو۔ بچے جوان ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ہم گناہگار نہیں ہیں لیکن وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔"
صمدو نے بلا چون و چرا اس کا مشورہ مان لیا۔ اب ایک ہفتہ بعد ملن کی گھڑیاں آنے لگیں تو جدائی اور انتظار میں بڑا مزہ آنے لگا۔ وہ ہر ہفتے اُس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کرتا تھا۔ ہر ہفتے میں ایک دن عید ہوتی تھی۔ وہ کھڑی استری کئے ہوئے کلف دار کپڑے پہنے، آنکھوں میں سرمہ لگا کر جوتوں کو پالش سے چمکا کر کبھی پھولوں کا گلدستہ اور کبھی قیمتی تحفے لے کر نوری کے دروازے پر پہنچتا تھا۔ ادھر نوری قیامت کا سنگار کیے بیٹھی رہتی تھی۔

پھر ایک وقت آیا کہ تکلفات بھی ختم ہونے لگے۔ کیونکہ بہت زیادہ بڑھاپا آگیا تھا۔ نوری کے بال سفید ہو گئے تھے۔ صمدو کی کمر جھک گئی تھی۔ لیکن محبت ہر عمر میں سینہ تان کر چلتی ہے — وہ گلبرگ سے اچھرے تک نوری کے گھر پیدل آتا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس کار تھی مگر وہ جوان بچوں کے مصرف میں رہتی تھی۔ بسوں میں کبھی بھیڑ ہوتی تھی۔ کبھی تیز رفتار بسیں ایک بوڑھے کے لیے اسٹاپ پر نہیں رکتی تھیں۔ اس لیے وہ چھڑی ٹیکتا ہوا پیدل نوری کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

لاہور کی گرمی، برسات اور سردی تینوں ہی موسم غضبناک ہوتے ہیں۔ جب نوری دروازہ کھولتی تو وہ کبھی پسینے میں شرابور ہوتا۔ کبھی بارش میں تربتر نظر آتا اور کبھی سردی سے تھر تھر کانپتا ہوتا۔ وہ ہر حال میں ہفتہ کی شام کو اپنی محبوبہ کے آستانے پر ضرور پہنچ جاتا تھا۔

جب وہ پسینے میں شرابور ہو کر آتا تو نوری اس کے لیے پنکھا چلا دیتی۔ وہ بھیگ کر آتا تو اسے دوسرا جوڑا پہننے کے لیے دیتی اور وہ سردی سے کانپتا ہوا آتا تو اسے ہیٹر کے پاس بٹھا کر وہیں گرما گرم کافی تیار کرتی۔ نوری اس سے اٹھارہ برس چھوٹی تھی۔ مگر اس پر بھی اس قدر بڑھاپا آگیا تھا کہ صمدو کو کافی پیش کرتے وقت اس کے ہاتھ جذبات سے کم اور بڑھاپے سے زیادہ کانپتے تھے۔

صمدو اس کے ہاتھوں سے کبھی پیالی لے کر بولتا۔ "نوری! تو نے اپنی جوانی پر بڑا ظلم کیا۔"

"ایسا نہ کرتی تو آج میں بھی ان بوڑھوں کے کباڑ خانے میں نظر آتی۔ تو کسی بھی حسین اور پُرشباب عورت کو دیکھ لے، بڑھاپے تک اس کے چھیچھڑے اُدھڑ جاتے ہیں۔"

"عورت اپنے مرد کے ہاتھوں بوڑھی ہونے میں فخر محسوس کرتی ہے؟"

"ہاں۔ جس عورت کو یہ یقین ہو کہ اس کا مرد صرف اُس کا ہے۔ اور جسے یقین نہ ہو اور وہ ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھا چکی ہو، اُسے نوری بن جانا چاہیے۔"

وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے گرم پیالی کو ہونٹ سے لگا کر ایک گھونٹ لیا۔ پھر التجا کی۔ "اب تو ہم بالکل ہی بوڑھے اور ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اب تو اپنا ہاتھ پکڑنے دے۔"

وہ دل ہی دل میں بولی۔ میں نے ایک طویل جوانی کی قربانی دے کر اپنے مرد کو اپنا دیوانہ بنائے رکھا ہے۔ میں جب تک اس کے لیے نایاب ہوں یہ میرا طلب گار بنا رہے گا۔ میں اپنی آخری سانس تک اس کی ضرورت بنی رہوں گی۔ اس طرح جب میں مر جاؤں گی تب بھی اس کے اندر زندہ رہوں گی۔ یہ اپنے بیوی بچوں کو بھول سکتا ہے اپنے آپ کو بھول سکتا ہے لیکن مجھے کبھی نہیں بھلا سکے گا۔

صمدو نے پیالی کو ہیٹر کے پاس رکھ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس کا ہاتھ طلب کیا۔ "نوری! میری جان! باہر بڑی سردی ہے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے، مجھے ذرا گرمی پہنچا دے۔"

نوری نے اس کی کافی کی گرم پیالی اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اب اسے غصہ نہیں آتا تھا۔ ایسے وقت وہ مسکرا کر کہا کرتا۔

"خدا کی قسم۔ تجھ سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہے۔۔۔"

باہر سرد ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی ہڈیوں میں اترتی تھیں۔ اندر نوری کا کمرہ گرم ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی تک صمدو کی نظروں میں جوان اور انمول تھی۔ اتنی خوبصورت، اتنی اونچی تھی کہ وہاں تک ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔

محی الدین نواب

**بعض** حالات میں کھانا سامنے ہوتا ہے مگر بھوک نہیں لگتی۔ حسن و شباب پہلو میں ہوتا ہے مگر ہوس نہیں ہوتی۔ زیبی سہمی ہوئی سی صفدر کے شانہ پر سر رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ صفدر بھی خوف زدہ تھا۔ زیبی کے حسن کو شاعرانہ انداز میں دیکھنے کے بجائے دروازے کی طرف بار بار دیکھ رہا تھا۔ اُدھر سے موت آنے والی تھی۔

وہ دونوں ایک جھگی کے کچے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں کی نیم تاریکی اور سناٹے میں انھیں اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ زیبی رہ رہ کر پہلو بدل رہی تھی۔ صفدر نے دھیرے سے کہا: "تم نرم کے ملائم بستر پہ سوتی ہو، قیمتی صوفوں پر بیٹھتی ہو، یہاں تمھیں تکلیف پہنچ رہی ہے۔"

وہ آہستگی سے بولی: "میں تمھارے ساتھ کانٹوں پر چلنے آئی ہوں۔ میں نے اپنی مرضی سے اپنے گھر کے عیش و آرام کو چھوڑا ہے۔"

"تم نے اپنی وفا سے مجھے خرید لیا ہے۔ آج یہ ایک جھگی ہے — کسی دن میں یہاں تمھارے لیے ایک عالی شان کوٹھی بناؤں گا۔ تم نے میرے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔"

"تم مجھ سے بڑی قربانی دے رہے ہو۔ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہے ہو۔ ڈیڈی کے پالتو غنڈے پیشہ ور قاتل ہیں۔ وہ تو سامنا ہوتے ہی تمھیں بیدردی سے قتل کر دیں گے۔"

"میں موت کے ڈر سے تمھیں چھوڑ نہیں سکتا۔"

"میں بھی نہیں ڈرتی۔ میں بھی تمھارے ساتھ ہی مروں گی۔ صرف یہ سوچ کر سہم جاتی ہوں کہ پتہ نہیں وہ لوگ تم پر کیسے ظلم ڈھائیں گے۔ اللہ کرے وہ مر جائیں۔ اِدھر نہ آئیں۔"

وہ صفدر سے لگی ہوئی تھی۔ دشمنوں کو بددعائیں دے کر اور اُس سے لگ گئی۔ صفدر نے اُسے تھپکتے اور سہلاتے ہوئے کہا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا مگر یہ سوچ کر ڈرتا ہوں کہ میرے بعد تمھارے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جائے گا۔"

"میں تمھارے بعد زندہ رہوں گی ہی نہیں۔"

"زیبی! ہم دونوں میں مرنے کا حوصلہ ہے مگر ہمیں جینے کی باتیں کرنا چاہیے۔"

"یہ جو ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں تو یہ ہم جینے کے لیے ہی ایسا کر رہے ہیں۔ صبح سے ہم زندہ رہنے کے لیے کہاں نہیں گئے؟ جہاں گئے میرے رشتے داروں نے اور تمھارے دوستوں نے ڈیڈی کے خوف سے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔"

"ہاں۔ رشتوں اور دوستوں کو ایسے ہی وقت آزمایا جاتا ہے"

ہاں وہی محی الدین نواب ہیں جن کی تحریروں نے آپ کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ جب کبھی ڈائجسٹوں کی شاہکار کہانیوں کا ذکر آئے گا تو نواب صاحب کا نام سرِ فہرست ہوگا۔

انہی محی الدین نواب کی ایک خالصتاً طبع زاد کہانی پیشِ خدمت ہے۔ نواب صاحب محبت کے موضوع پر لکھتے رہے ہیں۔ لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے کیونکہ محبت انسان کا جذبۂ اول اور جذبۂ آخر ہے۔ محبت کے موضوع پر سب نے لکھا لیکن نواب صاحب کی تحریر سب سے مختلف ہے۔ پڑھیے اور دل پکڑیے۔

اور ہم نے آزما لیا۔ آخر میری امّی نے ہی ساتھ دیا۔"

زیبی عقیدت سے بولی: "تمھاری امّی بہت اچھی ہیں مگر وہ ہمیں کب تک یہاں چھپا کر رکھیں گی۔"

"آج یہ رات کسی طرح گزر جائے۔ کل صبح امّی کسی قاضی صاحب سے بات کریں گی۔ اگر بات بن گئی تو ہمارا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

"جب ہم راضی ہیں تو قاضی راضی کیوں نہ ہوگا؟"

صفدر نے جواب دیا: "اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق تم پندرہ برس کی ہو۔ تمھارا نکاح نہیں پڑھایا جا سکتا اور میں سترہ برس کا ہوں۔ امّی کہتی ہیں کہ ہم قانونی اعتبار سے نابالغ ہیں۔"

"پھر ہماری شادی کیسے ہوگی؟"

"جیسے بہت سی غیر قانونی شادیاں ہو جاتی ہیں۔ ویسے ہی ہماری ہو جائے گی۔ امّی نے ہم سے زیادہ دنیا کو دیکھا ہے۔ شادی کے بعد بھی وہ ہمیں چھپا کر رکھیں گی۔ جب تمھاری عمر زیادہ ہو جائے گی یا ہمارے بچے ہوں گے تو یہ شادی ظاہر کر دی جائے گی۔"

بچوں کی بات آئی تو زیبی نے اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ یہ ایسا سپنا ہوتا ہے کہ لڑکی اپنے ہونے والے بچے کو گود میں لے کر اپنے سامنے موت کو بھول جاتی ہے حالانکہ زیبی خود ابھی بچی تھی۔ پندرہ برس کی عمر ہوتی ہی کیا ہے۔ یہ تو بیسویں صدی کا اعجاز ہے کہ وہ بچوں کو بالغ عمر سے پہلے بالغ بنا دیتی ہے۔

عشق کچی عمر میں ہو یا پکی عمر میں وہ اپنے ساتھ مصائب کا ہجوم لے کر آتا ہے۔ مخالفت ہر عمر اور ہر مرحلہ پر ہوتی ہے۔

صفدر نے اس کی ٹھوڑی کو ایک انگلی سے اٹھا کر اس کے حسین چہرے کو اپنے چہرے کے قریب کیا۔ انھوں نے ایک فلم میں ایسا ہی ایک رومانٹک سین دیکھا تھا۔ وہ اردو فلم تھی۔ پھر انھوں نے ایک انگریزی فلم کے جذباتی منظر کو دہرایا۔ رات کی گہری خاموشی میں ان کے دل کی دھڑکنیں موسیقی سنا رہی تھیں۔ وہ محبت دیکھنے، پڑھنے اور سننے میں کچھ اور تھی اور خود برتنے کے دوران ان کے ہوش اڑا رہی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی: "تمھاری قسم میں مر جاؤں گی۔ پر ڈیڈی کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

"میں تمھارے ڈیڈی کے ہاتھوں مر جاؤں گا مگر تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔"

"صفدر! مجھے ہمیشہ یاد رکھو گے نا؟"

زیبی کے لہجے میں ایسی تڑپ ایسی التجا تھی جو نہ مٹنے والی تحریر کی طرح صفدر کے دماغ میں نقش ہو گئی۔ اس نے پیار سے اسے سمیٹ کر کہا: "بچھڑنے والوں کو یاد رکھا جاتا ہے۔ تم تو ہمیشہ میرے پاس ہو میرے پاس ہی رہو گی۔"

یہ عاشقانہ دعوے کہ "محبوبہ ہمیشہ پاس رہے گی" شاید ہی کبھی پورے ہوتے ہوں۔ صفدر کے منہ سے یہ بات نکلتے ہی رات کے سناٹے کو ٹھیس پہنچی۔ قریب ہی گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ جھگی کی دیواریں سرکنڈوں سے بنائی گئی تھیں۔ ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس ان دیواروں سے چھن چھن کر اندر آنے لگیں۔

زیبی سہم کر صفدر سے لپٹ گئی۔ گاڑیوں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں طمانچوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ فرار ہونے کے لیے جھگی کا پچھلا دروازہ نہیں تھا۔ سامنے والے دروازے کی طرف سے قدموں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔

وہ کانپتے ہوئے بولی: "ڈ۔ ڈ۔ ڈیڈی شاید ڈیڈی آ رہے ہیں۔"

صفدر مرنے مارنے پر تن کر کھڑا تھا۔ پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ زیبی کو ابھی تجربہ نہیں تھا کہ مرد کیا ہوتا ہے مگر اس سمے وہ "پتھر" اسے بہت اچھا لگا۔ اس کا مردانہ لڑکپن دشمن قوتوں سے ٹکرانے کے لیے تیار تھا۔

پھر وہ ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ دروازے پر اس کی امّی کی آواز سنائی دی تھی: "بیٹے صفدر، دروازہ کھولو۔ میں ہوں میں۔۔"

زیبی کی جان میں جان آئی۔ پھر بھی وہ گھبرا رہی تھی۔ ماں کی موجودگی نے کئی قدموں کی آوازوں کو بھلا دیا تھا لیکن وہ آوازیں لاشعور میں چھپی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے دل گھبرا رہا تھا۔ شعوری طور پر گھبراہٹ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ماں کی آواز پھر سنائی دی: "بیٹے! گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

صفدر نے آگے بڑھ کر دروازے کو ذرا سا کھولا۔ باہر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کئی لوگ نظر آئے۔ کسی کے ہاتھ میں ریوالور اور کسی کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ صفدر فوراً ہی دروازے کو بند کرنا چاہتا تھا لیکن آنے والے اس سے زیادہ تیز طرار تھے۔ دروازے پر ایک زور کی ٹھوکر پڑی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے چلا گیا۔ زیبی اس سے لپٹ کر رونے لگی: "نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

سب کے سب جھگی میں گھس آئے تھے۔ ان میں صفدر کی ماں اور زیبی کا باپ نمایاں تھے۔ زیبی اور صفدر ایک گوشہ میں ایک دوسرے سے چپک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک قوی ہیکل بدشکل غنڈے نے کہا: "وقار صاحب! آپ حکم دیں۔ میں اس چھوکرے کا

قیمہ بنا دوں گا۔“

صفدر نے گھونسہ تان کر کہا: ”ایک ایک کر کے آؤ، میں تم سب کو مار ڈالوں گا یا مر جاؤں گا۔“

سارے بدمعاش ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا: ”سالا ایک طمانچہ کھاتے ہی زمین میں دھنس جائے گا۔ یہاں اس کی قبر کھودنا ہی ہوگی۔“

زیبی کے ڈیڈی وقار احمد کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور سختی تھی۔ وہ صفدر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر وہ تمام بدمعاش صفدر کے ٹکڑے کر کے پھینک سکتے تھے مگر بیٹی کا، اپنی عزت کا معاملہ تھا۔ وہ بڑی خاموشی اور خوش اسلوبی سے اس معاملہ کو دبانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک سگار سلگاتے ہوئے صفدر کی ماں سے کہا: ”بھابی! اپنا وعدہ پورا کرو۔“

صفدر کی امی نے آگے بڑھ کر کہا: ”بیٹے! ہم غریب ہیں اور کمزور ہیں۔ وقار کے پاس دولت اور بدمعاش سب کچھ ہیں۔ یہ اپنے بدمعاشوں کے ساتھ ابھی میرے پاس آیا تھا۔ یہ اگر تنہا ہوتا تو میں اس سے نمٹ لیتی۔ تمہاری خوشی کے لیے قانون سے بھی ٹکرا جاتی مگر یہ لوگ ریوالور اور چاقو لیے تمہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔“

”امی! میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔“

”نہیں بیٹے! تمہاری زندگی تمہارے لیے کچھ نہ ہو، میرے لیے سب کچھ ہے۔ میں تمہیں قاتلوں کے حوالے نہیں کروں گی۔ میرے ساتھ چلو۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔ یہ لوگ زیبی کو لے جائیں گے تو میں اپنی جان دے دوں گا۔ ہر حال میں مجھے مرنا ہے یا پھر زیبی کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔“

وقار احمد نے سگار کا ایک کش لیا۔ پھر دھواں چھوڑتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا: ”اپنے اندر کمزوری ہو تو آدمی کو جھکنا پڑتا ہے۔ زیبی تم میری کمزوری ہو۔ آج تم نے مجھے جھکا دیا ہے۔“

اس نے سگار کا ایک اور کش لے کر تمام بدمعاشوں سے کہا: ”تم لوگ باہر جاؤ۔“

وہ تمام کرائے کے ٹٹو باہر چلے گئے۔ وقار احمد نے اپنے سگار کو دیکھا۔ اس کی آگ پر راکھ جم رہی تھی۔ وہ بڑی سوجھ بوجھ سے صفدر کو اپنی بیٹی کے وجود سے راکھ کی طرح جھاڑ سکتا تھا۔ اس نے سگار کی راکھ کو انگلی کے ایک ٹھوکے سے جھاڑتے ہوئے کہا: ”صفدر! جب تم ایک دوسرے کو مرنے کی حد تک چاہتے ہو تو میں تمہیں نہیں مار سکوں گا۔ زیبی سے تمہاری شادی ہوگی۔“

زیبی خوش ہو گئی۔ صفدر اور اس کی امی حیرانی سے وقار احمد کو دیکھنے لگے۔ وہ بولا: ”ہاں بھابی! جیسا کہ تم جانتی ہو۔ صفدر کا باپ میرا گہرا دوست تھا۔ میں دولت کے غرور میں دوستی کو بھول گیا تھا مگر یہ بچے اس دوستی کو پھر سے ایک نئے رشتہ میں بدلنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ منظور ہے۔“

زیبی دوڑ کر آئی اور باپ کے بازو سے لگ گئی۔ صفدر کی امی نے خوش ہو کر کہا: ”وقار تم دشمنی کو دوستی میں بدل رہے ہو، مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”یقین آ جانا چاہیے۔ میں ایک انسان ہوں، غلطی کر سکتا ہوں اور غلطی پر پچھتا بھی سکتا ہوں۔ سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ میری بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ میری بیٹی تمہاری بہو بنے گی مگر شادی کی عمر کو پہنچنے کے بعد.....“

صفدر نے تڑپ کر کہا: ”نہیں۔ یہ آپ ہمیں بہلا رہے ہیں۔“

وقار احمد نے کہا: ”بزرگوں کے درمیان بچوں کو نہیں بولنا چاہیے۔ ابھی تم دونوں کے پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ یوں بھی مرد کو پہلے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر سوسائٹی میں کوئی مقام حاصل کرنا چاہیے۔ تم خود کو زیبی کے قابل بناؤ۔ اس وقت تک میں اپنے وعدہ پر قائم رہوں گا۔“

صفدر کی امی نے کہا: ”بیٹے! وقار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ تم دونوں کی منگنی کر دیتے ہیں۔ بات پکی ہو جائے گی تو تم دونوں دل لگا کر تعلیم حاصل کرو گے۔“

صفدر نے زیبی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ زیبی نے شرما کر سر کو جھکایا۔ پھر ہولے سے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”مان جاؤ۔“

وہ مان گیا۔ وقار احمد نے کہا: ”اگلے ہفتہ کی شام کو منگنی کی رسم ادا کر دی جائے گی۔ زیبی چلو.....“

وہ بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے جھگی سے باہر لے گیا۔

صفدر کے لیے وہ رات گزارنا مشکل ہو گیا۔ ماں اسے گولی مار والے مکان میں لے آئی۔ خود سونے تک اسے نصیحتیں کرتی رہی: ”بیٹا! پڑھنے لکھنے میں دل لگاؤ۔ تمہارا باپ بہت دور اندیش تھا۔ چھ ہزار گز کا پلاٹ ہمارے لیے چھوڑ گیا ہے۔ کہتا تھا۔ صفدر کی ماں سوسائٹی کا علاقہ آگے چل کر بہت ترقی کرے گا۔ ہمارا پلاٹ سونے کے بھاؤ بکے گا۔ بیٹے! وہاں جو جھگی بنی ہوئی ہے۔ تم اپنی محنت سے اس کی جگہ شاندار کوٹھی اور دکانیں بناؤ۔ پھر ہمارے پاس بھی دولت ہوگی۔ زیبی سے شادی کرنے کے لیے ان کے برابر ہونا ضروری ہے۔“

صفدر ماں کی باتیں سنتا رہا اور خیال ہی خیال میں جنت کی جگہ زیبی کے لیے شیش محل تعمیر کرتا رہا۔ دوسری طرف زیبی کی آنکھوں سے بھی نیند اڑی ہوئی تھی۔ اُس کی خواب گاہ کے باہر وقار احمد کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔

وہ بستر پر اِدھر سے اُدھر کروٹ بدل رہی تھی۔ وقار احمد کا دماغ کہہ رہا تھا: "یہ اتنی سی عمر میں بدل گئی ہے۔ یہ اب بچی نہیں رہی۔ وہ ماں باپ احمق ہوتے ہیں جو جوان ہونے والے بچوں کو بچہ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔"

زیبی سر جھکائے سوچ رہی تھی۔ شرما رہی تھی پھر اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ باپ کا تجربہ چیخنے لگا: "اس کی شادی فوراً ہی کر دینا چاہیے نہیں تو یہ پھر گھر سے بھاگ جائے گی۔"

"کیا جس کے لیے گھر سے بھاگ جاتی ہے، اُسی سے شادی کر دی جائے؟"

"نہیں۔" وہ سوچتا ہوا کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ "اُس لڑکے کو میں یہاں قدم رکھنے نہیں دوں گا۔ بدمعاش نے میری بیٹی کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اگر میں اُس کی ماں کو اس کے قتل کی دھمکی نہ دیتا تو میری عزت خاک میں مل چکی ہوتی۔"

وہ ایک کمرے سے گزرتے ہوئے ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے ٹھٹھک گیا۔ آئینے میں اُس کا عکس ہنس رہا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا: "تیری عزت خاک میں مل چکی ہے۔ ہاں تیری بیٹی کے ذریعہ تیری دولت اُس کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور یہ دولت تیری کب ہے؟ کیا تو نے صفدر کے باپ کو دوست بن کر دھوکا نہیں دیا تھا؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" اُس نے غصہ سے کہا۔

آئینہ کی سطح پر صفدر کا باپ نظر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا: "مجھے پہچانو۔ میں صفدر کا باپ ہوں۔ تمہارا دوست ہوں حیدر علی شاہ۔ میں نے تمہیں دوست سمجھ کر کاروبار کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ تم نے کبھی نفع دیا، کبھی نقصان بتایا۔ خود دوسری کمپنیوں کے شیئرز چپ چاپ خریدتے رہے میرے منافع سے دوسرا کاروبار کرتے رہے۔ مجھے اس کی ہوا بھی لگنے نہیں دی۔ پھر ایک دن تم نے منحوس خبر سنائی کہ ہمارا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہے اور ہم لاکھوں روپے کے قرض دار ہو گئے ہیں۔ میں صدمے سے مر گیا۔ ہاں میں مر چکا ہوں مگر میرا بیٹا زندہ ہے۔ وہ تم سے کاروبار کا منافع نہیں، رشتہ مانگ رہا ہے۔"

وقار احمد آئینے سے دور پیچھے ہٹنے لگا: "نہیں۔ اُس لڑکے کے اندر تمہاری روح سما گئی ہے۔ جو دولت میں نے تم سے حاصل کی تھی وہی دولت وہ زیبی سے شادی کر کے چھین لینا چاہتا ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اُس سے پہلے ہی میں زیبی کو گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا ٹیلیفون کے پاس آیا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف رابطہ قائم ہوا تو آواز آئی: "ہیلو!"

وقار احمد نے کہا: "خاور! میں بول رہا ہوں۔"

"اوہ انکل آپ؟ اتنی رات کو؟ آپ حکم دیں میں آپ کے قدموں میں حاضر ہو جاؤں گا۔ میری جان کی ضرورت ہوگی۔ جان دے دوں گا۔"

وقار احمد نے ڈانٹ کر کہا: "چاپلوسی نہیں۔ کل صبح دس بجے میرے وکیل کے پاس پہنچ جاؤ۔ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اس لڑکی نے ثابت کر دیا ہے کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔"

"تھینک یو انکل۔ میں ٹیڑھی انگلی سے نکال لوں گا۔"

"تمہارا تحریری معاہدہ جو کچھ ہوگا، وہ تمہیں یاد ہے؟"

"جی ہاں۔ میں زیبی کے مہر کی رقم پانچ لاکھ روپے لکھوں گا۔ حالانکہ میں پانچ پیسے کا آدمی نہیں ہوں لیکن آپ مجھے اپنا یا زیبی کا پابند بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ شادی کے بعد آپ مجھے دو ہزار روپے جیب خرچ دیا کریں گے۔ اُس کے علاوہ میں آپ سے یا زیبی سے ایک نیا پیسہ بھی نہیں مانگوں گا۔ زیبی کے بچے آپ کی دولت اور جائداد کے وارث ہوں گے۔ اگر میں فرمانبردار گھر داماد ثابت ہوا تو آپ تھوڑی سی خیرات مجھے بھی دے دیں گے....."

"بس۔ صبح آ جانا....." یہ کہتے ہی وقار احمد نے ریسیور رکھ دیا۔

دوسری صبح اُس نے بیٹی سے کہا: "چلو۔ میں تمہیں اسکول پہنچا دوں گا۔"

"ڈیڈی۔ کیا آج ڈرائیور نہیں آیا؟"

"آیا ہے مگر میں جانتا ہوں صفدر کہیں راستے میں تمہارے لیے کھڑا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ ڈرائیور یہ تماشا دیکھے۔"

زیبی نے سر جھکا لیا۔ جب وہ باپ کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر کوٹھی کے احاطے سے نکلی تو صفدر بیچ راستے کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ وقار احمد نے گاڑی روکتے ہوئے کہا: "دروازہ کھولو۔ اُسے بیٹھنے کے لیے کہو۔"

زیبی نے خوش ہو کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا: "آؤ۔ آ جاؤ۔ ڈیڈی کہہ رہے ہیں۔"

وہ جھجکتے ہوئے آ کر زیبی کے پاس بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کر دیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اگلی سیٹ پر تینوں خاموش تھے۔ صفدر زیبی سے بہت سی باتیں کرنے آیا تھا لیکن وقار احمد نے مہربانی کر کے بتا دیا تھا جو لوگ دنیا دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ بڑے پیار سے مہربانیاں کر کے پیار کی زبان بندی کرتے ہیں۔

زیبی اُسے کن انکھیوں سے کبھی کبھی دیکھتی رہی۔ اُس نے دل کی زبان سے کہا: "میں نے کروٹیں بدل بدل کر رات گزاری ہے۔"

کیا میری آنکھیں تمھیں بتا رہی ہیں؟"

صفدر کے دل کی زبان نے کہا: "کیا بتاؤں کل کیسی قیامت کی رات تھی۔ وہ رات مجھے دنیا سے گزار دینا چاہتی تھی لیکن میں نے اُسے گزار دیا۔ صبح ہوتے ہی دوڑا ہوا تمھاری کوٹھی کے سامنے چلا آیا۔ جب تک تم میری دلھن نہیں بنو گی میں تمھارے لیے دوڑتا ہی رہوں گا۔"

دونوں کے دل کی باتیں دل ہی میں رہیں۔ اسکول آ گیا۔ زیبی نے کار سے اُترتے وقت حسرت سے صفدر کو دیکھا۔ اگر ڈرائیور نہ ہوتا تو وہ اسکول نہ جاتی۔ ڈرائیور کو رشوت دے کر صفدر کے ساتھ کسی گارڈن میں وقت گزارتی۔ اُس سے خوب جی بھر کے باتیں کرتی لیکن باپ کی موجودگی میں اُسے سر جھکا کر اسکول کی عمارت میں داخل ہونا پڑا۔

اُس کے جانے کے بعد وقار احمد نے صفدر سے کہا: "بیٹھو۔ میں شہر میں کہیں تمھیں ڈراپ کر دوں گا۔"

وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ وقار احمد نے پوچھا۔ "کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے کہ شادی سے پہلے زیبی کے پیچھے بھاگو گے تو ہماری بدنامی ہوگی؟"

"میں سمجھتا ہوں مگر پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں آپ ہی آپ اس کے لیے بھاگا چلا آتا ہوں۔"

"ہوں۔" اُس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر میں ایک بار تم دونوں کو ایک گھنٹے کے لیے ملنے کا موقع دیا جائے تو یہ بھاگ دوڑ ختم ہو جائے گی؟"

"جی۔ جی ہاں۔ ایسا ہو جائے تو میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ آج شام پانچ بجے ایک گھنٹے کے لیے میری کوٹھی میں آ جانا۔"

"کل بھی آؤں گا نا؟"

"ہاں۔ روز شام کو لیکن اُس کے بعد تم دونوں کہیں باہر ایک دوسرے سے نہیں ملو گے۔ وعدہ کرو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

وقار احمد صدر میں ایک جگہ اُسے گاڑی سے اُتار کر چلا گیا۔ صفدر ایک فوٹو گرافر کی دکان میں گیا۔ وہاں اُس نے اور زیبی نے ایک دن جو تصاویر مختلف زاویوں سے کھنچوائی تھیں۔ صفدر نے بل ادا کر کے تصویریں دیکھیں۔ زیبی ہر تصویر میں حسن کا شاہکار نظر آ رہی تھی۔ وہ بڑی دیر تک ان تصویروں ہی میں کھویا رہا۔ پھر انھیں جیب میں رکھ کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

شام کو ٹھیک پانچ بجے وہ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا۔ زیبی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ خوش ہو کر بولی: "ڈیڈی کہہ رہے تھے تم روز شام کو آیا کرو گے۔ یہ سچ ہے نا؟"

"ہاں سچ ہے۔ میں روز آیا کروں گا۔"

وہ لان کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ صفدر نے جیب سے تصویریں نکال کر دیتے ہوئے کہا: "ہماری تصویریں تیار ہو گئی ہیں۔"

وہ جھپٹ کر انھیں دیکھنے لگی: "او مائی گڈنس! کتنی خوب صورت تصویریں ہیں۔ تم بہت اسمارٹ لگ رہے ہو۔"

"یہ تصویریں بول رہی ہیں کہ تم سا حسین کوئی نہیں۔ میں تو بہت خراب لگ رہا ہوں۔"

وہ ناراض ہو کر بولی: "دیکھو جی میرے صفدر کو خراب بولو گے تو میں تم سے بات نہیں کروں گی۔ یہ ساری تصویریں میں رکھوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"یہ تمھارے ہی لیے لایا ہوں۔ ان کی ایک ایک کاپی میرے پاس گھر میں ہے۔"

"صفدر! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ڈیڈی اس طرح بدل جائیں گے۔ سچ خوشی کے مارے پڑھنے لکھنے میں دل نہیں لگ رہا ہے۔"

"میں حیران ہوں کہ تمھارے ڈیڈی کل تک میری جان کے دشمن تھے اب اتنے مہربان کیوں ہو گئے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ میرے ریت لے مجھے بہت پیار سے ڈیڈی کیا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ پہلے وہ ہمیں سیدھے راستے پر لانا چاہتے تھے اب خود سیدھے راستے پر آ گئے ہیں۔"

اتنے میں وقار احمد کی کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی اور پورچ میں آ کر رک گئی۔ وہ کار سے اُتر کر اُن کی طرف آتے ہوئے بولا: "زیبی! کل صبح ہم بائی پلین پشاور جائیں گے۔ پھر وہاں سے باڑے پہنچ کر شاپنگ کریں گے۔"

زیبی نے باپ کے اس اچانک فیصلے سے پریشان ہو کر صفدر کو دیکھا۔ پھر کہا: "ڈیڈی! شاپنگ کے لیے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو یہاں بھی ہو سکتی ہے۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا: "باڑے میں غیر ملکی اشیا کی کے قیمتی کپڑے ڈنر سیٹ اور آرائش کے سامان ملتے ہیں۔ تمھاری منگنی اور شادی کے لیے وہیں سے تمام سامان خریدا جائے گا۔ صفدر کے لیے بھی وہیں سے سوٹ پیس خریدیں گے۔"

وہ سر جھکا کر بولی: "تو پھر صفدر کو بھی ساتھ لے چلیں۔"

وقار احمد نے ہونٹ بھینچ کر اُسے دیکھا۔ پھر کہا: "شادی کے بعد اسے کہیں بھی ساتھ لے جانا مگر ابھی نہیں۔"

"ڈیڈی! میں نہیں جاؤں گی۔ آپ جا کر شاپنگ کر لیں۔"

وہ غصے میں بولا: "یہ تمھاری کیا ضد ہے۔ پہلے تو تم ایسی نافرمان نہیں تھیں؟"

"پہلے تو آپ میری ہر ضد پوری کر دیا کرتے تھے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں باپ ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کون سی ضد پوری کرنا چاہیے۔ کل تم میرے ساتھ چلو گی۔"

یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ کرسی پیچھے کی طرف گر پڑی۔ وہ قدموں کے دھماکے کرتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ زیبی نے آواز دی۔ "ڈیڈی! میں جاؤں گی۔"

صفدر مایوس ہو گیا۔ باپ نے خوشی سے پلٹ کر دیکھا۔ بیٹی نے کہا۔ "مگر صفدر کے ساتھ....."

صفدر نے اطمینان کی سانس لی۔ وقار احمد نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ گہری چبھتی ہوئی نظروں سے کبھی زیبی کو اور کبھی صفدر کو دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا۔ "اس لڑکی کی دیوانگی بڑھتی ہی جا رہی ہے صفدر نے اسے کیا گھول کر پلا دیا ہے؟ یہ ایک دن کے لیے بھی اس سے دور نہیں جانا چاہتی ہے مگر میں بھی اس کا باپ ہوں۔ اس کی دیوانگی ختم کر کے ہی رہوں گا۔"

سوچنے کے دوران اس نے غصے کو ضبط کر لیا۔ اپنی مٹھیاں کھول دیں۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔ "صفدر کو ابھی روک لو۔ یہ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا۔ اس وقت تک میں فیصلہ کروں گا کہ تم دونوں کو باڑے لے جایا جائے یا یہیں شاپنگ کی جائے۔"

"تھینک یو ڈیڈی۔"

وہ تیزی سے پلٹ کر کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ صفدر کرسی کھسکا کر زیبی کے پاس آیا۔ پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ "یو آر گریٹ۔ تم نے میرے بغیر جانے سے انکار کر دیا۔"

"میں تمہارے بغیر جنت میں جانے سے بھی انکار کر دوں گی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ تم سے دور رہ کر مجھے کیا ہونے لگتا ہے۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم نہیں ہو تو میرے اندر کچھ بھی نہیں ہے' جان بھی نہیں ہے۔"

"ہاں بچی۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

"زیبی! خدا دیکھ رہا ہے۔ وہ ہمیں کبھی بچھڑنے نہیں دے گا۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔"

کوٹھی کے اندر ڈرائنگ روم میں وقار احمد کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا باہر لان میں انہیں دیکھ رہا تھا اور اپنے کان سے ریسیور لگائے کہہ رہا تھا۔ "پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ زیبی نے صفدر کے بغیر باڑے جانے سے انکار کر دیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ پھر اس کے بعد بولا۔ "پہلے میں نے بھی یہی سوچا کہ صفدر کو ساتھ لے جائیں۔ وہاں جو کچھ ہو گا، اس کے سامنے ہو گا۔ تو پھر جو ہونا ہے یہاں کیوں نہ ہو جائے۔"

"نہیں انکل۔" دوسری طرف سے خاور کی آواز سنائی دی۔ "یہاں آپ کی عزت کا معاملہ ہے۔ ان دونوں میں سے اگر ایک بھی ہمارے قابو سے باہر ہوا تو یہاں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ نکاح کے بعد زیبی کسی دن بھاگ کر پھر صفدر اور اس کی ماں کے پاس جا سکتی ہے۔ وہ ویرانہ ہی ٹھیک رہے گا وہاں کوئی زیبی کو پناہ دینے والا نہیں ملے گا۔ آپ حکم دیں تو صفدر کو وہیں ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔"

"نہیں۔ میں خون خرابے سے باز رہنا چاہتا ہوں۔ کبھی بات کھلے گی تو میں قاتل کہلاؤں گا۔ میں صرف اپنی بیٹی کو اس سے دور کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کے بعد رفتہ رفتہ اس کا مزاج بدلتا جائے گا۔ یاد رکھو صفدر یہاں سے میرے ساتھ جائے گا اگر وہ اپنی ماں کے پاس واپس نہ پہنچا تو اس کے اغوا اور قتل کا ذمہ دار میں ٹھہرایا جاؤں گا۔ اس لیے وہاں اسے جانی نقصان نہ پہنچانا۔ سمجھ گئے؟ تم ابھی روانہ ہو جاؤ۔ ہم کل وہاں پہنچیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ کھڑکی کے باہر وہ دونوں لان میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے دوسری کھڑکی کے پاس جا کر پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ باغیچے کے پھولوں بھرے ایک گوشے میں زیبی صفدر کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ دونوں کہیں دور جاگتے سپنوں میں کھو گئے تھے۔ ایک دم خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ صرف وقار احمد تلملا رہا تھا۔

○

وہ پہاڑی علاقہ جنت کی مثال پیش کر رہا تھا۔ کراچی کے خشک علاقے سے وہاں پہنچ کر زیبی اور صفدر کو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے لیے زمین پر جنت بچھا دی گئی ہے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ اونچے پہاڑوں پر درخت اتنے اونچے تھے جیسے آسمان کو چھو رہے ہوں۔ سفید بادل ان سے لپٹ لپٹ کر گزر رہے تھے۔ زیبی پھولوں کی اس حسین وادی میں صفدر کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہی۔ جب اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ دونوں ڈاک بنگلے میں واپس آ گئے۔

وقار احمد نے انہیں یہ سمجھایا تھا کہ وہ یہاں قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے آئے ہیں۔ وہاں سے واپسی پر وہ باڑے جائیں گے۔ ویسے منصوبہ کچھ اور تھا۔ آج رات خاور کسی وقت ڈاکو بن کر آنے والا تھا۔ اس کے ساتھ ایک قاضی صاحب اور چند کرائے کے نقاب پوش ہوتے۔ خاور ریوالور کی نال وقار احمد کی کنپٹی پر رکھ کر کہتا کہ وہ شام کے وقت زیبی کو وادی میں دیکھ کر اسے پسند کر چکا تھا۔ اب اس سے نکاح پڑھوا کر اسے ساتھ لے جانے آیا ہے۔ اگر زیبی انکار کرے گی تو اس کے باپ کو گولی مار دی جائے گی۔

صفدر کے لیے سوچ لیا گیا تھا کہ اچانک اُس کے سر پر ضرب لگا کر اُسے بے ہوش کر دیا جائے گا تاکہ اطمینان سے زیبی کے ساتھ نکاح پڑھایا جا سکے۔ وہ اپنے باپ اور اپنے محبوب کی جان بچانے کے لیے خاور کے نکاح میں جانا قبول کر لے گی۔ یہ ایک ڈراما بھی تھا اور حقیقتاً نکاح بھی پڑھایا جانے والا تھا۔ وقار احمد یہ گوارا نہ کرتا کہ اس کا داماد خاور نکاح کے بغیر اُس کی بیٹی کو لے جائے۔

خاور اُسے بیوی بنانے کے بعد جہاں لے جا کر قید کرنے اور اُس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے والا تھا، وہ جگہ وقار احمد دیکھ چکا تھا۔ وہ تحریری معاہدے کے ذریعے خاور کو اپنے شکنجے میں رکھے ہوئے تھا۔ خاور کسی طرح بھی نہ فریب دے سکتا تھا، نہ زیبی کی زندگی برباد کر سکتا تھا۔

ڈرامے کے اختتام پر جب صفدر کو ہوش آتا تو وقار احمد رسیوں سے بندھا ہوا نظر آتا۔ وہ پریشان ہو کر رو رو کر صفدر کو بتاتا کہ زیبی کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے۔ وقار احمد جانتا تھا کہ اس کے بعد صفدر دیوانہ وار زیبی کو تلاش کرتا رہے گا مگر دیوانگی ساری عمر نہیں رہتی۔ وقت بڑے بڑے زخم بھر دیتا ہے۔ اسی طرح زیبی ناپسندیدہ شوہر سے کچھ دنوں اختلاف رکھے گی۔ پھر حالات سے مجبور ہو کر سمجھوتہ کر لے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ زیبی اور صفدر کا عشق ابتدائی جوانی کی بھول بن کر رہ جائے گا۔

اُنھوں نے ڈاک بنگلے کے ایک کمرے میں رات کا کھانا کھایا۔ زیبی اور صفدر خوب ہنس بول رہے تھے۔ وقار احمد بھی مسکرا رہا تھا۔ کھانے کے بعد اُس نے ڈاک بنگلے کے ملازم کو چائے لانے کے لیے کہا۔ حالانکہ وہ رات کو چائے نہیں پیتا تھا لیکن اس رات وہ داماد ڈاکو کے انتظار میں چائے پی کر جاگنا چاہتا تھا۔

ملازم برتن سمیٹ کر لے گیا پھر کافی دیر ہو گئی، وہ چائے لے کر واپس نہیں آیا۔ وقار احمد نے کہا۔ "صفدر! ذرا جا کر دیکھو وہ بوڑھا کہاں مر گیا ہے۔ چائے لانے میں اتنی دیر نہیں ہوتی۔"

صفدر اپنی جگہ سے اُٹھ کر کمرے سے باہر برآمدے میں آیا۔ برآمدے کے اندھیرے نے اچانک اُس کے سر پر ایک ضرب لگائی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ وہ اوندھے منہ برآمدے کی سیڑھی پر گرا۔ پھر لڑھکتا ہوا کچی زمین پر پہنچ کر بے ہوش ہو گیا۔

زیبی نے اُس کے کراہنے کی آواز سنی تھی۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر جاتی، کچھ لوگ رائفلیں لیے کمرے کے اندر گھس آئے۔ اُن کے سروں پر پگڑیاں تھیں۔ پگڑی کے ایک پلّے سے اُنھوں نے اپنے چہروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ صرف اُن کی خوف ناک آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

زیبی نے ایک چیخ ماری۔ ایک نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے قابو میں کیا۔ وہ کمرہ وہ ڈاکو وقار احمد کو قابو میں کر کے رسیوں سے باندھ رہے تھے۔ باقی دو ڈاکو سامان کی تلاشی لے رہے تھے۔ اُنھیں بریف کیس میں سے سو سو روپے کی بہت ساری گڈیاں ملیں۔ ایک سوٹ کیس سے زیبی کے زیورات ہاتھ آئے۔ اُس کے منہ اور آنکھوں کو بھی باندھ دیا گیا تھا۔ یہ صرف پندرہ بیس منٹ کا کھیل تھا۔ کھیل کے اختتام پر ڈاکو جاتے وقت زیبی کو کاندھے پر لاد کر لے گئے۔

وقار احمد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہ گیا۔ اُس کا منہ اور ہاتھ پاؤں ایسی سختی سے بندھے ہوئے تھے کہ وہ چیخ سکتا تھا، نہ حرکت کر سکتا تھا۔ غصے سے کسمساتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ خاور نے زبردست دھوکا دیا ہے۔ وہ خود نہیں آیا۔ کرائے کے ڈاکوؤں کو بھیج دیا۔ نقد رقم اور زیورات کے ساتھ زیبی کو بھی اٹھوا لیا۔ بدمعاش کمینہ نمک حرام.....

وہ دل ہی دل میں گالیاں دے رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ رسیوں سے آزاد ہوتے ہی وہ خاور کو ڈھونڈ نکالے گا۔ اپنی بیٹی کو واپس لانے کے بعد اُس نمک حرام کو عبرت ناک سزائیں دے گا۔

اتنے میں برآمدے کے چوبی فرش پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ صفدر لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی چوکھٹ سے لگ گیا۔ اُس کے سر سے بہتا ہوا لہو چہرے پر پھیل رہا تھا۔ اُس نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ "زے بی۔ زیبی کہاں ہے؟"

"اُوں اُوں....." وقار احمد کا منہ بندھا ہوا تھا۔

اُس نے آگے بڑھ کر منہ پر بندھے کپڑے کو کھولا پھر منہ میں ٹھنسے ہوئے کپڑے کو نکالا۔ وقار احمد نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے جلدی کھولو۔ ڈاکو زیبی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"نہیں۔" صفدر نے چیخ کر کہا۔ "زیبی کو کوئی نہیں لے جا سکتا۔" وہ پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگا۔ "میری زیبی کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا....."

وہ زیبی کو پکارتا ہوا دوڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وقار احمد نے چیخ کر کہا۔ "ارے کہاں جا رہے ہو۔ پہلے مجھے کھولو۔ میں پولیس والوں سے رابطہ قائم کروں گا۔ صفدر۔ ارے او صفدر کے بچے! لعنت ہے تیری دیوانگی پر....."

وہ چپ ہو گیا۔ اُس دیوانے کی آواز رات کی تاریکی اور سناٹے میں گونج رہی تھی۔ "زے بی۔ بی۔ بی۔ بی....."

زیبی کا نام پہاڑوں کی پستیوں سے بلندیوں تک تھرا رہا تھا۔ ایک عاشق کے دل کو مار رہا تھا اور ایک باپ کے دل کو تڑپا رہا تھا۔ صفدر کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ جانے وہ دیوانہ کتنی دور بھٹکنے چلا گیا تھا۔ پھر وہ پکار ختم ہو گئی۔ چاروں طرف موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔

وقار احمد کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے منہ کھولے گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کتنا وقت گزرا ہو گا کہ باہر برآمدے میں بہت سارے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر کمرے میں کتنے ہی نقاب پوش گھس آئے۔ ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا باقی لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور چاقو تھے۔ ایک قاضی صاحب بھی رجسٹر پکڑے ہوئے تھے۔ ایک نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد آہستگی سے پوچھا: "انکل یہ کیا؟ آپ بندھے ہوئے ہیں۔ زیبی اور صفدر کہاں ہیں؟"

وقار احمد نے غصے سے کہا: "نمک حرام! پہلے دو مرتبہ سے میری بیٹی کو اٹھا لیا۔ اب پوچھنے آیا ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

"ارے رے۔ توبہ توبہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" خالد رتیلی کھسیاتے ہوئے بولا: "انکل! غصہ تھوک کر ٹھنڈے دماغ سے سوچیے۔ جب زیبی میرے نکاح میں آ رہی تھی۔ مجھے ماہانہ دو ہزار روپے جیب خرچ ملنے والے تھے اور میرے ہونے والے بچے آپ کی دولت اور جائداد کے وارث بننے والے تھے تو کیا میں پاگل ہوں کہ زیبی کو کوئی دشمن کے لیے اٹھا کر لے جاؤں گا اور اپنا مستقبل برباد کر لوں گا؟"

یہ بات وقار احمد کی سمجھ میں آ گئی کہ وہ جو ڈرامہ کھیلنے والا تھا قدرت نے اسے سچ کر دکھایا ہے۔ وہ اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے چیخ پڑا: "ہائے میری بچی! تجھے کون اٹھا کر لے گیا؟ ہائے تجھے کہاں ڈھونڈوں؟"

وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

○

پہاڑی علاقہ کی راتیں بڑی سرد ہوتی ہیں۔ صفدر شاید زیبی کو تلاش کرتے کرتے سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتا لیکن ایک پولیس چوکی کے سامنے سے گزرتے وقت سپاہیوں نے اسے لہو سے تربتر دیکھ کر پکڑ لیا۔ وہ چیختا چلاتا رہا: "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ وہ لوگ زیبی کو مجھ سے دور لے جا رہے ہیں۔"

وہ خود کو چھڑا کر بار بار بھاگنا چاہتا تھا۔ تھانیدار کے حکم سے سپاہیوں نے اسے باندھ کر ابتدائی طبی امداد پہنچائی۔ اس کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی کہ اتنے میں وقار احمد فرحی بن کر آ گیا۔ اس نے چوری اور اغوا کی رپورٹ درج کرائی۔ زیبی کو زندہ سلامت واپس لانے کے لیے دس ہزار روپے کے انعام کا لالچ دیا۔ تھانیدار نے کہا: "آپ نے اس واردات کے تین گھنٹے بعد رپورٹ درج کرائی ہے۔ وہ ڈاکو میلوں کا سفر طے کر چکے ہوں گے۔ پولیس کا ہیڈ کوارٹر یہاں سے پندرہ میل دور ہے۔ جب تک ہم جیپ میں بیٹھ کر ہیڈ کوارٹر پہنچیں گے۔ ٹیلیفون اور وائرلیس کے ذریعہ ناکہ بندی کریں گے۔ اس وقت تک وہ ڈاکو آزاد علاقہ میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں ہماری طاقت اور اسلحہ کام نہیں آئیں گے۔ بہرحال آئیے ہم کوشش کرتے ہیں۔"

وہ سب جانے کے لیے اٹھ گئے۔ صفدر سردی سے کانپتے ہوئے بول رہا تھا: "میں جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کی قسم میں زیبی کو واپس لے آؤں گا۔"

اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ ایک سپاہی نے اسے چھو کر دیکھا پھر تھانے کے انچارج سے کہا: "جناب! یہ تو بخار میں پھنک رہا ہے۔ اس کا کیا کریں؟"

تھانے کے انچارج نے وقار احمد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وقار احمد نے کہا: "اسے کچھ ہو گیا تو اس کی ماں مجھے الزام دے گی۔ اسے فوراً کسی بڑے ہسپتال تک پہنچانا ہو گا۔"

تھانیدار نے حکم دیا: "اس جوان کو بھی لے چلو۔"

دو سپاہیوں نے اسے اچھی طرح کمبل میں لپیٹ کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ وہ تھرتھراتے ہوئے نقاہت سے بڑبڑا رہا تھا: "میں زیبی کو لانے جا رہا ہوں۔ زیبی۔ زیبی میں آ رہا ہوں زیبی۔۔۔"

جیپ کار ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوئی۔ وہ کمبل میں لپٹا ہوا ایک سپاہی کی طرف ڈھلک کر بیہوش ہو گیا۔ بڑی طویل بیہوشی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کتنے گھنٹے تک دنیا اس کے لیے مر چکی ہے۔ جب ذرا ہوش آیا تو اسے کسی ہسپتال کا ماحول محسوس ہوا۔ دن کی تیز روشنی کا بھی احساس ہوا۔ پھر اس نے ایک ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ اس پر جھکا ہوا تھا اور کسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔

اتنا کچھ دیکھنے کے بعد صفدر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس کی خشک زبان سے نکلا: "زے۔" پھر ہونٹوں سے نکلا: "بی۔" اس کے بعد وہ پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ ہوش آنے اور بیہوش ہونے کا ایک طویل سلسلہ رہا۔ وہ بند آنکھوں کے پیچھے زیبی کو گلے لگاتا رہا۔ اس کے ساتھ رنگ برنگے پھولوں کی وادیوں میں ہنستا گاتا رہا۔ پھر جب آنکھ کھلی تو زیبی نہیں تھی۔ اس کے بستر کے سرہانے اس کی امی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں: "بیٹا! بس کرو۔ یہ کیسی دیوانگی ہے کہ کسی کو نہیں پہچانتے۔ کسی کی آواز نہیں سنتے۔ زیبی کو پکارتے چلے جاتے ہو۔ نہ بیہوش ہو، نہ ہوش میں ہو۔ کیا اپنی ماں کو بھی نہیں پہچانو گے؟"

وہ بڑی نقاہت سے بولا: "ابھی زیبی میرے پاس تھی۔ کہاں چلی گئی؟"

"وہ جہاں بھی گئی ہے بیٹا۔ اب شاید کبھی واپس نہیں آئے گی۔ تمہیں اس حال میں یہاں پڑے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو بیٹے!"

اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس بار بے ہوشی نہیں تھی۔ وہ زیبی کو بند آنکھوں کے پیچھے دیکھنے کے لیے سو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ بات اُس کی سمجھ میں آنے لگی کہ جلد صحت یاب ہونا چاہیے۔ یوں بیمار اور کمزور رہے گا تو زیبی کو تلاش نہیں کرسکے گا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُسے تلاش کرے گا۔ اس یقین کے ساتھ وہ وقت پر کھانا کھانے لگا اور دوائیں استعمال کرنے لگا۔ وقار احمد روز سر جھکا کر اُس کے پاس آتا تھا۔ وہ بھی یقین دلاتا تھا کہ بڑی تندہی سے تلاش جاری ہے مگر جھکا ہوا سر کچھ اور کہتا تھا۔

تین ہفتے بعد اُسے ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ امی نے کہا "ہم گھر واپس جائیں گے۔"

وہ بولا "نہیں میں ڈاک بنگلے میں جاؤں گا۔ اُسے تلاش کروں گا۔"

وقار احمد نے کہا "پہلے میں نے دس ہزار روپے نقد انعام رکھا تھا۔ اب زیبی کو واپس لانے والا مجھ سے منہ مانگی رقم لے سکتا ہے۔ اس اعلان کے بعد پولیس والوں کے علاوہ دوسرے بھی جی جان سے میری بیٹی کو تلاش کررہے ہیں۔ آزاد قبائل کے سرداروں سے بھی بات چیت ہوچکی ہے۔ انھوں نے قسمیں کھا کر یقین دلایا ہے کہ زیبی علاقہ غیر میں نہیں ہے۔ ورنہ وہ منہ مانگی رقم لے کر واپس کردیتے۔"

اُس کی امی نے کہا "اب تم ہی بتاؤ۔ اُسے تلاش کرنے میں کوئی بھی کسر اٹھا رکھی ہے؟ ایسی کون سی جگہ رہ گئی ہے جہاں تم اُسے ڈھونڈنے جاؤ گے؟"

"امی! میں کہیں ڈھونڈنے نہیں جاؤں گا مگر دل کی تسلی کے لیے کچھ روز اُس ڈاک بنگلے میں رہنا چاہتا ہوں۔"

اُس کی تسلی کے لیے اُس کی امی اور وقار احمد نے اُس ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ وقار احمد اوپر سے چپ رہتا تھا مگر اندر سے خطاکار تھا۔ خود پر لعنت بھیجتا رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ کسی کی بدسلوکی پسند نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے اُس نے خاور اور زیبی کا باقاعدہ نکاح پڑھانا چاہا تھا۔ تحریری معاہدے کے ذریعہ خاور کو غلام بنا کر رکھنا چاہا تھا اور وہ غلام کبھی زیبی سے اونچی آواز میں بات نہیں کرسکتا تھا مگر اب جانے وہ ڈاکو اُس نازوں کی پالی سے کیسا سلوک کررہے ہوں گے۔ جس نے کبھی باپ کی جھڑکی نہیں سنی تھی۔ اب وہ نہ معلوم کیسے کیسے مظالم برداشت کررہی ہوگی۔ وہ زندہ بھی ہوگی یا مرچکی ہوگی؟

وقار احمد کبھی تنہائی میں دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔ بیٹی اغوا کی گئی تھی۔ اُس کا ذمہ دار باپ تھا اور اگر بیٹی قتل کردی گئی تو باپ ہی اُس کا قاتل کہلائے گا۔ بہت سے غیرت مند بیٹیوں کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتے ہیں۔ بیٹی کا ہلاک ہوجانا کم صدمہ کی بات ہے لیکن زیبی کو اٹھا کر لے جانے والوں نے اگر اُسے کہیں چکلے میں بٹھا دیا ہوگا تو بالواسطہ وہ باپ ہی اپنی بیٹی کا قاتل سمجھا جائے گا۔ ایسے ہی زہریلے احساسات تھے جو وقار احمد کو رلاتے رہتے تھے۔

صفدر چاہتا تھا کہ ساری عمر ڈاک بنگلے کے آس پاس بھٹکتا رہے۔ اُس کی دیوانگی کہتی تھی کہ زیبی واپس آئے گی لیکن اس کی واپسی کا انتظار کرنے کے لیے زندہ رہنا ضروری تھا۔ زندہ رہنے کے لیے روٹی اور دوائی کے لیے کمائی ضروری تھی۔ ماں اُسے سمجھا بجھا کر کراچی لے آئی۔ پہلے اُس نے سوچا بیٹے کو پڑھنے لکھنے میں مصروف رکھے گی۔ پھر پتہ چلا کہ وہ کتاب کے صفحات پر بھی زیبی کی صورت دیکھتا ہے۔ آخر ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ شادی کردی جائے۔ بیوی کی قربت کسی حد تک زیبی کو بھلا دے گی۔

ماں بڑی جلدی تدبیریں سوچ لیتی تھی مگر بیٹا ان تدابیر پر عمل نہیں کرتا تھا۔ وہ شادی کے نام سے بدکتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زیبی کے سوا کوئی اُس کی بیوی نہیں بنے گی۔ ایسا تو سبھی عاشق کہتے آئے ہیں۔ اگر لیلیٰ کے بعد مجنوں اور شیریں کے بعد فرہاد زندہ رہ جاتے تو وہ بھی رفتہ رفتہ زندگی کے تقاضے پورے کرنے پر مجبور ہوجاتے۔ دنیا والے اُن کے سر پر بھی سہرا باندھ دیتے۔ ماں پورے ایک برس تک بیٹے کے انکار کو اقرار میں بدلنے کی تدبیر کرتی رہی۔

ایک بار وہ بیمار ہوئی تو صفدر اُسے ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا "میں یہ دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں۔ انھیں استعمال کرو لیکن ایکسرے اور خون ٹیسٹ کرانا ضروری ہے۔"

ماں دوائیں استعمال کرنے لگی۔ چوبیس گھنٹے کے بعد خون اور ایکسرے . . . کی رپورٹ ملنے والی تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ ڈاکٹر کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں اُس نے ڈاکٹر کو اپنے بیٹے کی رام کہانی سنائی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولی "ڈاکٹر صاحب! آپ چاہیں تو میرے بیٹے کی شادی ہوسکتی ہے۔ وہ زیبی کو بھول سکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا "بیٹے پر آپ کی باتوں کا اثر نہیں ہوا۔ وہ میرا مشورہ کیسے مان لے گا؟"

"آپ صفدر سے اتنا کہہ دیں کہ مجھے کینسر ہوگیا ہے۔ میری زندگی چند روز کی ہے لہٰذا وہ مجھے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرے۔ صدمہ پہنچے گا تو میں چند روز بھی جی نہ سکوں گی۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "بہت ہی عمدہ تدبیر ہے۔ کسی کی دیوانگی کا علاج کرنا بھی میرا فرض ہے۔ میں آپ کی خاطر نہیں بلکہ فرض کی خاطر جھوٹ بولوں گا۔"

دوسرے دن صفدر ماں کے ساتھ ہسپتال پہنچا تو مریضوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ جب اُن کی باری آئی۔ وہ ماں بیٹے ڈاکٹر کے کمرے میں گئے تو ڈاکٹر نے کہا "خاتون! آپ کا مرض تشویش ناک نہیں ہے لیکن دواؤں کے سلسلے میں آپ کے بیٹے سے کچھ باتیں کرنا چاہتا

ہوں۔ آپ اس وقت تک کمپاؤنڈر کے پاس جا کر انجکشن لگوا لیں۔"

وہ پچھلے کمرے سے دوسرے کمرے میں کمپاؤنڈر کے پاس چلی گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا: "مسٹر! میں نے تمھاری والدہ کو جھوٹی تسلی دی ہے۔ تمھیں حقیقت بتا رہا ہوں کہ وہ سال ڈیڑھ سال کی مہمان ہیں۔ اُن کا مرض لاعلاج ہے۔"

اُس نے پریشان ہو کر پوچھا: "کیا ہو گیا ہے امّی کو؟"

"کینسر......"

صفدر کے دماغ کو ایک زور کا جھٹکا پہنچا۔ یکلخت ماں کی اہمیت سمجھ میں آئی کہ ماں کے بعد وہ دنیا میں بالکل تنہا رہ جائے گا۔ دو ہی عزیز ہستیاں تھیں۔ ایک گم ہو چکی تھی۔ دوسری بھی سدا کے لیے گم ہونے والی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا: "کوشش کرو کہ اس مختصر سی زندگی میں انھیں کوئی دکھ نہ ملے۔ انھیں ہمیشہ خوش رکھا کرو۔"

وہ پریشان حال ڈاکٹر کے پاس سے واپس آیا۔ ماں کے سامنے جبراً مسکرا رہا تھا۔ گھر پہنچ کر ماں نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا: "آہ! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں دکھ سہتے سہتے مر جاؤں گی۔"

وہ ماں کے سینے سے لگ کر بولا: "امّی! آپ مرنے کی باتیں نہ کریں۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ کو کیا دکھ پہنچ سکتا ہے؟"

"یہ صدمہ کیا کم ہے کہ میں تمھارے سر پر سہرا نہیں دیکھ سکتی۔ بہو کی بلائیں نہیں لے سکتی اور پوتے پوتیوں کو گود میں نہیں کھلا سکتی۔ بیٹے! میں تمھارے ساتھ دکھ سہتی آئی ہوں مگر تم میری خوشیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ کتنے خود غرض ہو تم؟"

اس روز سے صفدر کے اندر ایک نئی کشمکش شروع ہو گئی۔ وہ اپنی امّی کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اور وہ اداسی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ صبح و شام اسی خواہش کا اظہار تھا کہ ایک بہو اور پوتے پوتی کی ضرورت ہے۔ صفدر کی نظروں میں ایک دم توڑنے والی ماں کی وہ آخری خواہش تھی۔ بیٹے کو کسی پس و پیش کے بغیر اس خواہش کو پورا کرنا چاہیے تھا لیکن دل کہتا تھا: "زیبی آنے والی ہے۔ ایک دن اور انتظار کر لو۔ ابھی کسی سے شادی نہ کرو۔"

"ایک دن اور۔ ایک دن اور" کرتے کرتے دو ہفتے گزر گئے۔ پھر رشتے داروں اور محلے پڑوس کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس کی ماں کینسر کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ تب ہر طرف سے صفدر کو طعنے ملنے لگے۔ وہ اولاد ہی کیا جو ماں کے دودھ کا قرض ادا نہ کر سکے۔ جب لوگ طعنوں کے بعد اس پر لعنتیں بھیجنے لگے تو وہ شادی کے لیے مجبور ہو گیا۔

اُس کے راضی ہوتے ہی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی مثال پوری ہو گئی۔ ماں نے لڑکی پہلے سے دیکھ رکھی تھی۔ پہلے ہی چپکے رشتہ بھی طے کر چکی تھی۔ لہٰذا نکاح پڑھانے میں دیر نہ لگی۔ صفدر سہرا باندھتے وقت بھی زیبی کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ اچانک آ جائے تو وہ اس شادی سے انکار کر دے گا لیکن وہ نہ آئی۔ دولھا کو بارات کے ساتھ جانا پڑا اور دلھن لے کر واپس آنا پڑا۔

رات کو محلے کی لڑکیوں نے آ کے چھیڑ چھاڑ کر کے دلھن کے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔ وہ آدھی رات تک بہانے کرتا رہا۔ اب بھی دل میں یہی بات تھی کہ زیبی آ جائے تو وہ سارے بندھن توڑ کر اس کے ساتھ بھاگ جائے گا لیکن وہ نہیں آئی۔ آخر لڑکیاں اُسے کھینچتی ہوئی دلھن کے کمرے تک لے گئیں۔

اس کمرے کے دروازے پر ماں کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے لڑکیوں سے جانے کے لیے کہا۔ جب وہ چلی گئیں تو ماں نے بیٹے کا ہاتھ تھام کر کہا: "بیٹے! مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میں چند روز کی اس دنیا میں مہمان ہوں۔"

صفدر نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ پھر لپٹ کر رونے لگا: "نہیں امّی! آپ زندہ رہیں گی۔ آپ کی حیات بڑھانے کے لیے ہی میں نے شادی کی ہے۔"

"بیٹے! زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔ خدا کی مرضی سے میرا آخری وقت آ پہنچا ہو تو میری ایک آخری خواہش پوری کر دو۔ دلھن کے کمرے میں جانے سے پہلے وعدہ کرو کہ موت سے پہلے تم پوتے یا پوتی کو میری گود میں کھیلنے دو گے۔"

آہ! اُس نے سوچ رکھا تھا کہ سہاگ کے کمرے میں جا کر دلھن سے معذرت چاہے گا اور اُس سے ازدواجی رشتہ قائم نہیں کرے گا اور ماں کو اس بات کا علم نہیں ہونے دے گا۔ لیکن ماں کو اپنی موت کا علم ہو گیا تھا اور وہ پہلی بار پوتے یا پوتی کی خواہش کو آخری خواہش کہہ رہی تھی۔ اُس نے سر جھکا کر ماں سے وعدہ کیا۔ پھر دلھن کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

❋

صفدر نے پرائیویٹ اسٹڈی کے بعد میٹرک کا امتحان دیا۔ جس روز اس کو پاس ہونے کی اطلاع ملی۔ اسی روز اُس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اُس نے دونوں خوشخبریوں پر جبراً خوشی کا اظہار کیا تھا کیونکہ سینے کے اندر ابھی تک زیبی کے لیے ماتم جاری تھا۔

اُس کی بیوی روزینہ کو اُس کے عشق کا سارا حال معلوم تھا۔ اُس نے ناگواری سے پوچھا: "آج بیٹا پیدا ہوا ہے۔ کیا آج بھی آپ خوش نہیں ہوں گے؟"

وہ بولا: "تم دیکھ رہی ہو کہ میں خوش ہوں۔"

"میں دیکھ رہی ہوں اور سمجھ بھی رہی ہوں کہ آپ محض خوش ہونے کا فرض ادا کر رہے ہیں۔"

"کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں ہر حال میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔"

"نہیں۔ آپ مجھے اچھا کھلاتے اور پہناتے ہیں۔ مجھے تفریح کے لیے ساتھ لے جاتے ہیں لیکن آپ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ نہیں ہوتے۔ کبھی آپ مجھے پیار کرتے ہیں تو میں صاف محسوس کرتی ہوں کہ آپ مجھے زیبی سمجھ کر چوم رہے ہیں۔ یہ فرض کی ادائیگی نہیں، بے ایمانی ہے۔"

"اگر میں ایسا کرتا ہوں تو مجھے معاف کر دو۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ تم سے کبھی بے ایمانی نہ ہو۔"

روزینہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آپ بہت اچھے ہیں۔ میں بار بار جھگڑا کرنا چاہتی ہوں مگر آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ آپ اپنی الماری کی چابی مجھے دے دیں۔ میں زیبی کی تصویریں نکال کر کہیں چھپا دوں گی۔ پھر وہ تصویریں نہ آپ دیکھیں گے نہ اس کی یاد آیا کرے گی۔"

"نہیں روزینہ! ایسا نہ سوچو۔ میں نے زیبی کے صفدر کو جسم و جان سے تمہارے حوالے کر دیا لیکن اس کی تصویریں تمہیں نہیں دے سکتا۔ ایسا کبھی نہ سوچنا۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔ روزینہ نے کہا۔ "جب اس کی پوجا ہی کرنا تھی تو آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ کیا میں گونگی بہری ہوں کہ ظلم سہتی رہوں گی اور زبان سے اف نہیں کروں گی۔ آپ اچھی طرح سن لیں جب تک اسے نہیں بھولیں گے اس وقت تک میں میکے میں جا کر رہوں گی۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ جا چکا تھا۔ وہ مصلحت اندیش تھا۔ بعد میں اس نے غور کیا کہ زیبی محبت کی علامت ہے اور وہ روزینہ کی نظروں میں اپنی محبوبہ کو دشمن بنا رہا ہے۔ روزینہ بحیثیت بیوی جو مطالبات کرتی ہے وہ سب جائز ہیں۔

اچھی طرح سوچ بچار کے بعد وہ فوٹو گرافر کے پاس پہنچا۔ اس اسٹوڈیو میں زیبی کی تصاویر کے تمام نگیٹیوز موجود تھے۔ اس نے انھیں دوبارہ پرنٹ کرنے کا آرڈر دیا۔ دوسرے دن تصاویر کا دوسرا اسیٹ تیار ہو گیا۔ اس نے امانت کے طور پر وہ تصاویر اسٹوڈیو میں رکھیں۔ پھر روزینہ کے میکے پہنچا۔ وہ منہ پھلائے ہوئے تھی۔ صفدر نے الماری کی چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ مجھے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ یہ لو چابی۔ وہاں سے زیبی کی تمام تصویریں نکال لو۔ تم میری شریک حیات ہو۔ میں تمہیں ناراض نہیں کروں گا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کانٹا اپنے دل میں چبھ رہا ہو، اسے بیوی کے دل میں چبھونا دانش مندی نہیں ہو سکتی۔ صفدر رفتہ رفتہ سنبھلنے لگا۔ وہ روزینہ کے سامنے دماغی طور پر حاضر رہتا تھا۔ اسے ذرا بھی پتہ نہیں چلنے دیتا تھا کہ دماغ کے اندر زیبی کہیں چھپی ہوئی ہے۔

اس نے اپنے بیٹے کا نام عدنان رکھا۔ دو سال بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کا نام عاشی رکھا گیا۔ دادی اپنے پوتے اور پوتی کو کچھ عرصہ گود میں کھلانے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ پھر زندگی جیسے ایک ہی ڈگر پر چلنے لگی۔ بیوی، بچے اور چھوٹا سا کاروبار، ان تینوں کے ساتھ وہ مصروف رہتا تھا۔ زیبی اب بھی پیاس کی طرح لگتی تھی اور پیاس تو کبھی کبھی لگتی ہے۔ وہ ہر لمحے یاد کرنے کا سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔

وہ جگہ جہاں کبھی زیبی اور صفدر نے پناہ لی تھی، وہ چھ ہزار گز کے پلاٹ پر تھی اور وہ پلاٹ سوسائٹی کے علاقے میں تھا۔ پندرہ سال کے بعد وہ پلاٹ سونے کی طرح قیمتی ہو گیا۔ وہ کراچی شہر کا سب سے امیر کبیر اور مہنگا علاقہ بنتا گیا۔ صفدر نے ایک بینک سے بھاری رقم قرض لے کر وہاں ایک شان دار کوٹھی اور بہت بڑا شاپنگ سنٹر تعمیر کرایا۔ یعنی اس کا دھیان اور زیادہ کاروبار میں لگ گیا۔ اگلے پانچ برس میں اس کا شمار سوسائٹی کے رئیسوں میں ہونے لگا۔

عدنان اور عاشی جوان ہو گئے تھے۔ وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ دوسرے بچے اسکول جاتے تھے۔ صفدر کے پاس دو عالی شان کوٹھیاں، دو ایئر کنڈیشنڈ کاریں اور لاکھوں روپے کا بینک بیلنس تھا۔ دولت جتنی تیزی سے آ رہی تھی۔ جوانی اتنی ہی تیزی سے جا رہی تھی۔ سر کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو چلے تھے اور چہرے پر بڑھاپے والی سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔

پھر زندگی کے اس سنجیدہ موڑ پر اچانک زیبی واپس آ گئی۔

☆

برسات کی رات کسی نامراد عاشق کے مقدر کی طرح کالی تھی۔ کبھی کبھی بجلیاں دکھانے سے نظر آتا تھا کہ یہ دنیا اپنی جگہ موجود ہے۔ صفدر نے بارش کے چھینٹوں سے بچنے کے لیے کار کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھا لیے تھے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے کا راستہ روشن ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی رات کی ابتدا تھی۔ برسات کے موسم میں آٹھ بجے ہی آدھی رات محسوس ہوتی ہے۔ نیو کراچی کے ایک موڑ پر اچانک ہی کسی کی چیخیں سنائی دیں۔ کار کے مڑتے وقت ہیڈ لائٹس کی روشنی

ملتی ہوئی تین افراد تک پہنچی۔ ان میں دو مرد تھے اور وہ ایک لڑکی کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُس نے کار ایک جھٹکے سے روک دی۔

روشنی میں نہاتے ہی ایک بدمعاش چاقو کھول کر گرجنے لگا۔ "جندہ رہنا چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ یہاں سے ۔ ۔ ۔ ۔"

صفدر ڈیش بورڈ کھول کر اپنا ریوالور نکالتے ہوئے کار سے باہر آیا۔ پھر ایک ہوائی فائر کرتے ہوئے بولا "کون ہو تم لوگ؟ یہ لڑکی کون ہے؟"

پہلے فائر کی آواز کے ساتھ ہی وہ دونوں اُس لڑکی کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سمجھ گئے تھے کہ مقابل تگڑا ہے۔ دال نہیں گلے گی۔ لڑکی کیچڑ اور پانی میں اکڑوں بیٹھ گئی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ صفدر تیزی سے چلتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔ وہ دوسری طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ اُس کے میلے کپڑے اور پھٹا ہوا دوپٹہ دیکھ کر پتہ چل رہا تھا کہ وہ غریب ہے۔ اس نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟ اندھیری رات اور بارش میں یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ خاموشی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے ہاتھوں کی حرکتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ آنسو پونچھ رہی ہے۔ صفدر نے کہا "مجھے بارش میں بھیگنے کا شوق نہیں ہے۔ میری گاڑی میں بیٹھو میں تمھیں گھر پہنچا دوں گا۔ کہاں رہتی ہو؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی "ناگن چورنگی۔"

"میری گاڑی میں آؤ۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے اُس نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر راستہ ٹٹول کر اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہی تھی۔ ڈھونڈ رہی تھی کہ اس کا مددگار کہاں ہے؟ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں بھی اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اُس نے قریب پہنچ کر پوچھا "کیا تم اندھی ہو؟"

وہ دوسری طرف بھٹک رہی تھی۔ آواز سن کر اُس کی طرف گھوم گئی۔ صفدر کے سینے میں یکبارگی دل اچھل پڑا۔ وہ حیرانی سے چیخ پڑا "زیبی۔ تم۔ یہ تم ہو زیبی؟"

وہ چپ کھڑی تھی۔ اندھی آنکھیں پھیلائے جیسے اپنے محسن کو دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بارش کی باریک پھواریں اُس کے حسین چہرے کو بھگو رہی تھیں۔ صفدر نے اُس کے دونوں شانوں کو مضبوطی سے تھام کر کہا "مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم مجھے مل گئی ہو۔ کہاں گم ہو گئی تھیں زیبی؟ تم کہاں گم ہو گئی تھیں؟"

اُس نے آہستگی سے پوچھا "آ۔ آپ کون ہیں؟"

صفدر نے گہرے صدمے سے کہا "اوہ تم بینائی کھو چکی ہو اتنی مدت کے بعد مجھے دیکھ نہیں سکتیں۔ اتنی مدت کے بعد شاید میری آواز بدل گئی ہے۔ میں صفدر ہوں زیبی! تمھارا صفدر ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ پلکیں جھپکتی ہوئی بولی "معاف کیجیے۔ میں آپ کو نہیں پہچانتی۔ میرا نام زیبی نہیں سلطانہ ہے۔"

"اپنا نام نہ بدلو زیبی۔ نام بدلنے سے تم بدل نہیں جاؤ گی۔"

"دیکھیے آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میری آنکھیں نہیں ہیں پھر بھی میں اپنوں کو پہچان لیتی ہوں۔ آپ آنکھیں رکھتے ہوئے پہچاننے میں غلطی کر رہے ہیں۔"

وہ بے حد سنجیدہ لڑکی تھی۔ صفدر اُسے بے یقینی سے دیکھنے لگا کوئی بھی آنکھ والا، جو زیبی کو ایک بار دیکھ چکا ہو، وہ اس لڑکی کو پورے یقین سے زیبی کہے گا۔ اگر اس کا ناک نقشہ ذرا سا بھی مختلف ہوتا، قد و قامت میں فرق ہوتا تو شبہ کی گنجائش نکل آتی لیکن وہ سرتاپا زیبی ہی زیبی تھی۔

وہ بولی "خدا کے لیے مجھے بس اسٹاپ تک پہنچا دیں۔ میں خود ہی اپنے گھر پہنچ جاؤں گی۔"

اُس نے کہا "اس بارش میں پتہ نہیں تمھیں کتنی دیر بعد بس ملے۔ وہ بدمعاش پھر تمھارے پیچھے آئیں گے۔ آؤ میں تمھیں پہنچا دوں۔"

وہ اُس کا ہاتھ تھام کر گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ زیبی اُس کے ساتھ چل رہی تھی۔ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر پھولوں بھری وادیوں میں صفدر کا ہاتھ تھامے ناچ رہی تھی، گا رہی تھی۔ خوش رنگ حسین تتلی کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتی پھر رہی تھی۔ پھر وہ حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ کار کا دروازہ کھول کر اُس نے اُسے اگلی سیٹ پر بٹھایا پھر کار کی اگلی طرف سے گھوم کر اس کے برابر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے سینے میں دل ایک ضدی بچے کی طرح مچل رہا تھا۔ سینے کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر کہہ رہا تھا کہ اصل کی زیبی اُسے مل گئی ہے۔

وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "میں ناگن چورنگی کی طرف جا رہا ہوں۔ چورنگی کے کس طرف تمھارا مکان ہے؟"

"وہاں ایک دو منزلہ عمارت ہے۔ اُس کی دیواریں لال، پیلے، نیلے، سبز اور جامنی رنگ کی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اتنے سارے رنگ کسی اور عمارت کی دیواروں پر نہیں ہیں۔ اُس عمارت کے سامنے ایک میدان ہے وہاں کچھ جھگیاں ہیں۔ وہیں ایک جھگی میں ہم رہتے ہیں۔"

"ہم یعنی کون کون وہاں رہتے ہیں؟"

"میرے والدین اور ایک چھوٹا بھائی۔ ابا بوڑھے ہیں۔ بیمار رہتے ہیں۔ امی کپڑے سلائی کرتی ہیں۔ میں ایک گھر سے سلائی کے پیسے لینے آئی تھی۔ بارش شروع ہو گئی۔"

"تمھیں اس بارش میں باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم جھگی کے اندر بھی بھیگتے رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے نگاہوں کی پیاس بجھاتا جا رہا تھا۔ پھر اُس نے پوچھا: "کیا تمھاری آنکھیں پیدائشی طور پر خراب ہیں؟"

"نہیں۔ میں پندرہ برس کی عمر تک دیکھتی رہی۔ ویسے آنکھیں بچپن سے کمزور تھیں۔ رفتہ رفتہ بینائی جاتی رہی۔ سُنا ہے۔ دوسری آنکھیں لگ جاتی ہیں مگر اُس کے لیے اتنے روپے لگتے ہیں، جتنے ہم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

"ان شاء اللہ میں تمھاری بینائی واپس لاؤں گا۔"

وہ چند لمحوں تک چپ رہی۔ کار کے باہر بارش کا شور سنائی دیتا رہا۔ پھر اُس نے پوچھا: "آپ مجھ پر یہ مہربانی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے دیکھ سکو اور پہچان سکو۔"

وہ آنکھیں پھیلائے خلا کی تاریکیوں میں گھورتی رہی۔ پھر اسی نے سوال کیا: "کیا وہ میری ہم شکل تھی؟"

وہ اُسے دیکھتے ہوئے بولا: "ہاں۔ تم میں اور اس میں صرف اتنا فرق ہے کہ تم خود کو زیبی تسلیم نہیں کر رہی ہو۔"

"کیا وہ اس دنیا میں اب نہیں ہے؟"

"پتہ نہیں۔ جو نہ ملے، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ سب سنتے ہیں بائیس برس پہلے ڈاکو اُسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں اُس کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"آپ کے بیوی بچے ہیں؟"

"ہاں۔ میں زیبی کے سوا کسی کو اپنا نہیں سکتا تھا مگر امی کو کینسر ہو گیا تھا۔ اُن کی آخری خواہش تھی کہ میں شادی کر لوں۔ میری بیوی بہت اچھی ہے۔ بچے بڑے ہی پیارے ہیں۔ اُن سب کا پیار اپنی جگہ اٹل ہے لیکن انسان اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھولتا اور ایسی محبت جو حادثہ بن جائے وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔"

"کیا اب بھی آپ کا خیال ہے کہ میں زیبی ہوں؟"

"ہاں۔ میں نے اکثر کہانیوں میں پڑھا ہے۔ فلموں میں دیکھا ہے کہ کسی کی یادداشت گم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا ماضی بھول جاتا ہے۔ اپنوں کو پہچان نہیں سکتا۔ بلکہ خود کو پہچان نہیں سکتا۔ پھر اچانک یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمھاری یادداشت بھی واپس آ جائے تو تم خود کو زیبی اور مجھ کو صفدر کی حیثیت سے پہچان سکو۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ صفدر نے کہا: "ہاں۔ یہ یادداشت گم ہونے والی بات مضحکہ خیز ہے۔ پہلے میں بھی ہنستا تھا مگر تمھیں دیکھ کر دل سے دعا نکلی ہے کہ یہ بات سچ ہو جائے۔"

"آپ میری بینائی واپس لانا چاہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو دیکھ کر بھی نہ پہچان سکوں گی کیونکہ نہ میری یادداشت گم ہوئی ہے اور نہ ہی میں نے پہلے کبھی آپ کا نام سنا ہے۔ آپ میرے لیے جو بھاری رقم خرچ کریں گے وہ سب ضائع ہو گی۔ میں لینا نہیں چاہتی۔ میں کچھ اور چاہتی ہوں۔"

"بولو۔ مجھے تمھاری ہر بات منظور ہو گی۔"

"بینائی حاصل ہونے کے بعد میں ملازمت کروں گی اور ہر ماہ قسطوں میں آپ کی رقم ادا کرتی رہوں گی۔"

وہ سر ہلا کر بولا: "ٹھیک ہے۔ انسان کو خوددار ہونا چاہیے۔ لو ہم جھگیوں کے سامنے پہنچ گئے ہیں۔ کیا تم اپنے والدین سے مجھے ملاؤ گی؟"

اُس نے گاڑی روک دی۔ دوسری طرف سے آ کر اُس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ کار سے باہر آتے ہوئے بولی: "آپ ذرا سمجھیں جس جھگی کا دروازہ نہیں ہوگا، میں اس میں رہتی ہوں۔"

ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں مرد و عورت اپنی اپنی جھگیوں سے جھانکتے ہوئے انھیں دیکھ رہے تھے۔ صفدر نے اس کا ہاتھ تھام کر اُسے جھگی تک پہنچایا۔ ماں نے کہا: "سلطانہ! یہ کس کے ساتھ آئی ہو۔ یہ موٹر گاڑی دیکھ کر آس پاس کے لوگ کیا کہیں گے؟"

"امی! آج میں واپس نہ آتی تو لوگ اور زیادہ کہتے۔ وہ بدمعاش مجھے زبردستی اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ انھوں نے میری عزت بچائی ہے۔ کیا آپ انھیں اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گی؟"

ادھیڑ عمر کی عورت نے صفدر کو اندر بلایا۔ اُس نے جھگی میں قدم رکھتے ہوئے دیکھا۔ سرکنڈوں کی دیواریں بارانی ہواؤں کی زد میں لرز رہی تھیں۔ جیسے اب تب میں دھجیوں کی طرح اُڑ جائیں گی۔ چھت پر پلاسٹک کی پتلی سی چادر منڈھی ہوئی تھی۔ کتنی ہی جگہ سے پانی شاور کی طرح کچے فرش پر گر رہا تھا۔ بوڑھا باپ اور چھوٹا بیٹا ایک طرف سمٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ عالی شان کوٹھی میں رہنے والا صفدر ایک مدت کے بعد دیکھ رہا تھا کہ اتنے بڑے کراچی شہر میں لوگ غربت کی کیسی لعنتی زندگی گزار رہے ہیں۔

صفدر نے بوڑھے شخص کو سلام کرتے ہوئے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ پھر حیرانی سے بولا: "آپ کو تیز بخار ہے۔ یہاں تو آپ کو خدانہ کرے ڈبل نمونیہ ہو جائے گا۔"

سلطانہ کی ماں نے کہا: "ہمیں تو بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ پھر بھی ہم ڈھیٹ بن کر زندہ رہتے ہیں۔"

"یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ لوگ میرے فلیٹ میں چل کر رہیں۔ وہ فلیٹ یوں بھی خالی پڑا رہتا ہے۔ میں ابھی انھیں ڈاکٹر

کے پاس لے جا کر دوائی دلاؤں گا۔"
سلطانہ کی ماں نے گہری نظروں سے صفدر کو دیکھا۔ پھر سوچتی ہوئی نظروں سے جوان بیٹی کو دیکھا۔ اس کے بعد پوچھا۔
"آپ یہ مہربانیاں کیوں کر رہے ہیں؟"
"دیکھیے ان بڑے صاحب کو تیز بخار ہے۔ یہ بچہ بھیگ رہا ہے سردی میں ٹھٹھر رہا ہے۔ یہ سوالات کرنے اور میرے خلوص پر شبہ کرنے کا وقت نہیں ہے۔ آپ ابھی میری بات مان لیں۔ میرے ساتھ چلیں۔ اگر مجھ میں کوئی کھوٹ نظر آئے یا میری مہربانیوں سے کوئی نقصان پہنچے تو آپ اس جھگی میں واپس آجائیں۔"
بوڑھے نے کہا۔ "سلطانہ کی ماں! اس بابو کی بات مان لے۔ نہیں تو میں کانپتے کانپتے مر جاؤں گا۔ میرا دل کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس رحمت کا فرشتہ بھیجا ہے۔"
صفدر نے کہا۔ "ڈوبنے والے تنکے کا سہارا لیتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ تنکا بھی ان کے ساتھ ڈوب جائے گا۔ وہ تنکے کی قوت اور صداقت کو آزماتے ہیں۔ آپ بھی مجھے ایک بار آزمالیں۔"
ماں وہاں سے گھوم کر سلطانہ کے پاس گئی۔ پھر آہستگی سے پوچھا۔ "تم کیا کہتی ہو؟"
وہ خلا میں گھورتی ہوئی بولی۔ "امی! اتنی بڑی دنیا میں کسی پر تو بھروسہ کرنا ہی ہو گا۔"
ماں نے دھیمے سے پوچھا۔ "تم اپنی بات بولو۔ کیا تم اس پر بھروسہ کرلو گی؟"
سلطانہ نے سر جھکا لیا۔ چند لمحوں تک تذبذب میں رہی پھر بھولے سے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا۔

☆

عدنان نے میز پر سے کھانے کی ایک ڈش اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں۔ میں اور ڈیڈی کا انتظار نہیں کروں گا۔"
عاشی نے کہا۔ "بھائی جان! میں بھی انتظار کر رہی تھی کہ کوئی پہل کرے تو میں بھی شروع کروں۔"
اس نے بھی کھانا شروع کر دیا۔ عدنان نے روزینہ سے پوچھا۔ "ممی! آپ کیوں چپ بیٹھی ہیں۔ شروع ہو جائیے۔ سنا ہے پرانے زمانے کی عورتیں اپنے شوہروں سے پہلے نہیں کھاتی تھیں۔"
روزینہ نے کہا۔ "بیٹے! زمانہ پرانا ہو جاتا ہے۔ عورت پرانی نہیں ہوتی۔ یہ بیویاں جانتی ہیں کہ شوہر کو کھلا کر کھانے میں کتنا مزہ آتا ہے۔"
"آل رائٹ ممی! میں آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ بلکہ یہ چاہوں گا کہ عمیرا آپ کی بہو بن کر آئے تو آپ اسے بھی ایسی شوہر پرستی سکھائیں۔ میں بحیثیت شوہر بڑا پرکشش رہا کروں گا۔"
عاشی نے پوچھا۔ "بھائی جان! آپ عمیرا کو میری بھابی کب بنا رہے ہیں؟"
وہ بولا۔ "تم اپنی بات کرو۔ سنا ہے عمر خان سے تمہاری دوستی ہے۔"
"ہاں۔ دوستی تو ابھی خاصی ہے۔ جب یہ دوستی سیریس (سنجیدہ) ہو گی تو آپ کو بتاؤں گی۔"
روزینہ نے چڑ کر کہا۔ "تم دونوں ماں کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہو۔ شرم نہیں آتی؟"
"یہ لیجیے۔ شرم کیسی؟ آپ ایک نہ ایک دن عمیرا کو بہو اور عمر جیسے کسی جوان کو داماد بنائیں گی۔ کیا اس وقت بھی مجھے اور عاشی کو شرمانے کے لیے کہیں گی؟"
"اس وقت کی بات کچھ اور ہے۔"
"کچھ اور کیوں ہے۔ اس وقت تو اور زیادہ شرم آنا چاہیے کیونکہ میں عمیرا کے ساتھ اور عاشی آپ کے داماد کے ساتھ اعلانیہ دن رات رہیں گے۔"
عاشی نے کہا۔ "ممی! ہمیں ابھی شادی سے پہلے نہیں شرمانا چاہیے کیونکہ ہم اعلانیہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ صرف دوستی کرتے ہیں۔"
روزینہ نے کہا۔ "مجھے معاف کرو۔ میں تم لوگوں سے بحث نہیں کر سکتی۔ تمہارے باپ نے تم لوگوں کو بہت زیادہ آزاد خیال بنا دیا ہے۔"
اسی وقت صفدر کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ عاشی نے مسکرا کر کہا۔ "ڈیڈی کی عمر لمبی ہے۔ آپ نے ذکر چھیڑا، وہ آ گئے۔"
روزینہ مسکرانے لگی۔ عدنان نے پوچھا۔ "ممی! آپ ڈیڈی کے استقبال کے لیے نہیں جائیں گی؟"
روزینہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔ "نہیں۔ وہ دیر سے آئے ہیں۔ میں ذرا ناراضگی ظاہر کروں گی۔"
عاشی نے کہا۔ "واہ مسکرا بھی رہی ہیں اور ناراض بھی ہیں۔ بھائی جان ہوشیار! یہ ہماری ممی عمیرا بھابی کو بھی یہی داؤ پیچ سکھائیں گی۔"
عدنان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ صفدر کے گنگنانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بچوں نے بچپن سے اپنے باپ کو اس قدر سنجیدہ دیکھا تھا کہ اسے گنگناتے ہوئے کبھی نہیں سنا تھا۔ روزینہ بھی حیران تھی۔ ڈائننگ روم کے باہر وہ گنگناہٹ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ پھر ایک لمحے کے لیے چپ لگ گئی۔ دوسرے لمحے سیٹی کی آواز

سنائی دی۔ صفدر کسی طربیہ نغمہ کی دھن سیٹی پر بجا رہا تھا۔ عدنان نے ہنستے ہوئے کہا: "کمال ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے ڈیڈی پھر سے جوان ہو رہے ہیں۔"

عاشر نے کہا: "مجھے تو لگتا ہے جیسے ڈیڈی کو کوئی گمشدہ خزانہ مل گیا ہے....."

روزینہ نے ایک دم سے چونک کر بیٹے بیٹی کو دیکھا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔ اُس کا دل یک بیک گھبرانے لگا تھا۔ بیٹی کی بات تیر کی طرح لگی تھی۔ روزینہ اُس گمشدہ خزانہ کو بھول نہیں سکتی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں پہنچی۔ صفدر سیٹی بجاتے ہوئے گیلے کپڑے اتار رہا تھا۔ روزینہ کو دیکھتے ہی سیٹی تھم گئی۔ وہ بولا: "مجھے یاد ہے کہ آج میں نے گھر میں کھانے کا وعدہ کیا ہے۔ بارش کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ ابھی کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

وہ صفدر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی: "بچے کھا رہے ہیں اور آپ کو خوش دیکھ کر میرا پیٹ بھر گیا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا: "میں تو ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔"

"آج کی خوشی کچھ اور لگتی ہے۔ آج تو آپ جوانوں کی طرح سیٹی بجا رہے ہیں۔"

"ارے تو کیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں؟ ابھی تو میں جوان....."

ایسا کہتے وقت اُس کی نظر آئینہ پر گئی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ آئینہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آئینے کے بالکل قریب آیا۔ مونچھوں کے سیاہ بالوں سے سفیدی جھانک رہی تھی۔ کنپٹی کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو چلے تھے۔ اُس کے دل نے پہلی بار جھوٹ کہا: "یہ بال بڑھاپے سے نہیں، نزلے سے سفید ہو رہے ہیں۔"

ٹھیک ہے بال نزلے سے بھی سفید ہو جاتے ہیں لیکن آنکھوں کے نیچے جو نصف حلقے پڑ گئے تھے وہ سوتی جوانی اور جاگتے بڑھاپے کی علامت تھے۔ وہ اندر سے تھرّا گیا: "نن نہیں۔ ابھی ابھی تو میری زینی مجھے ملی ہے۔ ابھی میں بوڑھا کیسے ہو سکتا ہوں۔ یہ ظلم ہے میرے ساتھ ایک بھیانک مذاق ہے۔ میں جانتا ہوں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ زینی کے لیے میں کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔"

اُسے آئینے میں اپنے ساتھ زینی کا عکس نظر آیا۔ وہ دلہن بنی ہوئی کلی تھی۔ اُس کے گورے گلابی مکھڑے پر ایسی شادابی اور شگفتگی تھی جیسے صبح دم کی شبنم گلاب کی پتی کو دھو کر نکھار رہی ہو۔ اُس کے روبرو صفدر اور عمر رسیدہ نظر آ رہا تھا۔

آئینے کے اندر صفدر نے کہا: "زینی! دنیا والے جہنم میں جائیں۔ فیصلہ تم کرو گی۔ کیا میں بوڑھا ہوں؟ کیا میں تمہاری محبت کا حقدار نہیں ہوں؟"

وہ فیصلہ کرنے کے لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صفدر کو دیکھنے لگی تب اُس کو پتہ چلا کہ سلطانہ اُس کے بڑھاپے کو دیکھ نہیں سکتی۔ پتہ نہیں دیکھے گی تو اُس کا فیصلہ کیا ہو گا؟ ابھی تقدیر صفدر پر مہربان تھی۔ بائیس برس کے بعد ایک اندھی زینی ملی تھی۔ جب تک اُسے آنکھیں نہ ملتیں، تب تک وہ اپنی جوانی اور صفدر کے بڑھاپے کے فرق کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جب وہ دیکھنے لگے گی تو کیا فیصلہ کرے گی؟

یہ سوال صفدر کو تڑپانے لگا۔ اُس نے اپنے دل کو سمجھایا کہ بے حساب محبت کرنے والی زینی عمر کا حساب نہیں کرے گی۔ بائیس برس کا انتظار محض انتظار نہیں تھا بلکہ مسلسل دن رات کی عبادت تھی۔ اُسے عبادت کا صلہ ضرور ملے گا۔

روزینہ کی آواز پر صفدر چونک گیا۔ وہ پوچھ رہی تھی: "آپ اتنی دیر سے آئینے میں کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"آں۔ کچھ نہیں۔ بس سوچ رہا تھا کہ آدمی اس عمر میں سیٹی بجائے، ذرا خوش ہو کر گنگنائے تو اُس پر نکتہ چینی کیوں ہوتی ہے؟ کیا اس عمر میں ہم آدمی نہیں رہتے؟"

روزینہ نے کہا: "ہر عمر میں ہنسنے بولنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں اس حد سے آگے جانے والا عجوبہ بن جاتا ہے۔"

"یوں کہو کہ ہم عجوبہ بنائے جاتے ہیں۔ پھر کون کہتا ہے کہ میں بوڑھا ہوں؟ کیا اِس لیے کہ میرے بچے جوان ہیں؟"

"ہاں جوان بچوں کے والدین بوڑھے ہی کہلاتے ہیں۔"

"یہ غلط ہے۔ مرد اپنی محنت اور فولادی ارادوں سے جوان رہتا ہے۔ میں آج بھی ویسی ہی محنت کرتا ہوں جیسی بائیس برس پہلے کرتا تھا۔ پھر میں بوڑھا کیسے ہو گیا۔ میں آج کل کے جوانوں کی کلائی پکڑ لوں تو وہ چھڑا نہ سکیں۔ پھر میں کیسے بوڑھا ہو گیا؟"

روزینہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا: "اور ایک بار آئینہ دیکھ لیجیے۔"

صفدر نے ہونٹوں کو بھینچ کر اُسے دیکھا۔ پھر لباس بدلنے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔

❁

سلطانہ فوم کے ملائم بستر پر بیٹھی اپنی اندھیری دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اُس کی ماں چپ چاپ اُس کی صورت دیکھتی تھی۔ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ جوان بیٹی کیا سوچ رہی ہے لیکن اُس کے چہرے سے اُس کے دل کا حال معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔

دوسرے کمرے میں اُس کے ابو شاید سو گئے تھے۔ چار گھنٹے پہلے صفدر انہیں اس فلیٹ میں چھوڑ کر باہر گیا تھا۔ پھر ایک ڈاکٹر کو لے کر

آیا تھا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد دوائیں لکھ کر دی تھیں۔ وہ ڈاکٹر کو واپس پہنچانے گیا۔ واپسی میں دوائیں اور بہت سی کھانے کی چیزیں لے آیا تھا۔ دوائیں کھانے کے بعد اس کے ابو کو نیند آ گئی تھی۔ چھوٹا بھائی ارشد بھی پیٹ بھر کر کھانے کے بعد سو گیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا جیسے کوئی خواب ہو جیسے صبح آنکھ کھلے گی تو معلوم ہو گا کہ اچھے فلیٹ میں رہنے اور آرام سے سونے کا ایک سپنا تھا جو فوراً ہی گزر گیا۔

اچانک نصیب بدلتے ہیں تو بدنصیبوں کو یقین نہیں آتا۔ وہ کچھ دیر تک اُسے مقدر کا فریب سمجھتے ہیں صفدر کے جانے کے بعد سلطانہ کی امی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ سلطانہ نے پوچھا۔ "ابو سو گئے؟"

"ہاں سو گئے۔ زندگی میں پہلی بار قیمتی دوائیں اور دودھ پینے کو ملا ہے نیند تو ضرور آئے گی۔ ہمارے لیے کھانا بھی کسی بڑے ہوٹل سے آیا ہو گا۔ تم اس فلیٹ کو دیکھ نہیں سکتیں۔ پیارا سا ہے۔ بیڈ روم، ڈرائنگ ڈائننگ روم، ٹی وی لاؤنج، کچن اور اٹیچڈ باتھ روم ہیں۔ فرنیچر بہت ہی قیمتی اور خوب صورت ہے۔ ہم دعا مانگنے کے بعد بھی یہ سب کچھ پانے کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹی! یہ سب کیا ہے؟ میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"آپ کیوں گھبرا رہی ہیں؟"

"میں کیا بتاؤں جب خدا نہیں دیتا اور بندہ سب کچھ دیتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی خوف ناک خود غرضی چھپی ہوتی ہے۔ تم تو جوان ہو، خوب صورت ہو۔"

"ہمارے محسن کے لیے میں صرف زیبی ہوں۔"

"زیبی؟" ماں نے حیرانی سے پوچھا۔ "زیبی کا مطلب کیا ہوا؟"

"بائیس برس پہلے زیبی سے صفدر صاحب کی شادی ہونے والی تھی۔ ڈاکو اس لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔ پھر وہ کبھی نہیں ملی۔ آپ سمجھ لیں کہ آج انھیں زیبی مل گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں زیبی کی ہم شکل ہوں۔"

اس کی امی چند لمحوں تک اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر پوچھا۔ "تم کیا کہتی ہو؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "اگر میں دیکھتی تو کچھ کہتی۔ اب تو صرف سن سکتی ہوں۔ بعض لوگ اپنی گفتگو اور لہجے سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ صفدر صاحب نے درست کہا کہ ہم ڈوب رہے تھے لہٰذا ہمیں سہارا دینے والے کی صداقت کو آزمانا چاہیے۔"

اُس کی امی نے اُٹھ کر اس کے سر پر دعائیہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکیں۔ کیونکہ انھیں شرم آ رہی تھی۔ کیونکہ بیٹی خود کو داؤ پر لگا کر باپ کے لیے دوائیں، ماں کے لیے سہاگ کی سلامتی اور چھوٹے بھائی کے لیے ایک اچھا مستقبل خرید رہی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ صفدر شریف ہے یا بدمعاش، خوب صورت ہے یا بدصورت، جوان ہے یا بوڑھا؟ آنکھ والے تو بڑی بڑی ٹھوکریں کھاتے ہی ہیں۔ وہ اندھی اپنے خاندان والوں کے لیے ایک اندھا فیصلہ کرتے ہوئے بے مثال قربانی دے رہی تھی۔ اس کی امی نادم سی تھیں۔ خاموشی سے سر جھکا کر وہاں سے چلی گئیں۔

☆

صفدر رات بھر بے چین رہا۔ اپنی زیبی کو دیکھنے کے لیے صبح کا انتظار کرتا رہا۔ اُسے تھوڑی دیر کے لیے نیند آئی ہو گی یا پھر زیبی کے تصور میں اس طرح ڈوب گیا تھا کہ وہ محویت نیند بن گئی ہو گی۔ گھڑی کے الارم نے اُسے چونکا دیا۔ روزینہ کی بھی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے گھڑی کو دیکھا پھر پوچھا۔

"آپ نے چار بجے کا الارم کیوں سیٹ کیا تھا؟"

"صحت مند رہنے کے لیے صبح اٹھنا چاہیے۔"

"لیکن ابھی تو اندھیرا ہے۔"

"میدان پہنچنے تک صبح ہونے لگے گی۔"

"آپ کون سے میدان جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟"

"ورزش کرنے....."

وہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ اس عمر میں ورزش کریں گے؟"

"کیا تم مجھے بڑھاپے کا احساس دلا رہی ہو۔ شاید تمھیں نہیں معلوم کہ ورزش کسی بھی عمر میں کی جا سکتی ہے میرے ساتھ چلو۔ میں دوڑ کر دکھاؤں گا کہ میری سانس نہیں پھولتی ہے۔ میرے پھیپھڑے مضبوط ہیں۔"

"میں بیوی ہوں۔ مجھ سے زیادہ آپ کے پھیپھڑوں کو ڈاکٹر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ آپ پہلوان بننے کی کوشش میں بیمار پڑ جائیں گے۔"

"تم سے بحث کرنا فضول ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ ورزش پہلوان بننے کے لیے نہیں، صحت مند رہنے کے لیے کی جاتی ہے۔"

"صحت مند رہنے کے لیے یا پھر سے جوان بننے کے لیے؟"

روزینہ کے چبھتے ہوئے سوال پر اس نے گھور کر دیکھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ عدنان کی آواز سنائی دی۔ "ممی! یہ آدھی رات کو کیا جھگڑا ہو رہا ہے۔ پلیز ہماری نیند کا تو خیال کریں۔"

صفدر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ عدنان جماہی لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "بیٹے ادھر آؤ۔ اپنی ممی کو سمجھاؤ کہ جوان بیٹے کے باپ بھی ورزش کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ممی! اتنی سی بات پر جھگڑا نہ کریں۔ ڈیڈی کو

ورزش کے لیے صبح جگا دیں۔"
"بیٹے! صبح ہو چکی ہے۔"
"اچھا!" اس نے تعجب سے کہا۔ "کمال ہے۔ صبح ہو گئی اور سورج نہیں نکلا!"
ماشی اپنے بالوں پر برش پھیرتی ہوئی آئی۔ "میں نے گھڑی دیکھی ہے۔ چار بج کر بیس منٹ ہو چکے ہیں۔ ہم نے آج تک صبح نکلتے نہیں دیکھا۔ پتہ نہیں کس وقت نکلتا ہے۔"
روزینہ نے کہا۔ "تو پھر اپنے باپ کے ساتھ میدان تک جاؤ۔ آج وہاں سورج نکلے گا۔"
عدنان نے پوچھا۔ "کون سا میدان؟"
روزینہ چڑ کر بولی۔ "حشر کا میدان۔ وہاں تمہارے ڈیڈی دوبارہ جوان ہونے والے ہیں۔"
صفدر غصے سے پاؤں پٹختا ہوا خواب گاہ سے باہر آ گیا۔ اب سے پہلے عمر کا جھگڑا نہیں تھا۔ اب وہ طنز کا نشانہ بن رہا تھا۔ کار میں بیٹھ کر میدان کی طرف جاتے ہوئے اس نے حساب لگایا۔ جب زیبی جدا ہوئی تھی۔ تب وہ سترہ سال کا تھا۔ اب بائیس برس گزر چکے ہیں۔ اس حساب سے وہ انتالیس برس کا ہوا یعنی ابھی چالیس برس بھی نہیں ہوئے تھے اور روزینہ اسے بوڑھا کہہ رہی تھی۔ محض اس لیے کہ بچے جوان ہو گئے تھے۔
ایک میدان میں پہنچ کر اس نے کھلی فضا میں گہری گہری سانس لی۔ پھر اسکیپنگ کرنے لگا۔۔۔ یعنی پاؤں کے دونوں پنجوں کے بل اچھلنے لگا۔ پھر اس نے ایک لمبی دوڑ لگائی۔ جوان اسپورٹس مین بھی دوڑنے کے بعد ہانپنے لگتے ہیں۔ وہ بھی کار سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔ وہ ایک طویل مدت سے زیبی کے لیے دوڑ رہا تھا۔ بے شک وہ ہانپ سکتا تھا مگر تھک نہیں سکتا تھا۔
اس نے کار کے عقب نما آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ پچھلی رات آئینہ اسے ڈرا رہا تھا کہ زیبی کے پیچھے بھاگنے اور اس سے محبت کرنے کی عمر گزر چکی ہے۔ اب صبح کی ورزش یقین دلا رہی تھی کہ بال کہیں کہیں سے سفید ہو جائیں تو آدمی بوڑھا نہیں ہو جاتا۔ اس کی سانسیں اس کے قابو میں تھیں۔ وہ بڑھاپے کے کسی مرض میں مبتلا نہ تھا اور ابھی تو وہ صرف انتالیس برس کا تھا۔ اس نے خوش ہو کر بے اختیار ایک قہقہہ لگایا۔ صبح کی روشنی میں وہ قہقہہ میدانی فضا میں گونجتا گیا۔ دور تک اعلان کرتا گیا کہ محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔
وہ تین گھنٹے بعد ایک ڈاکٹر کی رہائش گاہ میں اس سے ملاقات کرنے گیا۔ ڈاکٹر آنکھوں کے علاج کا ماہر تھا۔ وہ بہت ہی معروف اور مہنگا ڈاکٹر تھا۔ صرف دولت مندوں کے لیے اس کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ اس نے سلطانہ کی آنکھوں کے معائنہ کا وقت مقرر کیا۔ پھر وہ ایک ایجنسی میں گیا۔ ایجنسی والے گھریلو ضروریات کا تمام سامان اپنی گاڑی میں گھر تک پہنچاتے تھے۔ اس نے کھانے پکانے کے تمام سامان کا آرڈر دیا۔ فلیٹ کا پتہ لکھوایا۔ رقم ادا کی۔ پھر دھڑکتے ہوئے دل سے سلطانہ عرف زیبی کے پاس پہنچ گیا۔
وہ غسل کرنے کے بعد فلیٹ کی لابی میں بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ سیاہ زلفوں کے گھیرے میں اس کا چہرہ یوں چمک رہا تھا۔ جیسے ابھی رات کی گود سے صبح طلوع ہو رہی ہو۔ صفدر نے اس کے ابو کی خیریت دریافت کی۔ پھر اس کی امی سے کہا۔ "میں نے ڈاکٹر سے وقت لے لیا ہے۔ آج شام کو وہ زیبی کی آنکھوں کا معائنہ کرے گا۔"
امی نے کہا۔ "بیٹے! تم بھول رہے ہو۔ میری بیٹی کا نام سلطانہ ہے۔"
"جی۔ جی ہاں۔ سلطانہ ہے۔ نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
"ہمارے لیے بہت فرق پڑتا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم چاہتے کیا ہو؟"
صفدر نے کہا۔ "اس فلیٹ میں تین بیڈ روم ہیں۔ کل رات میں نے تیسرے بیڈ روم کا دروازہ نہیں کھولا تھا۔ آپ میرے ساتھ وہاں تک چلیں۔ میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔"
اس نے بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھایا۔ سلطانہ کی امی ان کے ساتھ تیسرے کمرے تک آئیں۔ صفدر نے جیب سے چابی نکال کر اس دروازے کو کھولا۔ پھر اس کمرے میں قدم رکھتے ہی سلطانہ کے ماں باپ نے حیرانی سے دیکھا۔ چاروں طرف دیواروں پر ان کی بیٹی سلطانہ کی مختلف زاویوں کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ باپ نے کہا۔ "یہ تو ہماری بیٹی کی تصویریں ہیں۔"
صفدر نے کہا۔ "میں نے کل رات سے پہلے آپ کی بیٹی کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ زیبی کی تصویریں ہیں۔ آپ والدین ہو کر دھوکا کھا رہے ہیں۔ میں غیر ہو کر سلطانہ کو زیبی کہتا ہوں تو پھر کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ آپ نے پوچھا تھا۔ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں۔ میں سلطانہ کو زیبی کہنا چاہتا ہوں۔"
بوڑھا باپ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماں نے زیبی کی ایک تصویر کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "اگر سلطانہ کی مرضی نہ ہو تو؟"
"تو بھی میں اس کی آنکھوں کا علاج کراؤں گا۔ یہ فلیٹ اس کے نام لکھ دوں گا۔ آپ جہاں چاہیں اس کی شادی کر دیں۔"
"تم سلطانہ کے لیے یہ سب کچھ کیوں کرو گے جبکہ تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا؟"
"خاتون! میں نہیں جانتا کہ زیبی زندہ ہے یا نہیں؟ سلطانہ کو دور ہی دور سے خوشحال دیکھ کر دل کو اطمینان ہوتا رہے گا۔ یہ سب

بھی میں کسی لالچ کے لیے نہیں صرف اپنے اطمینان کے لیے کر رہا ہوں۔“
وہ زیبی کی تصویر کی طرف سے پلٹ کر بولیں۔ ”میں تمہاری محرومیوں کو سمجھ گئی ہوں مگر دنیا والے نہیں سمجھیں گے۔ ہمارے درمیان کوئی گہرا رشتہ ہونا چاہیے ورنہ تمہاری یہ امداد ہمیں بدنام کر دے گی۔“
صفدر نے کہا۔ ”آپ سلطانہ کی رضامندی حاصل کر لیں۔ میں بہرحال میں راضی ہوں لیکن رشتہ قائم کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔“
سلطانہ کے والدین نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ صفدر یہ بات کھل کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کا اجازت نامہ عدالت کے سامنے پیش کرنا پڑتا ہے۔ اور روزینہ سے اجازت حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اپنی زیبی کی خاطر پھر ایک بار دنیا جہان کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔
اُس نے کہا۔ ”حال میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بیٹی پہلے دیکھنے لگے۔ میرا خیال ہے وہ دو چار ماہ بعد دیکھنے لگے گی۔“
ماں نے کہا۔ ”اُس وقت تک ہمارا کوئی رشتہ نہ ہوگا۔ ہم تمہاری کوئی مدد قبول نہیں کریں گے۔ بہتر ہے کہ ہم اپنی جھگی میں واپس چلے جائیں۔“
”خدا کے لیے آپ واپس جانے کا فیصلہ نہ کریں۔ آخر ہمارے درمیان انسانیت کا رشتہ تو ہے۔“
”ہماری دنیا میں انسان سب کچھ مانتے ہیں لیکن ایسے انسانیت کے رشتے کو تسلیم نہیں کرتے جو ایک جوان لڑکی سے ہو۔ ہم کسی کو کیا جواب دیں گے کہ تم سلطانہ کے کیا لگتے ہو اور کیوں اُس کے کام آ رہے ہو؟“
صفدر اُلجھ گیا۔ کیونکہ رشتے کو پہلے اہمیت دی جا رہی تھی پہلے سلطانہ سے نکاح لازم قرار دیا جا رہا تھا اور یہ روزینہ کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اگر چوری چھپے نکاح پڑھایا جاتا تو روزینہ اور جوان بچے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔
سلطانہ دروازے کے پاس دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ بہت دیر سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اُس نے پوچھا۔ ”امّی! کیا اس کمرے میں میری تصویریں ہیں؟“
”نہیں بیٹی! یہ زیبی کی تصویریں ہیں مگر ہو بہو تم ہی تم ہو۔“
”امّی! کیا یہ تصویریں دیکھ کر دنیا والے آپ سے نہیں پوچھیں گے کہ میرا صفدر صاحب سے کیا رشتہ ہے۔ آپ مجھے یہاں سے لے جائیں تب بھی میں ان تصویروں میں موجود رہوں گی۔ آپ کتنوں کو جواب دیں گی کہ صفدر صاحب کے ساتھ سلطانہ کی نہیں زیبی کی تصویریں رہتی ہیں؟ ہم جھگی میں دن رات مرتے تھے اور جیتے تھے۔ کوئی رشتے دار ہمیں پوچھنے نہیں آیا۔ اب کوئی ہمارا رشتہ پوچھنے آئے گا تو میں جواب دوں گی مگر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ امّی! میں اس دنیا کو چھوکر دیکھنا چاہتی ہوں۔“
”مگر بیٹی.....“
”مگر وگر کچھ نہیں۔ آپ میری آنکھوں کے اندر آ کر دیکھیں یہاں کیسی ڈراؤنی تاریکی ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے اور میں جی رہی ہوں مگر اب ایسے نہیں جیوں گی۔ دنیا کو دیکھتے ہوئے زندہ رہنے کا حق مجھے بھی حاصل ہونا چاہیے امّی! میں صرف ایک ہی بات جانتی ہوں وہ یہ کہ مجھے بینائی چاہیے اور ہر حال میں چاہیے۔“
اُس کی باتوں سے سب کو چپ لگ گئی۔ اُس کی امّی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے کے باہر آئیں۔ بیٹی کے اُجلے چہرے کو دیکھا، جس کے پیچھے ایک بھیانک اندھیری دنیا تھی۔ پھر انھوں نے اپنا ہاتھ اُس کے شانے پر رکھ دیا۔ لوگ تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے فیصلے کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کر رہی تھی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔
شام کو وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار ہوئی۔ ابو بیمار تھے اس لیے امّی انھیں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھیں۔ وہ ارشد کو ساتھ لے کر صفدر کی کار میں بیٹھ گئی۔ راستے میں اُس نے کہا۔ ”صفدر صاحب! آپ مجھے خود غرض سمجھ رہے ہوں گے۔“
”بھلا میں کیوں ایسا سمجھوں گا۔“
”اس لیے کہ میں صرف بینائی حاصل کرنے کی خاطر —— آپ کی حمایت کر رہی ہوں۔ ورنہ میرے والدین آپ کی مخالفت کر رہے تھے۔“
وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہر شخص تھوڑا بہت خود غرض ہوتا ہے۔ میں بھی خود غرض ہوں کہ سلطانہ کی جیتی جاگتی شخصیت کو نظرانداز کر رہا ہوں اور تمہیں زیبی کا نام دے کر چاہنے لگا ہوں۔“
وہ بولی۔ ”چاہت کے ہر عمل میں چاہت ہی ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ بائیس برس سے میری تصویریں سجا رہے تھے۔ میرا ہی انتظار کر رہے تھے اور اب میرے ہی لیے ساری دنیا کو بھلا رہے ہیں۔ یہ میری سب سے بڑی جیت ہے۔“
وہ خوشی سے کھل گیا۔ ”تم خوب بولتی ہو۔ جی خوش کر دیتی ہو۔ ایک طویل اور تھکا دینے والے انتظار کے بعد جو خوشی نصیب ہوئی ہے، اُس کی قدر و قیمت کو صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ جی چاہتا ہے اپنی باقی زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے ساتھ گزار دوں اور میں ایسا کرنے کے لیے دنیا جہان کی مخالفتوں کا سامنا کروں گا۔ تم میرا ساتھ دو گی نا؟“
اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں کے درمیان محبت کا سمجھوتہ ہو گیا۔ صفدر نے اُس کے بھائی اور ماں باپ کے لیے ڈھیر سارے

کپڑے خریدے سلطانہ سے پوچھ پوچھ کر اُس کے سنگھار اور ضروریات کا تمام سامان خریدا۔ پھر وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر نے سلطانہ سے مختلف سوالات کیے۔ اُس کی آنکھوں کا معائنہ کیا۔ پھر خوش خبری سنائی کہ اُسے بینائی مل جائے گی۔ دو ماہ بعد موسم سرما کے آغاز میں آپریشن کیا جائے گا۔

سلطانہ اتنی خوش تھی کہ اُس کی اندھی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ واپسی میں جب صفدر اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھا تو سلطانہ نے ٹٹول کر اُس کے بازو کو تھام لیا۔ پھر بڑی عقیدت سے بولی۔ "میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "اچھا تو کیا محبت کرنے والے بھی ایک دوسرے پر احسان کرتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے، احسان نہیں کرتے مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی آپ کے لیے کچھ کروں۔"

وہ اُس کے گورے نازک ہاتھ کو تھام کر بولا۔ "میرے لیے کچھ کرنا چاہتی ہو تو اپنا ہاتھ مجھے دے دو۔ میرے لیے اس سے بڑی اور کوئی دولت نہیں ہے۔"

سلطانہ نے شرما کر مسکرا کر سر جھکا لیا۔

عشق اور عقل کبھی ایک ساتھ نہیں چلتے۔ کیونکہ عشق دنیا کو بھلا دیتا ہے۔ عقل کو تھپک کر سُلا دیتا ہے۔ صفدر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر زیادہ سے زیادہ وقت سلطانہ کے ساتھ گزارنے لگا۔ اپنے گھر، بیوی اور بچوں کی طرف سے غافل ہوتا گیا۔ روزینہ نے ایک روز پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ تمام دن کہاں رہتے ہیں؟ میں نے کئی بار فون کیا۔ آپ دفتر میں نہیں تھے۔"

"میں کاروبار کے سلسلے میں دفتر سے باہر رہتا ہوں تم دفتر میں فون نہ کیا کرو۔"

"فون کیوں نہ کروں؟ کیا میں آپ کی بیوی نہیں ہوں؟ دفتر میں آپ سے باتیں کرنا جرم ہے؟"

"بھئی میں نے کہہ دیا نا کہ میں دفتر سے باہر رہتا ہوں۔"

"ایسا کون سا کاروبار ہے کہ آپ نے دفتر سے باہر ایک دفتر کھول رکھا ہے۔ صبح جاتے ہیں تو خوب اسمارٹ بن کر خوشبو لگا کر رات کو دیر سے آتے ہیں تو آپ کے لباس میں کسی دوسرے کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔"

"اصل بات یہ ہے روزی! کہ تم نے اپنے اوپر بڑھاپا طاری کر لیا ہے۔ اس لیے میری چہک مہک اور میری سج دھج تمہارے ذہن پر گراں گزرتی ہے۔"

"آپ ہمیشہ باتیں بنا کر ٹال دیتے ہیں لیکن آج یہ ضرور پوچھ کر رہوں گی کہ آپ کسے پھانس رہے ہیں۔ کوئی عورت ہے یا دوشیزہ؟"

"کیا تم مجھے دوسری شادی کے لیے تحریری اجازت دو گی؟"

"میں مر جاؤں گی مگر اجازت نہیں دوں گی۔"

"پھر تو میں شادی نہیں کر سکوں گا۔ پھر تمہیں اس فکر میں گھلنا نہیں چاہیے کہ میں کسے پھانس رہا ہوں۔ تمہارا رشتہ مضبوط ہے۔ تمہاری اجازت کے بغیر کوئی میری شریکِ حیات نہیں بن سکتی۔ پھر تم خواہ مخواہ جھگڑا کیوں کرتی ہو؟"

"میں آپ کے لیے ہوں۔ آپ میرے لیے ہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ ایک لمحہ بھی کسی کے ساتھ گزاریں۔"

"ہاں یاد آیا۔ تم تو یہ بھی برداشت نہیں کرتی تھیں کہ میں زیبی کی تصویروں کے ساتھ تھوڑا وقت گزاروں۔ تقریباً بیس برس پہلے تم ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھیں۔ آخر میں نے تمہیں منانے کے لیے زیبی کی تمام تصویریں تمہارے حوالے کر دی تھیں۔"

روزینہ نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا زیبی واپس آگئی ہے؟"

وہ ذرا گڑبڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔ جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔"

"وہ اس دنیا سے نہیں گئی تھی۔ کہیں گم ہو گئی تھی۔ آج میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میں آپ کے ساتھ سہم سہم کر زندگی گزار رہی ہوں۔ ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ واپس آئے گی اور آپ کو مجھ سے چھین کر لے جائے گی۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" وہ منہ پھیر کر چلا گیا۔ حالانکہ وہ وہم نہیں تھا۔ وہ بیوی کے سامنے اعتراف نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کا اندیشہ درست ثابت ہو رہا ہے۔ ایک زیبی اُس کے شوہر کو اُس سے چھینتی جا رہی ہے۔

یوں دیکھا جائے تو روزینہ مظلوم تھی۔ مذہبی، قانونی اور اخلاقی لحاظ سے وہ... ہمدردی کے قابل تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ صفدر ظالم نہیں تھا۔ کوئی دیوانہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ تو محبت کے نام پر برسوں سے خود ہی عذاب سہتا آ رہا تھا۔ زیبی کے ساتھ بھی یہی المیہ تھا۔ سلطانہ بھی مجبور تھی کہ اُسے زیبی کی صورت ملی تھی اور صفدر کی دیوانگی نے اُسے خرید لیا تھا۔

اُس نے وہ فلیٹ سلطانہ کے نام کر دیا تھا۔ شام کو اس فلیٹ کے کاغذات اُس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "روزینہ کو شبہ ہو گیا ہے کہ مجھے زیبی واپس مل گئی ہے۔"

"آپ کب تک اپنے گھر والوں سے مجھے چھپاتے رہیں گے؟"

"یہ درست ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بینائی واپس آنے تک کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ کسی کو خبر نہ ہو کہ تم مجھے مل گئی ہو۔ ورنہ علاج میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔"

"اب میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اللہ! جب بینائی واپس آئے گی تو میں سب سے پہلے آپ کو دیکھوں گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اب تک میں تمھیں پا رہا ہوں۔ آنکھوں سے دیکھ کر سمجھو کہ تم بھی مجھے پا لو گی۔"

"کیا اس کے بعد آپ اپنے گھر والوں کو میرے متعلق بتائیں گے؟"

صفدر کچھ دیر خاموش رہا۔ اس نے سمندر کے ساحل پر اپنی کار روک دی۔ "آؤ۔ یہ سمندر کا ساحل ہے۔ ٹھنڈی ریت پر چہل قدمی کریں۔"

وہ دونوں کار سے باہر آئے۔ صفدر نے رہنمائی کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر آگے بڑھتے ہوئے بولا: "آج میں نے روزینہ سے پوچھا تھا کہ اگر زیبی مجھے مل جائے تو کیا وہ مجھے دوسری شادی کے لیے تحریری اجازت دے گی؟"

وہ بولی: "اور آپ کی شریکِ حیات نے انکار کر دیا۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں عورت ہوں اور عورت اپنے مرد کی محبت میں حصہ داری کبھی پسند نہیں کرتی۔ اگر میں بیوی ہوتی اور وہ آپ کی محبوبہ ہوتی میں تو میں بھی انھیں برداشت نہ کرتی۔"

"بڑی مشکل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ مسئلہ حل کیسے ہوگا؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولی: "ہم اتنے قریب آگئے ہیں کہ دوری اب ہمیں مار ڈالے گی۔ میرے والدین بھی مجھے طعنے دیں گے۔"

"تمھارے والدین کی زبانیں بند رکھنے کے لیے میں تمھارا علاج کرا رہا ہوں۔ وہ فلیٹ تمھارے نام کر دیا ہے۔ تمھارے ابا کے لیے ایک دکان کھلوا دی ہے تاکہ تمھارے گھر والے میرے محتاج نہ رہیں۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد اگر مجھے قانوناً تمھیں اپنانے کی اجازت نہ ملے تو مجھ سے ہمدردی ہونا چاہیے۔ طعنے نہیں ملنے چاہئیں۔"

"ہاں۔ آپ نے میرے گھر والوں کو میری بہت بڑی قیمت ادا کی ہے لیکن میرا کیا بنے گا؟ کیا مجھے بھی زیبی کی طرح دیار ملیں گی؟"

صفدر کے پاس ایسے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ٹھنڈی ریت پر اس کا ہاتھ تھامے چل رہا تھا۔ سمندر کی لہریں آ کر اس کے قدموں سے لپٹ رہی تھیں اور بار بار آ کر زیبی کی طرح واپس جا رہی تھیں۔

عدنان اور حمیرا ایک چٹان پر کھڑے ہوئے تھے۔ حمیرا آنکھوں سے دُور بین لگائے دُور کہیں دیکھ رہی تھی۔ عدنان نے کہا: "میری جان! میں دیکھنے کی چیز میں ہوں اور دُور بین کے بغیر نظر آ جاتا ہوں۔"

وہ بولی: "میں ایسا منظر دیکھ رہی ہوں جو دُور بین کے بغیر نظر نہیں آتا۔"

"اوہو۔ اب اسے آنکھوں سے ہٹاؤ۔ جبھی ہم پیار، رومانس کے لیے آئے ہیں۔"

وہ چہک کر بولی: "آہا مجھے تو انوکھا رومانس نظر آ رہا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہے اور ایک کم سن مگر جوان لڑکی ہے۔ ذرا تم بھی دیکھو۔"

حمیرا نے دُور بین عدنان کی طرف بڑھا دی۔ پھر ایک سمت ہاتھ بڑھا کر کہا: "وہ۔ اُدھر دیکھنا..."

عدنان نے آنکھوں سے دُور بین لگا کر دیکھا تو چونک پڑا۔ اس کے ڈیڈی ایک جوان لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ ساحل کے اس حصے میں اور کوئی نہ تھا۔ عدنان نے دُور بین کے لینس کو ان کے اور قریب ایڈجسٹ کرتے ہوئے دیکھا تو اسے اس لڑکی کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ وہ سوچنے لگا: "کون ہے یہ؟ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے؟ تعجب ہے میری یادداشت ایسی کمزور نہیں ہے۔ میں کسی حسین لڑکی کو ایک بار دیکھ کر بھول نہیں سکتا۔ اسے ضرور کہیں دیکھا ہے۔"

رات کو کھانے کی میز پر عدنان نے کہا: "ممی! ہمارے ڈیڈی تو واقعی جوان ہو چکے ہیں۔ آج میں نے ہاکس بے کی طرف انھیں ایک جوان لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔"

روزینہ نے پریشان ہو کر پوچھا: "کون تھی وہ لڑکی؟"

ہاشی نے کہا: "بھائی جان تو یونہی ہانکتے رہتے ہیں۔ کسی دوست کی بیٹی ہوگی۔ چاچا بھتیجی کا رشتہ ہوگا۔"

"جی نہیں۔" عدنان نے کہا: "میں نے دُور بین سے دیکھا ہے۔ ڈیڈی بہت زیادہ رومانٹک ہو رہے تھے۔ وہ ویران ساحل پر کسی دوست کی لڑکی کو کیوں لے جائیں گے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اس لڑکی کو پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔"

روزینہ کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ وہ سخت لہجے میں بولی: "عدنان! یاد کرو۔ تم نے اسے کہاں دیکھا ہے۔"

"میں تو سوچتے سوچتے تھک گیا۔ کچھ یاد نہیں آیا۔"

روزینہ کے دماغ میں زیبی کا نام گونج رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صفدر جیسا دیوانہ کسی دوسری لڑکی سے کبھی دلچسپی نہیں لے گا۔ اس نے عدنان سے کہا: "بیٹے! کئی برس پہلے میں اپنی الماری کے دراز میں کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔ تم میرے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ تم نے اس دراز میں ایک لڑکی کی تصویر دیکھ کر پوچھا تھا یہ کون ہے..."

عدنان نے اچانک میز پر ہاتھ مار کر کہا: "زیبی تھی۔ ممی! مجھے یاد آگیا۔ ڈیڈی کے ساتھ آج میں نے اسی تصویر والی لڑکی کو دیکھا ہے۔"

روزینہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی کرسی پیچھے کی طرف

اُلٹ گئی۔ اُس نے اپنی تسلی کے لیے بیٹے سے پوچھا۔ "تم نے دُور سے دیکھا ہوگا۔ تمھاری آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں۔"

"میں نے عمارکی دُوربین لگا کر دیکھا تھا۔ یوں سمجھیے کہ بالکل قریب سے دیکھا تھا۔"

روزینہ غصہ میں مٹھیاں بھینچ کر ٹہلنے لگی۔ پھر اُس نے بیٹے سے پوچھا۔ "تم نے اپنے ڈیڈی کے ساتھ جس لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ زیبی نہیں ہو سکتی۔ زیبی تو اب بوڑھی ہو چکی ہوگی۔"

"ممی! وہ بوڑھی ہو یا جوان مگر وہ زیبی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے بالوں میں خضاب لگایا ہو۔ جوان لڑکیوں کی طرح میک اَپ کیا ہو۔ دُوربین کی آنکھوں سے میں نے میک اَپ پر توجہ نہیں دی تھی مگر مجھے وہ تصویر والی یاد آگئی ہے۔"

"ہاں وہ جوان چھوکری بنی ہوگی۔" روزینہ ٹہلتے ہوئے اِدھر سے اُدھر گئی۔ پھر چیخ کر بولی۔ "یہ ہیں تمھارے باپ کے لچھن۔ بڑھاپے میں جوانی کے تماشے دکھا رہے ہیں۔"

وہ غصے میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آ جا رہی تھی۔ "میرا تو اُسی رات ماتھا ٹھنکا تھا۔ جب وہ گنگناتے اور سیٹیاں بجاتے گھر میں آئے تھے اور صبح اٹھ کر جوان بننے کے لیے ورزش کرنے گئے تھے۔"

عاشی نے سر ہلا کر کہا۔ "اب ہماری سمجھ میں آ رہا ہے کہ ڈیڈی بہت بدل گئے ہیں۔"

روزینہ نے کہا۔ "اور یہ تبدیلی تمھاری ماں کو جیتے جی مار ڈالے گی۔"

اسی وقت صفدر وہاں پہنچ گیا۔ ڈائننگ روم میں چند ساعتوں کے لیے سناٹا چھایا پھر روزینہ غصے سے کانپتے ہوئے بولی۔ "آگئے زیبی سے مل کر؟"

صفدر چونک گیا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "زیبی؟ کیا زیبی ابھی تک تمھارے دماغ پر سوار ہے؟ وہ بھلا مجھے کہاں ملے گی؟"

"سمندر کے پ..."

صفدر ایک بار پھر چونک گیا۔ سمجھ گیا کہ بھید کھل گیا ہے پھر بھی اُس نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ "کسی نے میرے خلاف تمھیں بہکایا ہے۔"

عدنان نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی ویری سوری تو ہے۔ ایک بیٹا اپنے باپ کے خلاف اپنی ماں کو بہکا نہیں سکتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے زیبی کو آپ کے ساتھ دیکھا ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تم نے دیکھا ہے۔ اس لیے یہ درست ہے۔"

روزینہ نے مٹھیاں بھینچ کر پوچھا۔ "وہ تو ایک مدت سے گم تھی۔ آپ کو کیسے مل گئی؟"

"وہ زیبی نہیں ہے۔ زیبی کی ہم شکل ہے۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اُس کا نام سلطانہ ہے۔"

عدنان نے کہا۔ "وہ زیبی ہو یا سلطانہ لیکن آپ کو اس عمر میں یہ زیب نہیں دیتا۔"

صفدر نے گرج کر پوچھا۔ "کس عمر کی بات کر رہے ہو؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں؟ اس لیے اب انسان نہیں رہا۔ برسوں پہلے میرا عزیز ترین رشتہ حالات نے توڑ دیا تھا۔ آج حالات وہ رشتہ جوڑ رہے ہیں تو میں انکار کر دوں؟ اِس لیے کہ میں بوڑھا ہوں اور بوڑھے انسان نہیں جانور ہوتے ہیں اور تمھارے خیال میں یہ جانور پچھلے رشتے بھول جاتے ہیں۔"

روزینہ نے جواب دیا۔ "ہم بوڑھے ہیں۔ محترم ہیں۔ جوان بچوں کی نظروں میں ہمارا احترام اسی وقت رہتا ہے جب ہم موجودہ رشتے نبھاتے ہیں۔ اگر آپ میرے حقوق چھین کر کسی بچھڑے ہوئے رشتے کو دیں گے تو یہ بچے اِس ناانصافی کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔"

صفدر نے پہلے عاشی کو پھر عدنان کو دیکھا۔ چند لمحوں تک دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے پھر صفدر نے پوچھا۔ "بیٹے! انصاف کرو گے؟"

"کیسا انصاف؟"

"یہی کہ تمھاری عمر میں مجھ سے میرا پیار چھین لیا گیا۔ اب وہ مجھے واپس مل رہا ہے۔ تم انصاف کرو کہ مجھے اس پیار کو قبول کرنا چاہیے۔"

"ڈیڈی اگر دنیا کی کوئی عدالت یہ کہہ دے کہ بیوی کے حقوق چھین کر محبوبہ کو دیے جائیں تو میں تسلیم کر لوں گا۔"

"میں تمھاری ماں کے حقوق نہیں چھین رہا ہوں۔ محبت نہ تمھاری ماں کی جاگیر ہے۔ نہ زیبی کی۔ محبت تقسیم ہونے والی چیز ہے۔ ہم جسے چاہیں اُسے محبت دے سکتے ہیں۔"

عاشی نے پوچھا۔ "ڈیڈی! کیا عورت بھی ایسا کر سکتی ہے؟ کیا ممی آپ کو چھوڑ کر اپنی محبت کسی کو دے سکتی ہیں؟"

صفدر نے ہونٹ بھینچ کر دیکھا۔ پھر وہاں سے جانے لگا۔ روزینہ نے کہا۔ "آپ کترا کر نہیں جا سکتے۔ اگر آج آپ نے زیبی کو چھوڑنے کا فیصلہ نہ کیا تو میں اُس کے گھر پہنچ کر فیصلہ کروں گی۔"

صفدر نے دروازے سے پلٹ کر کہا۔ "تم زیبی تک کبھی نہیں پہنچ سکو گی۔ کیونکہ جسے تمھارے بیٹے نے دیکھا ہے۔ وہ زیبی نہیں ہے۔"

وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔ عدنان نے کہا۔ "ممی! میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ زیبی تھی۔"

روزینہ نے کہا۔ "ہاں۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ تمھارے ڈیڈی

جھوٹ بول رہے ہیں تاکہ میں زیبی تک نہ پہنچ سکوں۔ میں ابھی جاؤں گی۔"

○

وقار احمد ایک ایزی چیئر پر بیٹھا سگار سلگا رہا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرے پر کہیں کہیں جھریاں پڑ گئی تھیں۔ سگار سلگاتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے جب اس نے سگار کا پہلا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے سر کو اٹھایا تو نظریں زیبی کی تصویر پر ٹھہر گئیں۔

زیبی کی وہ مسکراتی ہوئی تصویر مینٹل پیس پر رکھی ہوئی تھی۔ وقار احمد بالکل ساکت رہ گیا۔ اس نے دیکھا۔ تصویر کے فریم میں زیبی مسکراتے مسکراتے اداس ہو گئی تھی۔ کہہ رہی تھی "ڈیڈی اٹھا کر مجھے اٹھا کر لے گئے تو کیا ہوا؟ اب تو یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ اتنے عرصہ تک کوئی کسی کے لیے نہیں روتا مگر میں دیکھ رہی ہوں۔ صفدر ابھی تک اندر ہی اندر آنسوؤں میں بھیگ رہا ہے۔ وہ دیوانہ ابھی تک مجھے تلاش کر رہا ہے۔"

وقار احمد نے آنسو بھرے لہجے میں کہا۔ "میں بھی اب تک تمہارے لیے رو رہا ہوں۔"

"آپ کو نہیں رونا چاہیے ڈیڈی! یہ تو آپ ہی کا منصوبہ تھا کہ کوئی ڈاکو بن کر آئے اور مجھ سے جبراً نکاح پڑھا کر مجھے لے جائے۔ آپ ایک ساحر طاہر کی طرح جھوٹ موٹ چھیننا چاہتے تھے کو شیر آیا۔ شیر آیا۔ لیکن سچ مچ شیر آگیا۔ مجھے اپنی خوراک بنانے کیلیے لے گیا۔ اب آپ کو رونا نہیں چاہیے۔"

"میری بچی! میں کیسے بتاؤں کہ اپنی اس غلطی کو یاد کر کے اندر ہی اندر کیسے مرنے لگتا ہوں۔ کئی بار خودکشی کے لیے سوچا پھر امید نے سہارا دیا کہ تم واپس آؤ گی۔ ایک دن ضرور واپس آؤ گی۔ میں تمہارے انتظار میں روز مرتا ہوں۔ روز جیتا ہوں۔ اپنی غلطی کی سزا آپ پا رہا ہوں۔"

بیٹی کی تصویر خاموش تھی۔ باپ بھی خاموش تھا۔ دونوں کے درمیان دل کی زبان سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اچانک یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ملازم کی آواز سنائی دی۔ "جناب! بیگم صفدر علی شاہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"صفدر؟" وقار احمد نے حیرانی سے زیرِ لب کہا۔ "کیا اسی صفدر کی بیوی مجھ سے ملنے آئی ہے؟" اس نے بلند آواز سے کہا۔ "بھیج دو۔"

ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد روزینہ اور عدنان کمرے میں داخل ہوئے۔ وقار احمد نے پلٹ کر پوچھا۔ "فرمائیے؟"

روزینہ نے کہا۔ "میں آپ کی بیٹی زیبی سے ملنے آئی ہوں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "زیبی سے ملنے آئی ہو؟ کہاں ہے میری بچی؟ کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟ اس کی کوئی خبر سنی ہے؟ کس امید پر ملنے آئی ہو؟ تم اسے کیسے جانتی ہو؟"

اس کے سوالات ایسے تھے کہ ایک باپ کی لاعلمی ظاہر ہو رہی تھی۔ روزینہ نے کہا۔ "میں انہی صفدر کی شریکِ حیات ہوں جو کبھی آپ کے داماد بننے والے تھے۔"

"اچھا۔ سمجھ گیا۔ آؤ بیٹھو۔ کیا صفدر کو زیبی کی کوئی اطلاع ملی ہے؟"

روزینہ ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔ عدنان نے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ممی! یہی لڑکی ہے میں نے کہا نا کہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ کیوں جناب! یہ زیبی کی تصویر ہے نا؟"

وقار احمد نے جوشیلے انداز میں عدنان کا بازو تھام کر کہا۔ "ہاں یہی میری زیبی ہے۔ بیٹے تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ مجھے بتاؤ۔ جلدی بتاؤ۔ میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔"

عدنان نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج شام کو میں نے اسے سمندر کے کنارے دیکھا تھا۔ ہم یہ سوچ کر آئے ہیں کہ یہاں آپ کی بیٹی سے ملاقات ہو سکے گی۔"

وقار احمد نے مضطرب ہو کر کبھی روزینہ اور کبھی عدنان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "سمندر کے کنارے؟ مجھے وہاں لے چلو۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔"

روزینہ نے کہا۔ "وہ آپ کو نہیں ڈھونڈے گی۔ کیونکہ اسے میرا شوہر مل گیا ہے۔ وہ دونوں ہمارے پائیدار رشتوں کو بھول کر اپنی الگ دنیا بسائے ہیں۔ میرے شوہر نے زیبی کا پتہ بتانے سے انکار کیا تو ہمیں یہاں آنا پڑا۔"

وہ حیرانی سے روزینہ کی باتیں سننے کے بعد بولا۔ "میری بیٹی! اس شہر میں ہے۔ صفدر کے ساتھ ہے اور مجھ سے ملنے نہیں آئی۔" اس نے بیٹی کی تصویر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ! سمجھ گیا۔ یہ مجھ سے ناراض ہے۔ میں ابھی جاؤں گا اور اپنی بیٹی کو منا کر یہاں لاؤں گا۔ مجھے صفدر کے پاس لے چلو۔"

"انہوں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔"

"صفدر ساری دنیا سے چھپا سکتا ہے مگر ایک باپ سے اس کی بیٹی کو نہیں چھپا سکتا۔ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میں اپنی بیٹی کو یہاں لا کر رہوں گا۔"

روزینہ نے سر ہلا کر کہا۔ "میں یہی چاہتی ہوں۔"

وہ تینوں وہاں سے روانہ ہوئے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ صفدر کی کوٹھی میں پہنچے۔ گیراج میں صفدر کی کار موجود تھی لیکن وہ گھر میں

نہیں تھا۔ عاشی نے کہا: "ممی! آپ کے یہاں سے جانے کے بعد ڈیڈی یہ کہہ کر گئے تھے کہ ابھی آتے ہیں۔"

عدنان نے کہا: "گاڑی موجود ہے۔ شاید یہیں کہیں گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔"

وہ سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ رات کے ایک بجے روزمینہ نے کہا: "زیبی کی بات کھل گئی ہے۔ اس لیے اب وہ بڑی دیدہ دلیری سے رات بھی اسی کے ساتھ گزاریں گے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ کہیں جا کے مر جاؤں گی۔"

عدنان نے ماں کا سر اپنے شانے پر رکھ کر کہا: "ممی! یہ گھر آپ کا ہے۔ آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ جوان بیٹے آخر کس دن کام آتے ہیں۔ میں آپ کے لیے لڑتا رہوں گا۔ ڈیڈی کو بھی دوسری شادی نہیں کرنے دوں گا۔"

وقار احمد نے روزمینہ سے کہا: "تم بھی میری بیٹی ہو مجھے ایک بار زیبی مل جائے تو میں اسے تمہاری سوکن بننے نہیں دوں گا۔ میں تو صفدر پر حیران ہوں کہ اتنی عمر گزر جانے کے بعد بھی وہ سنجیدہ اور مصلحت اندیش نہ بن سکا۔ اپنا گھر اور بیوی بچوں کی زندگی برباد کر رہا ہے۔"

وہ سب باتیں کرتے رہے۔ صفدر کے خلاف محاذ بناتے رہے۔ عاشی چائے لا کر پلاتی رہی اور وہ صفدر کے انتظار میں وقت گزارتے رہے۔ حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ روزمینہ کا غصہ سے برا حال تھا۔ وقار احمد اپنی بیٹی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ عدنان نے کہا۔ "ممی! آپ ذرا صبر اور حوصلے سے کام لیں۔ ہمیں اب سوچنا چاہیے۔ ڈیڈی آئیں گے تو....."

روزمینہ جھنجلا کر بولی: "میں مر رہی ہوں اور تم سوچنے کیلیے کہہ رہے ہو۔"

"ممی! غصہ سے کام نہیں چلے گا۔ ڈیڈی کو آنے دیجیے ہم دو ٹوک فیصلہ کریں گے۔"

"اور اگر وہ نہ آئیں تو؟"

"ضرور آئیں گے۔" عاشی نے کہا: "ڈیڈی ہمیں بہت چاہتے ہیں۔ وہ ضرور آئیں گے۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ عاشی نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے صفدر کی آواز سن کر چہکتی ہوئی بولی۔ "اوہ ڈیڈی! ابھی میں ممی سے کہہ رہی تھی کہ آپ ہمیں بہت چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں نہیں بھولیں گے ضرور واپس آئیں گے۔"

"ہاں بیٹے! میں تم لوگوں سے دور نہیں ہوں۔ میں جلدی آؤں گا۔"

روزمینہ نے بیٹی سے ریسیور چھین کر پوچھا: "آپ کہاں ہیں؟ رات کو گھر کیوں نہیں آئے؟"

"روزمینہ! مجھ پر بھروسہ کرو۔ ہمارا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ تمہارے شک و شبہ سے نہیں ٹوٹ سکے گا۔ زیبی کا ایک الگ مسئلہ ہے۔ میں اسے تمہارے گھر اور تمہارے بچوں پر اثر انداز نہیں ہونے دوں گا۔ وہ کبھی تمہارا کوئی حق نہیں چھینے گی۔"

روزمینہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وقار احمد نے ریسیور چھین کر کہا: "صفدر! میری آواز پہچانو۔ میں وقار بول رہا ہوں۔ میں زیبی کا باپ ہوں۔ بیٹے! خدا کے لیے میری بیٹی کو فوراً مجھ سے ملاؤ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔"

صفدر نے کہا: "وہ آپ کی بیٹی نہیں ہے۔ آپ اس معاملے میں نہ پڑیں۔"

"وہ میری بیٹی ہے۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔"

"آپ روزمینہ کو ریسیور دیں۔ وہ آپ کی بیٹی نہیں ہے۔"

"ہے میری بیٹی ہے۔ مجھے ایک بار اس سے ملا دو۔"

عدنان نے اس سے ریسیور چھین کر کہا: "ڈیڈی! سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ آپ یہاں آ جائیں۔"

"میں بہت مصروف ہوں۔ شام تک آؤں گا۔"

"تو پھر شام ہی کو باتیں ہوں گی۔"

بیٹے نے ریسیور رکھ دیا۔ وقار احمد نے کہا: "تم نے ریسیور کیوں رکھ دیا؟ اب میں کس سے باتیں کروں؟ کیسے زیبی تک پہنچوں؟"

دوسری طرف صفدر نے "ہیلو ہیلو!" کہہ کر آواز دی پھر سمجھ گیا کہ بیٹے نے ریسیور رکھ دیا ہے۔ باپ کی پوری بات نہ سننا گستاخی ہوتی ہے۔ باپ نے خود گستاخی کا موقعہ دیا تھا۔ اس نے تشویش سے سوچتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

سلطانہ کا علاج ضروری تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق اُس نے سلطانہ کو ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ایک ہفتہ بعد آپریشن ہونے والا تھا۔ صفدر نہیں چاہتا تھا کہ اس آپریشن میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔ اُس نے سلطانہ کو بتا دیا کہ عدنان نے انھیں ایک ساتھ دیکھ لیا ہے اور اب مخالفت دن بہ دن بڑھتی جائے گی۔ اب وہ چوری چھپے ملنے آئے گا اور کسی دن نہ آسکے تو اُسے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

شام کو وہ گھر پہنچا تو بیوی بچے سب ہی بھرے بیٹھے تھے۔ وقار احمد بھی موجود تھا۔ سب سے پہلے اُسی نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ "کہاں ہے میری بیٹی؟ تمھیں تمھارے بچوں کی قسم ہے۔ مجھے میری بچی سے ملا دو۔"

صفدر نے کہا: "آپ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زیبی مجھے نہیں ملی ہے۔ میں آپ کو کس سے ملاؤں؟"

"سمندر کے کنارے تمھارے ساتھ وہ کون تھی؟"

"زیبی سے مشابہت رکھنے والی ایک لڑکی تھی۔ اُس کا نام سلطانہ ہے۔"

"چلو۔ مجھے اُسی سلطانہ سے ملا دو۔"

صفدر نے بات بنائی: "میں خود اُسے کل رات سے تلاش کر رہا ہوں۔ وہ شام کو ملی تھی۔ دوبارہ ملاقات کے لیے اُس نے غلط پتہ دیا تھا۔ آپ میری پریشانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں کل سے اپنے گھر نہیں آسکا۔ اِس شہر کے کتنے ہی علاقوں میں اُسے تلاش کرتا رہا ہوں۔"

روزینہ اُسے گہری چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی: "آپ ہمارا منہ بند رکھنے کے لیے باتیں بنا رہے ہیں۔ میں نہیں مان سکتی کہ وہ کل آپ کو ملی اور کل ہی کہیں غائب ہو گئی۔"

وہ بولا: "میں اس قدر پریشان ہوں کہ تمھیں یقین نہیں دلا سکتا۔"

عدنان نے کہا: "ممی! آپ ڈیڈی کی پریشانی کا خیال کریں اور اس جھگڑے کو ختم کر دیں۔ ڈیڈی! آپ بھی ممی سے وعدہ کریں کہ اب کسی زیبی یا سلطانہ کو آپ تلاش نہیں کریں گے۔"

صفدر نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "جس قدر تلاش کرنا تھا، کر چکا۔ آؤ روزینہ اب میں تمھیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

اُس نے بڑے پیار سے روزینہ کے شانے پر ہاتھ رکھا پھر اُس کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ وہ سلطانہ کی بینائی واپس آنے تک اسی طرح جھوٹ اور فریب سے مخالفتوں کو ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا۔ وقار احمد نے آگے بڑھ کر کہا: "ٹھیرو صفدر! تم اپنے بیوی بچوں کو احمق بنا سکتے ہو مجھے نہیں بنا سکتے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تم نے میری بیٹی کو چھپا رکھا ہے۔ میں اپنی بیٹی کو تم سے حاصل کر کے رہوں گا۔"

"آپ بکواس کر رہے ہیں۔ پلیز اپنے گھر جائیں۔ میرا وقت ضائع نہ کریں۔"

وقار احمد نے گھونسہ دکھا کر کہا: "اب تو تمھارا وقت جیل میں ضائع ہوگا۔ زیبی کے اغوا کی رپورٹ پہلے ہی درج ہے۔ اب میں نئی رپورٹ درج کراؤں گا کہ تم نے بائیس برس سے میری بیٹی کو چھپا کر رکھا ہے۔"

صفدر نے پوچھا: "اِس بکواس کے لیے کوئی ثبوت بھی ہے؟"

"ہاں۔ یہ تمھارا جوان بیٹا چشم دید گواہ ہے۔ عدالت میں اِسے حلفیہ کہنا پڑے گا کہ اُس نے تمھیں زیبی کے ساتھ دیکھا ہے۔ مگر تم خیریت چاہتے ہو تو کل صبح ہونے تک مجھ سے میری بیٹی کو ملا دو۔ ورنہ آیندہ ہماری ملاقات عدالت میں ہوگی۔"

وہ غصہ سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ روزینہ نے پریشان ہو کر کہا: "اب کیا ہوگا؟ یہ تو آپ پر اغوا کا الزام لگا رہا ہے۔"

صفدر نے کہا: "تمھاری جلد بازی اور حماقت سے ایسا ہوا ہے۔ نہ تم اس بوڑھے کے پاس جاتیں نہ یہ... مصیبت بنتا۔ بہر حال دیکھا جائے گا۔ چلو اب بھوک لگ رہی ہے۔"

اُس رات صفدر نے بڑی خوبصورتی سے باتیں بنا کر بیوی بچوں کو مطمئن کر دیا۔ وقار احمد کی دھمکی زوردار تھی، لیکن صفدر پر اس کا اثر نہ ہوا۔ اُسے اطمینان تھا کہ جب تک عدالت میں پیشی ہوگی اُس وقت تک سلطانہ بینائی حاصل کر چکی ہو گی۔ اگر مقدمہ سنگین ہونے لگے گا تو وہ مجبوراً سلطانہ کو سب پر ظاہر کرے گا اور جب ایسا وقت آئے گا تو پھر ایک بار مخالفتیں شروع ہو جائیں گی۔

وہ بہت محتاط رہنے لگا۔ صبح وقت پر دفتر جاتا تھا۔ شام کو وقت پر گھر واپس آتا تھا۔ شام کے بعد اکثر روزینہ کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ سلطانہ سے ملاقات کی صورت یہ تھی کہ دفتری اوقات کے دوران کبھی ایک گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ کے لیے ہسپتال جا کر واپس آجاتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد آپریشن کیا گیا۔ اس روز صفدر نے حیدرآباد جانے کا بہانہ کیا اور تمام دن ہسپتال میں سلطانہ کے پاس رہا۔ ڈاکٹر نے یقین سے کہا کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ چند روز کے بعد آنکھوں سے پٹی کھلے گی تو سلطانہ دیکھنے لگے گی۔

عورت ایک بار اپنے مرد پر شبہ کرلے تو پھر وہ مرتے دم تک اس شبہ سے چپک کر رہتی ہے۔ روزینہ نے بظاہر مطمئن ہو کر صفدر کو ڈھیل دے دی تھی لیکن اُس کی ٹوہ میں رہتی تھی۔

اُس نے کبھی اپنے میاں کے دفتر میں خود فون نہیں کیا۔ دوسروں سے فون کرایا تو میاں کئی بار غیر حاضر پائے گئے۔ پھر وہ اس فکر میں رہی کہ کسی طرح پیچھا کرتے ہوئے اُس جگہ پہنچ جائے، جہاں بائیس برس کی پونجی چھپا کر رکھی گئی ہے۔

زیبی کے بچھڑنے سے یہ نقصان ہوا کہ محبت اپنی جگہ قائم رہی اور عمر گزر گئی۔ بڑھاپے میں صفدر کا عشق سنجیدہ اور سچا تھا لیکن مشرقی ماحول میں مضحکہ خیز بن گیا تھا۔ کیونکہ جوان بیٹا جو اُسے عشق کر رہا تھا۔ جوان بیٹی عاشی بھی ایک نوجوان کی محبت میں گرفتار تھی۔ جب بچے جوان ہو کر یہ کھیل کھیلتے ہیں تو بوڑھوں سے محبت کا حق چھین لیا جاتا ہے حالانکہ محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی اور محبت کبھی بے حیا نہیں ہوتی لیکن صفدر کی محبت کو بے حیائی سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔

کالج کے احاطہ میں عاشی اپنے محبوب سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ پھر اپنی رسٹ واچ دیکھ کر یہ کہتی ہوئی رخصت ہو گئی کہ اُس کی کلاس شروع ہونے والی ہے۔ کلاس میں پہنچی تو ایک سہیلی نے کہا "بھئی جدھر دیکھو اُدھر محبت کے ناٹک کھیلے جا رہے ہیں۔ تم عمر سے عشق کر رہی ہو اور اُدھر تمہارے ڈیڈی ہسپتال کی ایک مریضہ سے رومانس فرما رہے ہیں۔"

عاشی نے بگڑ کر کہا "شٹ اپ۔ میں ڈیڈی کے سلسلہ میں مذاق پسند نہیں کروں گی۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔ کل شام میں جناح ہسپتال اپنے انکل کی عیادت کے لیے گئی تھی۔ وہاں میں نے اسپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر بیس میں تمہارے ڈیڈی کو دیکھا۔ اُس کمرے میں ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی تھی۔ تمہارے ڈیڈی نے اس انداز میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں......"

عاشی فوراً ہی وہاں سے اٹھی، تیز قدم اٹھاتی ہوئی... کلاس روم سے نکلی۔ پھر پرنسپل کے کمرے میں پہنچ کر ٹیلیفون کرنے کی اجازت حاصل کی۔ ایک منٹ کے بعد ہی وہ فون پر کہہ رہی تھی "ممی! نوٹ کیجیے۔ جناح ہسپتال کے اسپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر بیس میں زیبی ہے۔ ابھی مجھے یہ اطلاع ملی ہے۔ آپ تصدیق کریں۔"

روزینہ نے پوچھا "تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی؟"

"اوہ ممی! سوال جواب بعد میں بھی ہو سکتے ہیں۔ بری اپ تو ہوسپٹل۔ آئی وش یو گڈ لک۔ او کے سو فار....."

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

اسپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر بیس میں سلطانہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ صفدر بستر کے سرے پر بیٹھا اُس کے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر سہلا رہا تھا اور کہہ رہا تھا "ڈاکٹر نے مجھ سے خود کہا ہے کہ کل صبح تمہاری آنکھوں سے پٹی کھول دی جائے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولی "الله! کل میں اپنی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھ سکوں گی۔"

"ہاں۔ یہ بتاؤ مجھے دیکھو گی نا؟"

"آپ کو تو سب سے پہلے دیکھوں گی۔ اوہ آج کا دن کیسے گزرے گا؟ صبح کب ہو گی؟ ذرا ٹائم بتائیں۔"

"تم تو خوشی سے پاگل ہو رہی ہو۔ ابھی صبح کے دس بجے ہیں۔ میں نے سوچا دفتر جانے سے پہلے تم سے ملتا جاؤں۔ ابھی پٹی کھلنے کے لیے پورے چوبیس گھنٹے باقی ہیں۔ صبر سے کام لو خوشی میں کہیں پٹیاں نہ چھوڑ دینا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ شام کو آنے کی کوشش کروں گا۔ اگر نہ آ سکا تو کل پٹی کھلنے کے وقت تمہارے سامنے کھڑا ہوں گا۔"

رخصت ہونے سے پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چند لمحوں تک خاموش رہے۔ پھر صفدر نے اُس کے ہاتھ کو چوم کر سینے سے لگایا۔ اُس کے بعد وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

سلطانہ مسکراتی رہی۔ پٹیوں کے پیچھے بند آنکھوں کے اندھیرے میں صفدر کی خیالی تصویر دیکھتی رہی۔ چوبیس گھنٹے بعد وہ پہلی بار اپنے محسن اپنے محبوب کو دیکھنے والی تھی۔ سلطانہ پہلے سے اُس کی وجاہت اور شخصیت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ پتہ نہیں خیالی تصویر دیکھنے میں کتنا وقت گزر گیا۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ کمرے کا دروازہ کھل رہا ہے۔ اُس نے سوچا، امی اور ابو آئے ہیں۔ وہ خوش ہو کر بولی "امی! ایک خوشخبری ہے۔ کل میری آنکھوں سے پٹی کھل جائے گی۔ ارشد کہاں ہے؟"

کمرے میں روزینہ اور عدنان کھڑے ہوئے تھے خاموشی

سے زیبی کی ہمشکل کو دیکھ رہے تھے۔ پھر روزینہ نے پوچھا۔
"لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟"

سلطانہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے پوچھا۔
"آپ کون ہیں؟ مجھ سے میرا نام کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

روزینہ نے کہا "تم اپنا نام بتاؤ۔ پھر میں بھی اپنا تعارف کراؤں گی۔"

"میرا نام سلطانہ ہے۔"

"مجھے روزینہ صفدر کہتے ہیں۔ میں صفدر علی شاہ کی بیوی ہوں۔"

سلطانہ کا چہرہ ایک دم بیماروں جیسا ہو گیا۔ پھر مردانہ آواز سنائی دی "میرا نام عدنان ہے۔ صفدر علی شاہ میرے ڈیڈی ہیں۔"

وہ گم صم بستر پر پڑی رہی۔ روزینہ آگے بڑھ کر اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ اُس نے سلطانہ کے ہاتھ کو تھام کر اُس کی چکناہٹ اور نوجوانی کو محسوس کرتے ہوئے کہا "تم زیبی نہیں ہو سکتیں کیونکہ زیبی کو ادھیڑ عمر کی عورت ہونا چاہیے۔ تم نوخیز ہو۔ میری بیٹی عاشی کے برابر ہو۔"

سلطانہ نے کہا "میں اٹھارہ برس کی ہوں۔"

"میری عاشی سترہ کی ہے۔ صرف ایک برس کا فرق کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں صفدر اور تمہاری عمر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب میں تمہیں بیٹی کہتی ہوں تو صفدر کو بھی یہی کہنا چاہیے۔"

یہ بات جیسے طمانچہ کی طرح لگی ہو۔ سلطانہ کے رخسار سرخ ہو گئے۔ وہ بولی "میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کیا کہنے آئی ہیں۔"

"کہنے کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ گزارش کی جاتی ہے یا حکم دیا جاتا ہے۔ ابھی ہم نے معلوم کیا ہے کہ تم غریب اور اندھی تھیں، اب آنکھیں مل رہی ہیں۔ اگر تم دولت مند ہوتیں تو میں تمہیں حکم دیتی پھر قانونی کارروائی کرتی۔ چونکہ غریب ہو۔ اس لیے نرمی سے سمجھانے آئی ہوں۔"

ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر روزینہ نے کہا "ہمارا ایک خوب صورت سا گھر ہے۔ پیارے پیارے ذہین بچے ہیں۔ برسوں کی محنت سے ہم نے یہ خاندان بنایا ہے۔ کل تم ہمارے گھر میں آگ لگاؤ گی؟"

عدنان نے کہا "ہمارے ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔ ہم لوگوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ہم سے جو پیار ہے وہ مضبوط اور سچا ہے۔ آپ سے صرف کیا ہو رہا ہے۔ وہ جھوٹا ہے۔ کیونکہ وہ آپ کا حسن دیکھ رہے ہیں۔"

... کچھ دیر ... بولی "یہ میں سمجھتی ہوں صفدر صاحب کئی سال سے ... ہیں۔ میں نے سوچا، مجھے ان کے دکھ درد بانٹنا چاہئیں۔ انہوں نے ایک فلیٹ میرے نام کیا ہے ابو کے لئے ایک دکان کھولا ہے۔ ہمارے مستقبل کا تحفظ کیا ہے ان کے خلوص اور ہمدردیوں نے مجھے جیت لیا ہے۔"

روزینہ نے کہا "جو کچھ تمہارے نام ہو چکا ہے، اُسے میں واپس نہیں لوں گی، نہ ہی میری طرف سے قانونی چارہ جوئی ہو گی۔ بلکہ میں آئندہ بھی تمہارے کام آتی رہوں گی۔"

سلطانہ نے اپنی تاریک دنیا میں لیٹے ہوئے سوچا "یہ بیگم صاحبہ بڑے پیار سے دو بار قانونی چارہ جوئی کی دھمکیاں دے چکی ہیں۔ اور یہ ایسا کر سکتی ہیں۔ میں غریب ہوں اور اتنی بڑی بیگم صاحبہ کو چیلنج نہیں کر سکتی۔ یہ مجھے پیس کر رکھ دیں گی۔ دوسری طرف صفدر بدنام ہوں گے۔ وہ عدالت کے کٹہرے میں بیوی کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔"

روزینہ نے کہا "تم خاموش ہو۔ میں تمہارا جواب سننا چاہتی ہوں۔"

وہ بڑے کرب سے بولی "آپ مجھے پیار سے سمجھانے آئی ہیں اور میں واقعی سمجھ رہی ہوں۔ میں حیران ہوں کہ آپ کی اور بچوں کی ہونے والی تباہیوں کو پہلے کیوں نہ سمجھ سکی۔ ہاں، شاید اس لئے کہ میں صفدر صاحب کے احسانات سے بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھی۔ یہ بھول گئی تھی کہ ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے پورے خاندان کو زخم لگا رہی ہوں۔"

"سلطانہ! تم بہت سمجھدار ہو، تمہارے سامنے ایک لمبی عمر پڑی ہے۔ میری اور صفدر کی عمر بہت کم رہ گئی ہے۔ تمہیں بہت سے خوبرو جیون ساتھی مل جائیں گے۔"

"میں مشرقی عورت ہوں۔ مر سکتی ہوں۔ مگر کسی دوسرے جیون ساتھی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا کل سرمایہ صفدر ہیں۔"

"میں آپ کا سرمایہ نہیں چھینوں گی۔ میں عورت ہوں اور سمجھتی ہوں کہ میرے ساتھ ایسا ہوتا تو میری کیا حالت ہوتی؟ دوسروں سے کچھ چھیننے والے خود کبھی خوش نہیں رہتے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ بینائی واپس ملنے کے بعد میں صفدر صاحب سے کبھی نہیں ملوں گی۔ وعدہ۔"

عدنان نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "آپ بہت اچھی ہیں۔ ہمیں جو خوشیاں ڈیڈی نہیں دے سکتے تھے، وہ آپ دے رہی ہیں۔"

روزینہ نے جھک کر اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا "تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ یہ ایک بوسہ میں اپنی بیٹی کی پیشانی پر لیتی آئی ہوں، اور یہی بوسہ تمہارے لئے بھی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

دور تک جاتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور

سلطانہ کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ پھر اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی، جو آ رہے تھے، وہ جا چکے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے وہ کتنی خوش تھی۔ صفدر اسے دکھائی دینے والا تھا۔ اور وہ دنیا دکھانے والے کو دیکھنے کی خوشی میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اب کیا وہ اسے دیکھ سکے گی؟

اس نے ایک گہری سانس لے کر سوچا: ہاں دیکھوں گی صرف ایک بار ۔۔ اور آخری بار؛

☆

قیامت کی وہ صبح آ گئی۔ ڈاکٹر اس کی آنکھوں سے پٹی کھولنے کے لئے مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ کمرے میں نرس کے علاوہ سلطانہ کے والدین، ارشد اور صفدر موجود تھے۔ دروازہ بند تھا۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ نیم تاریک ماحول تھا۔ تاکہ اس کی آنکھوں پر زیادہ روشنی کا بوجھ نہ پڑے۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے پوچھا: تم سب سے پہلے کس کو دیکھنا چاہتی ہو؟

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ صفدر اس کی سنجیدگی اور خاموشی کو محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کا سوال سن کر وہ مسکرا دیا۔ کیونکہ وعدہ کے مطابق سلطانہ اُسے سب سے پہلے دیکھنے والی تھی۔ لیکن اس نے ڈاکٹر سے پوچھا: آپ بتائیں ڈاکٹر صاحب: پہلے مجھے کسے دیکھنا چاہیئے؟

• جسے تم سب سے زیادہ چاہتی ہو:

صفدر نے پھر ایک بار مسکرا کر دیکھا۔ وہ بولی: انسان سب سے زیادہ اپنے لہو کے رشتوں کو چاہتا ہے۔ میں پہلے امی ابو اور ارشد کو پھر ساری دنیا کو دیکھنا چاہتی ہوں؛

صفدر مرجھا سا گیا۔ حیرانی سے سلطانہ کو دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر نے اس کے والدین کو بستر کے پائنتی کھڑے ہونے کے لئے کہا۔ تاکہ سلطانہ آنکھیں کھولنے کے بعد انہیں دیکھ سکے۔ پھر ڈاکٹر پٹیاں کھولنے لگا۔ اس نے پوچھا: تم اپنے والدین کو بہت چاہتی ہو؟

• جی ہاں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو محبت اپنے خاندان والوں سے مل سکتی ہے وہ کسی غیر سے نہیں مل سکتی۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ پہلے اپنے لہو کے رشتوں سے محبت کرے؛

صفدر اب اسے پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ کے سر کے اطراف آنکھوں پر کی پٹیاں کھلتی جا رہی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس دنیا میں صفدر کو بھی دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے بھول چکی ہو۔

پٹیاں کھل گئیں۔ ڈاکٹر اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا

• آہستہ آہستہ آنکھیں کھولو۔ انشاءاللہ تم دیکھ سکو گی؛

وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے لگی۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی لیکن اس روشنی سے بھی اس کی آنکھیں دکھنے لگیں وہ گھبرا کر آنکھیں بند کرنے لگی، ڈاکٹر نے حوصلہ دیا۔

• گھبراؤ نہیں، ایسا ہوتا ہے۔ اتنی روشنی تو تمہیں برداشت کرنا چاہیئے؛

اس نے کوشش کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے امی اور ابو نظر آ رہے تھے، ان کے ساتھ چھوٹا بھائی ارشد کھڑا ہوا تھا۔ وہ خوشی سے چیخ کر بولی۔

• میں دیکھ سکتی ہوں۔ میں اچھی طرح دیکھ سکتی ہوں؛

ماں نے قریب آ کر اس کی بلائیں لیں۔ باپ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ بھائی کو پاس بلا کر پیار کر رہی تھی۔ صفدر دور کھڑا اسے دیکھ کر اداسی سے مسکرا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے قریب آ کر کہا۔

• میری محنت اور آپ کی دولت کام آ گئی۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلوا لینا۔ ڈش یو مور گڈ لک؛

یہ کہہ کر وہ نرس کے ساتھ چلا گیا۔ تب سلطانہ نے بستر پر بیٹھے بیٹھے گھوم کر اسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ صفدر نے کہا۔

• ہیلو سلطانہ! بینائی مبارک ہو؛

سلطانہ نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا: آ ۔۔ آپ آپ صفدر صاحب ۔۔۔۔ مگر آپ تو میری توقع سے کچھ زیادہ ہی بڈھے ہیں؛

صفدر کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنی مونچھوں پر گیا۔ پھر وہ ہاتھ اس کی کنپٹی پر پہنچا، جہاں کے بال سفید تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بینائی ملتے ہی سلطانہ سب سے پہلے اس کے بڑھاپے کو دیکھے گی۔ وہ جھینپ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

• ہاں۔ وہ ۔۔ وہ میں تو تمہیں بتا چکا تھا کہ میرے جوان بچے ہیں۔ کیا تم نے اندازہ نہیں لگایا تھا؟

• اندازہ کیسے لگاتی؟ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کی عمر زیادہ نہیں ہے؛

• آں ۔۔ ہاں سلطانہ! ابھی تو میں چالیس برس کا بھی نہیں ہوا ہوں؛

• مگر میں نے سنا ہے کہ آپ کی بیٹی میری عمر کی ہے؛

صفدر کے دماغ کو پھر ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے

بولا: یہ — یہ تم کہہ رہی ہو؟"

وہ نظریں چراتے ہوئے بولی: "میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ میں اندھی تھی، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔"

• "اب کیا کہتی ہو۔ اب تو آنکھیں مل گئی ہیں؟"

"یہ بُرا ہوا کہ آنکھیں مل گئیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو چھپاتے ہوئے بولی: "کیا مجھے آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا بننا چاہئے؟"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ دل گرفتگی سے بولا۔ "ہاں، میرا بڑھاپا تو نظر آئے گا۔ آنکھیں رکھتے ہوئے تمہیں اندھا نہیں بننا چاہئے۔"

وہ پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔ اسے زیبی کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے گھوم کر رونے والی کو دیکھا پھر کہا: "یہ ادا سمجھ میں نہیں آئی کہ فیصلہ بھی سنا رہی ہو اور رو بھی رہی ہو۔ اگر میں کسی طور تمہارے آنسو پونچھ سکوں تو مجھے بتا دینا۔"

وہ فوراً ہی گھوم کر اس کمرے سے باہر آ گیا۔ سلطانہ کے رونے نے ایسا صدمہ پہنچایا تھا کہ اندر سے دل کٹ رہا تھا، سر گھوم رہا تھا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہو۔ جان بھی نہ رہی ہو اور اب تب میں کہیں گرنے ہی والا ہو۔ وہ ہسپتال کے ایک ستون کا سہارا لے کر ٹھہر گیا۔

ذرا دیر گہری گہری سانسیں لینے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا سلطانہ کا کمرہ دُور رہ گیا تھا۔ وہاں سے اس کمرے تک بائیس برس کی دوری تھی۔ ایک زیبی سے دوسری زیبی تک کا فاصلہ تھا اور ہر فاصلہ طے کرنے کے بعد وہی محرومی تھی جو ابتدا سے محبت کے مقدر میں لکھی گئی تھی۔

وہ سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا ہسپتال کے پارکنگ ایریا میں آیا۔ وہاں اپنی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ زیبی کی محبت اور نفرت کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر دماغ کو خالی رکھ کر پُرسکون رہنا چاہتا تھا۔ لیکن جب تک سانس چلتی ہے دماغ سوچ سے خالی نہیں رہتا۔ اس کی بند آنکھوں کے پیچھے زیبی مسکرا رہی تھی یعنی زخمی ہونے کے بعد بھی تصورات مسکراتے ہیں۔

زیبی نے پوچھا: "صفدر! کیا تمہارا اعتماد اتنا کمزور ہے؟ کیا کبھی تم سے نفرت کر سکتی ہوں؟"

وہ بولا: "نہیں، تم مجھ سے کبھی نفرت نہیں کر سکتیں۔ مگر ابھی تم کیسا سلوک کیا تھا؟"

• "وہ میں نہیں تھی۔ وہ تو ایک بہلاوا تھی۔ تمہاری دولت سے خریدی ہوئی ایک چیز تھی۔ خریدی ہوئی زیبی بے وفا ہو سکتی ہے یا دلداری کے لئے کٹھ پتلی بن سکتی ہے۔ اصل محبوبہ نہیں بن سکتی۔ غلطی تمہاری تھی۔ کیا آج تک کوئی محبت کو خرید سکا ہے۔ تم نے خرید کر غلطی کی۔ دوسری غلطی یہ کہ تم مجھے بے وفا سمجھ رہے ہو؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا: "میں بھی کیسا احمق ہوں۔ سلطانہ کو زیبی سمجھ کر صدمہ سہہ رہا ہوں۔ میری زیبی ہوتی تو مجھے بائیس برس کی عبادت کا انعام دیتی۔ مجھے کبھی صدمہ نہ پہنچاتی۔"

اس خیال نے اسے ذرا بہلا دیا کہ سلطانہ بہرحال غیر ہے۔ زیبی کی صورت میں فریب دیتی رہی۔ نہ وہ زیبی تھی اور نہ ہی کبھی زیبی بن سکتی تھی۔

اس روز وہ شام تک سمندر کے کنارے بیٹھا رہا۔ جیسے دنیا سے کنارہ کر لیا ہو۔ شام تک اسے پتہ چلا کہ وہ سلطانہ کو بے وفا کہہ سکتا ہے مگر اُسے بھلا نہیں سکتا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ گھومتا رہا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زیبی تھی یا سلطانہ؟ لیکن سلطانہ کی ایک ایک بات ایک ایک ادا یاد آ رہی تھی۔ اسے سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ کل تک بے وفا نہیں تھی۔ آج اچانک ہی اس کا مزاج کیسے بدل گیا؟

رات کو وہ بالکل ہی نڈھال ہو کر گھر پہنچا۔ بیوی بچے اس کی صورت دیکھ کر سمجھ گئے کہ سلطانہ نے چرکہ دیا ہے۔ روزینہ نے کھانے کے لئے کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس عمر میں پھر ایک بار اس کی بھوک مر گئی تھی اور نیند اُڑ گئی تھی۔ رات کے دو بجے روزینہ نے پوچھا۔

• "آپ کروٹیں بدل رہے ہیں، کیا پریشانی ہے آپ کو؟"

• "تم بھی جاگ رہی ہو۔ تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

• "میں ماں بننے والی ہوں۔ ایسے حالات میں نیند نہیں آتی ہے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر بولا: "کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں؟"

• "آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

• "اس لئے کہ تم اور تمہارے جوان بچے مجھے بڈھا کہتے ہیں۔ طعنے دیتے ہیں کہ اس عمر میں عشق نہیں کرنا چاہئے۔"

وہ بولی: "ہم کیا ساری دنیا یہی کہے گی۔"

• "تو پھر اس عمر میں باپ بننا کہاں تک مناسب ہے؟ اگر وہ شرم کی بات ہے تو یہ بھی شرم کی بات ہے۔ تم کہتی ہو، دنیا کہتی ہے، میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھے جوانی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں اس سے زیادہ شرمناک مظاہرہ اور کیا ہو گا کہ میں اب باپ بن رہا ہوں۔ آؤ ہم دونوں کہیں شرم سے ڈوب مریں۔"

اس نے روزینہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا وہ ہاتھ چھڑا کر بولی: "آپ ناجائز بات کو جائز بنانے کے لئے خواہ مخواہ جائز کو ناجائز کہہ رہے ہیں۔ زیبی یا سلطانہ آپ کے لئے ناجائز تھیں۔ میں آپ کی جائز بیوی ہوں۔ میں آپ کے بچے کی ماں بنوں تو شرم کی کیا بات ہے؟"

وہ بولا: "بچے کی ماں یا باپ بننا شرم کی بات نہیں ہے۔ اصل

بحث ہے جوان بننے کی۔ اگر جوانی کی ایک حد مقرر ہے، اگر اس کے لئے عمر کی قید ہے کہ فلاں عمر تک محبوبہ یا بیوی کے ساتھ عشق کیا جا سکتا ہے تو ہمارے ماں باپ بننے کا دور گذر چکا ہے۔"

• "نہیں۔" وہ بولی: "میاں بیوی کا رشتہ سدا بہار ہوتا ہے۔"

• "یوں کہو، محبت سدا بہار ہوتی ہے۔ اگر میاں بیوی میں محبت نہ ہو تو یہ رشتہ پائیدار نہیں ہوتا۔ اصل چیز محبت ہے، خواہ تم سے ہو یا زیبی سے۔ اور یہ محبت کسی بھی عمر میں کی جا سکتی ہے۔ تم اگر بوڑھی ہو تو میری محبت جائز ہو گی اور زیبی جوان ہو تو ناجائز ہو گی۔ یہ کوئی محبت کی کسوٹی نہیں ہے۔ محبت کی تعریف یہ ہے کہ محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، کبھی مرتی نہیں۔ یوں تو مارنے والے بہت سے پیدا ہوئے مگر آج تک کوئی محبت کی قبر نہ بنا سکا۔"

• "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا میں زیبی کی قبر بنا رہی ہوں؟"

اس نے دور ہسپتال کے کمرے میں سلطانہ کو دیکھا وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اپنی محبت کو اپنے اندر دفن کر رہی تھی۔ صفدر نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

• "وہ خود اپنی محبت کو دفن کر رہی ہے، مگر نہیں کر سکے گی۔ مجھے یقین ہے۔"

⁂

سلطانہ فلیٹ کے ڈائننگ روم میں اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ وہ ایک لقمہ اپنے منہ تک لے جاتے جاتے

جاتے رک گئی۔ اس نے چشم تصور میں دیکھا کہ وہ ایک ریسٹورانٹ کے کیبن میں صفدر کے روبرو بیٹھی ہے اور ایک لقمہ اپنے منہ تک لے جانا چاہتی ہے۔ اسی وقت صفدر نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا: "جب تک تمہیں بینائی نہیں ملے گی، میں اپنے ہاتھ سے تمہیں کھلاؤں گا۔"

یہ کہہ کر صفدر نے اس کے منہ میں ایک لقمہ ٹھونس دیا۔ وہ ہنستے ہوئے لقمہ چباتے ہوئے بولی: "اچھا جب بینائی مل جائے گی تو پھر کیا ہو گا؟"

• "پھر تم اپنے ہاتھ سے مجھے کھلایا کرنا۔"

وہ تصور ہٹ گیا، ہوٹل کا منظر غائب ہو گیا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے منہ تک پہنچنے والے لقمہ کو واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ باپ نے پوچھا۔

• "کیا ہوا بیٹی؟"

• "کچھ نہیں۔" وہ کھانے کی میز پر سے ہٹ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

اس کی ماں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: "تم کب تک کھانے پر سے اٹھتی رہو گی، کب تک اپنے آپ کو سزا دیتی رہو گی؟"

وہ اپنے کمرے میں داخل ہو کر بولی: "میں بھلا خود کو سزا کیوں دوں گی۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

• "سلطانہ! تم مجھے نہیں، میں نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تم مجھ سے دل کا حال نہیں چھپا سکتیں بیٹی! میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اپنے محسن کو کیوں ٹھکرا دیا؟"

اس نے ماں کو دیکھا۔ پھر نظریں جھکا کر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی: "کبھی کبھی احسانوں کا بدلہ یوں بھی چکایا جاتا ہے۔"

• "میں نہیں سمجھی، صاف صاف کہو۔"

• "میرے محسن کی بھلائی اسی میں ہے کہ میں ان سے نفرت کروں۔ انہیں اپنے سے دور کر دوں۔ اگر میں ان کی بیوی کی سوکن بن جاؤں تو وہ ان کی دشمن بن جائے گی۔ انہیں عدالت میں چیلنج کرے گی۔ جوان اولاد گستاخی پر آمادہ ہو جائیں گی۔ ان کا پورا خاندان بکھر جائے گا۔ ان کی آئندہ نسل ان سے بدگمان ہو جائے گی۔ یہ تو سراسر اپنے محسن سے دشمنی ہو گی۔"

• "یہ بات صفدر کو سوچنا چاہئے۔"

• "وہ نہیں سوچ سکتے۔ ان کے دل و دماغ پر زیبی چھائی ہوئی ہے۔ وہ دیوانے ہیں، سوچ نہیں سکتے۔ میں ہوشمند ہوں، ان کے گھر میں آگ نہیں لگا سکتی۔"

• "جو آگ وہاں نہیں لگا سکتیں، اس آگ میں خود جل رہی ہو۔"

• "میں رفتہ رفتہ حالات سے سمجھوتہ کر لوں گی۔ وہ بھی مجھے احسان فراموش سمجھ کر صبر کر لیں گے۔"

• "اگر وہ تمہیں احسان فراموش نہ سمجھے اور یہاں آ جائے تو؟"

• "تو ......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ کال بیل کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کوئی آیا تھا۔ شاید وہی آیا ہو گا۔ سلطانہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

اس کی امی بیرونی دروازے کو کھولنے جارہی تھیں۔ وہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ فلیٹ کا بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی پھر صفدر کی ملتی ہوئی آواز اس کے کمرے میں آئی اور اس کے سینے کو سہلانے لگی۔

وہ اس کی امی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ سلطانہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ قدم قدم چلتی ہوئی اپنے کمرے کے دروازے کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

صفدر اس کی امی سے باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "سلطانہ کیسی ہے، آنکھوں میں تکلیف تو نہیں ہے؟"

"بیٹے۔ خدا کا شکر ہے۔ تمہاری مہربانی ہے اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔ چائے پیو گے یا ٹھنڈا؟"

"آپ تکلیف نہ کریں۔ میں صرف یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ شاید یہاں میری ضرورت ہو؟"

سلطانہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس سے پوچھ رہا ہے۔ "مجھے بتاؤ میری ضرورت ہے یا نہیں؟"

اس کی امی کی آواز سنائی دی۔ "بیٹا! برا نہ ماننا، ہم سے زیادہ تمہارے بیوی بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم سمجھدار ہو۔ اچھی عمر والے ہو۔ اپنے گھر میں آگ لگا کر ہمارے گھر کو گلزار نہ بناؤ۔"

"دیکھئے، میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ آپ لوگوں کا رویہ کیوں بدل گیا ہے؟"

"ہم نہیں بدلے، حالات بدل گئے ہیں۔ اب سلطانہ دیکھنے لگی ہے۔ ہماری برادری سے اس کے لئے رشتے آرہے ہیں۔ جہاں سے تمہاری عمر تھک کر بیٹھنے والی ہے، وہاں سے سلطانہ کی نوعمری اپنا سفر شروع کرنے والی ہے۔ تم اس سے دو گھڑی کے لئے بھی ملنا چاہو گے تو یہاں آنے والے رشتے واپس چلے جائیں گے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں سمجھ گیا۔ میں سلطانہ کو بدنام نہیں کروں گا۔"

وہ سر جھکا کر بیرونی دروازے تک گیا۔ پھر سلطانہ کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔ مگر جو آنکھیں برسوں تک انتظار کرتی رہیں، وہ... وہ مرتے دم تک انتظار کرتی رہیں گی۔"

وہ چلا گیا۔ دروازہ ایک دھماکے سے یوں بند ہوا جیسے سلطانہ کا دل یکبارگی دھڑک کر بند ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔

صفدر ایک طویل عرصے تک صدمات سہتے ہوئے زندہ رہنے کی مثال پیش کر رہا تھا۔ کوئی اس کا دکھ بانٹنے والا نہ تھا۔ ایک سلطانہ ملی تھی، وہ اور صدمے دے کر الگ ہو گئی تھی۔ ایسے وقت اس نے غم غلط کرنے کے لئے شراب کا سہارا لیا۔ انسانی ہمدردیاں اور سہارے سب

کمزور ثابت ہوئے تھے۔ وہ صبح و شام پیتا تھا اور اپنے آپ کو بھول جاتا تھا۔

ایک شام وہ دفتر میں بیٹھا پی رہا تھا۔ اس کی بیٹی عاشی نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ "ڈیڈی! فوراً جناح ہسپتال پہنچئے۔ ممی کی حالت بہت نازک ہے۔"

اسے یاد آیا کہ روزینہ زچگی کے سلسلہ میں ہسپتال میں داخل کرائی گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "بیٹے پریشان نہ ہونا، میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھا۔ وہسکی کی بوتل کو میز کی دراز میں بند کیا آئینہ دیکھ کر بال اور لباس درست کئے۔ پھر وہاں سے چل پڑا جب وہ ہسپتال پہنچا تو عدنان اور عاشی بہت پریشان نظر آئے۔ لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ ہونے والا بچہ ہلاک ہو گیا ہے۔ آپریشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس مردہ بچے کو آپریشن کے ذریعہ نکالا جائے گا۔ لیکن کیس بہت بگڑ گیا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد آپریشن شروع ہوا۔ پانچ منٹ کے بعد ہی بجلی چلی گئی۔ ہسپتال میں افراتفری مچ گئی۔ فون کھڑکھڑائے گئے۔ دس منٹ بعد بجلی آگئی۔ ایک منٹ کے بعد پھر چلی گئی۔ برآمدے میں بیٹھی ہوئی عاشی رونے لگی۔ عدنان اسے دلاسے دینے لگا۔ صفدر گم صم بیٹھا ہوا تھا۔

بجلی واپس آگئی۔ بجلی جاتی ہے اور آتی ہے۔ کراچی شہر میں یہ کھیل دن رات ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس کھیل میں زندگی جا کر واپس نہیں آتی۔ بچہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ روزینہ بھی اس کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئی۔ جب صفدر اس کی لاش کے پاس پہنچا تو عاشی دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ عدنان ماں کے قدموں پر جھکا ہوا تھا۔ روزینہ کی لاش دیکھ کر صفدر کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس کی محبت کو روکنے والی سب سے مضبوط دیوار گر چکی تھی۔ لیکن اس وقت صفدر کو احساس ہوا کہ روزینہ کتنی اہم ہستی تھی! یہ روزینہ ہی تھی۔ جس نے اس کی آئندہ نسل کو دودھ پلایا تھا۔ ایک ماں کی پوری ذمہ داریوں سے ان کی پرورش کی تھی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم دلا رہی تھی وہ ایسی خدمت گزار اور وفا شعار بیوی تھی، جس نے شوہر کی دیوانگی اور بے وفائی کو اپنے اندر کینسر کی طرح پال رکھا تھا۔ وہ اوپر سے گھر سنبھالتی تھی اور اندر سے مرجاتی تھی۔ اب تو ہمیشہ کے لئے مر ہی گئی تھی۔

وہ دو دنوں تک چپ چپ سا رہا۔ پھر یہ طوفان اٹھنے لگا کہ ایک بار سلطانہ کے پاس جائے۔ ایک بار زیبی کی صورت دیکھ لے اب اس کے گھر والے بیوی بچوں کا طعنہ نہیں دے سکیں گے۔ کیونکہ بیوی تو مر چکی ہے اور بچے اپنے اپنے گھر کے ہو جائیں گے۔ اب اس کے اور زیبی کے درمیان سلطانہ اپنا رویہ بدل دے گی۔

لیکن اسے یاد آیا کہ وہ فلیٹ کے دروازے پر دوبارہ نہ آنے

کا وعدہ کر چکا ہے۔ یوں بھی اس کے وہاں جانے سے پہلے لگے گا جیسے اپنی بیوی کی خوشخبری سنانے آیا ہو۔ وہ زیبی کو دیکھنے کی دوسری تدبیریں سوچنے لگا۔ اس کے اندر بے چینی بھری ہوئی تھی سلطانہ کے فلیٹ میں ٹیلیفون ہوتا تو آسانی سے باتیں ہو جاتیں۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک ہفتہ بعد اس فلیٹ کے پتہ پر ایک خط لکھا۔ روزینہ کی موت کی خبر اور اپنی تنہائی کا دکھ سنایا۔ پھر وہ خط پوسٹ کرنے کے لئے چپراسی کو دے دیا۔

روزینہ نے اپنی زندگی میں ہی دفتر کے چند ملازموں کو کچھ زیادہ مراعات دے کر انہیں خرید لیا تھا۔ وہ لوگ صفدر کی دفتری معروفیات کی اطلاعات گھر تک پہنچایا کرتے تھے۔ اس چپراسی نے بھی کوٹھی میں پہنچ کر وہ خط صنان کو دیا اور انعام میں پچاس روپے لے کر واپس چلا گیا۔

صفدر خط لکھنے کے بعد اپنی جگہ مطمئن تھا اور یہ یقین تھا کہ سلطانہ جوابا ہمدردی کرے گی اور اگر محبت سے خط نہ لکھے تب بھی تعزیتی خط ضرور لکھے گی۔ وہ اس خوش فہمی میں انتظار کرتا رہا اور دن گزرتے رہے۔ پھر اسے سلطانہ پر غصہ آنے لگا۔ اس کی بے حسی اور بے مروتی نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ صرف جدائی حاصل کرنے اور اسے احمق بنانے کے لئے محبت کا ڈھونگ رچاتی رہی تھی۔

اب وہ شراب پینے کے دوران اسے نفرت سے یاد کرنے لگا اکثر تنہائی میں نشہ کے دوران بڑبڑاتا تھا۔ "تم ذلیل ہو — کمینی ہو — تم اپنے چہرے پر زیبی کا چہرہ لگا کر مجھے فریب دے رہی ہو — مجھے ترسا رہی ہو۔ میں کہتا ہوں باز آجاؤ۔ زیبی کی محبت اور وفا کا چہرہ بنا بگاڑ کر نہ پیش کرو۔ ورنہ میں کسی دن تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔"

ایک شام اس نے بہت زیادہ پی لی۔ نشہ میں کار ڈرائیو کرتا ہوا فلیٹ والی عمارت تک پہنچ گیا۔ اس کے دماغ میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ وہ جی بھر کے اسے باتیں سنانا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر ٹھٹھک سا بیٹھ گیا۔ فلیٹ کے سامنے شامیانے اور قناتیں تنی ہوئی تھیں۔ "شادی مبارک" کا بورڈ کبھی جل رہا تھا، کبھی بجھ رہا تھا۔ اس کے دل کی تاریکی کو وہ بورڈ اور زیادہ تاریک بنا رہا تھا۔

چند لمحوں تک صفدر کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہوتی رہی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ طربیہ نغموں کے شور میں سلطانہ بیاہی جا رہی ہے، وہ کسی سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہاں بچے کھیل رہے تھے قنات کے ایک طرف مرد باراتیوں کا ہجوم تھا۔ دوسری طرف عورتیں شوخ بھڑکیلے لباس پہنے ہنس بول رہی تھیں۔ ان میں سلطانہ کی امی نظر آئیں۔

اتفاق سے سلطانہ کی امی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ ان کے ہنستے ہوئے چہرے سے اچانک پریشانی ظاہر ہوئی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی قناتوں کی چار دیواری سے باہر آئیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر محتاط انداز میں بولیں۔

"تم — تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا سلطانہ کو بدنام کرو گے یہاں اس کے سسرال والوں نے تمہیں دیکھ لیا تو ہم ان کے مشکوک سوالات کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ خدا کے لئے یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔"

وہ کرب سے بولا: "مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اپنی بیٹی کو دلہن بنا رہی ہیں۔ معلوم ہوتا تو کبھی نہ آتا۔"

"دلہن —؟" وہ حیرانی سے سر اٹھا کر بولیں۔ پھر انہوں نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "تم نے شراب پی ہے۔ توبہ! کیسی بو آ رہی ہے۔ کیا تم یہاں سے نہیں جاؤ گے؟"

وہ پلٹ کر لڑکھڑاتے ہوئے اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرنے کے بعد اس نے حسرت سے "شادی مبارک" کے بورڈ کو دیکھا۔ پھر تیزی سے کار ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ سلطانہ کی امی دور تک جاتی ہوئی کار کو دیکھتی رہیں۔ پھر زیر لب بولیں: "کمبخت نشہ میں یہ سمجھ رہا ہے کہ سلطانہ کی شادی ہو رہی ہے۔"

پھر وہ ایک سرد آہ بھر کر بولیں: "یہ لڑکی مانتی نہیں ہے ورنہ آج کل ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

وہ وہاں سے گھوم کر قناتوں کی چار دیواری میں چلی گئیں۔ اندر فلیٹ کے ایک کمرے میں لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔ ایکسرے گلی کی دلہن بنی بیٹھی ہوئی تھی اور سلطانہ ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی "صفدر کی دی ہوئی بینائی سے میں سب کو دیکھ سکوں گی مگر خود کو دلہن کے روپ میں کبھی نہیں دیکھوں گی۔ کبھی نہیں دیکھوں گی۔"

ایک جواری نے اپنے دوست کو بتایا: "اس ہفتے میں پورے دو ہزار روپے ہار گیا۔ اس سے پہلے والے ہفتے میں ساڑھے تین ہزار روپے ہارے تھے۔ اس سے پہلے ڈیڑھ ہزار روپے اور اس سے پہلے..."

"خدا کی پناہ۔" دوست نے گھبرا کر کہا: "آخر تم جا کھیلنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"افسوس تو یہی ہے کہ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔" جواری بولا "میری آمدنی اسی میں ہے۔"

...انسان موسموں کی طرح بدلتا ہے۔ اور نہ بدلے تو دنیا اسے

بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ایک وہ موسم تھا جب وہ اور زیبی بچے تھے پندرہ اور سترہ سال کے کچے جوانوں کو بچہ ہی کہا جائے گا۔ اس لئے اس وقت کے سماج نے انہیں بچہ سمجھ کر ان کی محبت کو کچل دیا۔

دوسرا موسم وہ تھا جب وہ تقریباً چالیس برس کے ابتدائی بڑھاپے میں داخل ہوا اور زیبی (سلطانہ) اٹھارہ برس کی جوانی لے کر اس کی زندگی میں آئی۔ ایسے وقت سماج نے انہیں ان میل بے جوڑ کہہ کر ایک دوسرے سے دور پھینک دیا۔

اب صفدر پر بڑھاپے کا تیسرا موسم آیا تھا۔ تمام عمر کی مسلسل جدوجہد کے بعد کچھ نہ پاکر مرجھا جانے کا نام بڑھاپا ہے۔ اس نے صبر کرلیا تھا کہ اب دل پر محبت کا بوجھ لئے چپ چاپ رہنا ہے۔ اور اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھتے رہنا ہے۔ اس نے صفدان اور عبیرا کی منگنی کی رسم ادا کر دی تھی اور کسی دن عاشی کو بھی دلہن بنا کر گھر سے رخصت کرنے کا فرض باقی رہ گیا تھا۔

ایک برس گزر گیا۔ دل پر بوجھ ہو تو ایک دن بھی گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ آدمی کو کسی کروٹ چین نہیں ملتا۔ کیونکہ دل کا بوجھ اگر اتر جائے، اگر اچانک ہی پھر خوشی مل جائے تو اس خوشی کے بغیر ایک لمحہ بھی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اچانک بوڑھی زندگی کے ایک موڑ پر زیبی پھر نظر آگئی۔

واقعہ یہ ہوا کہ بندر روڈ کے ایک چوراہے پر کسی کو حادثہ پیش آیا تھا۔ چاروں طرف سے گزرنے والی گاڑیاں ٹریفک کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے اپنے لئے راستہ بنا کر نکل رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت صفدر نے قریب سے گزرنے والی ایک کار کی اگلی سیٹ پر زیبی کو دیکھا۔ پہلے وہ چونک پڑا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر دیکھا، دیکھا کہ کوئی خواب یا خیال نہ ہو۔ مگر وہ نہ خواب تھی، نہ خیال تھی اور نہ ہی سلطانہ تھی۔ وہ سچ مچ زیبی تھی۔

اس کے سر کے بال کہیں کہیں سے سفید تھے۔ چہرے پر بڑھاپے کی پرچھائیاں نظر آرہی تھیں۔ اس کے زیبی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی وقار احمد کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

صفدر نے چیخ کر آواز دی: "زیبی - زے .... بی ....؟"

ٹریفک کانسٹبلوں کی سیٹیاں، گاڑیوں کے شور مچاتے ہوئے ہارن اور بسوں کے اندر سے گونجنے والے فلمی نغموں کے شور میں صفدر کی آواز دب کر رہ گئی۔ وقار احمد اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ صفدر کے آس پاس دوسری گاڑیاں یوں لگی ہوئی تھیں کہ وہ باہر نکلنے کے لئے اپنی کار کا دروازہ بھی نہیں کھول سکتا تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹہ تک پریشانیاں اٹھانے کے بعد وہ ٹریفک کے جال سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکا۔ اس وقت تک وقار احمد اپنی بیٹی کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ صفدر کی عجیب حالت تھی۔

حیرت اور مسرت سے اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ وہ پلک جھپکتے ہی زیبی کے پاس پہنچ کر اسے سینے میں چھپا لینا چاہتا تھا۔ پلکیں جھپکاتے ہوئے وہ کئی بار حادثہ سے بال بال بچا۔ کتنی بار غلط طریقہ سے اوور ٹیک کرتے ہوئے کار کی تیز رفتاری قائم رکھی۔ ونڈ اسکرین کے پار اس کے آگے راستہ بچھا ہوا تھا۔ مگر اسے راستہ نہیں، صرف زیبی نظر آرہی تھی۔

آخر وہ وقار احمد کی کوٹھی تک پہنچ ہی گیا۔ احاطہ کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا اندر پہنچا۔ پورچ میں وقار احمد کی وہی کار کھڑی ہوئی تھی جسے وہ ٹریفک کی بھیڑ میں دیکھ چکا تھا۔ وہ اپنی کار سے نکل کر دوڑتا ہوا کوٹھی کے دروازے پر گیا۔ پھر کال بیل کا بٹن دبانے لگا۔

دوبار بٹن دبانے کے بعد اس نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے دروازے کو دیکھا، کوئی اسے کھول کر باہر نہیں آرہا تھا۔ وہ خود ہی دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا آیا۔ وقار احمد دوسرے کمرے سے آرہا تھا اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک گیا۔ پھر تیور بدل کر بولا: "یہاں کیوں آئے ہو؟ کس کی اجازت سے آئے ہو۔ آئی سے گیٹ آؤٹ؟"

صفدر نے اس کی بدمزاجی اور حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "زیبی کہاں ہے؟"

"تم کون ہوتے ہو اسے پوچھنے والے؟ بدمعاش تم بچپن سے میری بیٹی کے پیچھے پڑے ہو، چلے جاؤ۔ اس سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے؟"

"اس سے میرا ایک سانس کا رشتہ ہے۔ میں اس سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا؟"

"میں تمہیں نہیں ملنے دوں گا۔ یاد ہے، دو برس پہلے تم زیبی کی ایک ہمشکل کو کہیں سے پکڑ لائے تھے، میں اسے دیکھنے کے لئے ترس کر رہ گیا، میں نے تمہاری خوشامدیں کیں۔ قانونی چارہ جوئی کی دھمکیاں دیں۔ مگر تم نے مجھے اس کی صورت تک نہیں دکھائی تھی۔

"اس لئے کہ وہ آپ کی بیٹی نہیں تھی۔ لیکن آپ کی بیٹی میری زندگی ہے اور آج میں اپنی زندگی ہارنے نہیں آیا ہوں۔ میں اس سے ضرور ملوں گا۔ زیبی ....؟"

وقار احمد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ صفدر اس کا ہاتھ ہٹانے لگا۔

زیبی اپنے بیڈروم میں داخل ہو رہی تھی، اسے صفدر کی آواز سنائی دی: "زیبی ....؟" وہ ایک دم پلٹ کر آواز کی سمت دیکھنے لگی پھر صدا آئی: "زے .... بی ....؟"

زیبی نے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ پہلے وہ سوچتے ہوئے انداز میں آگے بڑھی۔ پھر تیزی سے چلنے لگی تیسری بار صفدر کی آواز سنتے ہوئے وہ دوڑتی ہوئی ایک کمرے سے دوسرے

گھر میں آئی، وہاں سے بھاگتی ہوئی لابی میں پہنچی۔ پھر زینے کے اوپری سرے پر ٹھٹھک گئی۔ نیچے ڈرائنگ روم میں اس کے ڈیڈی کے سامنے صفدر کھڑا تھا۔

دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر جم گئیں۔ وہ تقریباً چوبیس برس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جب وہ بچھڑے تھے تب ان پر نئی نئی جوانی آئی تھی۔ اب وہ مل رہے تھے تو ان پر بڑھاپے کا حملہ ہوچکا تھا لیکن زیبی اسے بوڑھی نہیں لگ رہی تھی بس یوں لگ رہی تھی جیسے کسی نے زبردستی اس پر بڑھاپے اور سنجیدگی کا ایک لیپ چڑھا دیا ہو۔

صفدر نے زینے کے نچلے سرے پر ریلنگ کو تھام کر مدھم سی جذباتی آواز میں پکارا: "زیبی ...."

وقار احمد جھنجلا کر وہاں سے چلا گیا۔ زیبی نے زینے کے اوپری سرے پر سے مسرت بھرے لہجے میں کہا: "صفدر! مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"تم مجھے دیکھ رہی ہو، میں تمہیں دیکھ رہا ہوں... یہ ... یہ خواب نہیں ہے۔"

وہ بولی: "میں آج صبح آئی ہوں۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ تم برسوں پہلے یہ شہر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہو۔"

"نہ تمہاری یاد نے مجھے چھوڑا، نہ تمہارا شہر میں نے چھوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ تم کبھی نہ کبھی واپس آؤگی۔" وہ زینے کے ایک پائیدان پر چڑھ کر بولا: "اور تم آگئی ہو۔ کہاں کھو گئی تھیں تم؟ کیا تمہیں واپس آنے کا راستہ نہیں ملا تھا؟"

"نہیں، نہ کوئی راستہ تھا، نہ کوئی راستہ دکھانے والا تھا۔ یہ میرا خدا جانتا ہے کہ میں تمہارے لیے کس طرح روتی تڑپتی رہی پھر مجھے لے جانے والے نے جبراً مجھ سے شادی کر لی۔ ایک سال بعد میری ضد میرا غصہ سب کچھ ختم ہوگیا کیونکہ میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی تھی۔"

وہ ایک پائیدان اتر کر بولی: "پھر میں کیا منہ لے کر تمہارے سامنے آتی؟ میں اس کی بیوی کسی کی ماں بن گئی تھی۔ یہ ایسے معتبر اور مقدس رشتے ہوتے ہیں جنہیں عورت خود کبھی نہیں توڑتی۔"

صفدر نے ایک ایک پائیدان چڑھتے ہوئے پوچھا "کیا آج بھی ان رشتوں کی زنجیریں پہن کر آئی ہو؟"

"نہیں، ایک زنجیر ٹوٹ چکی ہے، میرا مجازی خدا، خدا کو پیارا ہوگیا ہے۔"

وہ زینے سے اترتے ہوئے ذرا قریب آگئی: "میں نے اپنے بیٹے کی اپنے طور پر تعلیم دلائی تھی، اسے پڑھانے کے لیے شہر بھیجا تھا۔ جب اس نے دس جماعتیں پاس کرلیں تو میں نے اسے کراچی بھیج دیا تین ماہ پہلے میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ میں اب یہاں اپنے بیٹے اور اپنے ڈیڈی کے پاس آگئی ہوں۔"

وہ ایک پائیدان اور چڑھ کر اس کے روبرو آگیا۔ ایک مدت کی جدائی کے بعد اتنی قربت ملی تھی۔ دونوں کے سینے میں دھڑکنیں پاگل ہورہی تھیں۔ صفدر نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر پوچھا۔

"اب مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤگی نا؟"

زیبی کی آنکھیں بھیگ گئیں، وہ سر کے خفیف سے اشارے سے بولی: "نہیں جاؤں گی۔"

صفدر نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کی نگاہوں کے سامنے سے ساری دنیا گم ہوگئی۔ صرف وہ دونوں تھے اور ان کے اندر اور باہر پھول ہی پھول کھل رہے تھے۔ ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ رو بھی رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے، بالکل دیوانے لگ رہے تھے۔

دنیا ہمیشہ سے دیوانوں کو پتھر مارتی آئی ہے، انہیں بھی اچانک جیسے پتھر سا لگا۔ ایک گرجدار آواز سنائی دی: "یہ کیا بے حیائی ہے؟"

اس آواز کے ساتھ ہی کسی نے صفدر کو کالر سے پکڑ کر کھینچا۔ صفدر زینے پر لڑکھڑا گیا۔ لیکن گرنے سے پہلے ریلنگ کو تھام کر سنبھل گیا۔ بیس بائیس برس کا ایک نوجوان اس کا گلا دبوچنا چاہتا تھا۔ اس نے نوجوان کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ دونوں کے درمیان زور آزمائی ہونے لگی۔ زیبی چیخ کر کہنے لگی۔

"عمر! دور ہٹو، جھگڑا نہ کرو، میں تمہیں بتاتی ہوں، یہ کون ہیں؟ صفدر — صفدر! یہ میرا بیٹا ہے۔"

اس وقت تک صفدر اس کے بیٹے عمر پر غالب آکر اسے ریلنگ پر دبوچ رہا تھا۔ جب زیبی نے اسے بیٹا کہا تو وہ عمر کو چھوڑ کر فوراً الگ ہوگیا۔ اسے محبت سے دیکھنے لگا، کیونکہ اسے زیبی نے جنم دیا تھا۔

لیکن عمر اس پر حملہ کرنے آگے بڑھا، زیبی نے آگے آکر راستہ روک لیا: "ٹھہرو، کیا پاگل ہوگئے ہو؟ یہ میرے بچپن کے ساتھی ہیں ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔"

عمر نے گرج کر کہا: "امی چپ ہوجائیے، ورنہ آپ کی شان میں بھی گستاخی ہوجائے گی۔ کوئی غیرت مند بیٹا اپنی ماں کی عشقیہ داستان نہیں سن سکتا۔ آپ چلی جائیں۔ میں اس کمینے کا خون پی لوں گا۔"

زیبی نے تڑاخ سے اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا پھر اس کا گریبان پکڑ کر بولی: "اگر تم غیرت مند ہو تو تمہیں ان کا نہیں، اپنے باپ کا خون پینا چاہئے تھا جو تمہاری ماں کو جوانی میں اٹھا کر لے گیا تھا۔"

وہ غصے سے بولا: "میرے باپ نے جو غلطی کی، اسے شادی کرکے نبھا دیا۔"

• کیا کسی کی بیٹی یا بہن کو اغوا کر کے زبردستی نکاح پڑھا لینا جائز ہے؟ کیا یہی تمہاری غیرت ہے؟ کیا تم اس لئے اس غلطی کو جائز کہہ رہے ہو کہ خطا کار تمہارا باپ تھا، وہ ایک مرد تھا، تم بھی مرد ہو، اور تم لوگ کبھی باپ بن کر، کبھی شوہر بن کر اور کبھی بیٹے بن کر جو چاہو سلوک کرو، جب چاہو غیرت کی آڑ لے کر ہماری دنیا برباد کر سکتے ہو؟"

وہ اپنا گریبان چھڑا کر بولا: "میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میرے بابا نے جو غلطی کی تھی، اس پر شرمسار ہو کر میں اس شخص کو پہلی بار معاف کر رہا ہوں۔ یہ ابھی چلا جائے، ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے زینے پر چڑھتے ہوئے پہلی منزل پر جانے لگا۔ زیبی صفدر کو دیکھ کر ندامت سے بولی: "تم بُرا نہ ماننا میرا بیٹا ضدی ہے، مگر میں اسے منا لوں گی۔"

صفدر نے کہا: "تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا، اچھا نہیں کیا۔ وہ میرا بھی بیٹا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ تم فون پر رابطہ قائم کرنا۔ پھر کھل کر باتیں ہوں گی۔"

وہ اپنا وزیٹنگ کارڈ دے کر جانے لگا۔ زیبی کا دل اس کے ساتھ کھنچا جا رہا تھا مگر بیٹے کو سمجھانا منانا ضروری تھا۔ اس لئے صرف اس کی نگاہیں اس کے پیچھے جاتی رہیں۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ سر جھکا کر زینے پر چڑھتے ہوئے بیٹے کی طرف جانے لگی۔

عمر ایک کمرے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا ٹہل رہا تھا۔ ماں کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ پھر کہنے لگا: "میں سمجھ رہا تھا کہ آپ یہاں عاشی کو بہو بنانے آئی ہیں لیکن آپ تو اپنا رشتہ طے کر رہی ہیں۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے۔"

• "کسی کی بیٹی کو اٹھا کر لے جانا شرم کی بات ہے، کسی کی ماں سے شادی کی بات کرنا شرم کی بات نہیں ہے۔ پہلے شرم کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لو، پھر مجھے الزام دو۔"

وہ بولا: "معلوم ہوتا ہے، ہم ماں بیٹے کے راستے الگ الگ ہونے والے ہیں۔"

• "نہیں بیٹے، جس ماں نے تمہیں پروان چڑھانے کے لئے اپنے بچپن کے پیار کو تھپک کر سلا دیا تھا وہ تمہارا راستہ الگ نہیں ہونے دے گی۔ میری ہونے والی بہو کا پتہ مجھے بتاؤ، میں رشتہ مانگنے جاؤں گی۔"

بیٹے نے ماں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا، ماں نے کہا: "لڑکی والے تمہارے بابا کا نام اور پیشہ پوچھیں گے، اور ہمارے ملک کے ہر تھانہ میں ان کا نام اور پیشہ درج ہے۔"

بیٹے نے پریشان ہو کر کہا: "میرے بابا میرے لئے اچھے تھے مگر دنیا کے لئے ایک خطرناک ڈاکو تھے۔ میں کسی کے سامنے ان کا نام تو لے سکتا ہوں، پیشہ نہیں بتا سکتا۔"

• "بیٹے! میں نے تمہیں باپ کے سائے میں زیادہ عرصہ تک نہیں رہنے دیا تعلیم دلانے کے بہانے تمہیں شہر بھیج دیا۔ اسکول اور کالج میں تمہارے باپ کے بجائے تمہارے نانا وقار احمد کا نام سرپرست کی حیثیت سے لکھوایا لیکن لڑکی والے تمہارے باپ کا نام اور پتہ ضرور پوچھیں گے۔"

• "آپ میرے بابا کا نام بتائیں مگر پیشہ نہ بتائیں۔"

• "پیشے کے بغیر تمہارے باپ کی شناخت نہیں ہوگی۔ ایک ہی نام کے ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ بہرحال جو تم کہو گے، وہی کروں گی۔ تم عاشی کے باپ کا نام اور پتہ بتاؤ۔"

وہ بولا: "اتفاق سے عاشی کے باپ کا نام بھی صفدر ہے۔ صفدر علی شاہ ...."

زیبی اپنی حیرانی چھپانے کے لئے دوسری طرف گھوم گئی۔ بیٹا صفدر علی شاہ کی رہائش کا پتہ بتا رہا تھا۔ اور زیبی ہاتھ میں پکڑے ہوئے وزیٹنگ کارڈ پر صفدر کا وہی پتہ پڑھ رہی تھی۔

❋

بہت ہو چکا تھا۔ تقدیر زیبی اور صفدر پر ظلم کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ اس لئے اب یہ قصہ ختم کرنا چاہتی تھی۔ زیبی نے فون پر صفدر کو بتا دیا تھا کہ عمر عاشی کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ محبت کا جو مرض ان کے لئے لاعلاج تھا، ان کے بچوں کے لئے قابل علاج ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ متفقہ پروگرام کے مطابق ایک شام عمر کو لے کر عاشی کا رشتہ مانگنے صفدر کی کوٹھی میں پہنچ گئی۔

چونکہ منگنی کی باقاعدہ تقریب نہیں تھی۔ صرف رشتہ مانگنا اور عاشی کو دیکھنا مقصود تھا۔ اس لئے زیبی اپنے ڈیڈی کے ساتھ نہیں آئی۔ کوٹھی کے دروازے پر عدنان نے ان ماں بیٹے کا استقبال کیا۔ عدنان کو خوشی تھی کہ اس کی بہن کا رشتہ ہونے والا ہے۔ وہ انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے مسکراتے ہوئے آگے بڑھا لیکن زیبی کو دیکھتے ہی ٹھٹھک کر رک گیا۔

عمر نے کہا: "عدنان بھائی! یہ میری امّی ہیں۔"

عدنان نے سلام کرتے ہوئے پوچھا: "کیا آپ کا نام سلطانہ

• نہیں بیٹے، میرا نام زیب النساء ہے۔"

تب عدنان نے غور سے دیکھا کہ زیبی کے چہرے سے بڑھاپا جھلک رہا تھا اور جس سلطانہ کو اس نے ہسپتال میں دیکھا تھا وہ نوجوان تھی۔ زیبی نے عمر سے کہا: "بیٹے۔ عاشی اندر ہوگی، تم چلو میں ذرا عدنان میاں سے دو باتیں کر لوں۔"

عمر عاشی سے ملنے کے خیال سے مسکراتا ہوا کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ عدنان نے اس کے جانے کے بعد پوچھا: "کیا آپ زیبی ہیں؟"

"ہاں۔ تمہارے ڈیڈی نے مجھے بتایا ہے کہ تم مجھے میری تصویر کے ذریعے جانتے ہو، مگر پہچانتے نہیں۔ اس لئے کبھی سلطانہ کو زیبی اور کبھی زیبی کو سلطانہ سمجھ لیتے ہو۔ بیٹے! تم جوان ہو اور یہ دنیا اب تم لوگوں کی ہے۔ آج تمہیں انصاف کرنا ہوگا کہ تمہاری دنیا میں ہم بوڑھوں کو زندہ رہنے کا حق ہے یا نہیں؟"

عدنان نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا: "اب ہماری ممی نہیں رہیں ہمیں ماں کی ضرورت ہے۔ اب ڈیڈی کو محبت کرنے کا حق پہنچتا ہے۔"

زیبی مسکرانے لگی۔

کوٹھی کے اندر ڈرائنگ روم میں عمر اور عاشی ایک دوسرے کے روبرو کھڑے پیار سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ عمر نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا: "آج تم نے غضب کا سنگھار کیا ہے۔ جی چاہتا ہے تمہیں ایک دم سے سمیٹ کر سینے میں چھپا لوں۔"

عاشی نے اپنا ایک ہاتھ اسے پیش کرتے ہوئے کہا: "فی الحال تمہیں یہی ایک ہاتھ مل سکتا ہے۔ باقی پروگرام شادی کے بعد — ٹھیک ہے نا؟"

اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا: "سنا ہے انگلی پکڑنے کے بعد پہنچا پکڑنے کا موقعہ بھی جلد ہی مل جاتا ہے؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک گرجدار آواز سنائی دی: "یہ کیا بے حیائی ہے؟ کون ہو تم؟"

یہ کہتے ہی کسی نے عمر کا کالر پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ عمر نے پلٹ کر دیکھا۔ پھر صفدر کو دیکھتے ہی بوکھلا گیا۔ عاشی نے کہا —

"ڈیڈی! یہ مسٹر عمر ہیں۔ آپ کو اس طرح پیش نہیں آنا...."

"یو شٹ اپ" صفدر نے عاشی کو ڈانٹ کر عمر سے پوچھا "تم نے میری بیٹی کا ہاتھ کیوں پکڑا تھا؟"

"میں عاشی سے محبت کرتا ہوں۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے" صفدر نے نرمی اور سنجیدگی سے پوچھا: "بیٹے جب میں تمہاری بوڑھی ماں سے محبت نہیں کر سکتا تو تم میری جوان بیٹی سے کیسے محبت کر سکتے ہو؟"

"جی — وہ — بات دراصل یہ ہے کہ بوڑھے محبت کریں تو عجیب سے لگتے ہیں۔"

صفدر نے پوچھا: "ہم عجیب لگتے ہیں، اس لئے ہمیں صرف نفرت کرنا چاہئے۔ کیا محبت کی کوئی عمر ہوتی ہے؟ کیا بوڑھے شادیاں نہیں کرتے؟ ہمیں مذہب نہیں روکتا، قانون نہیں روکتا۔ تم روکنے والے کون ہوتے ہو؟"

عمر نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ زیبی اور عدنان ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔ زیبی نے عمر سے کہا: "بیٹے! یہی ایک گھرانہ ایسا ہے جہاں کوئی تم سے تمہارے باپ کا پیشہ نہیں پوچھے گا۔ یہی ایک موقع ہے کہ تم اپنے باپ کی غلطی کی تلافی کر سکتے ہو۔ بیٹے وہی انسان بڑا ہوتا ہے، جو جائز مشوروں کے آگے جھک جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم جھک جاؤ۔"

عمر نے صفدر کو دیکھ کر سر جھکاتے ہوئے کہا: "انکل! میں نے آپ سے گستاخی کی تھی۔ اس پر شرمندہ ہوں۔"

صفدر نے آگے بڑھ کر اس کے شانہ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم میرے بیٹے ہو، اور میں اپنے بچوں کی بعض غلطیوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔"

عدنان نے عمر کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: "تم ہمارے ڈیڈی کو انکل نہیں کہو گے۔ تمہاری امی ہماری امی بننے والی ہیں۔ اس لئے یہ تمہارے ڈیڈی ہوئے۔"

صفدر نے مسکرا کر زیبی کو دیکھا۔ زیبی نے شرما کر سر کو جھکا لیا۔

دو محبت کرنے والوں کی داستان کو ہنسی خوشی ختم ہو جانا چاہئے کیونکہ جو رشتہ جوانی میں نہ ہو سکا تھا وہ بڑھاپے میں ہو گیا تھا۔

کبھی صفدر کی تمنا تھی کہ وہ زیبی کے شانہ بشانہ دنیا کی سیر کرتا۔ اب عمر کے آخری حصہ میں وہ تمنا پوری ہو رہی تھی۔ انہوں نے پروگرام بنایا تھا کہ عدنان حمیرا اور عمر اور عاشی کی شادیاں ہو جانے کے بعد وہ دونوں سوئٹزرلینڈ جائیں گے۔ فی الحال وہ شادیوں کی شاپنگ کرتے پھر رہے تھے۔

ایسے ہی وقت سلطانہ نے اپنے فلیٹ کی بالکونی سے اس خوشحال جوڑے کو دیکھا۔ زیبی اور صفدر سامنے ایک گل فروش کی دکان پر کھڑے ہوئے تھے۔ زیبی پھولوں کا ایک گلدستہ خرید کر صفدر کو پیش کر رہی تھی۔ صفدر اس تحفہ کو قبول کر کے اسے سونگھ رہا تھا مسکرا رہا تھا۔

سلطانہ کے دل پر جانے کیسی قیامت گزر رہی ہو گی۔ اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہے جا رہے تھے۔ اس نے آنسوؤں کے دھندلکے میں دیکھا صفدر اپنی زیبی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی المیہ کہانی ختم ہو چکی تھی۔

اور جس کی کہانی بخیر و خوبی انجام تک پہنچتی ہے وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اس کی شروع کی ہوئی کوئی اور کہانی ادھوری رہ گئی ہے اور اپنی تکمیل کے لئے رو رہی ہے۔

محبت سدابہار ہوتی ہے۔ اور بھری بہار میں بھی رُلاتی ہے۔

**

محی الدین نواب کی کہانیوں کے متعلق ایک عام شکایت یہ ہے کہ ان کہانیوں کے ولن یا بد معاشوں کو اُن کی غلطیوں اور گناہوں کی سزا نہیں ملتی۔ جواباً عرض ہے کہ حقیقتاً سزا نہیں ملتی۔ اگر ملتی تو ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ راتوں رات دولت مند نہ بن پاتے۔ ایک جوان بیوہ پردے کے باہر مزدوری کر کے اپنی جھگی میں صوفے اور ٹی وی نہ لاتی۔ مسجد سے کوئی گھڑی یا ایمپلی فائر چرا کر نہ لے جاتا۔ ہمارے ملک میں کوئی بھوکا نہیں سوتا۔ اس لیے کہ بھوک سے نیند ہی نہیں آتی۔ رات بھر دماغ میں جرائم کی تدبیریں پکتی رہتی ہیں۔ کوئی کسی سے یہ نہیں پوچھتا کہ بھائی! تم پندرہ روپے کی مزدوری کرتے ہو۔ تمہاری کلائی میں دو ہزار روپے کی گھڑی کیسے بندھی ہے؟

ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں، وہاں ہر سانس میں ایک سوال ہے۔ اور ہر سوال کے پیچھے ایک خواہش ہے کہ خطا کار کو سزا ملے۔ آپ محض کھلی آنکھوں سے نہیں کھلے ذہن سے بھی اپنے آس پاس دیکھیں تو یہ انکشاف ہوگا کہ دس میں سے ایک بد نام کو سزا ملی باقی نیک نام رہے۔

یہ کہانی جو آپ پڑھنے جا رہے ہیں، آپ کے لیے ایک چیلنج ہے۔ آپ جواب دیں کہ اس کہانی میں جو خطا کار ہے، اُسے آپ کس طرح سزا دیں گے؟

کیا آپ نے چیلنج قبول کر لیا ہے؟

**شہریار** کو ملازمت کے سلسلے میں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا پڑتا تھا۔ کبھی چار چھ مہینے کے لیے لاہور میں رہ جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر دورے پر نکل جاتا تھا۔ جگہ بدلنے سے مزاج بھی بدل جاتا ہے۔ ذرا شوق بھی بدل جاتا ہے اور بہت کچھ بدلنے کے ساتھ محبت کو بھی بدلنے کا شوق جوان ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس کی گھر والی نہیں جانتی تھی۔

سلمٰی کا دعویٰ تھا کہ اس کا مجازی خدا ایسا نہیں ہے۔ جیسے دوسرے مرد ہوا کرتے ہیں۔ شہریار کی بات دوسروں میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہایت ہی رعب اور دبدبے والا آفیسر تھا۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ ریلوے کا کوئی پل تعمیر کرنا ہو یا کسی پل کی مرمت لازمی ہو یا پھر ریلوے لائن کو کہیں نقصان پہنچا ہو تو وہ ایسی جگہ پہنچ جاتا تھا اور باقاعدہ پلاننگ کے مطابق تمام احکامات صادر کرتا تھا کہ کس طرح کام ہونا چاہیے۔ ان دنوں سیلاب کی وجہ سے ملیر کے پل کو کافی نقصان پہنچا تھا لہٰذا وہ اس پل کا معائنہ کرنے اور اس کی تعمیر کے احکامات صادر کرنے کے لیے کراچی آیا ہوا تھا۔

ایسے وقت اس کے لیے ایک سیلون کار ریزرو ہوتی تھی۔ وہ جب بھی کسی شہر میں ڈیوٹی پر پہنچتا تھا تو وہ سیلون کار ریلوے کے شنٹنگ ایریا میں کہیں کھڑی رہتی تھی۔ اس کار کے اندر اس کی رہائش کے مکمل انتظامات ہوتے تھے۔ کھانے کے انتظامات کے علاوہ خدمت کے لیے نوکر اور عیاشی کے لیے بھی بہت کچھ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے ملک میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہوا تھا اور شراب عام تھی۔ سیلون کار کے عیش کدے میں اس کے لیے شراب اور شباب سب کچھ مہیا ہو جاتا تھا۔

اگرچہ وہ خوب عیش کرتا تھا۔ ڈیوٹی بھی انجام دیتا تھا اور اپنے شوق بھی پورے کرتا تھا لیکن ادھر چار برسوں میں اس کا مزاج بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اگر کوئی اس کے پاس آنا بھی چاہتی تو وہ جھڑک دیتا تھا۔ دور بھاگتا تھا۔ صرف کبھی کبھی پی لیتا تھا اور پینے کے بعد کہیں دور کسی دھن میں کھو جاتا تھا حالانکہ یاد کرنے کے لیے اپنی بیوی بھی خاصی خوبصورت تھی، وفادار تھی، ہنس مکھ اور ملنسار تھی لیکن بے چاری بیوی تھی۔ بار بار یاد آنے والی چیز نہیں تھی۔

لیکن سلمٰی نے اس بار شہریار کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”میں بھی کراچی چلوں گی۔ وہاں خوب شاپنگ کروں گی سیر کروں گی۔ پھر آپ کے ساتھ واپس آ جاؤں گی۔“

اس نے بیوی کو خوش کرنے کے لیے اُسے اور اپنے چار سال کے بیٹے امیر کو ساتھ لے لیا تھا۔ اس بار وہ بیوی بچے اس کے

ساتھ سیلون کار میں موجود تھے۔ جو کراچی کینٹ اسٹیشن کے باہر شنٹنگ ایریا میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ صبح ٹرالی میں بیٹھ کر ملیر ہالٹ تک آیا تھا۔ آنے سے پہلے سلمیٰ سے کہہ دیا تھا کہ وہ بچے کو لے جا کر اپنی مرضی کے مطابق شاپنگ کرے لیکن دوپہر تک سیلون میں واپس آجائے۔ اس کی بھی واپسی اسی وقت ہوگی۔

دن کے ایک بجے وہ ملیر کے پل سے ٹرالی میں بیٹھ کر واپس ہوا۔ راستے میں ملیر ہالٹ کے اسٹیشن پر ٹرالی کو رکنے کا حکم دیا۔ وہاں پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ ریلوے کا آفیسر تھا اور پلیٹ فارم پر ایسی غیر معمولی بھیڑ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ فوراً اس بھیڑ کی وجہ معلوم کی جائے۔

یہ حکم دینے کے بعد وہ خود بھی پلیٹ فارم پر آگیا۔ ایک ٹرالی مین نے آکر کہا۔ "حضور! ایک پولیس والے نے ایک بدمعاش کو پکڑا ہے۔ وہ ایک ننھے سے بچے کو اٹھا کر کہیں لے جا رہا تھا۔"

اس کی بات سنتے ہی شہریار کے دل کو دھچکا سا لگا۔ یوں لگا جیسے اس کا اپنا بیٹا کہیں گم ہو گیا ہو، کوئی اسے اٹھا کر لے جا رہا ہو۔ آئے دن اخبارات میں بچوں کے اغوا ہونے کی خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ سلمیٰ کے ساتھ بچے کو جانے کی اجازت دے کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ ان ماں بیٹے کو اکیلے کراچی جیسے بڑے شہر میں گھومنا نہیں چاہیے۔ اس کے اندر بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔

وہ مڑ کر اپنی ٹرالی کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس وقت بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ تب ہی ایک ننھی سی آواز سنائی دی۔

"امّی... امّی... امّی..."

یہ آواز سنتے ہی اس کے قدموں میں زنجیر پڑ گئی۔ ایک دم ویسی ہی آواز تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی آواز کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ ایک دم سے پلٹ گیا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر پولیس والے کی گود میں اس بچے کو دیکھنے لگا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا اور وہ امّی امّی کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ شہریار اس کا منہ دیکھنے کے لیے دوسری طرف لپک گیا۔ پھر اسے دیکھتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ "میرا بیٹا۔ میرا بچہ۔ امیر! امیر بیٹے! تم یہاں کہاں آگئے ہو؟"

اس نے پولیس والے کی گود سے بچے کو چھین لیا۔ اسے کبھی سینے سے لگانے لگا اور کبھی اِدھر اُدھر سے چومنے لگا۔ "یہ میرا بیٹا ہے۔ میں اس کا باپ ہوں۔ کون بدمعاش اسے اٹھا کے جا رہا تھا؟"

دوسرے پولیس والے نے ایک آدمی کے سر پہ زور کی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "یہی بدمعاش تھا۔"

وہ بدمعاش دونوں ہاتھ جوڑ کر رونے لگا۔ بولا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ میں اس بچے کو اٹھا کر نہیں لے جا رہا تھا بلکہ اس کے ماں باپ کو تلاش کر رہا تھا۔"

پولیس والے نے اسے ایک ڈنڈا رسید کرتے ہوئے کہا۔ "بدمعاش تو اسے سوسائٹی کے علاقے سے اٹھا کر لایا ہے اور ملیر ہالٹ میں آکر اس کے ماں باپ کو تلاش کر رہا تھا۔ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تجھ جیسے لوگوں کو ہم خوب سمجھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اس کی پٹائی کرنے لگے۔ اسٹیشن ماسٹر اور ریلوے کے بہت سے ملازمین پہلے ہی وہاں موجود تھے اور شہریار کے آس پاس ادب سے کھڑے ہوئے تھے۔ اسے مبارک باد دے رہے تھے کہ بچہ اغوا ہونے سے پہلے ہی واپس مل گیا ہے۔ وہ اس بدمعاش کے خلاف قانونی کارروائی کے مشورے دے رہے تھے۔ شہریار نے کہا۔ "میں کیا کروں یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو یہاں لاہور سے صرف چار دن کے لیے آیا ہوں، اگر قانونی الجھنوں میں پڑوں گا تو پھر تھانے کچہری کے چکر لگانے پڑیں گے اور میں یہاں پیشی کے دنوں حاضر نہیں ہو سکوں گا۔"

ایک سپاہی نے کہا۔ "جناب! پہلے تو یہ ثابت ہونا چاہیے کہ یہ سچ مچ آپ ہی کا بیٹا ہے۔ آپ کو کوئی ثبوت تو دینا ہی ہوگا۔"

اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ارے اسے، یہ کیا بولتے ہو۔ تم انھیں نہیں جانتے ——— یہ چیف انجینئر ہیں۔ ریلوے کے بڑے آفیسر ہیں۔ انھیں کون نہیں پہچانتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں، ہم سب اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ یہ ان کا ہی بچہ ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ تھانے میں چل کر رپورٹ لکھائیے۔ وہاں اپنے دستخط کیجیے، اپنا پتہ دیجیے۔ پھر اس بدمعاش کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔"

شہریار نے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم لوگ اس بدمعاش کو اچھی خاصی سزا خود ہی دے کر اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔ اگر قانونی کارروائی ہوئی تو میں بڑی الجھن میں پڑ جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہوئے شہریار نے اپنی اوپری جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ پھر سپاہی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں آپس میں بانٹ لو۔"

وہ دو سپاہی تھے انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرے سپاہی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم اس بدمعاش کی ایسی پٹائی کریں گے کہ یہ آئندہ کسی بچے کو اغوا نہیں کرے گا۔ جناب آپ تو بہت بڑے آفیسر ہیں۔ بڑے شریف آدمی ہیں، آپ جا سکتے ہیں۔ بچہ آپ کو مبارک ہو۔"

سو روپے کے ایک نوٹ نے بڑا کام دکھایا تھا۔ ایک دم سے قانون بدل گیا تھا۔ کسی تھانے میں رپورٹ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بار بار تھانے کچہری کے چکر لگانے کی مصیبت سے نجات مل گئی تھی۔ اگر

یہی سو روپے کا نوٹ وہ اغوا کرنے والا مجرم پولیس والوں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تو قانون کے وہ رشوت خور محافظ بہت پہلے ہی اس مجرم کو بچے کے ساتھ فرار ہونے کا موقع دے چکے ہوتے۔ اچھے بھلے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ رشوت دینے اور لینے کے باعث شریفوں سے زیادہ بدمعاشوں کا بھلا ہوتا ہے۔

وہ بچے کو سینے سے لگائے ٹرالی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرالی ریلوے لائن پر دوڑتی جا رہی تھی۔ دو ملازم اس ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے دوڑتے ہوئے لے جا رہے تھے اور ہانپتے جا رہے تھے۔ تیز چلچلاتی ہوئی دھوپ میں وہ لوہے کی جلتی ہوئی پٹری پر ننگے پاؤں دوڑ رہے تھے۔ یہ ٹرالی اور اس کے دھکا دینے والے برطانوی سامراج کی یادگار تھے۔ گورے صاحب لوگ اسی طرح دھوپ میں اور بارش میں چھتری کے نیچے ٹرالی پر بیٹھتے تھے اور برصغیر کے کالے آدمی ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے دوڑتے ہوئے لے جاتے تھے۔ کبھی بارش کی وجہ سے لوہے کی پٹری پر پھسل کر زخمی ہوتے تھے اور کبھی جلتی ہوئی دھوپ میں لوہے کی گرم پٹری پر ننگے پاؤں دوڑتے تھے۔ وہ انگریز حاکم جا چکے تھے۔ اب پاکستانی افسران تھے اور اپنے ہی پاکستانی ملازمین کو وہی برطانوی انداز دکھا رہے تھے۔

لیکن ٹرالی پر بیٹھے ہوئے شہریار کو ان باتوں کا احساس نہیں تھا۔ چھتری کے سائے میں یا ایئر کنڈیشنڈ میں بیٹھ کر مزدور کے پسینے کا احساس کرنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اس وقت سوچ رہا تھا کہ سلمیٰ کو بچے کی گمشدگی کا پتہ چلا ہوگا تو وہ بازاروں میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوگی۔ اس نے اپنے بال نوچ لیے ہوں گے۔ چیخ رہی ہوگی۔ تھانے میں رپورٹ کرائی ہوگی۔ ممتا کی تڑپ اتنی شدید ہوگی کہ اس کا کلیجہ پھٹ رہا ہوگا۔ اچھا ہے ایسی عورتوں کو ایسی سزا ملنی ہی چاہیے۔

اس نے لاہور سے چلتے وقت سلمیٰ کو سمجھایا تھا کہ کراچی میں اس کی خالہ زاد بہن رہتی ہے لہٰذا اسے بچے کے ساتھ وہیں اپنی بہن کے پاس رہنا چاہیے۔ وہاں بچے کی دیکھ بھال ہوگی۔ وہ شاپنگ کے لیے جایا کرے گی تو بچہ گھر میں رہا کرے گا لیکن شادی کرنے کے بعد عورت بچہ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ وہ ضد کرتی رہی کہ وہ سیلون کار میں شہریار کے ساتھ رہے گی، لہٰذا اب ساتھ رہنے کا نتیجہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔

امیر شہریار کے شانے پر سر رکھے کئی بار اپنی ماں کو آوازیں دے چکا تھا۔ بار بار امی امی کہہ رہا تھا۔ شہریار نے اسے تھپک تھپک کر کہا۔ ”بیٹے! میں تمہارا پپا ہوں، مجھ سے بھی تو باتیں کرو۔“

لیکن وہ ماں کو آوازیں دے رہا تھا۔ شہریار کو تعجب ہو رہا تھا کہ آج وہ صرف ماں کو کیوں یاد کر رہا ہے، حالانکہ وہ ماں سے زیادہ باپ کو چاہتا تھا۔ کبھی اس سے پوچھا جاتا تھا۔ بولو بیٹے! امی اچھی ہیں کہ پپا اچھے ہیں ہے وہ فوراً ہی کہتا تھا پپا اچھے ہیں لیکن اب پپا کے سینے سے لگے ہوئے، شانے پر سر رکھے ہوئے صرف اپنی ماں کو یاد کر رہا تھا۔

وہ ٹرالی کینٹ اسٹیشن کے شینٹنگ ایریا میں پہنچ کر رک گئی۔ وہاں سے سیلون کار تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ڈیڈ لائن پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ امیر کو اپنی گود میں سنبھالتے ہوئے ٹرالی سے اتر کر اپنی سیلون کار کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سوچتا جا رہا تھا۔ سلمیٰ تو ابھی واپس نہیں آئی ہوگی۔ بچے کو تلاش کرتی پھر رہی ہوگی۔ وہ بچے کو آیا کے پاس چھوڑ کر سلمیٰ کی تلاش میں جائے گا۔ سیلون کار کی سیڑھی کے پاس ایک اردلی کھڑا ہوا تھا۔ دور سے اپنے صاحب کو آتا دیکھ کر اٹینشن ہو گیا۔ شہریار جب اس سیلون کار کے قریب پہنچا تو اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس کھڑکی سے سلمیٰ کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

وہ ٹھٹھک گیا۔ اس ہنسی کو غور سے سننے لگا۔ پھر پہچان گیا کہ واقعی سلمیٰ ہی ہنس رہی ہے۔ اس نے دوبارہ غور کیا کہ وہ ہنسی خوشی کے جذبے سے ہے یا بچے کی گمشدگی پر وہ پاگل ہو کر قہقہے لگا رہی ہے۔ کھڑکی سے آواز آ رہی تھی۔ ”میرا لال! میرا پیارا پیارا راشد! یہ بندر میرے بیٹے کے لیے ہے اور یہ دیکھو یہ بھالو کیسے باجا بجاتا ہے۔ میں ابھی اپنے لال کو اس کا باجا سناتی ہوں۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا سیلون کار کے دروازے پر آیا۔ اردلی نے اسے سلام کیا۔ وہ زینے پر قدم رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا بیگم صاحبہ اندر موجود ہیں ہے؟“

سوال کرتے وقت اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ سلمیٰ کی ہنسی سے صاف پہچان گیا تھا کہ وہ موجود ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے۔ کیا ہمارا راشد بھی ان کے ساتھ ہے؟“

اردلی نے ادب سے کہا۔ ”جی صاحب! امیر بابا اندر موجود ہے۔ ابھی ہم اس کو گود میں کھلا رہا تھا۔ ابھی بیگم صاحب بازار سے آیا تو ہم نے اس کو اندر چھوڑ دیا۔“

شہریار حیران رہ گیا۔ وہ اپنی گود کے بچے کو دیکھنے لگا۔ اس کا بیٹا امیر اس کی گود میں تھا پھر اردلی کہہ رہا تھا کہ وہ سیلون کے اندر ہے۔ سلمیٰ کی ہنسی سے اور باتوں سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ ان کا بیٹا امیر سیلون کے اندر ہے اور ایک امیر شہریار کی گود میں بھی تھا۔ یہ تو چکرا جانے والی بات تھی۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا سیلون کار کے اندر داخل ہوا۔ قدموں کی آہٹ سن کر سلمیٰ کی ہنسی اور باتیں ذرا تھم گئیں۔ اس نے اندر پہنچ کر سیلون کا اندرونی دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر اپنے بیٹے پر گئی، وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا اور بھالو کو باجا بجاتے ہوئے دیکھ کر تالی بجا رہا تھا۔

شہریار کی گود میں ایک بچہ دیکھ کر سلمیٰ کا ہنستا ہوا چہرہ ساکت ہو گیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہاں سب پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ صرف ایک بھالو باجا بجا رہا تھا۔ امیر کو سنبھالنے والی آیا بھی گم صم سی ہو کر شہریار کی گود کے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد سکتہ ٹوٹ گیا۔ اب وہ

کبھی اپنے بیٹے امیر کو دیکھتے تھے جو قالین پر کھلونوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی شہریار کے گود کے بچے کو دیکھتے تھے۔ دونوں کا چہرہ بالکل ایک جیسا تھا۔ ناک نقشہ ایسا تھا کہ کہیں سے ذرا سا بھی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں کا قد بھی ایک جیسا تھا، جسامت بھی ویسی ہی تھی۔

پھر سلمیٰ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شہریار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "یہ..... یہ بچہ... آپ کو کہاں سے مل گیا ہے؟"

شہریار نے کہا۔ "تعجب ہے۔ تم یہ پوچھ رہی ہو کہ بچہ کہاں سے مل گیا۔ یہ نہیں پوچھ رہی ہو کہ یہ ہمارے بیٹے کا ہمشکل کیسے ہے؟ تمہیں بچے کے ملنے پر نہیں، اس کے ہمشکل ہونے پر حیران ہونا چاہیے۔"

"آں، ہاں۔ میں حیران ہوں۔" سلمیٰ پر بدحواسی طاری تھی۔ وہ کبھی قالین پر بیٹھے ہوئے امیر کو اور کبھی گود کے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "میں خود حیران ہوں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ادھر بھی میرا بیٹا ہے، ادھر بھی اپنا ہی بیٹا نظر آ رہا ہے۔"

وہ بچے کو شہریار کی گود سے لیتے ہوئے بولی۔ "آپ جائیے غسل کر لیجیے۔ گرمی کی وجہ سے پسینے میں نہائے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے لیے کھانا نکالتی ہوں۔"

شہریار نے کمرے میں داخل ہو کر پنکھے کے نیچے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کمال ہے، یہاں بچے کا اتنا اہم مسئلہ ہے اور تم مجھے نہانے اور کھانے کے لیے کہہ رہی ہو۔ اگر ہم آنکھیں بند کر کے ان دونوں کو ایک جگہ بٹھا دیں اور پھر آنکھیں کھول کر دیکھیں تو یہ سمجھ میں نہیں آئے گا کہ ان میں سے ہمارا امیر کون ہے۔"

سلمیٰ نے کہا۔ "آپ ان باتوں کی فکر نہ کریں۔ میں اپنے بیٹے کو پہچان لوں گی۔"

شہریار نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیسے پہچانو گی؟ کیا تم دونوں کو پہلے سے جانتی ہو؟"

وہ ایک دم سے گھبرا کر بولی۔ "آں، نہیں تو۔ میں بھلا دونوں کو کیسے پہچان سکتی ہوں۔ میں تو صرف اپنے بیٹے کو پہچانتی ہوں۔ پتہ نہیں آپ اسے کہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ کچھ بتائیے تو سہی۔"

شہریار اسے بتانے لگا کہ وہ کس طرح اس اجنبی بچے تک پہنچا تھا اور اسے اپنا امیر سمجھ کر اس نے پولیس والوں کو سو روپے کی رشوت بھی دی تھی اور تھانے والوں سے کترا کر بچے کو ادھر لے آیا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ "اگر تھانے میں رپورٹ ہوتی تو یہ بچہ اپنے ماں باپ تک پہنچ جاتا۔ سو روپے کی رشوت بڑی مہنگی پڑی ہے۔ اب اس بچے کے ماں باپ کی تلاش میں بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی۔ تم کیا کہتی ہو؟"

شہریار نے سوال کیا۔ سلمیٰ گم صم بیٹھی اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کے سوال کرنے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسی طرح اس کے چہرے کو تکتی رہی، جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو، کہیں دور پہنچ گئی ہو اور اس اجنبی بچے کو لے کر کہیں بھٹک رہی ہو۔ شہریار نے ذرا بلند آواز سے پوچھا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیا سوچ رہی ہو؟ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

"آں۔" وہ چونک گئی۔ پھر بولی۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"سلمیٰ! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟"

"ہاں ہاں۔ سب کچھ سن لیا ہے۔ آپ جلدی سے نہا دھو کر لباس بدل لیجیے، کھانا کھا لیجیے۔ پھر ہم کہیں تھانے میں جا کر اس بچے کے متعلق رپورٹ درج کرائیں گے۔ یہ انشاءاللہ شام تک اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے۔ میں چار دن کے لیے یہاں آیا ہوں، اگر اس بچے کے لیے بھاگ دوڑ میں لگا رہا تو ادھر پل کی مرمت کا کام نہیں ہو سکے گا۔ میرا لوکیشن پر موجود رہنا بہت ضروری ہے۔"

"آپ کھانا کھا کر ڈیوٹی پر چلے جائیے۔ میں بچے کو لے کر جاؤں گی، تھانے میں رپورٹ لکھواؤں گی اور انہیں یہاں سیلون کار کا پتہ لکھوا دوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ جائیے غسل کر لیجیے۔"

پھر وہ بچے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی پسینے میں نہا گیا ہے۔ میں گیلے کپڑے سے اس کا بدن پونچھ رہی ہوں، پھر اپنے امیر کا کوئی سا بھی لباس اسے پہنا دوں گی۔ بے بے! ذرا یہ کپڑا گیلا کر کے لے آنا۔"

آیا وہاں سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف جانے لگی۔ شہریار نے کہا۔ "میں غسل نہیں کروں گا۔ پتہ نہیں یہ کراچی کا موسم کیسا ہے۔ اتنے خشک موسم میں بھی غسل کرو تو زکام ہو جاتا ہے۔"

آیا ایک کپڑے کو بھگو کر لے آئی۔ سلمیٰ بچے کو گود سے اتار کر قالین پر بٹھاتے ہوئے اس کی بنیان اتارنے لگی۔ جیسے ہی بنیان اتری شہریار پھر اس بچے کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس بچے کے دائیں بازو پر ایک بڑا سا زخم کا نشان تھا۔ اس نے جلدی سے جھک کر قالین پر بیٹھتے ہوئے سلمیٰ سے کہا۔ "یہ دیکھو، اس کے بازو پر بھی ویسا ہی نشان ہے جیسا ہمارے امیر کے بازو پر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ہمارے امیر کے بائیں بازو پر یہ نشان ہے اور اس کے دائیں بازو پر۔"

ایسا کہتے ہی وہ ایک دم سے چونک کر خلا میں گھورنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے دھیرے دھیرے نظریں جھکا کر سلمیٰ کو دیکھا۔ وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ شہریار نے آہستگی سے کہا۔ "سلمیٰ! یہ دو نشان اگر ملا دیے جائیں۔ دونوں بچوں کے بازوؤں کو جوڑ دیا جائے تو ایسا لگے گا جیسے یہ جڑواں بچے ہیں۔ ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔"

سلمیٰ ایک دم سے پیچھے ہٹ کر تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ "یہ

آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ نہیں۔ میں نے تو... میں نے تو صرف امیر کو جنم دیا ہے۔"

شہریار نے حیرانی سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تو ایسے بچھے ہٹ رہی ہو جیسے میں تمہیں مارنے آ رہا ہوں۔ بھئی میں تو ایک قاعدے کی بات کہہ رہا ہوں۔ کسی بھی ڈاکٹر کو یہ دو نشان دکھائے جائیں تو یہی کہے گا کہ یہ جڑواں بچے ہیں اور انھیں آپریشن کے ذریعے الگ الگ کیا گیا ہے۔"

سلمٰی نے بچے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے ننگے بدن کو گیلے کپڑے سے پونچھتے ہوئے بولی۔ "یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ایسا نشان ہو تو بچے جڑواں ہوں۔ یہ کسی چوٹ کا نشان ہوگا۔ بس یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے بچے کی طرح اس کے بازو پر بھی ایک نشان بن گیا ہے۔"

شہریار قالین پر سے اٹھ کر پھر بستر پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "ہم خواہ مخواہ بحث کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بچے کو اس کے ماں باپ تک پہنچانے کا انتظام کرنا چاہیے۔"

"میں ابھی اس بچے کو لے جاؤں گی اور تھانے میں رپورٹ درج کراؤں گی۔"

"تم اتنی دھوپ میں کہاں جاؤ گی؟ ایسا کرو۔ امیر کی ایک تصویر مجھے دے دو۔ میں یہاں ریلوے پولیس انسپکٹر سے جا کر ملتا ہوں اور اسے پوری روداد سناتا ہوں۔ اس بچے کے لباس کے بارے میں بتا دوں گا کہ اس نے ایک سفید نیکر اور سرخ بنیان پہنی ہوئی ہے۔ اپنے امیر کی وہ تصویر پیش کر دوں گا۔ وہ پولیس انسپکٹر تمام تھانے والوں سے رابطہ قائم کرے گا۔ یقیناً اس بچے کے ماں باپ نے کہیں نہ کہیں پر رپورٹ درج کرائی ہوگی۔ یہ تھانے والے آپس کے رابطے سے بچے کو یہاں آ کر لے جائیں گے۔ ہمیں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑے گی۔"

آیا نے کہا۔ "ٹھیک ہے بی بی جی! آپ صاحب کو امیر کی تصویر نکال کر دے دیں۔ میں اس بچے کو کپڑے پہنا دیتی ہوں۔"

سلمٰی بچے کو بار بار اپنی گود میں سمیٹ کر سینے سے لگا کر اس کا بدن پونچھ رہی تھی جیسے وہ اپنے ہی گوشت پوست کا حصہ ہو۔ اس نے کہا۔ "میں بچے کو خود ہی کپڑے پہنا دوں گی۔ تم ایسا کرو میرا سوٹ کیس کھول کر امیر کا کوئی اچھا سا لباس نکال کر اس بچے کے لیے دو۔ وہیں ایک البم رکھی ہوئی ہے۔ وہ صاحب کو دے دو۔ یہ اس میں سے کوئی تصویر پسند کر کے نکال لیں گے۔"

آیا نے حکم کی تعمیل کی۔ سوٹ کیس کھول کر البم نکالی اور اسے صاحب کے حوالے کر دیا۔ پھر امیر کا ایک جوڑا نکال کر سلمٰی کو دے دیا۔ سلمٰی کہہ رہی تھی۔ "پتہ نہیں اس کی ماں کا کیا حال ہوگا۔ بے چاری در در کر پریشان ہوگی۔"

شہریار نے البم میں سے امیر کی ایک تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ "یہی میں راستے میں سوچتا آ رہا تھا کہ ہمارا امیر اغوا ہوا ہے اور تم اسے تلاش کرتی ہوئی لوگوں سے پوچھتی پھر رہی ہوگی اور پاگلوں کی طرح چیخ چلا رہی ہوگی۔ اب تم نہ سہی کوئی دوسری ماں ہے جو اپنے اس بچے کے لیے پریشان ہوگی۔ پتہ نہیں اپنا کیا حال کیا ہوگا۔ میں ریلوے پولیس انسپکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔"

وہ تصویر لے کر سیلون کا سے باہر آ گیا۔ باہر اردلی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پھر اٹینشن ہو کر سلام کیا۔ شہریار اسے نظر انداز کرتے ہوئے ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتے ہوئے پلیٹ فارم کی طرف جانے لگا۔ جب وہ پلیٹ فارم کے قریب پہنچا تو ادھر سے ایک سپاہی آ رہا تھا۔ سپاہی نے شہریار کو دیکھ کر سلام کیا۔ اس نے پوچھا "تھانے انسپکٹر صاحب ہیں؟"

سپاہی نے کہا۔ "جی نہیں، صاحب! وہ ایک کیس کے سلسلے میں صدر کی طرف گئے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد واپس آئیں گے۔"

شہریار نے کچھ سوچا۔ پھر واپس پلٹ کر سیلون کی طرف جانے لگا۔ اب وہ ایک گھنٹے بعد انسپکٹر سے نہیں مل سکتا تھا کیونکہ اسے ملیر برج کی طرف ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اب سلمٰی ہی انسپکٹر سے رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ وہ سیلون کا کے قریب پہنچا تو اردلی وہاں موجود نہیں تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہاں سے سلمٰی کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اس بات کو سنتے ہی ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ کان لگا کر سننے لگا۔

وہ کہہ رہی تھی "بے بے! کبھی کبھی اندازے سے کہی ہوئی بات درست ہو جاتی ہے۔ تمہارے صاحب نے بھی اندازے سے درست کہہ دیا کہ دونوں جڑواں بچے تھے۔ آپریشن کے ذریعے الگ کیے گئے ہیں لیکن ان کی بات درست نکلنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے تو اسے جھٹلا دیا ہے۔"

آیا کی آواز سنائی دی۔ "ٹھیک ہے آپ نے صاحب کی بات کو جھٹلا دیا لیکن اس بچے کو جلدی رخصت کر دینا چاہیے۔ نہیں تو بھید کھل جائے گا۔"

یہ ایسی بات تھی کہ جسے سنتے ہی شہریار کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ دونوں جڑواں بھائی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے آج تک دھوکے میں رکھا گیا۔ سلمٰی نے یہ بات کیوں چھپائی ہے وہ جب ملیر ہالٹ کے اسٹیشن سے اس دوسرے بچے کو گود میں اٹھا کر لا رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ اس کی ماں کتنی پریشان ہوگی۔ اسے ڈھونڈ رہی ہوگی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خود ہی اسے اس کی ماں کے پاس لے آیا ہے۔ اس بچے کی کوئی دوسری ماں نہیں ہے۔ جو ہے وہی سلمٰی ہے لیکن یہ کیا بھید ہے؟ اگر وہ جڑواں بچوں کا باپ بنا تھا تو اس سے اس کے

دوسرے بیٹے کو کیوں چھپایا گیا؟

وہ اپنی سوچ کی گرفت سے نکل کر ان کی باتیں پھر توجہ سے سننے لگا۔ سلمیٰ کہہ رہی تھی: "میں خود ہی اس بچے کو یہاں سے لے جانا چاہتی تھی۔ یہ جس کی امانت ہے اسے ڈھونڈ کر اس کے حوالے کرنا چاہتی تھی۔"

آیا نے کہا: "مگر صاحب، امیر بابا کی تصویر لے کر چلے گئے ہیں۔ بی بی جی! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ اگر ڈھونڈنے والوں نے پتہ چلا لیا اور اس عورت تک پہنچ گئے تو پھر صاحب کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ دونوں بچے ان کے نہیں ہیں۔ وہ ان بچوں کے باپ نہیں ہیں۔"

آیا کی یہ بات ایسی دھماکا خیز تھی کہ شہریار ایک دم سے کانپ کر رہ گیا۔ اس کا سر ایک دم سے پھٹا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا وجود پھٹ پڑے گا۔ اس کے چیتھڑے چیتھڑے ہو جائیں گے اور وہ بالکل معدوم ہو جائے گا۔ ایسی مکروہ دنیا سے نجات حاصل کرے گا جہاں کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے سلمیٰ پر ایسا اندھا اعتماد کیا تھا اور وہ تھی کہ چار سال سے ایک ناجائز بچے کو اس کی گود میں کھلا رہی تھی۔

اس نے غصّے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ دانت پیسنے لگا۔ غصّے اور جنون میں بس ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ابھی اندر جائے اور سلمیٰ کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دے۔ اسے اتنی سفاکی سے قتل کرے کہ وہ منظر دیکھ کر پھر دنیا کی کوئی عورت اپنے مرد سے بے وفائی نہ کر سکے۔

آدمی سوچتا بہت کچھ ہے لیکن سوچی ہوئی بات پر عمل نہیں کر سکتا۔ شہریار نے کبھی اپنے ہاتھوں سے ایک مرغی بھی ذبح نہیں کی تھی۔ پھر وہ سلمیٰ کو کیسے قتل کر سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ غصّے کی گرمی نکالنے کے لیے کوئی بہانہ ہونا چاہیے۔ کوئی کمزور یا شریف آدمی جب کسی کو ہلاک نہیں کر سکتا تو خیال ہی خیال میں اپنے دشمن کو بار بار قتل کرتا ہے۔ بار بار اُسے مرتے ہوئے دیکھتا ہے اور آسودگی حاصل کرتا ہے اس طرح اپنے اندر کا غبار نکالتا رہتا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر اندر جاتا تو غصّے کی حالت میں سلمیٰ کو مار بیٹھتا۔ پھر چیخ چیخ کر گالیاں دینا شروع کر دیتا اس طرح اس کی پوزیشن بگڑ جاتی۔ وہ ریلوے کا اتنا بڑا آفیسر تھا۔ سیلون کار میں جاہلوں جیسا ہنگامہ ہوتا تو بڑی شرم کی بات ہوتی۔ اس کے ماتحت طرح طرح کی باتیں بناتے۔ پھر بات کا بتنگڑ بنتا، جو بات ابھی سیلون کار کی چار دیواری میں چھپی ہوئی ہے وہ عام ہو جاتی اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اُف۔ کتنی گندی گالی پڑتی — اسے ایک مرد برداشت نہیں کر سکتا۔

وہ وہاں سے دور جانے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سلمیٰ اس کی بیوی نہیں بلکہ غلاظت کا ڈھیر ہے۔ اگر وہ قریب رہے گا۔ سیلون کار کے اندر جائے گا تو بدبو سے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ مختلف لائنوں کو عبور کرتے ہوئے دور ڈیڈ لائن پر کھڑی ٹرالی کی طرف جانے لگا۔

سلمیٰ کھڑکی کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی اور آیا اس کے سامنے کھڑی ہوئی باہر دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس کی نظر دور جاتے ہوئے شہریار پر پڑی۔ اس نے کہا: "بی بی جی! صاحب تو انسپکٹر سے ملنے گئے تھے۔ یہ تو وہاں ٹرالی کی طرف جا رہے ہیں۔"

سلمیٰ نے اُدھر دیکھتے ہوئے تعجب سے پوچھا: "یہ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟ انھوں نے تو غسل بھی نہیں کیا۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ آرام کرنے کے بعد یہ ڈیوٹی پر جاتے ہیں۔ مگر ابھی سے جا کر ٹرالی پر بیٹھ رہے ہیں۔"

اچانک وہ سہم گئی۔ دل میں چور تھا اس لیے سوچنے لگی۔ کیا یہ انسپکٹر سے ملنے کے لیے پلیٹ فارم پر نہیں گئے تھے۔ یہیں کھڑے ہوئے تھے؟ کیا انھوں نے ہماری باتیں سُن لی ہیں۔ شاید یہی بات ہے۔ یہیں سے وہ سیدھے ٹرالی کی طرف گئے ہیں۔"

وہ آیا سے بولی: "اردلی سے جا کر کہو کہ وہ صاحب کو یہاں بلا کر لائے۔"

"بی بی جی! وہ تو کھانے کی چھٹی لے کر گیا ہے۔ کیا میں خود جا کر بلا لاؤں؟"

"پوچھتی کیا ہو۔ جاتی کیوں نہیں ہو؟"

آیا جلدی سے باہر چلی گئی۔ سلمیٰ جھنجلاہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ایک تو دوسرے بچے کی آمد نے ہی اُسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ پرانی باتیں تازہ کر دی تھیں اور یہ خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ جو بات چار برس سے چھپی ہوئی ہے وہ اچانک ہی کھل نہ جائے۔

آیا ریل کی پٹریوں پر سے گزرتی ہوئی ٹرالی کے پاس پہنچی۔ شہریار نے اُسے گھور کر دیکھا پھر غرّا کر پوچھا: "کیا بات ہے؟"

وہ سہم کر بولی: "صاحب جی! بی بی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"بھاگ جاؤ یہاں سے۔" اس نے زور سے ڈانٹا۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹی۔ سہمی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر جانے لگی۔ شہریار نے کہا: "ٹھہرو۔"

وہ قریب آ کر ٹرالی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ شہریار نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر امیر کی تصویر نکالی، اسے دیکھا۔ وہ بچہ جو چار برس سے اس کی گود میں کھیل رہا تھا، جس سے اُسے دلی اور روحانی لگاؤ تھا۔ صبح شام اسے پیار کرتا تھا۔ اب وہ بچہ بالکل اجنبی ہو گیا تھا۔ اپنا تو لگتا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک گناہ تھا جو اس کی گود میں پالنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے نفرت سے تصویر کو دیکھا پھر اس کے دو ٹکڑے کر کے آیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اسے اپنی بی بی جی کو دے دو۔"

آیلہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگنے کے انداز میں ان تصویر کے ٹکڑوں کو لیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر جانے لگی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اسی لیے وہ چلتے وقت ڈگمگا رہی تھی۔ ایک جگہ ریل کی پٹڑی پر اس نے ٹھوکر بھی کھائی۔ مگر سنبھل گئی۔ شہریار نے دانت پیس کر دل ہی دل میں کہا۔ "حرام زادی اپنی بی بی جی کی ہمراز ہے۔"

پھر وہ بے بیک مسکرایا۔ بڑی ظالم مسکراہٹ تھی۔ اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اس نے تصویر کے دو ٹکڑے کر کے سلمیٰ کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ ایک عورت کو منہ سے گالی دینے اور ہاتھ سے مارنے کے بجائے اس کو ذہنی اذیتیں پہنچائی جائیں تو اس سے بڑا انتقام کوئی نہیں ہوتا۔ اس نے تصویر کو ٹکڑے کر کے بہت ہی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب سلمیٰ تلملائے گی۔

ایک بے وفا، مکار اور فریبی عورت سے انتقام لینے کا ایک راستہ سجھائی دیا۔ وہ راستہ اور روشن ہوتا گیا۔ اس کے دماغ میں بات آ گئی۔ "اب اس عورت کو نہ تو کچھ بھلا برا کہا جائے اور نہ ہی غصے میں آ کر اسے طلاق دی جائے۔ اسے ذہنی اذیتیں پہنچائی جائیں۔ یہ میری بیوی بن کر رہے گی۔ لیکن میں اسے تمام عمر ذلیل کرتا رہوں گا۔ کیسے اسے ذلیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ مجھے بہت اطمینان سے سوچنا چاہیے۔"

ہاں، اس نے سوچا۔ ٹھیک تو ہے۔ اس نے ایک ناجائز بچے کو میرا بیٹا بنایا ہے۔ اب میں باپ بن کر ہی اس بیٹے پر سختی کروں گا۔ میں باپ ہوں مجھے حق پہنچتا ہے کہ اپنے بیٹے سے جیسا بھی سلوک کروں۔ دیکھوں گا کہ اب یہ کیا کرتی ہے۔

وہ سوچ رہا تھا اور کبھی کبھی چور نظروں سے سیلون کار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی سلمیٰ نظر آئی۔ وہ دروازہ کھول کر سیڑھی سے اترتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ اسی وقت ایک مال گاڑی اپنی سست رفتاری سے چلتی ہوئی اس کے سامنے سے گزرنے لگی۔ گویا اس کا راستہ روک دیا۔ اب وہ بے چین ہو گی کہ وہ مال گاڑی جلدی گزرے تو فوراً اس کے پاس پہنچ کر پوچھے کہ بچے کا کیا قصور ہے؟ اس کی تصویر پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن ابھی یہ سوال کرنے میں بہت دیر تھی۔ مال گاڑی کا ایک ایک ویگن بہت سست رفتاری سے گزرتا جا رہا تھا۔ شہریار کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ کس قدر بے چین ہو گی۔ اندر سے کیسے تڑپ رہی ہو گی اور تصویر کے پھاڑے جانے پر اس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یہ سب کچھ وہ سمجھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔

مال گاڑی بہت لمبی تھی۔ گزرتی جا رہی تھی۔ مگر اس کا آخری سرا نہیں آ رہا تھا۔ وہ ٹرالی کی سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ خود کس قدر بے چینی سے خود ہی سلمیٰ کا انتظار کر رہا ہے۔ آنے والی کی بے چینی اور تڑپ.... دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ دوسرے کے اندر آگ لگا کر اپنی آگ کو تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ مال گاڑی گزر گئی۔ سلمیٰ ریل کی پٹڑیوں کو عبور کرتی ہوئی ٹرالی کے سامنے آئی۔ وہ دور سے آتے وقت نظریں جھکائے ہوئے تھی۔ ایک بار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر مجرم کی طرح سر جھکا لیا تھا۔ قریب پہنچ کر بھی اس کا سر جھکا رہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر تصویر کے دو ٹکڑے دکھائے۔ آہستگی سے پوچھا۔ "یہ آپ نے کیا کیا ۔۔۔؟"

وہ اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر نے بھی آپریشن کے ذریعے دو کئے تھے۔ میں نے بھی دو ٹکڑے کر دیے۔ کیا یہ پسند نہیں آئے؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"وہی جو تم چھپانا چاہتی ہو۔ چھپاتی آ رہی ہو۔ تم نے میرے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت قتل کر دوں۔ مگر افسوس کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ قاتل یا بدمعاش نہیں ہوں۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

"دیکھئے۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ہمارے منے کی، ہمارے امیر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ...؟"

"بس آگے اسے ہمارا نہ کہنا۔ اب تم نے اسے میرا کہا تو میں تمہارے منہ پر تھوک دوں گا۔"

سلمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ایک دم سے موم کے بجائے پتھر بن گئی۔ اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ مجھ پر تھوکیں گے؟ کیا آپ نے مجھے کوئی بازاری عورت سمجھا ہے؟ میں ایک شریف خاندان کی عزت ہوں۔ میں آپ کو سمجھاتی ہوں کہ کسی بات کا غصہ ہے تو اسے اپنے آپ تک محدود رکھیں۔ آئندہ آپ نے ذلیل کرنے والی بات مجھ سے کی تو میں بھی ایک عورت ہوں۔ اپنی انا کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کروں گی۔"

"دیکھو میں کوئی معمولی پوزیشن کا آدمی نہیں ہوں۔ اس ملک کے چاروں طرف جہاں جہاں ریلوے لائن جاتی ہے وہاں تک میری عزت اور شہرت ہے۔ میرے نام کا رعب اور دبدبہ سب لوگوں پر طاری رہتا ہے۔ میں تمہاری جیسی عورت سے یوں سرِ عام منہ لگ کر اپنی عزت کو خاک میں ملانا نہیں چاہتا۔ تم سے کہتا ہوں کہ ان دونوں بچوں کو لے کر اپنی بہن کے ہاں چلی جاؤ اور وہیں رہ کر اس خوش نصیب کو تلاش کرو جو تمہارے بچوں کا باپ ہے۔"

وہ ایک دم سے چیخ کر بولی۔ "میرا کوئی بچہ نہیں ہے سمجھے؟"

وہ ایک جھٹکے سے ٹرالی پر یوں چڑھ گئی جیسے اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھنا چاہتی ہو۔ پھر بولی۔ "آپ ان بچوں کے باپ نہیں

ہیں۔ میں ان بچوں کی ماں نہیں ہوں۔ سمجھے؟"

وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سلمٰی ایک دم سے چیخنے لگے گی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "یہ یہ تم کیوں چیخ رہی ہو۔ ارے یہاں ریلوے کے ملازمین سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ میری پوزیشن کا خیال کرو۔ خاموش ہو جاؤ۔"

"کوئی آپ کو گالی دے تو کیا آپ خاموش رہیں گے؟"

"نہیں، مگر تم آرام سے باتیں کرو۔"

"اگر آپ کو عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو اُدھر چلئے۔"

سلمٰی نے انگلی اٹھا کر سیلون کار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی ٹرالی سے اُتر گیا۔ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے اُدھر جانے لگا۔ شریف اور عزت دار آدمی بڑا مجبور ہوتا ہے۔ اپنی عورت پر بھی دھونس نہیں جما سکتا۔ عورت ذرا بھی تیز طرار ہو تو گھر کی چار دیواری سے باہر اس کی عزت کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دیتی ہے۔

سیلون کار کے اندر پہنچتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "آپ نے مجھے اتنی بری گالی دی تھی کہ میں چیخنے پر مجبور ہو گئی۔ کیا آپ کی عزت میری عزت نہیں ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے باہر ایسی حرکت کی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔"

شہریار نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر آیا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا اب بھی اپنی بی بی جی کی ہمراز بن کر رہنا ہے۔ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

وہ فوراً ہی پلٹ کر سرونٹ کلاس کی طرف دروازہ کھول کر جانے لگی۔ اس نے کہا "ٹھہرو۔ اکیلی کہاں جا رہی ہو ان سوّر کے بچوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

سلمٰی نے تلملا کر کہا۔ "آپ کیسی گندی زبان استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ننھے معصوم بچے آرام سے یہاں قالین پر کھیل رہے ہیں۔ آپ کا کیا بگڑ رہا ہے۔ بے بے۔ تم یہاں سے جاؤ۔"

آیا دروازہ کھول کر سرونٹ کلاس کی طرف گئی پھر دروازے کو دوسری طرف سے بند کر دیا۔ شہریار نے بچوں کو گھورتے ہوئے کہا "یہ میرے نہیں ہیں۔ یہ تمہارے بھی نہیں ہیں۔ تم کسی دوسری عورت کو ان بچوں کی ماں بنا دو گی۔ تمہارے پاس پہلے سے اس سلسلے میں کوئی دلچسپ کہانی تیار ہو گی۔ جسے تم سنا دو گی اور میں سن بھی لوں گا۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ تمہارے پاس ایک بات کا جواب کبھی نہیں ہو گا اور وہ یہ کہ تم چار برس تک دھوکہ کیوں دیتی رہیں اگر تم پارسا ہو، اگر تم نے میرے اعتماد کو بحال رکھا ہے تو چار سال تک مجھے بیوقوف کیوں بنایا گیا۔"

"خدا گواہ ہے کہ میں نے بیوقوف نہیں بنایا بلکہ بہت مجبوری کی حالت میں اس بات کو آپ سے چھپائے رکھا۔"

"میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ وہ مجبوری کیا ہے؟"

"آپ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ اتنے عرصے تک بات چھپی رہی اگر بتانا ہوتا تو میں چار برس پہلے بتا چکی ہوتی۔"

"میرے سامنے باتیں نہ بناؤ۔ اگر تم سچی ہو اور بے حیا نہیں ہو تو اپنی سچائی اور پارسائی ثابت کرنے کے لیے تمہیں بتانا پڑے گا۔"

وہ بولی۔ "ہماری شادی کو چھ برس ہو گئے۔ آج تک آپ انصاف سے کہئے۔ کبھی میں نے کوئی بات جھوٹ کہی ہے؟ کبھی آپ کو کسی سلسلے میں دھوکہ دیا ہے؟ کبھی آپ سے اپنی یا اپنے گھر والوں کی کوئی بات چھپائی ہے؟ جو بات ہوتی ہے۔ صاف صاف سامنے بیان کر دیتی ہوں۔ لیکن یہ بات جو چھپائی گئی۔ اس میں آپ ہی کی بھلائی ہے۔"

"جہنم میں گئی بھلائی۔ سچ کیا ہے، یہ میں سن کر ہی رہوں گا۔"

وہ چند لمحوں تک اس کے چہرے کو تکتی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ "کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ میں بانجھ ہوں۔ میں ماں نہیں بن سکتی تھی۔ اس لیے ان دو میں سے ایک بچے کو گود لے لیا۔"

"یہ تم سیدھا اور صاف جھوٹ بول رہی ہو۔ کیا تم بھول گئیں کہ تمہارا ڈاکٹری معائنہ کرایا گیا تھا اور ڈاکٹری رپورٹ یہ تھی کہ تم ماں بن سکتی ہو۔ میں تم سے کہتا تھا کہ ہمارے گھر میں بیٹا پیدا ہو گا۔ میرا نام پیدا ہو گا۔ میں اسے اتنا پیار دوں گا۔ اتنا پیار دوں گا کہ تم بھی باپ بیٹے کی محبت سے جلنے لگو گی۔ تم میری دیوانگی کو سمجھتی تھیں۔ پھر تم نے کسی دوسرے کی اولاد کو گود کیوں لیا۔ تم نے انتظار کیوں نہیں کیا۔ کیا تمہارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی تھی؟"

سلمٰی نے بڑے کرب سے اور بڑے اضطراب سے اسے دیکھا پھر بولی۔ "آپ بہت مجبور کر رہے ہیں تو مجھے بولنا پڑتا ہے۔ اب جو سچ ہے وہ سن لیجئے۔ یہ سچ آپ کو بہت کڑوا لگے گا۔ آپ کو یاد ہے کہ شادی کے ڈیڑھ سال بعد آپ کا کار سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ جانگھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ آپ ہسپتال میں ایک مہینے تک پڑے رہے۔ آپ کا آپریشن کیا گیا تھا۔ اسی وقت ڈاکٹر نے آپ کے ابا جان سے کہا تھا کہ آپ کبھی باپ نہیں بن سکیں گے۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ڈاکٹر یہ بات مجھ سے نہ چھپاتا۔"

"ڈاکٹر آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا لیکن ابا جان نے اسے روک دیا۔ انہوں نے کہا۔ شہریار بہت جذباتی انسان ہے بہت حساس ہے۔ اسے اولاد کا بہت شوق ہے، وہ کئی بار باتوں ہی باتوں میں اس خوشی کا اظہار کر چکا ہے وہ بیٹے کو خیالوں میں دیکھتا ہے اور پیار کرتا رہتا ہے۔ اگر اسے یہ المیہ سنا دیا جائے کہ ہمیشہ کے لیے وہ اولاد سے محروم ہو گیا ہے تو یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا ذہنی انتشار

میں مبتلا ہو جائے گا۔ بڑے بوڑھے جانتے ہیں کہ کون سی بات کس سے چھپانا چاہیے اور کسے بتانا چاہیے۔ میں آپ کی شریک حیات ہوں۔ ساری عمر آپ کے ساتھ رہنا ہے اور ساری عمر اولاد کا سپنا دیکھنا تھا۔ اس سے پہلے ہی ابا جان نے مجھے سمجھا دیا تھا بھی اولاد کے سپنے نہ دیکھو۔ بہت زیادہ خواہش ہو تو کبھی کسی کی اولاد کو گود لے لیا جائے گا۔ اور شہریار کو اس کی خبر نہیں ہونے دی جائے گی۔۔۔ یہ شہریار کے حق میں بہتر ہو گا۔"

وہ ناگواری سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب وہ چپ ہوئی تو اس نے پوچھا: "بکواس کر چکیں۔ تم کتنی چالاک اور مکار ہو۔ اب ابا جان اس دنیا میں نہیں رہے کہ تمہارے جھوٹ کا پول کھولیں گے۔ تم نے میرے مرحوم باپ کے کاندھے پر جھوٹ کی بندوق رکھ کر چلا دی۔ اور سمجھ لیا کہ میں اس پر یقین کر لوں گا کوئی ایسا گواہ پیش کرو جو زندہ ہو اور جس پر میں بھروسہ کر سکوں۔"

"میں کوئی ایسا گواہ پیش نہیں کر سکتی۔ بس یہ ایک آیا ہے جو ہمارے ساتھ اس راز میں شریک رہی ہے اس کے علاوہ ان بچوں کی ماں ہے۔"

"تم بھی عورت ہو اور جسے گواہی کے لیے پیش کرو گی وہ بھی عورت ہو گی۔ میں اب تمہاری ذات پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ان بچوں کا باپ کون ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

سلمٰی چپ رہی۔ شہریار نے اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "چپ کیوں ہو۔ مجھے بتاؤ۔ جب تم ان بچوں کی ماں کو جانتی ہو تو ان کے باپ کو بھی جانتی ہو گی۔ کون ہے ان کا باپ؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی: "میں نہیں جانتی۔"

"بہت خوب۔ ان کی ماں کو جانتی ہو۔ ان کے باپ کو نہیں جانتیں۔ وہ کیسی عورت تھی جس نے ان کے باپ سے اجازت لیے بغیر ایک بچہ تمہارے حوالے کر دیا؟"

"وہ بات یہ ہے کہ" وہ جھجکتے ہوئے بولی: "کہ وہ کنواری ماں تھی۔"

"کنواری ماں؟" وہ ایک دم سے سیدھا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے گھورتے ہوئے بولا: "کیا بکواس کر رہی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ ماں بن گئی تھی اور تم مجھے ایک ناجائز بچے کا باپ بنائے ہوئے ہو۔ کیا میں اب تک حرامی بچے کو گود میں لیتا رہا ہوں اور اسے پیار کرتا رہا ہوں۔ تم کیسی ذلیل عورت ہو۔"

وہ چیخ پڑی۔ "آپ میرے ساتھ اپنے مرحوم ابا جان کو بھی گالی دے رہے ہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اس بچے کو گود لینے میں ان کا مشورہ بھی شامل تھا۔"

وہ ذرا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے خالی خالی نظروں سے تکنے لگا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے مگر وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ بہت سی باتیں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ ایک تو اس بات کا ہی ثبوت نہیں تھا کہ وہ کس حد تک سچ بول رہی ہے اور اس کے مرحوم باپ کا حوالہ دے کر اپنی سچائی ثابت کرنے میں کہاں تک دیانت دار ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ بچے ناجائز تھے۔ یہ بات ناقابل برداشت تھی۔

وہ بولی: "گناہ کرنے والے گنہگاروں کو سزا ملنی چاہیے ان معصوم بچوں نے کیا بگاڑا ہے۔ انہوں نے تو نہیں کہا تھا کہ گناہ کیا جائے اور انہیں پیدا کیا جائے؟"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر ان بچوں کو گود لیا گیا اور ان کی پرورش کی گئی تو گناہ اور زیادہ پھلے پھولے گا۔"

وہ چڑ کر بولی: "تو پھر مار دیجیے ان دونوں کو گولی۔"

"میں کون ہوتا ہوں گولی مارنے والا۔ انہیں میرے پاس سے لے جاؤ۔ اب ان میں سے کوئی بھی ہمارے پاس نہیں رہے گا۔"

"آپ کیسی ظالمانہ باتیں کر رہے ہیں۔ یہ وہی امیر ہے۔ یہ وہی بیٹا ہے۔ جسے آپ اپنے پاس سلاتے تھے۔ میں اپنے پاس سلانا چاہتی تھی تو آپ جھگڑا کرتے تھے۔ آپ صبح اٹھ کر اس کے بغیر ناشتہ نہیں کرتے تھے۔ شام کو آتے ہی پہلے امیر کو پوچھتے تھے پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے تھے۔ آپ بیٹے کو اس قدر چاہتے تھے۔ اب حقیقت معلوم ہوتے ہی کیا آنکھیں بھی بدل گئیں۔ کیا آدمی ایسا طوطا چشم ہوتا ہے؟ ذرا سی بات پر دل کی گہرائیوں سے قائم ہونے والے رشتے پل کی پل میں بالکل مردہ ہو جاتے ہیں؟"

"مجھ سے بحث مت کرو۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ میرے خاندان کا نام صرف میری اولاد سے چلے گا۔ میں یہاں سے لاہور پہنچنے کے بعد اپنا ڈاکٹری معائنہ کراؤں گا اور اس بات کی تصدیق کروں گا کہ میں باپ بن سکتا ہوں یا نہیں؟ اگر نہیں بن سکتا تو ہم اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کی اولاد کو گود لے سکتے ہیں۔ اپنی اولاد کا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن میں کسی ناجائز اولاد کو اپنے گھر میں رہنے کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔"

سلمٰی نے پوچھا: "شادی کے بعد ہم نے جو گھر بسایا ہے اس گھر میں کیا میری کوئی بات نہیں چلے گی؟"

"کوئی غلط بات نہیں چلے گی۔"

"یہ کیسے معلوم ہو گا کہ ہم میں سے کون غلط ہے اور کون درست کہہ رہا ہے۔ آپ کسی بھی صاحب عقل سے پوچھیں۔ وہ معصوم بچوں کی حمایت کرے گا۔"

"میں نے کہہ دیا نا کہ میں اس سلسلے میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ شام کو جب واپس

آؤں تو یہ بچے یہاں نہ رہیں۔ انہیں ان کی ماں کے پاس پہنچا دو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں ان کی ماں کا پتہ ٹھکانہ نہیں جانتی ہوں۔ اگر وہ شام تک نہیں ملی تو میں انہیں کہاں لے کر جاؤں گی؟"

"کہیں بھی لے جاؤ۔ یہاں تمہاری خالہ زاد بہن کا گھر ہے۔ ایک طرح سے تمہارا میکہ ہے۔ جب تک بچے اپنے ٹھکانے پر نہ پہنچیں اس وقت تک تم ان بچوں کے ساتھ اپنی بہن کے ہاں رہو۔"

وہ باہر جانے کے لیے دروازے تک گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بولا۔ "میں ریلوے کی طرف سے ایک سال کی ٹریننگ کے لیے فرانس چلا گیا تھا۔ اس دوران تم نے یہ چکر چلا دیا۔ مجھے ایک ناجائز بچے کا باپ بنا دیا۔ میں پھر ایک طویل مدت کے لیے تمہیں تمہاری بہن کے پاس رہنے کی اجازت دیتا ہوں۔ وہاں رہ کر پھر کوئی چکر چلاؤ اور مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کرو۔ لیکن اب میں تمہارے فریب میں نہیں آؤں گا۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا اسی وقت فرش پر بیٹھے ہوئے امیر نے کہا۔ "پاپا ٹاٹا۔"

شہریار ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ بے اختیار اس نے بچے کی طرف دیکھا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ وہ اس کا اپنا بیٹا نہیں ہے بلکہ نجاست کی پوٹ ہے۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر دروازے سے باہر چلا گیا۔ دروازے کو ایک دھماکے سے بند کر دیا۔ سلمیٰ نے بھیگی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے بچے کی طرف بڑھی۔ امیر نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "امی۔ پاپا نے ٹاٹا نہیں کیا۔"

وہ اسے گود میں لے کر چومتے ہوئے بولی۔ "بیٹا وہ ٹاٹا کر چکے ہیں۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

⁂

ڈاکٹر وحیدہ انجم کلینک کے چیمبر میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ روز صبح دس بجے سے بارہ بجے تک مریضوں کو دیکھنے کے بعد بارہ بجے سے ایک بجے تک چیمبر میں تنہا بیٹھی رہتی تھی۔ کسی کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ روز انتظار کرتی تھی۔ لیکن وہ نہیں آتا تھا۔

تقریباً پانچ برس پہلے وہ ٹھیک دن کے بارہ بجے اس کے پاس مریض بن کر آیا تھا اور اسے ہمیشہ کے لیے مریضہ بنا کر کہیں گم ہو گیا تھا۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ دن کے بارہ بجے کا وقت زوال کا وقت ہوتا ہے۔ یہ وقت بڑا ہی منحوس ہوتا ہے۔ ایسے وقت نہ کسی کا اعتبار کرنا چاہیے، نہ کسی سے کچھ پانے کی توقع کرنی چاہیے۔ نہ جانے والے کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ ایسے وقت کسی کو کچھ نہیں ملتا۔ لیکن وہ ایسے ہی وقت انتظار کرنے پر مجبور تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ حالات کبھی اسے ایسے ہی وقت اس کی طرف لا سکتے ہیں۔

ٹھیک ہے کہ وہ نہیں آتا تھا لیکن اس وقت یادیں آتی تھیں اور بڑے زور و شور سے آتی تھیں۔ گزرے ہوئے دنوں کا ایک ایک لمحہ نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ یہ یادیں ان دنوں سے شروع ہوتی تھیں جب وہ پریکٹیکل کی کلاسیں اٹینڈ کرتی تھی اور ہسپتال میں جا کر مریضوں کو دیکھتی تھی۔ اس کے لیے اور اس کی ساتھی لڑکیوں کے لیے ایک کمرہ مخصوص تھا۔ جس میں مریض آتے تھے۔ اپنا نام لکھاتے تھے اور اپنا چیک اپ کراتے تھے۔ پھر وہ ان کے لیے دوائیں تجویز کرتی تھی۔

ایسے ہی وقت وہ مریض آیا تھا۔ وہ کبھی کسی سے آنکھیں ملا کر باتیں نہیں کرتی تھی۔ نظریں جھکی جھکی رہتی تھیں۔ کسی مریض کی نبض تھام کر بھی وہ سر جھکائے سوال کرتی رہتی تھی لیکن اس آنے والے کو جب اس نے ایک۔ دو بار دیکھا تو کئی بار اس کی نظریں اُدھر اٹھ گئیں۔ وہ بے حد خوبرو تھا۔ اس کی شخصیت اور اس کے چہرے پر مردانگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کبھی کبھی بخار رہتا ہے اور سر میں درد بھی ہوتا ہے۔" تو وحیدہ نے اس کی نبض تھام کر اسی طرح سر جھکائے پوچھا۔ "آپ کا نام؟"

"میرا نام نیکنام ہے۔"

وحیدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بولی۔ "یہ تو عجیب نام ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا نیکنام ہونا عجیب بات ہے؟"

وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔ "جی نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ نیکنامی تو اچھی چیز ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے ایسا عجیب نام پہلے کبھی نہیں سنا۔"

"آپ پہلے کبھی کب سن سکتی تھیں؟ آپ کی عمر ہی کتنی ہے۔ جب آپ بڑی ہو کر دنیا دیکھیں گی تو اور بھی عجیب و غریب نام سنیں گی۔ میرے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ ان کا نام جھاڑو ہے۔ کیا آپ نے ایسا نام کبھی سنا ہے؟"

اس کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ اسے ہنستے دیکھ کر دوسرے مریضوں کو دیکھنے والی لڑکیاں چونک گئیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "ارے دیکھو، پتھر کو جونک لگ گئی ہے۔ آج یہ ہنس رہی ہے۔"

دوسری نے کہا۔ "نظر نہ لگاؤ ورنہ پھر رونے والا منہ بنا لے گی۔"

سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ ایک لڑکی نے نیکنام کے پاس آکر پوچھا۔ "کیوں مسٹر آپ کوئی ماہر نفسیات ہیں؟ آپ نے اس پتھر

کو کیسے ہنسا دیا؟"

وہ بولا۔ "دیکھئے، ڈاکٹر صاحبہ، پھول آپ جیسے پھولوں کے درمیان نہیں کھل سکتا۔ پھول کی خاصیت ہے کہ وہ کانٹوں میں رہ کر کھلتا ہے۔ میں ایک کانٹا ہوں۔ شاید ان کے احساسات میں کہیں چبھ گیا ہوں۔ انہیں گدگدی ہوئی اور یہ ہنس پڑیں۔"

اس کی بات سن کر وحیدہ ایک دم سے جھینپ گئی تھی۔ اس کی نظریں جو جھکیں تو پھر اٹھ نہ سکیں وہ بڑی گہری بات کہہ گیا تھا۔ اس بات کو اس نے بڑی دور تک سمجھا تھا۔ پتہ نہیں لڑکیوں نے کیا سمجھا ہو۔

اس نے بڑی مشکلوں سے شرماتے لجاتے ہوئے اس نیکنام کا معائنہ کیا۔ اس کے لیے نسخہ لکھا۔ اس دوران وہ کچھ نہ کچھ بولتا رہا اور خوب بولتا رہا۔ جاتے وقت اس نے آہستگی سے کہا۔ "میں نے آج تک کسی لیڈی ڈاکٹر کو اپنے مریض سے یوں شرماتے نہیں دیکھا۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ چونکہ بھلا نہیں سکوں گا اس لیے پھر آؤں گا۔ مجھے یاد رکھنا۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد یقین ہوا کہ وہ سچ مچ کانٹا ہے، جو اس کے احساسات کے کسی نازک حصے میں چبھتا جا رہا ہے اور وہ رہ رہ کر آپ ہی آپ شرماتی جا رہی ہے ہوسٹل میں لڑکیوں نے اسے خوب چھیڑا۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ بے اختیار سوچنے کے دوران مسکرا دیتی تھی۔ پہلے وہ تنہائی پسند تھی لیکن اب لڑکیوں میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ خصوصاً ان کا چھیڑنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ رات کو جب ہوسٹل کے کمرے میں وہ تنہا بستر پر لیٹتی تو تنہائی بھی اچھی لگی۔ کمرے میں وہی وہ دکھائی دے رہا تھا۔

دوسرے دن وہ پھر زوال کے وقت آیا۔ اس بار وحیدہ نے شرمانے کے باوجود اس سے کچھ باتیں کیں۔ بات کچھ آگے بڑھی۔ تیسرے دن وحیدہ نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر بننے کے بعد کراچی جیسے شہر میں پریکٹس کرنا چاہتی ہے اس کے والدین خانپور میں رہتے ہیں۔ وہ لاہور میں پچھلے پانچ برس سے ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہی ہے اب یہ آخری سال ختم ہونے کو آ رہا ہے پہلے وہ خانپور جائے گی۔ پھر کراچی جا کر کسی اچھی جگہ اپنی ذاتی کلینک قائم کرے گی۔

اگلی ملاقات میں وحیدہ نے کہا۔ "میں اپنا نام بتا چکی ہوں۔ اب آپ اپنا صحیح نام بتائیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ کا نام نیکنام ہے۔"

"گویا کہ تم مجھے نیکنام نہیں سمجھتی ہو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "آپ مذاق نہ کریں۔ کیا مجھے آپ کا نام جاننے کا حق نہیں ہے؟"

"تم نے حق کی بات کہی۔ میرا نام حقدار شاہ ہے۔"

"واہ، جو میں نے کہا۔ اسی پر آپ نے اپنا نام رکھ دیا۔ معلوم ہوتا ہے آپ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے۔"

"یقین کرو۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ میرا نام حقدار شاہ ہے۔ اب یہ اتنا مشکل نام ہے کہ حلق سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ نیکنام کتنا سیدھا سادا سا ہے۔ تم مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہو۔ بائی دی وے تم صبح ہوسٹل سے کتنے بجے نکلتی ہو؟"

"آٹھ بجے۔"

دوسرے دن وہ ٹھیک آٹھ بجے ہوسٹل کے سامنے کھڑا ہوا نظر آیا۔ وحیدہ انجم خوشی سے کھل گئی۔ کوئی ایسا چاہنے والا تھا کہ صبح اٹھ کر اس کے دروازے پر چلا آتا تھا۔ یقیناً رات کو اسی کے متعلق سوچتا ہوگا۔ دن بھی اسے ہی یاد کرتے ہوئے گزرتا ہوگا۔ وہ قریب آ کر بولی۔ "ارے، آپ یہاں کھڑے ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا۔ میں نے وقت یوں ہی تو نہیں پوچھا تھا۔ آؤ میں تمہیں ہسپتال تک چھوڑ دوں۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ وحیدہ نے کہا۔ "آپ نے میرا نام بھی معلوم کر لیا اور پتہ ٹھکانہ بھی۔ اب آپ بتائیں کہ کہاں رہتے ہیں۔؟"

"میں جہاں رہتا ہوں وہاں تمہیں کبھی لے جا نہیں سکوں گا۔ کیونکہ میرا اپنا گھر نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا مکان ہے جسے ہم پانچ آدمیوں نے مشترکہ طور پر کرائے پر حاصل کیا ہے۔ ہم جیسے ہوسٹل والی زندگی گزارتے ہیں۔"

"آپ کرتے کیا ہیں؟"

"اس ملک کے ہزاروں، لاکھوں گریجویٹ کی طرح ملازمت تلاش کرتا ہوں۔"

"آپ کے والدین رشتہ دار کہاں ہیں؟"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ہاں دور کے رشتہ دار ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ نہ وہ میرے وقت پر کام آتے ہیں نہ میں ان کے کسی وقت پر جا کر حاضری دیتا ہوں۔ بس یوں سمجھو کہ بالکل تنہا ہوں۔"

شام کو ہوسٹل میں لڑکیاں اسے کرید کرید کر پوچھا کرتی تھیں۔ "بتاؤ آج کیا باتیں ہوئیں؟"

جب وحیدہ نے ساری بات بتا دی تو ایک لڑکی نے کہا۔ "میری مانو تو یہ آدمی بہت گہرا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے۔"

دوسری لڑکی نے کہا۔ "ہاں پہلے تو اپنے آپ کو نیکنام بتایا میں تو کہتی ہوں کوئی بدنام ہے۔"

تیسری لڑکی نے کہا۔ "اپنا ٹھکانہ ایسی جگہ بتایا ہے کہ وحیدہ وہاں جا کر دیکھ بھی نہیں سکتی وہاں تو سارے مرد ہوں گے یہ بیچاری

اس کے بارے میں کیسے کھوج لگا سکتی ہے؟"

وحیدہ انجم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں ان کے بارے میں کھوج لگاتی پھروں۔"

ایک لڑکی نے کہا۔ "ارے تو کیا یونہی بات بڑھاؤ گی۔ آخر اس سے دلچسپی لے رہی ہو تو بات شادی تک پہنچے گی۔ شادی سے پہلے ایک دوسرے کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہونا چاہئیں کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔؟"

ایک اور لڑکی نے کہا۔ "عشق کا بھوت سوار ہو تو دوسروں کی تمام باتیں غلط معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے وقت کسی بھی محبت کرنے والے کو سمجھانا بہت بڑی حماقت ہے۔"

یہ سچ ہے کہ حماقت کرنے کے دوران اپنی حماقت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے پاس ایسا کوئی آلہ نہیں ہے، جس کے ذریعے ہم نقصان اٹھانے سے پہلے اپنی حماقتوں کو سمجھ سکیں۔ ایک عقل ہے جسے ہم استعمال کرنا نہیں جانتے۔ وحیدہ انجم خود اپنا تجزیہ نہ کر سکی کہ وہ چند ہفتوں میں اس سے بے تکلف کیسے ہو گئی۔ وہ اس کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جانے لگی۔ پہلے وہ اپنا بہت سا وقت لائبریری میں بیٹھ کر معلوماتی کتابیں پڑھنے میں گزارتی تھی۔ اب وہ لائبریری کا راستہ بھول گئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ہسپتال میں پریکٹیکل کی کلاسیں اٹینڈ کرنے جاتی اور نیکنام آ کر اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور وہ کشاں کشاں چلی جاتی۔ اس کے ساتھ فلمیں بھی دیکھنے لگی۔ پہلے وہ بالکونی میں بیٹھ کر فلمیں دیکھتے تھے۔ پھر باکس میں بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ لاہور کے سینما ہال میں عشق کرنے والوں کے لیے یہ بڑی سہولت ہے کہ باکس میں تنہائی نصیب ہو جاتی ہے۔

اب وحیدہ انجم زمین پر نہیں چلتی تھی۔ ہواؤں میں اڑتی تھی۔ ہوسٹل کی تنہائیوں میں صرف اپنے نیکنام کو یاد کرتی تھی اس کے تصور میں کھوئی رہتی تھی۔ رات سے صبح بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ جب صبح ہوتی تو اس کا انتظار ہوتا۔ جب وہ آ جاتا تو تنہائی کی تمنا ہوتی جب تنہائی ملتی تو ایک گھر بسانے کی آرزو مچلنے لگتی۔ اب وہ ہر بار اس سے پوچھتی تھی کہ کب تک ملازمت مل جائے گی۔ کب اپنا گھر بساؤ گے اور وہ مجبوری بیان کرتا تھا۔ پھر وہ خود ہی منصوبے بناتی۔ "ہم کراچی چلیں گے۔ وہاں میں اپنا کلینک قائم کروں گی پھر تمہیں اطمینان سے روزگار تلاش کرنے کا موقع ملے گا۔ جب تک تمہیں ملازمت نہیں ملے گی۔ میں اس وقت تک اپنے گھر کے تمام اخراجات برداشت کروں گی۔"

وہ خواب دکھاتا تھا۔ یہ تعبیر بتاتی تھی۔ تعبیر تک پہنچنے کے لیے نیکنام نے کبھی عملی طور پر کچھ نہیں کیا۔ ہمیشہ وعدے کرتا رہا کہ جلد ہی ملازمت کرے گا یا پھر اس کے ساتھ کراچی جائے گا۔ جب ہوسٹل سے جانے میں چار ماہ رہ گئے تو وحیدہ نے کہا۔ "ہم یہاں سے خانپور جائیں گے۔ میں امی اور ابو سے آپ کا تعارف کراؤں گی۔ وہیں ہماری شادی ہو گی۔ پھر ہم کراچی چلے جائیں گے۔"

ایک دن نیکنام اس سے رخصت ہو کر گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔ اس نے ایک دن انتظار کیا۔ دوسرے دن بھی اس کی راہ دیکھی۔ جب وہ نہیں آیا تو بے چین ہو گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ سمن آباد میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک مکان میں رہتا ہے۔ وہ دوست ایسے ہیں کہ وہاں وحیدہ کا جانا مناسب نہیں ہے لیکن سمن آباد بہت بڑی جگہ تھی۔ وہ اسے کہاں جا کر تلاش کرتی؟

ہر آنے والا دن اسے مایوس کرنے لگا۔ اس کی محبت کا مذاق اڑانے لگا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی محبت کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ ایک کہانی پڑھ رہی تھی ادھوری محبت کے عنوان سے کہانی ختم ہو گئی۔ کردار بھی ختم ہو گیا اور وہ ادھوری محبت کے انجام پر سوچتی ہی رہ گئی ہے۔

لیکن کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تو شروع ہوئی تھی۔ ایک دن سویرے ناشتہ کرنے کے بعد اس کا دل گھبرانے لگا۔ جی متلانے لگا۔ آخر قے کرنے کے بعد اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ تب اسے پتہ چلا کہ دن میں تارے کیسے نظر آتے ہیں۔

اگر وہ موجود ہوتا تو یہ بڑی خوشی کی بات ہوتی۔ فوراً ہی نکاح پڑھا لیا جاتا۔ وہ ایک سے دو ہوتے اور دو سے فوراً ہی تین ہو جاتے۔ کوئی اس پر انگلی نہ اٹھا سکتا۔

وہ پریشان ہو گئی۔ اب کیا کرے؟ کسے اپنا دکھڑا سنائے؟ کس کی ہمدردی حاصل کرے؟ کون اسے صحیح مشورہ دے گا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ دماغ نے چپکے سے کہا۔ "جو غلطی ہو چکی ہے اسے منظر عام پر آنے سے پہلے ختم کر دو۔ غلطی آخر غلطی ہوتی ہے۔ اسے دنیا والے قبول نہیں کریں گے۔"

وہ اپنے دماغ کے اس مشورے پر تلملا گئی۔ دل نہیں مانتا تھا کہ ایسا کرے۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے نیکنام کو چاہا تھا۔ اس سے محبت کی تھی۔ جیسے عبادت کرتی رہی ہو۔ وہ اس کی محبت کی نشانی کو مٹانا نہیں چاہتی تھی۔ نیکنام کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج نہیں آیا ہے تو کل ضرور آئے گا۔ جب کل آیا تو پھر اس نے یہی سوچا کہ کل ضرور آئے گا۔

کتنے ہی کل گزرنے لگے۔ ایک ماہ بعد اسے ڈاک کے ذریعے ایک لفافہ ملا۔ اس لفافے کے ایک کونے پر نیکنام کا نام لکھا تھا۔ وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ اس نے لفافے کو چاک کیا۔ پھر اس میں تہہ کیے ہوئے کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ نیکنام نے لکھا تھا۔ "میری جان وحیدہ! بہت ہی بڑی مصیبتوں سے گزر رہا ہوں۔ ایک حادثہ ہو گیا

تھا۔ اس حادثے میں میری ٹانگ کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی تھی بہرحال اب میری ٹانگ ٹھیک ہو گئی ہے۔ میں ایک ماہ تک ہسپتال میں رہ کر واپس آیا ہوں لیکن ابھی گھر سے نہیں نکلتا ہوں جس دن نکلوں گا تو سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔ میں ہسپتال میں اس قدر پریشان رہا کہ تمہیں اطلاع نہ دے سکا اور ان دنوں جہاں ہوں وہاں تمہیں بلا نہیں سکتا۔ جہاں اتنے دنوں تم نے صبر کر لیا ہے۔ کچھ روز اور انتظار کر لو۔ میں جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ فقط۔ تمہارا اپنا نیکنام۔"

خط پڑھ کر دل اور دماغ کا سارا بوجھ اتر گیا۔ ایک اندیشہ تھا کہ نیکنام نے محبت کا فریب دیا ہے اور اس سے کھیل کر اسے بھلا دیا ہے۔ اب وہ اندیشہ مٹ گیا تھا۔ اب وہ محبت سے جھنجلا رہی تھی کہ اس نے ہسپتال رہنے کے دوران اطلاع کیوں نہیں دی۔ وہ خود ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اس سے زیادہ اس کی دیکھ بھال کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دن رات اس کے بستر سے لگی بیٹھی رہتی۔ اس کی خدمت کرتی مگر نیکنام نے اس کا موقع نہیں دیا تھا۔

وہ محبت سے سوچتی رہی اور دن گزارتی رہی۔ اس نے لکھا تھا کہ چند روز میں آئے گا۔ وہ چند روز گزر گئے۔ پھر چند ہفتے بھی گزرنے لگے۔ پھر دل گھبرانے لگا۔ بھوسو سے جنم لینے لگے۔ آخر اس سے برداشت نہ ہوا۔ تو وہ اسے تلاش کرنے کے لیے نکل پڑی۔

اسے ڈھونڈ نکالنے کا یہ راستہ تھا کہ وہ لاہور کے تمام ہسپتالوں میں جاتی اور یہ معلوم کرتی کہ پچھلے ایک ماہ تک ایسا کون مریض آیا تھا جس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ تمام ہسپتالوں میں گئی۔ تین دن تک ایک ایک ہسپتال سے گزر کر آ گئی۔ ہر جگہ یہی پتہ چلا کہ ایسا کوئی مریض ہسپتال میں نہیں آیا تھا۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ جب اسے دھوکہ ہی دینا تھا اور خط لکھنے کے بعد دوبارہ نہیں ملنا تھا تو اس نے خط لکھا ہی کیوں؟ کیا وہ پھر کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب تو نیکنام سے زیادہ اس بچے کے متعلق سوچنا تھا۔ دو ماہ گزر چکے تھے۔ پانی سر سے گزرنے والا تھا۔ اب فیصلہ کرنا تھا کہ اس بچے کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟ کیا اسے مٹا دے؟ نہیں نہیں! اس کے اندر کی عورت چیخنے لگتی تھی۔ وہ بچہ محبت کی نشانی تھا۔ وہ محبت کرنے والا کبھی واپس آ کر ناراض ہو جاتا کہ اس کا انتظار کیوں نہیں کیا؟ تب وہ کیا جواب دے گی۔

اس کا دل یہی سمجھاتا تھا کہ وہ پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ نہ آتا ہوتا تو وہ خط کبھی نہ لکھتا۔ اسی کشمکش میں تین ماہ گزر گئے۔ کچھ لڑکیوں کو شبہ ہونے لگا وہ اپنے طور پر پوری کوشش کر رہی تھی کہ راز کھلنے نہ پائے۔ یوں بھی تین ماہ میں اتنی دکھاوٹ سے راز عیاں نہیں ہوتا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی پھر

اس نے چار ماہ پورے ہونے سے پہلے ہی ہوسٹل چھوڑ دیا۔ خانپور جانے کے ارادے سے نکل گئی۔ اپنی عزیز ترین سہیلی کو سمجھایا کہ اگر نیکنام آئے تو وہ فوراً اسے خانپور کے پتے پر بھیج دے یا خانپور اسے ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دے دے اس نے فون کا نمبر بھی بتا دیا۔ نیکنام سے دوسری بار ملنے کے تمام انتظامات کر کے وہ خانپور چلی آئی۔

وہ والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ ماں باپ اسے بے حد چاہتے تھے اس کی ہر ضد پوری کرتے تھے۔ اسی کی ضد پر اسے اتنا پڑھایا لکھایا تھا اس کے ضد کرنے پر نیکنام سے اس کی شادی بھی کر دی جاتی۔ لیکن جب شادی سے پہلے ہی وہ عورت کے مقام سے گر گئی تو ماں باپ سکتے میں رہ گئے۔ پہلے تو تمام دن کچھ بول نہ سکے۔ کچھ کھا نہ سکے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سانس بھی نہیں لے رہے ہوں۔ یہ اتنے بڑے صدمے کی بات تھی جسے اولاد نہیں سمجھتی۔ ماں باپ بڑے اعتماد سے تعلیم دلانے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجتے ہیں لیکن ان کے اعتماد کو جب ٹھیس پہنچتی ہے اور جب ان کی عزت کو مٹی میں ملایا جاتا ہے تو اس کے بعد خون کے رشتے برائے نام رہ جاتے ہیں۔ اعتماد کا مضبوط رشتہ ہمیشہ کے لیے مر جاتا ہے۔

اس کا باپ بہت ہی سنجیدہ اور متحمل مزاج شخص تھا۔ اس نے شام کو بڑی نرمی سے کہا۔ "بیٹی ہم نے اعتماد کے ساتھ تمہیں پانچ برس تک لاہور کے ہوسٹل میں رکھا، تم تنہا یہاں سے جاتی تھیں اور تنہا ہم سے ملنے آتی تھیں۔ ہمارے پاس پڑوس والوں نے ہمیں سمجھایا کہ جوان لڑکیوں پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ہم نے تم پر بھروسہ کیا۔ ہمیں کیا، دنیا کے ہر ماں باپ کو اپنی اولاد معصوم اور فرشتہ نظر آتی ہے۔ ہم ابھی معصوم اور فرشتہ سیرت وحیدہ انجم کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ واپس چلی جاؤ اور جب دوبارہ آؤ تو اس طرح کہ ہماری عزت بحال رہے تمہارے آس پاس تمہارے گناہ کا سایہ تک نہ ہو پھر ہم تمہیں قبول کریں گے۔"

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے ماں باپ کے گھر سے ٹھکرائی جائے گی۔ کیوں ٹھکرائی گئی؟ کس کی وجہ سے ٹھکرائی گئی؟ کہاں ہے وہ جس نے اسے اس مقام پر لا کر چھوڑ دیا؟ اب اسے اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ اب وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ صرف نیکنام کے لیے

نہیں تھی۔ اپنے ماں باپ کے لیے بھی کچھ تھی۔ اس کی وجہ سے ماں باپ کی نیکنامی تھی۔ اب وہ نیکنامی نیکنام کو دے کر ہمیشہ کے لیے بدنام ہو رہی تھی۔ اپنے والدین کی اور اپنے خاندان کی برسوں کی عزت کو خاک میں ملا رہی تھی۔

اس نے والدین کے سامنے ندامت سے سر جھکا کر کہا "میں واپس جا رہی ہوں۔ بدنامی کو ہمیشہ کے لیے چھپا کر آؤں گی یا بدنامی کے ساتھ خود بھی چھپ جاؤں گی۔ آپ لوگوں کو منہ نہیں دکھاؤں گی۔"

رات کے ایک بجے وہ ٹرین میں سوار ہونے کے لیے اسٹیشن آئی تو ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے بیٹی کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا "اس میں دس ہزار روپے ہیں۔ کم پڑیں تو اور منگوا لینا۔ مگر بیٹا میں تیری زندگی چاہتی ہوں۔ تجھے ضرور واپس آنا چاہیے تیرے ابا نے کراچی کے سب سے اچھے علاقے سوسائٹی میں تیرے لیے پلاٹ لیا ہے۔ وہاں تیرے لیے ایک چھوٹا سا اسپتال بنانا چاہتے ہیں۔ کم از کم دس لاکھ روپے وہ اس اسپتال میں خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ تو کہے گی تو اور زیادہ اخراجات برداشت کریں گے۔ تیری خوشی کے لیے ہم سب کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر بیٹا بڑھاپے میں اپنی جدائی کا داغ نہ دینا۔ واپس چلی آنا۔ میری آنکھیں تیری راہ تکتی رہیں گی۔"

ایسا کہتے کہتے بوڑھی آنکھیں رونے لگیں۔ وحیدہ نے ماں کے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے کے آنچل سے پونچھتے ہوئے کہا "امی آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک واپس آ جاؤں گی۔"

"بیٹی میں تجھے ہر حال میں اپنے کلیجے سے لگا سکتی ہوں آخر ماں ہوں نا۔ پر تیرے ابا عزت کی خاطر مر سکتے ہیں مگر بے عزتی برداشت کر کے تجھے قبول نہیں کر سکیں گے۔ میری مجبوریوں کو سمجھ۔ یہ کبھی نہ سوچنا کہ ہم نے تجھے برے وقت میں بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ لاہور میں زیادہ پریشانی ہو تو مجھے ٹیلی گرام دینا۔ میں تیرے پاس آ جاؤں گی۔"

ٹرین آئی۔ وہ فرسٹ کلاس کے ایک چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئی۔ دونوں ماں بیٹی کمپارٹمنٹ میں بیٹھ کر تھوڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ پھر آنسو بہاتے ہوئے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئیں۔ جب ٹرین چل پڑی تب وحیدہ نے محسوس کیا کہ وہ کمپارٹمنٹ میں تنہا نہیں ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا سامنے ایک برتھ پر ایک حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نظریں ملتے ہی اس عورت نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر بولی "میرا نام سلمیٰ ہے۔ بیگم سلمیٰ شہریار۔ میں لاہور جا رہی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے آپ کہاں جا رہی ہیں۔؟"

اچانک ہی وحیدہ کا سر چکرانے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی پھر جواب دیے بغیر وہاں سے پلٹ کر ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹوائلٹ کے اندر ابکائیاں لے رہی تھی۔ بڑے اچھے وقت طبیعت بگڑی تھی۔ اپنا نام بتانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب وہ قے کرتے وقت سوچ رہی تھی کہ اپنا نام نہیں بتانا چاہیے۔ نام بتلائے گی تو ٹھکانہ بتانا ہوگا۔ پھر ٹھکانے سے بات چلے گی تو ماں باپ کے نام تک پہنچے گی۔ اس کے بعد وہ نام بدنامی تک پہنچے گا۔ اسے اب گمنام بننا چاہیے۔ اس نے جو غلطی کی ہے اس کی سزا یہی ہے کہ اپنے نام کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔ اب اس کی اپنی کوئی ذات نہیں رہی ہے۔ جب تک فریب خوردہ محبت کی نشانی اس کے وجود میں پرورش پا رہی ہے۔ اس وقت تک وہ دنیا کی بدترین اور ذلیل عورت ہے جو اپنے پیدا کرنے والے والدین کے لیے صرف بدنامیاں لائی ہے۔

وہ سوچ رہی تھی۔ اپنے آپ کو کوس رہی تھی گالیاں دے رہی تھی اور اس طرح اپنے نام کو مٹانے کا حوصلہ کر رہی تھی۔ جب وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو اس خاتون نے ایک تولیہ اس کی طرف بڑھا دیا "لو بہن منہ ہاتھ پونچھ لو۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تم ماں بننے والی ہو؟"

وحیدہ نے ایک دم سے چونک کر گھبرا کر یوں دیکھا جیسے اس عورت نے پتھر مارا ہو۔۔۔۔ اس نے اسے سہارا دے کر برتھ پر بٹھاتے ہوئے کہا "یہاں آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں بدنصیب اولاد سے محروم ہوں لیکن اولاد والیوں کے کام تو آ سکتی ہوں مجھے اپنی بڑی بہن سمجھو۔"

اچانک ہی وحیدہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی وہ اندر ہی اندر حیران بھی ہوتی رہی کہ یہ یک بیک آنسو کیسے ابل پڑے؟ وہ کیوں رو رہی ہے۔ ایک اجنبی عورت کے سامنے کیوں اپنا راز کھول رہی ہے؟ ارے یہ کیسے آنسو ہوتے ہیں جو بے ارادہ آنکھوں سے نکل پڑتے ہیں؟ وہ کتنی مجبور تھی۔ اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکتی تھی۔ خود نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے۔

کبھی کوئی بات اچانک نہیں ہوتی۔ اس کے پیچھے بہت سی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں۔ وہ لاہور میں تین ماہ تک نیکنام کا انتظار کرتی رہی۔ محبت کے بھروسے پر بھٹکتی رہی۔ وہ نہ آیا تو کچھ امید لیے کر اپنے والدین کے پاس گئی مگر وہاں بھی اسے محبت نہیں ملی۔ وہاں سے ٹھکرائے جانے کے بعد پھر وہ لاہور کی طرف جا رہی تھی۔ اتنی پریشانیاں اٹھانے کے بعد پہلی بار کسی عورت نے اسے تسلی دی تھی اور اسے کہا تھا کہ اسے اپنی بہن سمجھے۔ بس اسی ایک بات پر بے اختیار آنسو نکل پڑے تھے۔

سلمیٰ اس کے پاس برتھ پر بیٹھ گئی تھی۔ اسے چھوتے ہوئے تھپک کر تسلیاں دے رہی تھی "بہن چپ ہو جاؤ۔ کیوں رو رہی ہو، کیا شوہر سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ خاتون جو تمہیں رخصت کرنے آئی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ تمہاری امی ہوں گی۔ تم مجھے اپنے

متعلق کچھ بتاؤ۔ میں تمہارے کام آنا چاہتی ہوں۔ بشرطیکہ تم مجھے بالکل اپنا سمجھو۔"

سلمٰی کی ایک ایک بات اسے رلا رہی تھی۔ سوال تھا کیا شوہر سے جھگڑا ہو گیا ہے؟ ارے شوہر تھا ہی کہاں وہ تو ہرجائی تھا۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ وہ خاتون جو رخصت کرنے آئی تھیں کیا اس کی ماں تھیں؟ ماں کہاں تھیں، باپ کہاں تھا۔ دنیا کا کوئی رشتہ کہاں تھا؟ ہر رشتہ اپنے لیے ایک عزت اور ایک مرتبہ رکھتا ہے اور وہ ساری عزت اور مرتبے کھو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جو خاتون اس پر اتنی مہربان ہے اور اس کے کام آنا چاہتی ہے۔ وہ اسے کیا بتائے۔ کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔

وہ روتی جا رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی کہ ایک اجنبی خاتون کے سامنے نہیں کھلے گی۔ اُدھر سلمٰی میں جادو بھرا ہوا تھا۔ اس کی باتوں میں عجیب محبت اور ممتا تھی وحیدہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے ماں اسٹیشن سے رخصت نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ اسے بتا رہی ہے کہ سب چھوٹ سکتے ہیں۔ ماں نہیں چھوٹ سکتی۔ ماں چھوٹ بھی جائے تو ممتا نہیں چھوٹ سکتی اور ممتا تو کسی بھی عورت میں ہو سکتی ہے کسی اجنبی ہمسفر میں بھی ہو سکتی ہے۔

سلمٰی اس کے پاس سے اٹھ کر اپنی برتھ کی طرف گئی۔ پھر اوپری برتھ کی طرف ہاتھ بڑھا کر ٹفن کیریئر نکالا۔ اسے کھول کر پھر کوئی چیز نکالی اور ایک چھوٹی سی ننھی سی پیالی میں اسے لے کر وحیدہ کے پاس آئی۔ پاس بیٹھ کر بولی "یہ لو۔ اسے ذرا چکھ لو۔ تمہاری یہی خواہش ہو گی۔"

وحیدہ نے کن انکھیوں سے اس ننھی سی پیالی کو دیکھا تو دل مچل گیا۔ وہ اس کے لیے اچار لے کر آئی تھی۔ اس نے پیالی کو یوں لپک لیا جیسے برسوں کی بھوکی ہو۔ آہا ہا۔ کھٹا کھٹا، چٹخارے دار اچار ایسا تھا کہ دیکھنے اور سننے والوں کے منہ میں بھی پانی آ جاتا ہے وہ ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر چوسنے لگی۔ سلمٰی نے بڑی محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "تمہیں رونا کیوں آ رہا ہے؟ کیا اپنے میاں سے جھگڑا ہو گیا ہے؟"

وہ اچار چکھتے چکھتے رک گئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ ایک اجنبی ہمسفر کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔ اپنی ماں کے پاس نہیں ہے۔ اس کے آس پاس کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ سلمٰی نے بڑے پیار اور اپنائیت سے پوچھا "چپ کیوں ہو۔ چلو اپنا نام ہی بتا دو۔"

وہ اپنا نام وحیدہ انجم بتانے جا رہی تھی پھر "وحی۔۔۔وحی۔۔" کہتے کہتے ایک دم سے چپ ہو گئی۔ اس کے تصور میں ہسپتال کے وہ پہلے دن کا منظر آیا۔ جب وہ اپنے محبوب کی نبض تھام کر پوچھ رہی تھی۔ "آپ کا نام؟"

اس نے بتایا تھا "میرا نام نیکنام ہے۔"

تم نے بے محبت کے بے شمار سبق پڑھائے ہیں پھر بھی میں تم سے محبت کرنا نہیں سیکھ سکی۔"
"مگر یہ تو سوچو! میں نے تمہارے اور عشق تمہارے لیے پچاس ہزار روپے جمع کیے ہیں۔"
"اچھا، تو ایک سبق اور پڑھا دو۔"

سلمٰی کی آواز سنتے ہی تصور مٹ گیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "تم چپ کیوں ہو گئیں۔ کیا اپنا نام نہیں بتاؤ گی؟"

وحیدہ انجم نے ایک سرد آہ بھری۔ پھر کہا "میرا نام بدنام ہے۔"

سلمٰی ہنس پڑی۔ پھر بولی "میں صورت دیکھ کر بتا سکتی ہوں کہ تم کسی نہایت شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہو اور شریف زادیوں کے نام ایسے نہیں ہوتے۔ اگر ایسے ہوتے تو پھر ان کے مرد بھی نیکنام نہیں ہوتے۔"

وہ بڑے کرب سے بولی "یہی تو بات ہے کہ وہ نیک نام ہے۔ ازل سے ایسا ہوتا ہے۔ مرد نیکنام ہوتا ہے اور عورت بدنام ہوتی ہے۔"

"میں نام پوچھ رہی تھی۔ تم کردار کی باتیں کرنے لگیں۔ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میرے ہی شوہر کو لے لو۔ وہ بڑے سنجیدہ اور بڑے رکھ رکھاؤ والے آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو انہیں یا ان کے خاندان کے کسی فرد کو بدنامی کی طرف لے جاتا۔"

وحیدہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "بہن! تم خوش نصیب ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اچھے مردوں کی اور اچھی عورتوں کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔"

"تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تمہیں اپنے میاں سے شکایت ہے اور ان سے کچھ اختلافات ہیں۔"

اختلافات کی بات آئی تو وحیدہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ کیا اچھا ہوتا کہ نیک نام شوہر کی حیثیت سے ہوتا۔ اس سے شکایتیں ہوتیں۔ بات بات پر اختلافات ہوتے۔ لڑتے جھگڑتے پھر صلح کرتے اس وقت وہ اپنے پاس بیٹھی ہوئی عورت سے کہہ سکتی تھی کہ ہاں جی، میاں بیوی میں تو اختلافات ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے یہ باتیں سوچیں۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ سلمٰی نے کہا "تم بار بار ٹھنڈی آہیں بھرتی ہو۔ مجھے اپنا دکھ نہیں بتاؤ گی؟"

وہ سر جھکا کر بولی "سنا ہے کسی ہمدرد کو اپنا دکھ بتانے سے بوجھ ہلکا ہوتا ہے مگر بوجھ بدستور رہتا ہے نا؟ دور تو نہیں ہوتا؟ پھر

بتانے کا فائدہ ؟"

سلمٰی نے پھر اس کی پشت کو محبت سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے دُکھ دُور کر دوں۔ تمہارے اتنے کام آؤں کہ تمہارا اپنا بھی کوئی اتنے قریب نہیں آیا ہو گا اور تمہاری تکلیف کو اپنایا نہیں ہو گا۔ تم ایک بار مجھ پر بھروسہ کر کے تو دیکھو۔"

وحیدہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سلمٰی کا چہرہ ایسا شفیق اور ایسا ممتا بھرا تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا وہ ایسی عورت تھی جو زندگی کے اتار چڑھاؤ سے تراشی جاتی ہے اور دوسروں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہر دم بہہ جانے کے لئے تیار رہتی ہے۔ انہیں دیکھ کر ان سے مل کر ان کی باتیں سن کر بے اختیار ان پر بھروسہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

وحیدہ نے کہا "اچھی بات ہے میں تم پر بھروسہ کروں گی۔ تمہیں اپنا دکھڑا سناؤں گی لیکن ایک شرط ہے۔"

"بولو، میں تمہاری ہر شرط مان لوں گی۔"

وہ بولی "میں اپنا نام نہیں بتاؤں گی۔ اپنا نام بتاؤں گی تو میرے والدین کا نام بھی آئے گا۔ ہاں" اس کا نام بتا رہی ہوں۔ اس نے پہلی ملاقات میں مجھے اپنا نام نیک نام بتایا تھا۔ دوسری ملاقات میں اس کا دوسرا نام تھا۔ مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے تھا کہ وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے۔ وہ جو کچھ اندر ہے وہ باہر نہیں ہے ــــ میں اس کے باہر ہی رہوں گی۔ اس کے اندر نہیں پہنچ سکوں گی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے مرد کا نام بھی نہیں جانتی ہو۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "نہ نام جانتی ہوں نہ پتہ ٹھکانہ معلوم ہے۔"

"تعجب ہے۔ تم پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہو۔ اتنا بڑا دھوکہ کیسے کھا گئیں؟ کسی کو اچھی طرح سمجھے بوجھے بغیر، اس کا پتہ ٹھکانہ معلوم کئے بغیر اس حد تک اعتماد کیوں کر کر لیا کہ اس کے بچے کی ماں بن گئیں۔۔؟"

"بے شک میں تعلیم یافتہ ہوں۔ میں نے اتنی بڑی غلطی کیسے کی؟ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سوچتی ہوں اس کی پُر وقار شخصیت سے متاثر کیسے ہو گئی تھی وہ جیسے کوئی جادوگر تھا۔ میں سحر زدہ ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی ٹھوکر کھانے کے بعد آخر میں جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ خواہ کتنی ہی تعلیم ہو۔ جوانی کے ساتھ عقل کبھی نہیں ہوتی۔ ہوتی تو یہ میرے ساتھ نہ ہوتا۔"

"اب جو ہو گیا ہے۔ اس پر پچھتانے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ویسے اب کتنے مہینے ہو چکے ہیں؟"

"تین ماہ گزر چکے ہیں۔"

"تین ماہ تو بہت ہوتے ہیں۔ تم پہلے ہی اسے ضائع کر سکتی تھیں۔ بدنامی سے بچ سکتی تھیں۔"

"ہاں کرنے کو تو بہت کچھ کر سکتی تھی لیکن اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب دوسرا مہینہ گزرنے لگا تو اس کا خط ملا کہ وہ ایک ماہ تک ہسپتال میں رہا ہے اور بہت بیمار ہے اس لئے آ نہیں سکتا۔ اب ہسپتال سے گھر جا چکا ہے کچھ دنوں میں آ جائے گا۔ میں پھر پُر امید ہو گئی۔ میں نے سوچا وہ آئے گا تو ساری بدنامی دُھل جائے گی۔ ہم فوراً شادی کر لیں گے لیکن وہ دوسرا مہینہ بھی گزر گیا پھر میں اس کی تلاش میں نکلی۔ میں نے لاہور کے ہر ہسپتال میں جا کر معلوم کیا کہ اس نے اپنے خط میں جس حادثے کا ذکر کیا تھا، اس حادثے والا کوئی مریض کسی ہسپتال میں ایک ماہ تک رہا تھا یا نہیں؟ پتہ چلا، ایسا کوئی مریض کسی ہسپتال میں نہیں تھا۔ تب اس کا جھوٹ اور بھی ثابت ہو گیا۔ وہ مجھے بہلا رہا تھا، دھوکہ دے رہا تھا جب تین ماہ ہو گئے تو میں پریشان ہو گئی۔ اپنے والدین کے پاس آ گئی۔ وہ بہت عزت دار ہیں۔ ہمارا گھرانہ ایسا ہے کہ میری اس غلطی کو کسی نے معاف نہیں کیا۔ اس لئے میں لاہور واپس جا رہی ہوں۔ ایک بار پھر اس نیک نام کو تلاش کروں گی۔ نہیں ملے گا تو سوچ رہی ہوں کیا کروں؟ کہاں پناہ لوں؟ میں جہاں بھی جاؤں گی۔ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کئے جائیں گے۔ کسی میٹرنٹی ہوم میں بھی مجھے داخلہ نہیں ملے گا۔"

سلمٰی نے ایک گہری سانس لے کر کہا "خدا نے ہمیں خوب ملایا ہے میں تمہیں پناہ دوں گی اور تمہاری زچگی وغیرہ کا انتظام کروں گی لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟ تمہیں تو شاید تمہارے ماں باپ قبول کر لیں مگر وہ بچہ۔۔۔۔؟"

"میں اسی کے لئے پریشان ہوں۔ دماغ میں کئی بار یہ بات آئی کہ اسے ختم ہو جانا چاہئے۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ یہ انسانیت کے خلاف ہے۔ اب اس کی عمر تین ماہ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اسے قتل کرنا بہت بڑا جرم ہو گا۔ ایک گناہ تو میں نے کر ہی لیا۔ اس کے بعد اور گناہ کروں، یہ مجھ سے نہ ہو گا۔"

سلمٰی اس کے پاس سے اٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دوسری برتھ پر گئی۔ پھر کھڑکی کے پاس بیٹھ کر باہر اندھیرے میں تکنے لگی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا مگر سوچ کی روشنی ہوتی ہے وحیدہ اسے دیکھ رہی تھی۔ جب دونوں کی نظریں ملیں تو وحیدہ نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ سلمٰی پھر وہاں سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ آہستگی سے بولی "اگر تم میری بات مانو تو تمہارے بچے کا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ میں اسے گود لے لوں گی۔"

وحیدہ نے چونک کر اسے دیکھا "تم۔ تم میرے بچے کو گود لو گی۔ کیا تمہیں میرے بچے سے نفرت نہیں ہو گی؟"

سلمٰی نے بڑی محبت سے پوچھا "کیا میں تم سے نفرت کر رہی ہوں۔ اس بے چارے بچے نے کیا قصور کیا ہے؟ وہ تو معصوم ہے میں اسے اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔ تم نہیں جانتیں کہ میں کتنی بدنصیب

ہوں۔ میں ماں نہیں بن سکتی"

وحیدہ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس میں ممتا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ بولی: "تمہارے چہرے سے تو ماں کا نور جھلکتا ہے تم ماں کیسے نہیں بن سکتیں؟ کیا بانجھ ہو؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی: "نہیں بانجھ ہوں اور نہ میرے شوہر ایسے تھے لیکن دو ماہ پہلے وہ کار چلا رہے تھے کہ ایک زبردست حادثہ ہو گیا۔ اس حادثے میں ان کی جانگھ کی ہڈی ٹوٹ گئی"

سلمیٰ کہہ رہی تھی: "آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے میرے سسر کو بتایا کہ اب میرے شوہر کبھی باپ نہیں بن سکیں گے"

وحیدہ نے پوچھا: "تمہارے شوہر کہاں زیرِ علاج رہے تھے؟"

"ریلوے ہسپتال میں۔ میرے شوہر ریلوے میں انجینئر ہیں۔ میں انہیں کراچی ایئرپورٹ سے رخصت کر کے آ رہی ہوں۔ وہ ریلوے کی طرف سے ٹریننگ کے لئے فرانس گئے ہیں۔ تقریباً ایک سال میں واپس آئیں گے۔ پھر یہاں آ کر چیف میکینکل انجینئر بن جائیں گے اس کے بعد ہمیں سفر کرنے کے لئے سیلون کا ملے گی یا پھر ٹرین کے ساتھ ہمارے لئے سیلون کا خاص کمپارٹمنٹ لگایا جائے گا"

سلمیٰ کہہ رہی تھی، وحیدہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔

"اگر میں اپنا بچہ دے دوں گی تو میری ایک کمزوری ہمیشہ اس عورت کے پاس رہے گی۔ اس کے ذریعے یہ میرے خاندان والوں تک پہنچے گی۔ کبھی زندگی کے کسی موڑ پر اس عورت سے اختلافات ہوئے تو یہ میری بدنامی کا باعث بن جائے گی"

سلمیٰ نے کہا: "تمہارے دل میں اگر کسی قسم کا اندیشہ ہو تو مجھ سے صاف صاف باتیں کرو۔ میں کوشش کروں گی کہ اپنی طرف سے صفائی پیش کروں۔ تمہارا دل جیت لوں اور تمہارے بچے کو اپنا لوں"

وہ پھر سوچنے لگی: "بچے سے تو نجات حاصل کرنی ہو گی میں اس کو لے کر اپنے گھر واپس نہیں جا سکوں گی اور بچے کو اس عورت کے حوالے کروں گی تو یہی مناسب ہو گا کہ یہ میرا نام تک نہ جانے اور میرے گھر تک کبھی نہ پہنچے"

یہ سوچتے ہوئے اس نے کہا: "میں اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟ اس بچے کے ساتھ میں اپنے گھر واپس نہیں جا سکوں گی۔ مگر میری ایک شرط ہے"

"کیا یہی شرط کہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہ پوچھوں؟"

"ہاں! میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اپنے والدین کا پتہ ٹھکانہ بھی مجھ سے کبھی نہ پوچھنا۔ میں ایک اجنبی کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گی۔ زچگی کے بعد بچے کو تمہارے حوالے کروں گی پھر تمہاری دنیا سے دور چلی جاؤں گی۔ اس کے بعد ہم کبھی زندگی کے کسی موڑ پر ملیں تو ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیں۔ بولو، میری یہ شرط منظور ہے؟"

"مجھے منظور ہے۔"

"کیا تمہارے سسر نے اس بات کو مان لیں گے کہ ایک ناجائز بچے کو تم اپنی گود میں رکھو"

"سسرال میں صرف میرے سسر ہیں جو مجھے بیٹی کی طرح چاہتے ہیں اور مجھے باپ کی محبت دیتے ہیں۔ میری کسی بات سے انکار نہیں کرتے وہ خود چاہتے ہیں کہ میں کسی بچے سے بہلتی رہوں۔ مجھے تمہارا بچہ مل جائے گا تو میں اپنے شوہر کو یہاں سے یہ لکھ دوں گی کہ میں ان کے ہی بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ انہیں واپس آنے میں کم سے کم آٹھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عرصہ لگے گا۔ وہ واپس آنے کے بعد اس بچے کو اپنا ہی سمجھ کر خوب پیار کریں گے۔ اسے باپ کی محبت دیں گے۔ اس کے ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

وہ دونوں بہت دیر تک مستقبل کے منصوبے بناتی رہیں اور ان منصوبوں پر اچھی طرح غور کرتی رہیں۔ پھر سلمیٰ نے کمپارٹمنٹ کی بتی بجھا دی۔ خود دوسری برتھ پر جا کر لیٹ گئی۔ وحیدہ کو نیند نہیں آ سکتی تھی۔ بہت سے مسئلے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ نیلم دور ہو گیا تھا ماں باپ چھوٹ گئے تھے۔ ایک اجنبی خاتون اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔ اب اپنے جگر کے ٹکڑے کو اس خاتون کے حوالے کرنا تھا۔ ایسی بہت سی سوچیں تھیں جو دماغ میں چبھ رہی تھیں۔ ویسے وحیدہ بہت ہی متاثر ہونے والا ذہن رکھتی تھی۔ کسی سے بھی فوراً ہی متاثر ہو جاتی تھی۔ نیلم کے فریب میں بھی اسی طرح آ گئی تھی۔ اب دوسری بار وہ سلمیٰ کی شخصیت سے متاثر ہو رہی تھی۔

سلمیٰ اسے لاہور میں اپنے ہاں لے گئی تھی۔ اپنے سسر سے ملایا تھا پھر ایک الگ کمرے میں اپنے سسر کے ساتھ جا کر اس کی پوری رُوداد سنائی تھی۔ دوسرے دن بڑے میاں نے فیصلہ سنایا کہ سلمیٰ اور وحیدہ کو لاہور میں نہیں کراچی میں رہنا چاہئے۔ زچگی بھی وہیں ہو گی۔ بڑے میاں شہر بھر کے ملنے جلنے والوں کو اور اپنے دُور کے رشتے داروں کو یہی کہیں گے کہ ان کی بہو اپنی خالہ زاد بہن کے ہاں زچگی کے لئے گئی ہوئی ہے۔ جب وہ کراچی سے واپس آئے گی تو اس کی گود میں ایک بچہ ہو گا۔ اس طرح رشتہ داروں سے یہ بات چھپ جائے گی۔

کراچی بڑا بندہ پرور شہر ہے۔ یہاں ہر بندے کو روزی ملتی ہے بشرطیکہ وہ محنت کرنا جانتا ہو لیکن ہر بندے کو رفاقت نہیں ملتی یہ انسان سے زیادہ مشینوں کا شہر ہے اور جو انسان ہیں وہ بھی مشینوں کی طرح صبح سے شام تک چلتے رہتے ہیں، دوڑتے رہتے ہیں۔ انہیں اپنا ہوش نہیں رہتا۔ یہاں بیشتر... گھرانے ایسے ہیں جو اپنے پڑوسیوں کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے۔ انہیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی سے مروت اور ملنساری کا رویہ اختیار کر سکیں۔ ایسے شہر میں جب سلمیٰ اور وحیدہ نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تو کوئی زیادہ کریدنے کے لئے نہیں آیا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ اور ان میں سے جو ایک عورت ہے وہ کس کے بچے کی ماں بننے والی ہے؟

پہلی بار شہریار کے والدان کے ساتھ آئے ان کے لئے رہائش کا انتظام کیا۔ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں مہیا کیں۔ پھر جاتے وقت اپنے گھر کی پرانی ملازمہ کو ان کے پاس چھوڑ گئے۔ تاکہ وہ گھر کا اور باہر کا اوپری کام کرتی رہے۔ اس کے بعد بھی وہ پہلے اور مہینے میں کراچی آجاتے تھے۔ ان کی خیریت معلوم کرتے تھے۔ ان کی ضروریات کا تمام سامان مہیا کرتے تھے۔ پھر چلے جاتے تھے جب زچگی کا وقت قریب آنے لگا تو پہلی کر اس کے میٹرنیٹی ہوم میں وحیدہ انجم کو بیگم سلمیٰ شہریار کے نام سے داخل کرا دیا گیا۔ تاکہ وہ بچہ شہریار کے نام سے منسوب ہو اور اس کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی اسی نام سے تیار ہو سکے۔

جیسے جیسے زچگی کا وقت قریب آتا تھا۔ وحیدہ کی حالت عجیب ہوتی جاتی تھی۔ اس کی سوچ بدلتی جا رہی تھی۔ رہ رہ کر دل میں یہ بات پیدا ہوتی تھی کہ اتنی تکلیفیں اٹھا کر وہ بچے کو جنم دے گی اور کسی دوسرے کے حوالے کر دے گی۔ یہ زندگی کیسا مذاق کر رہی تھی، ایک تو جوانی غارت ہوئی محبت کا فریب ملا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اب ماں بن رہی تھی تو اس سے ممتا کے حقوق بھی چھینے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا کر سوچتی تھی کہ اپنا بچہ کسی کو نہیں دے گی۔ اپنے کلیجے سے لگا کر رکھے گی۔

ہونے والی اولاد نے اسے بڑا پریشان کیا۔ وہ رہ رہ کر درد نہ میں مبتلا ہوتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اسے آکر دیکھتی تھی اور پیشگوئی کرتی تھی کہ شام تک زچگی ہو جائے گی۔ مگر شام سے صبح ہو جاتی تھی اور کچھ نہیں ہوتا تھا بچہ تھا کہ دنیا میں آنے کا نام نہیں لیتا تھا وہ دن رات ایسی اذیتیں۔ برداشت کر رہی تھی کہ ان اذیتوں کو مائیں ہی سمجھ سکتی ہیں اور ایسی تکالیف اٹھانے کے بعد اس کے خیالات کیوں نہ بدلتے۔ اس کی ماتا کیوں نہ لے جھنجھوڑتی۔ وہ درد و کرب کے دوران اپنے ہوش میں نہیں رہتی تھی لیکن جب درد میں کمی ہوتی تب یہی سوچتی کہ اتنی تکلیفوں سے پیدا ہونے والے بچے کو وہ نہیں چھوڑے گی۔

ایک شام لیڈی ڈاکٹر نے پورے یقین سے کہا کہ گھنٹے دو گھنٹے کے اندر زچگی ہو جائے گی۔ اسے زچہ خانے پہنچایا گیا۔ مگر وہی درد و کرب کا دور تھا کہ ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ دو گھنٹے سے چار اور چار سے آٹھ گھنٹے ہو گئے۔ ساری رات مصیبتوں میں کٹی۔ ادھر سلمیٰ پریشان ہو کر زچہ خانے سے باہر ساری رات ٹہلتی رہی۔ اس کے سسر بھی آگئے تھے۔ آیا بھی بے چاری دعاؤں میں لگی ہوئی تھی۔ ادھر وحیدہ اپنی زندگی کے لئے موت سے لڑ رہی تھی۔

وہ رات بھی کٹ گئی تھی مگر ایک ماں کی مصیبت نہ کٹی۔ صبح آٹھ بجے لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ میجر آپریشن کی ضرورت ہے۔ شہریار کے والد کو ہسپتال کے اس معاہدے پر دستخط کرنا پڑے کہ آپریشن ناکام ہوا۔ تو اس کی ذمہ داری ڈاکٹروں پر نہ ہوگی۔ انہوں نے ایک بزرگ سرپرست کی حیثیت سے دستخط کر دیئے تھے۔ اس کے بعد وہ سلمیٰ اور بے چاری آیا تینوں ہسپتال کے برآمدے میں بے چینی سے وقت گزارتے رہے۔ دوپہر کے قریب انہیں یہ خوش خبری ملی کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ زچہ اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں بلکہ بچے خیریت سے ہیں کیونکہ جڑواں ہوئے ہیں اور اب ان کے آپریشن کا مرحلہ باقی ہے۔

وحیدہ کو ہوش آیا تو اس نے اپنے قریب سلمیٰ کو موجود پایا۔ وہ تھوڑی دیر تک گم صم بستر پر پڑی رہی۔ اسے یاد آیا کہ وہ زچگی کے مرحلے سے گزرنے والی تھی اور اب کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ اسے آپریشن کے لئے لے جایا گیا تھا۔ سلمیٰ نے اسے سوچتے ہوئے دیکھ کر کہا: "بہن ساری مصیبتیں دور ہو چکی ہیں۔ میں تمہیں خوشخبری سناؤں کہ تم ماں بن چکی ہو بلکہ......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وحیدہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کے لئے کہا۔ پھر بولی: "میں کتنی مصیبتوں سے گزر کر ماں بنی ہوں یہ تم نے دیکھا ہے تم ایک عورت ہو، خود ہی فیصلہ کرو۔ کیا میں بچے کو تمہارے حوالے کر دوں۔ کیا میری ماںتا کی کوئی حیثیت نہیں ہے؟ میں اپنے آپ کو مار ڈالوں؟ ایک فریبی نے مجھے پہلے ہی ختم کر دیا ہے مجھ میں جو باقی بچا ہے وہ صرف ممتا ہے۔ میں اپنے بچے کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتی، اگر کروں گی تو مر جاؤں گی۔"

سلمیٰ نے مسکرا کر کہا: "میں تمہاری ممتا کو سمجھتی ہوں۔ بے شک تمہیں بچے کو اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہئے۔ بچے کو تمہاری ضرورت ہے اور مجھے بھی بچے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ مشکل بھی آسان کر دی ہے۔ میں تمہیں یہی خوش خبری سنانے جا رہی تھی کہ تم نے دو بچوں کو جنم دیا ہے۔ وہ جڑواں بچے ہیں اور ڈاکٹر انہیں آپریشن کے ذریعے ایک دوسرے سے الگ کرنے گئے ہیں۔"

وحیدہ نے حیرانی سے یہ بات سنی۔ پھر چپ ہو کر اپنے تصور میں ان دو بچوں کو دیکھنے لگی۔ سلمیٰ نے کہا: "دیکھو بہن! اب انکار نہ کرنا۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ اب تمہاری ممتا کے ارمان بھی پورے ہوں

گے اور میری خالی گود بھی بھر جائے گی۔ ایک بچہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ ایک میں رکھ لوں گی۔"

وحیدہ نے پوچھا: "بچے کہاں ہیں؟"

"وہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی نگرانی میں ہیں۔ ہم کل صبح تک انہیں دیکھ سکیں گے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر سلمیٰ کے ہاتھ کو تھام لیا: "میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ اب جبکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے احسان کا بدلہ چکانے کی توفیق عطا کی ہے تو ایک بچہ میں تمہیں ضرور دوں گی مگر شرط یہ ہے، یہاں سے جانے کے بعد ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں گے۔ تم بھی میرے یا میرے خاندان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

سلمیٰ نے کہا: "پگلی ہوئی ہو۔ جب میں نے اب تک کچھ نہیں پوچھا تو آئندہ کیوں پوچھوں گی؟"

شہریار کے والد نے جب یہ سنا تو انہوں نے وحیدہ کو سمجھایا۔ "بیٹی! یہ بچہ تمہارے ساتھ رہے گا تو تم بدنامیاں اٹھاتی پھرو گی۔ کہاں جاؤ گی؟ کیا تمہارے والدین تمہیں قبول کریں گے؟"

اس نے سر جھکا کر کہا: "میں اب خانیوال نہیں جاؤں گی۔ اپنے خاندان والوں کو اس وقت تک منہ نہیں دکھاؤں گی جب تک بچے کے باپ کو تلاش نہیں کر لوں گی۔ کبھی کبھی میرا دل کہتا ہے کہ وہ فریبی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مصیبت پیش آئی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مجبوری ہے۔ جب بھی وہ اپنی مصیبتوں سے نکلے گا، اپنی مجبوریوں کے پار ہوگا تو مجھے تلاش کرے گا۔ میرے پاس ضرور آئے گا۔ مجھے یہ سوچنا چاہئے کہ خدانخواستہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ وہ مجبور ہو سکتا ہے۔"

شہریار کے والد نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "بیٹی! ایسا بھی سوچا جا سکتا ہے۔ خدا کرے کہ وہ بے وفا نہ ہو۔ ایک شریف انسان ہو، اور شرافت سے آکر تمہارا ہاتھ تھام لے، اس بچے کو اپنا نام دے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں مگر ہسپتال سے جانے کے بعد تم تنہا کہاں رہو گی۔ میں تو اپنی بہو اور بچے کو لاہور لے جاؤں گا۔"

وحیدہ نے کہا: "جناب! آپ لوگوں نے اتنا ساتھ دیا ہے، ایک آدھ ہفتہ اور میرے ساتھ رہ جائیں۔ میں اپنی والدہ سے رابطہ قائم کروں گی اور اپنے مستقبل کے متعلق ضروری فیصلے کروں گی۔"

دوسری صبح دو نرسیں دو بچوں کو لے کر آئیں۔ ایک بچے کو وحیدہ نے گود میں لے لیا۔ دوسرے کو سلمیٰ نے سینے سے لگایا۔ وہ انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہیں۔ وحیدہ نے کہا: "ہم انہیں الگ کیسے پہچانیں گے یہ تو بالکل ایک جیسے ہیں۔"

ایک نرس نے مسکراتے ہوئے کہا: "صورت، شکل، قد و قامت اور صحت سب کچھ ایک جیسی ہے۔ بس ایک ہی فرق ہے۔ وہ یہ کہ ایک بچے کے دائیں بازو پر زخم کا نشان ہے اور دوسرے بچے کے بائیں بازو پر۔ یہ اسی طرح سے جڑے ہوئے تھے اور یہیں سے آپریشن کے ذریعے انہیں الگ کیا گیا ہے۔"

نرسوں کے جانے کے بعد شہریار کے والد نے کہا: "میں اپنے پوتے کا نام امیر شہریار رکھوں گا۔ کیوں بہو! کیسا نام ہے؟"

سلمیٰ نے خوش ہو کر کہا: "بہت اچھا نام ہے۔ امیر۔"

وحیدہ نے کہا: "میں اپنے بیٹے کا نام کبیر رکھوں گی۔ ایک امیر دوسرا کبیر۔۔۔ دونوں بھائی امیر کبیر ہوں گے۔"

ایسا کہتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو کر سوچنے لگی، پھر بولی: "مگر دونوں بھائی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکیں گے، ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ کبھی نہیں معلوم ہوگا کہ امیر اور کبیر کے درمیان خون کا رشتہ ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ سلمیٰ اس کا ہاتھ تھام کر اسے تھپکنے لگی۔ اسے تسلیاں دینے لگی۔ اسی دن وحیدہ نے ہسپتال سے اپنے والد کو ٹرنک کال کے ذریعے مخاطب کیا۔ انہیں بتایا کہ وہ کراچی میں ہے اور اپنی امی کو دو چار روز کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے۔

اس کے والد ٹیلی فون پر چند لمحوں تک خاموش رہے۔ اس نے پوچھا: "ابا جان! آپ خاموش کیوں ہیں؟ کیا میری آواز آپ تک نہیں پہنچ رہی ہے یا آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟"

"نہیں بیٹی! تم سے ناراض ہو کر کہاں جاؤں گا۔ تم ہی تو ہماری آرزوؤں اور خوشیوں کا مرکز ہو۔ ہم تم سے ناراض ہو تو سکتے ہیں لیکن تمہیں نہ تو بھلا سکتے ہیں اور نہ ہی تمہیں اپنے دل سے نوچ کر پھینک سکتے ہیں۔ تم کیسی ہو بیٹی؟"

"میں سکھر کا رہنے والا ہوں۔ وہاں کے لوگ بہت تیز واقع ہوتے ہیں۔ وہ پانچ منزلہ عمارت بنانا شروع کرتے ہیں اور پانچ دن میں اس کی تعمیر سے فارغ ہو جاتے ہیں۔"

"یہ تیزی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کبھی کراچی آؤ۔ ایک صبح میرا گزر اسمال انڈسٹریز کے علاقے سے ہوا۔ اس وقت وہاں ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ شام کو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عمارت کا مالک اپنے کرائے داروں کو کرایہ ادا نہ کرنے کے الزام میں باہر نکال رہا تھا"

اس کے ابو خیریت پوچھ لیتے تھے۔ وہ نادان نہیں تھی۔ سمجھ رہی تھی کہ بچے کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں مگر شرم سے کچھ بول نہیں سکتے۔ وہ آہستگی سے بولی: "ابو! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"کیسے نہ کروں۔ میں راتوں کو سوتا نہیں ہوں۔ سوتا بھی ہوں تو صبح اٹھ کر یہ احساس ہوتا ہے جیسے نیند میں بھی جاگتا رہا ہوں، تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں، بیٹی! تم والدین کی محبت کو نہیں سمجھ سکو گی۔"

"پہلے شاید نہیں سمجھتی تھی۔ اب قدرت نے سمجھا دیا ہے۔ اب میں سمجھ رہی ہوں کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے؟ وہ ہوتی ہے کہ ماں کو سارے دنیا جہاں کی بلاؤں سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

آخر اس نے باتوں ہی باتوں میں کہہ دیا۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا: "یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟ ایسے خیالات نہ رکھو۔ ممتا کو اتنا شدید نہ ہونے دو۔ تمہیں یہاں اکیلے واپس آنا ہے۔"

"نہیں! اب میں واپس نہیں آؤں گی۔ یہاں کراچی میں رہنا چاہتی ہوں۔ آپ میرے پلاٹ پر اپنے وعدے کے مطابق ہسپتال تعمیر کرا دیں۔ میری رہائش کا بندوبست کر دیں۔ میں یہاں تنہا رہوں گی۔ آپ لوگ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آ جایا کریں۔۔۔ بس۔"

"یہ بات کتنی سنگدلی سے کہہ رہی ہو۔ کیا ہم کبھی کبھی تمہاری صورت دیکھیں؟ ابھی تمہیں دلہن نہیں بنایا، تمہیں رخصت نہیں کیا کہ صبر آ جاتا کہ بیٹی پرائی تھی، پرائی ہو گئی۔ تم تو ابھی پرائی نہیں ہو بیٹی! ہم کس دل سے تمہیں دور کریں؟"

"ابو! سیدھی سی بات ہے۔ آپ اپنے دل سے مجھے نکال کر نہیں پھینک سکتے۔ کوئی اپنی اولاد سے ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی محبت کی کسوٹی پر میری محبت کو پرکھنے کی کوشش کریں اور انصاف سے وہی کریں جو میں چاہتی ہوں۔ آپ امی کے ساتھ یہاں آ سکتے ہیں۔ میں ایڈریس دے رہی ہوں۔ اس ایڈریس پر آپ ٹیلی گرام دے دیجیے کہ کس ٹرین سے کس دن کس وقت یہاں پہنچ رہے ہیں۔ میں اس وقت اسٹیشن پر آ کر ملوں گی۔"

اس نے اپنا موجودہ ایڈریس نوٹ کرانے کے بعد کہا: "ایک بات یاد رکھیے کہ آپ لوگ اس پتے پر اچانک نہ پہنچیں۔ کیونکہ میں جس فیملی کے ساتھ ابھی رہتی ہوں، انہیں نہ تو اپنا نام بتایا ہے اور نہ ہی آپ لوگوں کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ میں ان کے لئے اجنبی ہوں اور اجنبی کی حیثیت سے رخصت ہو جاؤں گی۔ اس سے پہلے آپ لوگوں سے مل کر یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ یہاں میری مستقل رہائش کا انتظام کر سکتے ہیں یا نہیں؟"

"بیٹے! میں ضرور کروں گا۔ جو تم چاہو گی، وہی کروں گا۔ مجھے تمہارا تحفظ اور تمہاری سلامتی منظور ہے۔ تمہیں جلد ہی ہماری طرف سے ٹیلی گرام ملے گا۔"

دوسرے دن ٹیلی گرام موصول ہوا کہ اس کی والدہ ۔۔۔ ماہ رواں کی سات تاریخ کو بولان ایکسپریس سے کراچی پہنچ رہی ہیں۔ سلمیٰ نے وہ ٹیلی گرام موصول کیا تھا۔ وحیدہ نے اسے بتایا کہ اس کے والدین پہنچنے والے ہیں لیکن وہ تنہا اسٹیشن جائے گی اور ان سے ملاقات کرے گی۔

سلمیٰ نے کہا: "بے شک ہم تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہم نے زبان دی ہے ہم تمہارے یا تمہارے والدین کے متعلق نہ کوئی سوال کریں گے اور نہ ہی چوری چھپے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے بس ہماری دعا ہے کہ تمہارے والدین تمہیں بچے کے ساتھ قبول کر لیں۔"

چند دن کے بعد ماں بیٹی ریلوے پلیٹ فارم پر ملیں۔ ماں کے آنسو نہ رک سکے۔ وہ نقاب کے پیچھے روتے روتے بولیں: "بیٹی! وہ کہاں ہے؟"

وحیدہ فوراً ہی نہ سمجھ سکی۔ اس نے پوچھا: "وہ؟ آپ کسے پوچھ رہی ہیں؟" پھر وہ فوراً ہی سمجھ کر بولی: "اچھا، میرا منا! میں اسے اپنی محسنہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔"

وہ دونوں پلیٹ فارم سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھیں۔ اس کی والدہ نے سوسائٹی کے ایک علاقہ کا پتہ بتایا۔ پھر ٹیکسی چل پڑی۔ وحیدہ نے بڑے دکھ سے کہا: "میں جانتی ہوں کہ ابو نہیں آئیں گے۔"

وہ بڑی محبت سے سمجھانے کے انداز میں بولیں: "تم یہاں تنہا رہو گی تو وہ تم سے دس بار ملنے آئیں گے۔ تمہیں اپنے ساتھ خانپور بھی لے جائیں گے۔ اور بچے کے ساتھ رہو گی تو وہ کبھی تمہارا سامنا نہیں کریں گے۔ وہ، اس، بچے کی موجودگی میں۔۔۔ میں کیا بتاؤں کہ کیسی شرم محسوس کریں گے۔ تم اگر شرافت کو ذرا بھی سمجھ سکتی ہو تو ان کی شرم کو بھی سمجھ لو گی۔۔۔"

وحیدہ نے اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھائی۔ اسے خیال آ گیا کہ سامنے بیٹھا ہوا ٹیکسی ڈرائیور ان کی باتیں سن سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے۔ اس نے پوچھا: "امی! کیا آپ اس پلاٹ پر پہلے بھی آ چکی ہیں؟"

"ہاں! میں دو بار تمہارے ابو کے ساتھ یہاں آ چکی ہوں۔ یہ چار ہزار گز کا پلاٹ ہے۔ اس پر دو کمرے کا ایک چھوٹا سا مکان بنا ہوا ہے۔ ہسپتال کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ صرف تمہارے امتحان پاس کر کے آنے کی دیر تھی۔ پھر تمہارے سامنے تعمیری کام شروع ہوتا۔ اب تمہارے ابو نے کہا ہے کہ جتنی رقم کی ضرورت ہو گی، وہ یہاں تمہارے بینک اکاؤنٹ میں بھیج دیں گے۔ تم یہاں اپنا اکاؤنٹ کھلوا لو۔ اس کے بعد اپنی موجودگی میں اپنی مرضی کے مطابق ہسپتال تعمیر کرا لینا۔ تمہیں کسی چیز کی یہاں پر کمی نہیں ہو گی۔"

کچھ وقت اور گزرا۔ ایک چھ بستروں کا چھوٹا سا ہسپتال تعمیر ہو گیا تھا۔ وہ اسے کلینک کہتی تھی۔ اس چھوٹے سے ہسپتال کی پیشانی

پر بڑا سا بورڈ لکھ کر لگایا تھا: "نیک نام کلینک۔ ڈاکٹر وحیدہ انجم"! وہ اس نام کو کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ جس نے اسے بدنام کیا تھا اور محبت کا روگ لگایا تھا۔ یہ روگ ہی ہے کہ اتنے صدمات سہنے اور بدنامیاں اٹھانے کے بعد بھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچتی تھی، ضرور وہ مصیبتوں میں گرفتار ہے۔ حالات اس کے دشمن ہیں۔ اسے آنے نہیں دیتے۔ جب بھی آنے کا موقع ملا تو وہ ضرور آئے گا۔ اسے تلاش کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی کلینک کا نام پڑھ کر یہیں آ جائے۔ وہ اکثر بارہ بجے زوال کے وقت آیا کرتا تھا۔ اس لئے وہ مریضوں کے جانے کے بعد بھی بارہ بجے سے ایک بجے تک کلینک کے چیمبر میں تنہا بیٹھی رہتی تھی۔

ماضی ایسا ہوتا ہے کہ اسے یاد کرتے کرتے عمر گزر جاتی ہے۔ وحیدہ انجم کو پتہ بھی نہ چلا کہ ان یادوں میں بہتے بہتے تین بجنے لگے تھے۔ اچانک ہی اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کی بوڑھی ملازمہ اسے آوازیں دیتے ہوئے، دوڑتے ہوئے چیمبر میں داخل ہوئی۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے کہا: "بی بی جی! غضب ہو گیا۔ کبیر بابا کا پتہ نہیں ہے۔ ہم نے اس کو تمام کمروں میں دیکھا، گارڈن میں دیکھا مگر وہ نہیں ہے۔ پھر ہم کوٹھی کے باہر مین گیٹ کے پاس گیا تو بابا، سڑک پر کنارے بابا کا یہ کھلونا پڑا ہوا تھا۔"

وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔

"میرا بچہ! میرا بیٹا! میرا کبیر!"

●

ٹرالی لوہے کی پٹری پر دوڑتی جا رہی تھی۔ شہریار چھتری کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جونیئر آفیسر بھی اس سے سہمے ہوئے تھے۔ کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے سلمیٰ کو حکم دیا تھا کہ وہ دونوں بچوں کو لے کر سیلون کار سے باہر چلی جائے۔ اس کے لئے یہ سزا کافی تھی۔ مگر سزا دینے کے باوجود وہ اندر سے اضطراب میں مبتلا تھا۔ اسے رہ رہ کر اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ سلمیٰ چار برس تک اس سے یہ بات چھپاتی رہی، اسے دھوکہ دیتی رہی۔ اگر اس کی بھلائی کے لئے ایسا کیا تھا تب بھی اس کا قصور ناقابلِ معافی تھا۔ کیونکہ وہ ناجائز بچے کو اس کی گود میں کھلاتی رہی تھی۔

پھر یہ خیال آ گیا کہ ایکسیڈنٹ کے بعد واقعی ڈاکٹر نے یہ رپورٹ دی تھی کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکے گا۔ اس بات کی تصدیق ہونی چاہئے۔ اگر تصدیق ہو گئی تب بھی اس عورت کو کیسے معاف کیا جا سکتا ہے؟ جس نے اتنا بڑا ڈرامہ کھیلا۔ جڑواں بچوں کو اس سے چھپایا۔ ایک بچے کو اس کے سامنے لائی۔ دوسرے کو کسی عورت کے پاس چھوڑا۔ اب ان بچوں کی ماں سلمیٰ ہے یا کوئی دوسری عورت ہے۔ اس بات کا یقین کیسے کیا جائے؟ کیا سلمیٰ نہیں ہو سکتی؟

وہ بے چینی سے اپنی سیٹ پر پہلو بدلنے لگا۔ اس کے اندر سے آواز آ رہی تھی۔ سلمیٰ ایسی نہیں لگتی ہے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ اس میں ذرا بھی سستا پن نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں شرم ہے۔ اس کے مزاج میں سنجیدگی ہے۔ اس نے کبھی اپنے شوہر کے دوستوں سے مسکرا کر بات نہیں کی۔ دوست کبھی گھر آتے تو وہ ان کے سامنے چائے اور ناشتہ پیش کرنے کی حد تک آتی تھی۔ پھر کام کے بہانے چلی جاتی تھی۔ شہریار جانتا تھا کہ پچھلے چھ برسوں میں اس نے سلمیٰ کی ایسی کوئی غلطی نہیں پکڑی جس سے اس کے شبہ کو تقویت پہنچتی۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان اندر سے کچھ ہوتا ہے اور باہر سے کچھ ہوتا ہے۔ عورت ظاہراً تو اپنے آپ کو بڑی وفادار بڑی پارسا بنا کر پیش کرتی ہے لیکن اندر ہی اندر کیا گل کھلاتی ہے؟ یہ بعد میں پتہ چلتا ہے اور بہت سے بدنصیب مرد ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں کبھی پتہ ہی نہیں چلتا۔

یہ شہریار کا ذاتی تجربہ تھا۔ وہ خود دوہرے کردار کا مالک تھا۔ گھر میں عام مردوں کی طرح بیوی کے سامنے نہایت سنجیدہ ہوتا تھا۔ اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تو گھر کے کسی سامان کو توڑ پھوڑ کر غصے کا اظہار کرتا تھا۔ ملازموں کو جھڑکتا تھا اور سلمیٰ کو ہر دم سہمے رہنے اور محتاط رہنے پر مجبور کرتا رہتا تھا۔ گھر کے باہر جب وہ دورے پر نکلتا تو پرائی عورتوں کے سامنے سنجیدگی شوخی میں بدل جاتی تھی۔ افسرانہ رعب اور دبدبہ بھی خاک ہو جاتا تھا۔ کیونکہ پرائی عورتوں پر رعب جمانے اور غصہ کرنے سے وہ ٹھینگا دکھا کر چلی جاتی ہیں۔ محبت اور رومانس کا ماحول ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ وہ کالج کا شریر طالب علم بن جاتا تھا۔

▲

ٹرالی رک گئی۔ خیالات کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اس نے ٹرالی سے اترتے ہوئے آس پاس کے ماحول کو دیکھا۔ وہ ملیر برج کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس وقت اس کا موڈ کچھ اور تھا۔ وہ کسی کام کی طرف توجہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے وہ شرمیلی سی لیڈی ڈاکٹر یاد آ رہی تھی جسے پا کر اس نے کھو دیا تھا اور کھو دینے کے بعد کئی بار پانے کی تمنا کی تھی۔ صرف تمنا کی تھی کوشش نہیں کی تھی۔

پل کی مرمت کرنے والا ٹھیکیدار خوشامدانہ انداز میں سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ شہریار نے اسسٹنٹ انجینئر سے کہا: "میں آرام کرنا چاہتا ہوں کیا تم کام سنبھال لو گے؟"

"یس سر! آپ بیشک آرام کریں اور بے فکر رہیں۔ میں سارا کام سنبھال لوں گا۔"

ٹھیکیدار نے کہا: "جناب! دھوپ بہت تیز ہے۔ ٹرالی میں آنے جانے سے لو لگ جائے گی۔ اگر واپس جانے کا ارادہ ہو تو میری ایئر کنڈیشنڈ

کار حاضر ہے"

پندرہ منٹ بعد وہ ایک آرام دہ گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ ٹھیکیدار نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کام کی بات چھیڑنا چاہی۔ شہریار نے ہاتھ اٹھا کر کہا "پلیز! میں کام کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ خاموش رہنا چاہتا ہوں"

پھر تمام راستے خاموشی رہی۔ گاڑی چلتی رہی اور وہ خیالات کی رو میں بہتا رہا۔ ٹھیک زوال کے وقت وہ لیڈی ڈاکٹر وحیدہ انجم کے سامنے پہنچ گیا۔ دراصل ہسپتال میں وہ اپنے ایک دوست کی عیادت کے لئے آیا تھا۔ واپس جاتے وقت اس نے ہسپتال کے ایک کمرے میں دیکھا تو وحیدہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ایسی پیاری پیاری سی لڑکی تھی۔ ایسی من موہنی صورت تھی کہ من کو موہ رہی تھی۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ اس لڑکی کو حاصل نہ کیا تو زندگی میں کچھ نہ کیا۔

ایک ہوس ہوتی ہے۔ اس کو چھونے کے بعد اس کو چھونے کی تمنا ہوتی ہے۔ گھر سے نمکین کھا کر نکلنے کے بعد باہر میٹھی ڈش کھانے کو جی چاہتا ہے۔ بہت کم لوگ اصول پسند ہوتے ہیں گھر سے کھا پی کر نکلتے ہیں تو باہر ایک پیالی چائے تک نہیں پیتے۔ مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ اس نے جب وحیدہ کو دیکھا تو دل نے مچل کر کہا۔ "میرے پاس سب کچھ ہے۔ بس یہ ایک حسینہ نہیں ہے جو نبض تھام کر درد کی دوا کرتی ہے" لہٰذا وہ اسی وقت بیمار بن کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اپنی کلائی بڑھا دی۔ اس نے نبض کو تھام کر پوچھا "آپ کا نام؟"

اس نے اپنا نام بے اختیار نیکنام بتایا تھا اور اپنی اس شوخی پر اندر سے جھوم گیا تھا۔ واہ کیا مزے کا نام بتایا ہے۔ اگر یہ بات گھر کی عورت کو معلوم ہوتی تو وہ کبھی یقین نہ کرتی کہ اس کا میاں باہر اتنا شوخ اور چنچل ہو جاتا ہے۔

دوسری، تیسری ملاقاتوں میں شہریار کو اپنے دل کا حال معلوم ہوا کہ وہ خود کو وحیدہ سے بہلا نہیں رہا ہے بلکہ چپکے چپکے اسے دل سے لگا رہا ہے۔ وہ چیز ہی ایسی تھی کہ دل سے لگ جاتی تھی۔ مزید چند ملاقاتوں میں وہ پریشان ہو گیا۔ اس کا ضمیر اندر سے ملامت کرتا تھا کہ اتنی حسین تعلیم یافتہ اور شریف لڑکی کو دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ اس کی محبت میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ اب سلمیٰ کے سامنے بھی وحیدہ کی ہی صورت دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے؟ کس طرح وحیدہ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لئے لے آئے۔

وہ وحیدہ کے ساتھ باہر تفریح کے لئے نکلتا تو محتاط ہو کر آس پاس دیکھتا رہتا۔ کہیں کوئی جان پہچان والا نہ دیکھ لے۔ وحیدہ کے سامنے اس کی اجنبی اور اس کے خاندان والوں کا بھید نہ کھل جائے۔ اس بے چاری نے اپنے والدین کا نام اور پتہ سب کچھ بتا دیا تھا اور وہ خود کو چھپاتا جا رہا تھا، اس کی معصومیت سے کھیلتا جا رہا تھا۔

وحیدہ دل میں سماتی رہی۔ اب اس کے سوا کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ جو وہ ہوتی ہے جو حاصل ہوتے ہوئے بھی دور کی چیز ہوتی ہے۔ جو انتظار کراتی ہے۔ راتوں کو جگاتی ہو، دن کو دوڑاتی ہے۔ اگر وحیدہ کی جگہ سلمیٰ ہوتی اور سلمیٰ کی جگہ وحیدہ بیوی ہوتی تو شہریار سلمیٰ کے لئے تڑپتا۔ بات صرف پوزیشن کی تھی۔ پوزیشن بدلنے سے محبت اور وفا کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔

ایک دن وحیدہ نے کہا تھا "ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ تم میرے ساتھ خانپور چلو۔ میں اپنے والدین سے تعارف کراؤں گی پھر ہماری شادی ہو جائے گی"

اس نے بات بنائی "میں کس منہ سے تمہارے والدین کے سامنے جاؤں۔ میں بے روزگار ہوں۔ جب تک کوئی اچھی ملازمت نہ ملے۔ اس وقت تک شادی کرنا حماقت ہے"

"نوکری ایک نہ ایک دن مل ہی جائے گی۔ روزگار کی فکر نہ کرو۔ میں ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ لاکھوں میں کھیلتی ہوں۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی"

"نہیں وحیدہ! ایسا نہ کہو۔ میں شادی کے بعد سسرال کے پیسے پر گزارہ نہیں کروں گا۔ یہ میری توہین ہے"

اس نے بڑی خوبصورتی سے باتیں بنائیں لیکن تنہائی میں سنجیدگی سے وحیدہ کو اپنانے کے مسئلے میں الجھا رہتا تھا۔ مذہب میں دوسری شادی کی اجازت ہے لیکن اس کے لئے جواز پیش کرنا پڑتا ہے۔ اگر پہلی بیوی اچھی ہو، صحت مند ہو، ازدواجی زندگی اچھی طرح گزار رہی ہو، کسی بات کی کمی نہ ہو تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ پہلی بیوی سے اجازت لینی پڑتی ہے۔

اس نے کئی بار سوچا کہ سلمیٰ میں کس طرح کوئی عیب نکالے؟ کوئی کمزوری ڈھونڈے، اس میں کوئی ایسی کمی ثابت کرے کہ دوسری شادی کی اجازت مل جائے۔ لے دے کر ایک اولاد نہیں ہوئی تھی۔ شادی کو صرف دو برس ہوئے تھے۔ کوئی مجبوری تو نہیں۔ چار برس اور چھ برس بعد بھی اولاد ہوتی ہے۔ پھر بھی اس نے سوچا۔ شاید سلمیٰ بانجھ ہو۔ اگر اس کے بانجھ ہونے کی ڈاکٹری رپورٹ مل جائے تو وہ خوب دھوم دھڑلے سے وحیدہ کو اپنی دلہن بنا کر لا سکتا ہے۔

ٹھیکیدار نے کینٹ اسٹیشن کے پاس گاڑی کو روکتے ہوئے پوچھا "جناب! اور کہیں جانا ہو تو حکم دیجئے؟"

وہ خیالات سے چونک گیا تھا۔ اس نے ونڈ اسکرین کے پار کینٹ اسٹیشن کی عمارت کو دیکھا۔ پھر گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "بس اور کہیں نہیں جانا۔ شکریہ"

"جناب! حکم ہو تو شام کو حاضر ہو جاؤں؟ کچھ ضروری باتیں

کرتی ہیں۔"

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا: "میں آج کسی سے نہیں ملنا چاہتا۔ کل سیلون کار میں آکر مجھ سے ملاقات کرنا۔"

وہ وہاں سے چلتا ہوا اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ اسے اسٹیشن ماسٹر سے بھی ملاقات کرنی تھی لیکن دل یہی چاہتا تھا کہ تنہائی ہو اور وحیدہ کی یادیں ہوں۔ سلمیٰ کی بے وفائی کے بعد وحیدہ کچھ اور شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ جب وہ پلیٹ فارم پر پہنچا اور وہاں سے گزرتے ہوئے اپنے سیلون کار کی طرف جانے لگا تو پولیس انسپکٹر سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے کہا: "آپ کی وائف یہاں رپورٹ درج کرانے آئی تھیں۔ بچے کی تصویر بھی دی ہے۔ میں نے تمام تھانوں میں اس رپورٹ کے مطابق خبر پہنچا دی ہے۔ اس بچے کا کوئی دعوے دار ہو گا تو اسے یہاں بھیج دیا جائے گا۔"

شہریار نے پوچھا: "میری وائف نے بچوں کو حاصل کرنے کے لئے کہاں کا پتہ لکھوایا ہے؟"

"وہ اپنی کسی بہن کا پتہ لکھوانا چاہتی تھیں لیکن ان کو مکان کا نمبر یاد نہیں رہا۔ اس لئے یہاں کا پتہ لکھوا دیا ہے کہ کینٹ اسٹیشن کی ایک ڈیڈ لائن پر سیلون کار کھڑی ہوئی ہے۔ وہیں بچہ مل سکتا ہے۔"

اس نے پوچھا: "کیا میری وائف اور وہ بچے سیلون کار میں ہیں؟"

"پتہ نہیں جناب! آدھ گھنٹہ پہلے میں نے انہیں بچوں کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر کہیں جاتے دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ ایک آیا بھی تھی۔"

شہریار نے اطمینان کی سانس لی۔ سلمیٰ کی یہی بات اچھی لگتی تھی۔ اسے جو حکم دیا جاتا اس پر خاموشی سے عمل کرتی تھی۔ ایک ہی بار کہنے پر وہ بچوں کو لے کر چلی گئی تھی۔ ایسی عورتوں میں کمزوریاں ڈھونڈنے سے نہیں ملتیں۔ قدرت بھی ان پر مہربان ہوتی ہے۔ ڈاکٹری رپورٹ نے بتایا کہ سلمیٰ بانجھ نہیں ہے۔ وہ ماں بن سکتی ہے۔ شہریار کا یہ حربہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ دوسری شادی کرنے کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا تھا۔

کئی بار اس نے سوچا کہ وحیدہ انجم کو اپنی مصیبت بتا دے۔ جب اس کے شادی شدہ ہونے کی بات معلوم ہو گی تو وہ روئے گی۔ فریاد کرے گی۔ پھر اس کی دنیا سے دور ہو جائے گی۔ یا محبت نے زیادہ بےبس کر دیا تو اس حالت میں بھی اس کی محبت قبول کرتی رہے گی۔ ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو شادی شدہ مردوں کا بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ شاید وحیدہ انجم بھی ایسی ہی ہو۔

لیکن جب وہ ملاقات کے دوران اس سے باتیں کرتا تھا اور اس کی باتیں سنتا تھا تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اور طرح کی لڑکی ہے۔ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ اسے جب معلوم ہو گا کہ میں شادی شدہ ہوں تو یہ جاہل عورت کی طرح دامن پکڑ کر فریاد نہیں کرے گی۔ بلکہ گریبان پکڑ کر محاسبہ کرے گی۔ پڑھی لکھی، تیز طرار لڑکیوں میں یہی خامی ہے کہ جب خود ڈوبتی ہیں تو ساتھ لے کر ڈوبتی ہیں۔ بدنام ہوتی ہیں تو بیچ بازار میں اپنے عاشق کی عزت بھی اتار دیتی ہیں۔

اسے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ وہ یہی بہتر سمجھتا رہا کہ وحیدہ سے جیسے عشق چل رہا ہے اسی طرح چلتا رہے۔ جب خطرے کی گھنٹی بجے گی تو اس کی زندگی سے غائب ہو جائے گا۔ پھر ایسا ہی وقت آ گیا۔ ایک بار وہ اس سے رخصت ہو کر اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا مال روڈ سے گزر رہا تھا کہ اچانک اسٹیئرنگ بہک گیا۔ کار فٹ پاتھ پر چڑھ کر بجلی کے کھمبے سے ٹکرائی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا۔

اس کے خیالات کا سلسلہ پھر ٹوٹ گیا۔ وہ چلتے چلتے اپنی سیلون کار کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اردلی اٹینشن کھڑا ہوا تھا۔ وہ سیڑھی پر چڑھتا ہوا اندر آیا۔ پھر اندرونی دروازے کو کھول کر سیلون کار کے خصوصی کمرے میں پہنچا۔ وہاں ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ سلمیٰ جب بھی گھر چھوڑ کر جاتی تو گھر کی ایک ایک چیز کو اپنی جگہ اسی طرح رکھتے اور صفائی کرنے کے بعد جاتی تھی۔ ایک خط میں اس کی رہنمائی کی جاتی تھی کہ سلمیٰ کی غیر موجودگی میں اسے کیا کرنا ہے؟ اس نے نظریں دوڑائیں۔ ایک برتھ کے ایک سرے پر تکیہ رکھا ہوا تھا اور تکیے کے اوپر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ ایک پیپر ویٹ سے دبا ہوا تھا۔ اس نے پہلے تو سوچا کہ اسے ہاتھ نہ لگائے۔ پھر اس خیال سے اسے اٹھا لیا کہ سلمیٰ نے اپنی بہن کے ہاں رہنے یا پھر سیلون کار میں واپس آنے کے سلسلے میں کچھ لکھا ہو گا۔

اس نے تہہ کئے ہوئے کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ لکھا ہوا تھا۔ "میں آپ کے حکم کے مطابق جا رہی ہوں۔ رات کو آٹھ بجے تک اپنی بہن کے ہاں آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ کو ضرور آنا ہو گا۔ ورنہ میرے میکے میں میری سبکی ہو گی۔ اگر آپ نہ آئے تو میں آپ کی مصروفیات کا بہانہ کر کے اپنی بہن سے رخصت ہو کر پھر یہاں آ جاؤں گی۔ اب آپ کو دونوں صورتوں میں جو پسند ہو، اس پر عمل کریں۔ اگر آپ شام سے پہلے واپس آ گئے ہوں تو غسل ضرور کر لیں۔ گرمی بہت ہے۔ غسل کرنے سے طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔ آپ کے لئے لباس استری کرنے کے بعد وارڈ روب میں رکھ دیا ہے۔ اسے پہن لیجئے گا۔ ٹرے میں برف بھری ہوئی ہے اور برف میں بیئر کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ آپ پینے کے دوران نمکین مونگ پھلیاں شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ کچن میں رکھی ہوئی ہیں۔ آخر میں اتنا سمجھا دوں کہ پینے کے

وقت آدمی اکثر منفی انداز میں سوچتا ہے اور مسلسل جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوتا رہتا ہے۔ بیئر پینے کے دوران دماغ ٹھنڈا ہو تو مثبت انداز میں سوچیے گا۔ پھر آپ کو اپنی بیوی کی اچھائیاں یاد آئیں گی۔ تب تک کے لئے رخصت، خدا حافظ - آپ کی کنیز

سلمیٰ"

وہ سلمیٰ کی تحریری ہدایات پر عمل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن گرمی کی زیادتی کے باعث غسل کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے وہ پندرہ منٹ تک غسل خانے میں رہا ـــــ واپس آکر اسے وہی لباس پہننا پڑا جو سلمیٰ چھوڑ گئی تھی۔ کیونکہ وہی استری کیا ہوا تھا۔ غسل کرنے کے بعد واقعی طبیعت ہلکی ہو گئی۔ اب پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ سلمیٰ بڑی مزاج شناس تھی۔ اپنے شوہر کے مزاج کو خوب سمجھتی تھی۔ یوں تو اکثر سمجھاتی رہتی تھی کہ زیادہ نہیں پینا چاہئے لیکن آج وہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے برف میں بیئر کی بوتلیں رکھ کر گئی تھی تاکہ وہ پیئے اور اسے یاد کرے۔ بہرحال وہ پینے کے لئے بیٹھ گیا۔

پہلا جام شروع کرتے ہی محبوبہ یاد آتی ہے لیکن اسے بیوی یاد آنے لگی۔ اس نے دونوں بچوں کو وہاں سے لے جا کر اس کے دماغ کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا اور جانے سے پہلے اس کے لئے اتنا سارا انتظام کیا تھا کہ وہ آرام سے بیٹھ کر پی سکتا تھا اور سکون سے سوچ سکتا تھا جب وہ ایک ماہ تک ہسپتال میں رہا تھا تب بھی سلمیٰ نے اپنی خدمت گزاری کا خوب رنگ جمایا تھا۔ صبح و شام ہمیشہ اس کے کمرے میں رہتی تھی، اسی کے پاس سوتی تھی۔ کبھی غسل کرنے کے لئے یا لباس تبدیل کرنے کے لئے ہسپتال کے پاس ہی اپنے بنگلے میں جاتی تھی، پھر چلی آتی تھی۔ اس نے ایک ماہ کے دوران اتنی خدمت کی تھی کہ پچھلے دو سال کی خدمت گزاری بھی دماغ میں تازہ ہو گئی تھی۔ تب اس نے سوچا تھا۔ سلمیٰ میں کس بات کی کمی ہے؟ اگر کوئی دوسری بیوی آئے گی تو کیا وہ آسمان سے تارے توڑ کر لائے گی؟ وہ بھی داسی کی طرح خدمت کرے گی۔ اگر وہ خدمت گزار نہ ہوئی تو درد سر بن جائے گی۔ جیسا کہ عام طور پر دو بیویاں بن جایا کرتی ہیں۔

بیئر کی دو بوتلیں ختم کرنے کے بعد جب ذرا سرور حاصل ہوا تو اس نے تیسری بوتل کھولتے ہوئے اور سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔ یہ دماغ میں سلمیٰ کیوں گھسی ہوئی ہے؟ میری انجم کہاں گئی؟ ہاں! وہ کہاں چلی گئی؟ یہ سوال تو برسوں سے اس کے دماغ میں چبھ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے والدین کا پتہ ٹھکانہ بتایا تھا۔ ایک بار جب وہ ڈیوٹی کے سلسلے میں خانپور گیا تو اس کی کوٹھی کے قریب سے بھی گزرا۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر وحیدہ کے باپ کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ بس اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا۔ کیا اندر جائے وحیدہ کو ایک نظر دیکھے، اس سے ملاقات کرے۔ لیکن تین برس تک اس سے دور رہنے کا کیا جواز پیش کرے گا؟ اگر وہ پھر اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ اور شادی کے لئے کہا تو مصیبت ہو جائے گی۔ گلے کا ہار بنانا تو بڑی ہی خوش آئند بات ہے مگر شادی کا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔

وہ خانپور کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے وہیں کے ایک ملازم کو اپنا ہمراز بنا کر معلومات حاصل کرنا چاہا تھا کہ وہاں وحیدہ انجم نام کی کوئی لڑکی رہتی ہے یا نہیں؟ اگر رہتی ہے تو کیا وہاں پریکٹس کر رہی ہے؟ شادی کر لی ہے؟ کیا شوہر اور بچوں والی ہو گئی ہے یا اب تک کسی کا انتظار کر رہی ہے؟ وہ بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ شام کو ملازم نے آکر بتایا جن صاحب کے نام کی پلیٹ دروازے پر لگی ہوئی ہے وہ مر چکے ہیں۔ ایک بوڑھی خاتون ہیں جو تنہا اس کوٹھی میں اپنی خادماؤں کے ساتھ رہتی ہیں اور ان کی بیٹی کراچی میں ہے۔ ابھی شادی نہیں کی۔"

"کیوں نہیں کی؟" شہریار نے پوچھا "کیا کہیں سے رشتہ نہیں آتا ہے؟"

ملازم نے کہا۔ "نہیں، حضور! ایسی بات تو نہیں ہے۔ ان کی بیٹی بڑی خوبصورت ہے۔ ڈاکٹرنی ہے۔ پھر یہ کہ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے دولت میں کھیلتی ہے۔ چاروں طرف سے رشتے ہی رشتے آتے ہیں۔ میری گھر والی کہہ رہی تھی کہ وہ ڈاکٹرنی شادی سے انکار کرتی ہے۔ اس لئے کبھی خانپور اپنے رشتہ داروں کے ہاں نہیں آتی۔ ہمیشہ کراچی میں رہتی ہے۔"

شہریار کے دل نے دھڑک دھڑک کر کہا۔ "وہ شادی سے انکار کرتی ہے۔ اب تک میرا انتظار کر رہی ہے۔ اپنے ماں باپ سے اور اپنے خاندان والوں سے بھی دور تنہا زندگی گزار رہی ہے۔"

پہلے تو اس کے جی میں آیا کہ کوٹھی میں جائے اور وحیدہ کی والدہ سے اس کا کراچی والا پتہ معلوم کرے۔ پھر اس کے دماغ نے سوال کیا اگر اس بوڑھی خاتون نے پوچھا کہ تم کون ہو اور میری بیٹی کا پتہ کیوں معلوم کر رہے ہو تب وہ کیا جواب دے گا؟

تب اُسے بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے اور اُس کی بیٹی سے کیا رشتہ رہا ہے اور جب پُرانا رشتہ ظاہر ہو گا تو وہ بوڑھی خاتون نفرت سے اُسے دیکھیں گی، پھر وہ یہ معلوم کریں گی کہ اس کا نام کیا ہے؟ وہ کہاں رہتا ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ اسے اپنی اصلیت ظاہر کرنی پڑے گی۔ نہیں کرے گا تو وہاں کس منہ سے جائے گا؟ کس رشتے سے جائے گا؟ کس نام سے جائے گا؟

وہ خانپور سے واپس چلا گیا۔ ایک مجرم کسی کو اپنا اصلی چہرہ نہیں دکھا سکتا۔ لاہور پہنچنے کے بعد وحیدہ خوب یاد آتی رہی۔ وہ خوب اضطراب میں مبتلا رہا۔ بعد میں اس نے سوچا کہ اسی ملازم کے ذریعے وحیدہ کا کراچی والا پتہ کیوں نہ معلوم کیا۔ اگر پتہ کسی طور چل جاتا تو کراچی جاتا اگر وحیدہ کا سامنا نہ کر سکتا تب بھی چوری چھپے اسے دیکھتا کہ وہ کس حال میں ہے؟ کیسی ہے؟ تنہا کس طرح زندگی گزار رہی ہے؟ کچھ تو

اس کے متعلق معلومات حاصل ہو تیں۔ ہو سکتا تھا پھر کسی طرح پرانی محبت کے رشتے استوار ہو جاتے۔

ایک ماہ بعد پھر خانپور جانا ہوا تو وہاں اس نے اسی ملازم سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو اس کوٹھی میں بھیجے اور کسی طرح وحیدہ انجم کا پتہ معلوم ہو جائے۔ ملازم نے بتایا "صاحب! اب تو اس کوٹھی میں کوئی نہیں ہے۔ وہاں تالا لگا ہوا ہے۔ بس ڈاکٹرنی کی ماں بھی مر چکی ہے۔"

"اس کے کسی رشتے دار سے معلوم کرو کہ وہ کراچی میں کہاں رہتی ہے؟"

ملازم نے اپنی گھر والی کو معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کے رشتہ داروں کے پاس بھیجا اور اسے سمجھا دیا کہ معلومات حاصل کرنے کے دوران بڑے صاحب کا نام درمیان میں نہ آئے۔ اس کی گھر والی سمجھ دار تھی۔ واپس آکر بتایا کہ اس کے رشتہ دار اس ڈاکٹرنی کا پتہ نہیں جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پچھلے کافی برسوں ـــ سے انہوں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ وہ ادھر آتی ہی نہیں ہے۔ کراچی سے اگر کبھی یہاں آئے گی تو اس کا پتہ معلوم ہو گا۔

وہ نہ ملی۔ وحیدہ کی محبت میں عجب حال تھا۔ وہ اسے تلاش بھی کر رہا تھا اور اس کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے دور ہی دور سے دیکھ کر نگاہوں کی پیاس بھی بجھانا چاہتا تھا اور یہ بھی توقع کر رہا تھا کہ شاید وحیدہ پہلے کی طرح مل بیٹھے اور وہی پہلے جیسی محبت کا دور شروع ہو جائے۔

بیئر کی تیسری بوتل بھی خالی ہو گئی۔ اب نشہ کچھ جم رہا تھا نگاہوں کے سامنے وحیدہ ہی وحیدہ، انجم ہی انجم نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تلاش ختم ہو گئی ہے، جھجک مٹ گئی ہو اور اپنی وحیدہ سے سامنا کر رہا ہو۔ ایسے ہی وقت اسے وحیدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی "مجھے اندر جانے دو ـــ ہٹ جاؤ، راستے سے۔"

وہ وحیدہ کی آواز کو لاکھوں میں پہچانتا تھا۔ اگرچہ اس سے جدا ہوئے چار برس گزر گئے تھے لیکن اس کی ادائیں نگاہوں کے سامنے اب بھی گھومتی تھیں اور اس کی آواز اب بھی کانوں میں رس ٹپکاتی تھی۔ وہ لڑ رہی تھی، جھگڑ رہی تھی۔ اس کے پاس آنا چاہتی تھی۔ وہ نشے کی حالت میں کبھی کھڑکی کی طرف اور کبھی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ کھڑکی اور دروازے توڑ کر اس کے پاس آنا چاہتی ہو۔

وہ نشے میں بڑبڑایا "توڑ دو ان دروازوں کو جو ہمیں صدیوں سے جدا کر رہے ہیں۔ آ جاؤ میری جان.... آ بھی جاؤ۔"

دوسرے ہی لمحے ایک دھڑاکے سے دروازہ کھل گیا اور وہ نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنے لگا۔ وحیدہ انجم سر سے پاؤں تک وہ وحیدہ انجم ہی تھی اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

وہ حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ شدید حیرانی سے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

شہریار نے اپنے سر کو جھٹک کر اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا میں بہت زیادہ نشے میں ہوں؟ کیا نشے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ آگے بڑھ کر اسے ہاتھ لگاؤں گا تو وہ غائب ہو جائے گی؟

وحیدہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی تھی۔ وہ پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زبردستی دروازہ کھول کر سیلون کار میں گھسنا چاہے گی تو اسے اپنا نیک نام نظر آ جائے گا۔ کیا یہ وہی ہے؟ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا اور یقین نہ کرنے کے باوجود بھی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

پلیٹ فارم پر ریلوے پولیس والوں نے اسے بتایا تھا کہ ادھر قریب ہی ڈیڈ لائن پر سیلون کار کھڑی ہوئی ہے۔ وہیں اس کا بچہ حفاظت سے ہے۔ ابھی انسپکٹر صاحب آئیں گے تو اسے اس سیلون کار میں پہنچا دیں گے لیکن وحیدہ انجم، انسپکٹر کے آنے تک انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنے بیٹے کو دیکھنے، اسے پانے اور اسے اپنے سینے سے لگا کر چومنے کی بے چینی تھی۔ وہ وہاں خود ہی ایک قلی کو اپنے ساتھ لے کر نکلی۔ تاکہ وہ اسے سیلون کار تک پہنچا دے۔ اب وہ وہاں پہنچ کر چند لمحوں کے لئے اپنے بچے کو بھول گئی تھی۔ سچویشن ہی کچھ ایسی تھی کہ جسے چار برسوں سے گم کر دیا تھا۔ اس نے اچانک ہی سامنے آ کر ساری دنیا کو بھلا دیا تھا۔

اب وہ ایک لمحہ فیصلے کا تھا کہ اس سے روٹھ جائے یا معاف کر دے اس کے گلے لگ جائے یا غصے سے منہ پھیر کر چلی جائے۔ ادھر چند برسوں میں اس نے کتنے ہی ڈراؤنے خواب دیکھے تھے کہ وہ آیا تھا اور چلا گیا تھا اور پھر چلا جائے تو؟ بس اسی خوف نے اسے دہلا دیا۔ وہ ایک دم سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ گئی پھر جس کا گریبان پکڑنا تھا اس کا گریبان بن گئی۔ جس کا کلیجہ نوچنا تھا اس کے دل سے لگ گئی۔ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس لئے رونے لگی کہ وہ سمجھائے، منائے۔ جب ہی تو یقین ہو گا کہ وہ اپنے آنسو پونچھنے والے کے پاس پہنچ گئی ہے۔

ابھی وہ گھڑی آئے گی جب وہ اسے بری طرح جھڑک دے گی، اس سے الگ ہو جائے گی۔ اسے نفرت سے بے بھاؤ کی سنائے گی۔ اسے شرم دلائے گی اور اسے چھوڑ کر چلی جانے کی دھمکیاں دے گی۔ ابھی بہت کچھ ہونا تھا۔ اس لئے نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ابھی اپنے اختیار میں نہیں تھی۔

کبھی وہ اپنے ـــ ہاتھوں سے اس کے چہرے کو سمیٹ کر دیکھتی تھی۔ ہاں! یہی تو وہ صورت ہے جو مجھے رلاتی ہے۔ وہ رتجگے رہتے اس کی آنکھوں میں جھانکتی تھی۔ یہی وہ آنکھیں ہیں جو میری آنکھوں کو جگائے رکھتی تھیں۔ کبھی وہ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اپنے اوپر جھکا لیتی تھی۔ ہاں! یہی تو ہے وہ، جو میری تنہائیوں میں آ، آ کر مجھ پر جھک

جاتا تھا اور سمجھاتا تھا کہ میں تمہارا آسمان ہوں۔ اپنی دھرتی سے سرک کر کہاں جاؤں گا؟

شہریار کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ پہلے وہ مدہوشی میں اسے پکار رہا تھا۔ اب ہوش میں اسے پکار رہا تھا۔ اس کے آنسو پونچھ رہا تھا اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ان چند لمحوں میں پچھلی ساری ملاقاتوں کو یاد کر رہا تھا کہ وہ اسے پا کر کیسی پاگل ہو جاتی تھی۔ صرف اسے یاد رکھتی تھی۔ ساری دنیا کو بھلا دیتی تھی۔ آج بھی اس پر ایسی ہی جنونی کیفیت تھی۔ اس نے اسے جھنجھوڑ کر سمجھانا چاہا: "وحیدہ! چپ ہو جاؤ، دیکھو! میں ہی تمہارے سامنے ہوں۔ میں تمہارا نیک نام ہوں۔۔۔ چپ ہو جاؤ۔"

یک لخت وہ چپ ہو گئی۔ ایک دم سے ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ اسے ذرا بھی نہ سنبھالتا تو فرش پر گر پڑتی۔ اس نے پریشان ہو کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ سمجھ میں آ گیا کہ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھایا۔ پھر ایک بیڈ پر لا کر اسے لٹا دیا۔

وہاں جتنی ہلچل مچی تھی۔ اتنی ہی خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیڈ کے قریب اس پر جھک گیا۔ اسے خوب جی بھر کر دیکھنے لگا۔ اس کی دیوانگی نے بتا دیا تھا کہ وہ اب اس کی ہے۔ اس کے انتظار میں جی رہی ہے۔ اگر وہ نہ ملتا تو اسی کے انتظار میں مر جاتی اسے بڑا پیار آیا۔ اس پر قربان ہونے کو جی چاہا۔ پھر وہ قربان ہونے لگا۔

اس لمحے اسے پتہ چلا کہ محبوبہ آخر محبوبہ ہوتی ہے۔ اسی کے لئے جیتی ہے۔ اسی کے لئے مرتی ہے اور ایک بیوی ہے جو اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔ اب سلمیٰ اس کی نظروں سے گر رہی تھی وہ فیصلہ کر رہا تھا کہ وحیدہ کو کہیں نہیں جانے دے گا۔ اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لے گا۔ سلمیٰ نے ذرا بھی اعتراض کیا تو اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا۔

اچانک اسے عقل آئی کہ وہ بے ہوش پڑی ہے۔ اسے ہوش میں لانا چاہئے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف گیا۔ وہاں سے فوراً ہی ایک گلاس میں پانی لے کر آیا۔ پھر پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر مارنے لگا۔ ذرا سی دیر میں وحیدہ نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ پھر وہ اپنے سر کو دائیں سے بائیں حرکت دینے لگی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ شہریار اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ دھڑکتے دل سے سوچ رہا تھا کہ اس وقت اس کے لبوں پر اپنے نیک نام کا ہی نام ہو گا۔ وہ گلاس کو ایک طرف رکھ کر پھر کان لگا کر سننے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ آواز دے رہی تھی۔ "کبیر۔۔۔۔ کبیر۔۔۔۔ تم کہاں ہو؟"

اس کا منہ لٹک گیا۔ ساری خوش فہمی خاک میں مل گئی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اتنے برسوں میں وحیدہ نے صرف اسے یاد کیا ہے۔ اب پتہ چل رہا تھا کہ کوئی کبیر اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ ہوش میں آتے وقت اسی کا نام اس کے لبوں سے سنائی دے رہا تھا۔ وہ پھر بولنے لگی۔ "میرے بیٹے! میرے بچے! تم کہاں ہو؟ اپنی ماں کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے میرے لال؟"

وہ حیران رہ گیا۔ کیا یہ ماں بن گئی ہے؟ کیا اس نے شادی کر لی ہے؟ گویا اس نے میرے انتظار میں یہ دن نہیں گزارے۔ کوئی اس کا جیون ساتھی ہے۔ اور اس جیون ساتھی سے اس کی کوئی اولاد ہے جسے وہ یاد کئے جا رہی ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بے یقینی سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ دل نہیں مانتا تھا کہ یہ حسینہ جو اس کی رہی تھی، کسی اور کی ہو گئی ہے۔

وحیدہ نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے وہ ماحول اجنبی سا لگا پھر شہریار کی موجودگی نے ساری اجنبیت دور کر دی۔ سب کچھ یاد آ گیا کہ ابھی وہ اس کی پناہ میں رو رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ لیٹی رہی۔ اپنے اندر کمزوری محسوس کرتی رہی۔ پھر ایک کہنی بیڈ پر ٹیک کر آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھنے لگی۔ اس نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر شہریار کو دیکھتے ہوئے پوچھا: "تم۔۔۔۔ تم یہاں کیسے ہو؟ یہاں کس حیثیت سے ہو؟ چیف مکینیکل انجینئر کون ہے؟"

اس نے پوچھا: "پہلے تم بتاؤ۔ کیا تم نے شادی کر لی ہے؟ تم ابھی کسی کا نام بڑبڑا رہی تھیں۔ پھر اپنے بچے کو پکار رہی تھیں۔ کیا تم کسی بچے کی ماں ہو؟"

وحیدہ نے اپنے دونوں ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ اسے ذرا دیر غصے سے دیکھتی رہی پھر بولی: "تمہارے جھوٹ اور فریب نے تمہاری بے وفائیوں نے مجھے اتنی عقل دی ہے کہ لڑکیوں کو پہلے دوسروں کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہئے۔ اپنے سوال کا جواب طلب کرنا چاہئے جب میں تم سے ملا کرتی تھی تو تمہارے ہر سوال کا جواب دیا کرتی تھی۔ اپنے ہی متعلق بتاتی چلی جاتی تھی۔ تمہارے متعلق پوچھتی تو تم جواب دینے کے بجائے ٹال دیتے، بہلا دیتے اور میں بہل جاتی۔ اب تمہارے کسی سوال کا جواب تمہیں اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک میرے سوال کا جواب تم نہیں دو گے۔"

شہریار نے ایک گہری سانس لی۔ پھر ہار کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا: "ٹھیک ہے پہلے اپنے سوالوں کا جواب سن لو۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا، تمہیں دھوکہ دیا تھا۔ جب تم سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو اس وقت میری شادی کو دو سال گزر چکے تھے۔ میں ایک بہت عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس وقت میں ریلوے کا ایک جونیئر آفیسر تھا۔ جگہ جگہ دورے پر جاتا تھا، ماحول بدلتا تھا، مزاج بدلتا تھا اور بڑی ہی

عادتوں کو اپناتا رہتا تھا۔ میں شراب اور شباب کا عادی ہو گیا۔ جب تمہیں دیکھا تو تمہارا دیوانہ بن گیا۔ ارادہ تھا کہ تمہیں بیوقوف بنا کر، تم سے کھیل کر، تمہیں بھی چھوڑ دوں گا لیکن تمہیں چھوڑنے کے بعد میں سکون سے نہیں رہ سکا۔ تم پہلی عورت ہو جو مجھ جیسے عیاش آدمی کو بار بار یاد آتی رہیں۔ میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ دو بار خانپور گیا اور اپنے ایک ملازم کے ذریعے تمہارے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اتنا حوصلہ نہیں ہوا کہ خود جا کر تمہاری والدہ سے ملتا۔ جب دوسری بار گیا تو تمہاری والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ بہرحال میں تم سے کترانے کے باوجود تمہیں تلاش کرتا رہا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بیوی میرے پاس ہوتی اور میں تمہارے پاس ہوتا۔ باتیں اس سے ہوتیں اور پیار تم سے کرتا۔ وہ روٹھ جاتی تو میں تمہیں منانے لگتا۔ میں نے اپنی شریک حیات کی خوشیوں کا ایک ایک لمحہ چرا کر تمہیں دیا ہے۔ اور تمہیں تلاش کیا ہے۔ کاش کہ تم نہ ملتیں۔ مجھے یہ نہ معلوم ہوتا کہ تم کسی کے بچے کی ماں بن گئی ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر چیخ کر بولی۔ "مجھے گالی مت دو۔ میں تمہارے بچے کی ماں ہوں۔"

وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ کہنے لگی۔

"میرے نیکنام! تم نے مجھے بدنامیوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ تمہارے بچوں کی خاطر میں اپنے ماں باپ سے چھوٹ گئی۔ اپنے رشتہ داروں سے اب تک منہ چھپاتی پھر رہی ہوں، دنیا والوں سے کتراتی ہوں، کوئی سوسائٹی نہیں اپنائی۔ کبھی بھی سوسائٹی میں جاؤں گی تو مجھ سے میرے بچے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ مجرم تم ہو، سزا میں پا رہی ہوں۔ میں یہ سوچ کر صبر کر لیتی تھی کہ شاید تم کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو۔ میرے پاس پہنچنے سے پہلے اس دنیا سے اٹھ گئے ہو اور اگر کہیں ہو تو بڑی مجبوریوں میں گرفتار ہو۔ جب بھی تمہاری مجبوریاں ختم ہوں گی تو میرے پاس ضرور آؤ گے۔ بس! انہی خیالوں میں خود کو بہلاتے ہوئے میں نے اتنا عرصہ گزار دیا ہے۔"

وہ یک بیک چیخ پڑا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں کیسے یقین کروں کہ تم نے میرے بعد شادی نہیں کی؟ اگر شادی نہیں کی تو کسی اور کو اپنا نہیں بنایا؟ کیا ثبوت ہے کہ میں تمہارے بچے کا باپ ہوں۔ کیا تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو؟"

وہ پہلے تو بالکل سکتے کی حالت میں رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ کبھی وہ ملے گا تو اپنے بچوں کا باپ بننے سے انکار کرے گا۔ اس پر اس طرح الزام عائد کرے گا۔ پھر وہ بھی بپھر گئی۔ "دیکھو! میں پہلی اور آخری بار سمجھاتی ہوں کہ مجھے کوئی بازاری عورت نہ سمجھنا۔ میں نے اپنی جوانی، اپنی پارسائی، اپنے ماں باپ کا اعتماد اور اپنی انا سب کچھ تم پر قربان کر دی۔ اس کے باوجود تم مجھے ذلیل کرو گے تو میں تمہاری محبت کو اٹھا کر طاق پر رکھ دوں گی اور تمہیں عدالت تک گھسیٹتے ہوئے لے جاؤں گی۔ میں کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہوں کہ اپنا سب کچھ لٹا کر اپنی غربت کے ہاتھوں مجبور ہو جاؤں۔ تم ایک عزت دار ہو۔ ریلوے کے ایک بہت بڑے آفیسر ہو۔ میں ایک بہت معروف لیڈی ڈاکٹر ہوں۔ نہ تمہیں بے وجہ بدنام کر سکتی ہوں اور نہ تمہیں بدنام کرنے کی سازش میں خود کو دنیا کے سامنے تماشہ بنا سکتی ہوں۔ اگر میں یہ ثابت نہ بھی کر سکی کہ ان بچوں کے باپ تم ہو۔ تب بھی تمہیں دنیا والوں کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھوں گی۔"

شہریار نے غصے میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ پھر بند کر لیا۔ اچانک ہی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ وہ بارود کے ایک ڈھیر کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ مخالفت کی ذرا سی بھی چنگاری دکھائے گا تو ایک دھماکے سے اڑ جائے گا۔ اوہ! بیوی خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ اس پر کتنی ہی دھونس جماؤ، چوں نہیں کرتی۔ اس وقت سلمٰی یاد آ رہی تھی۔ وہ بے بسی سے وحیدہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ الٹے پاؤں اپنے پیچھے ایک برتھ پر بیٹھ اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگا۔ وحیدہ نے پوچھا۔ "ہمارا بچہ کہاں ہے؟"

شہریار نے ایک جھٹکے سے سر کو اٹھایا۔ وہ لفظ "ہمارا" پر اعتراض کرنا چاہتا تھا۔ پھر عقل آ گئی۔ اس نے سر کو جھکا کر سوچا۔ وحیدہ ایک بچے کی بات کر رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم ہے کہ دوسرا بچہ بھی میرے پاس پرورش پا رہا ہے اور اس نے دونوں کو ناجائز کہہ کر سلمٰی کو ان کے ساتھ یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اب وہی ناجائز بچے میرے ہو رہے ہیں۔ کیا یہ میرے ہیں؟ کیا میں انہیں اپنا تسلیم کر لوں؟"

وہ اپنے اندر جھانکنے لگا۔ اس کے ضمیر نے کہا "بے شک وحیدہ کو دیکھو، اس کی محبت کو اور اس کے مزاج کو سمجھو۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور دولت مند لڑکی تھی۔ مجھ سے دھوکہ کھانے کے بعد کسی سے بھی شادی کر کے اپنا ایک گھر بسا سکتی تھی۔ وہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اس بچے کو ضائع کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ محبت کی ماری محبت میں مر گئی۔ اب میں اس پر اعتماد نہیں کر رہا ہوں۔ اعتماد نہ کروں تب بھی مجھے نجات نہیں ملے گی۔ یہ کوئی ایسی ویسی نہیں ہے۔ جو کہہ رہی ہے کر دکھائے گی۔ جہاں میرے لئے برسوں انتظار کیا ہے اور اس بچے کی پرورش کی ہے وہاں وہ بچے کو جائز حقوق دلانے کے لئے عدالت تک بھی پہنچ جائے گی، خود کو تماشہ بنائے گی مگر اپنی بات منوا کر رہے گی، نہیں منوا سکی تو مجھے ہر جگہ بدنام کرتی پھرے گی۔ میں کتنوں کو جواب دیتا رہوں گا کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ سوسائٹی میں میرا ریکارڈ کچھ اچھا تو نہیں ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر وحیدہ کو دیکھا۔ وہ بولی "میں پوچھ رہی ہوں کہ ہمارا بچہ کہاں ہے؟"

"میری والدہ اسے اپنی بہن کے ہاں لے گئی ہے۔"

"کیوں لے گئی ہے؟ یہاں میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"میں کسی کے بچے کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بہن کے گھر میں اس بچے کے ساتھ رہے۔ جب اس کے ماں باپ آئیں گے تو وہیں سے لے جائیں گے۔"

وہ بولی: "تمہاری ہچکچاہٹ سے یوں لگتا ہے جیسے تم کچھ چھپا رہے ہو۔ دیکھو مجھے میرا بچہ واپس لا دو۔ تم نے پہلی بار مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے شادی کرو گے۔ میں آج اسی خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں تمہارے بچوں کی ماں ہوں۔ میں نے ایک نہیں تمہارے دو بچوں کو جنم دیا ہے۔ وہ جڑواں تھے بعد میں آپریشن کے ذریعے انہیں الگ الگ کیا گیا۔ میں تمہاری شرافت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ اگر تم کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہو، ایک خدا پر بھروسہ کرتے ہو، ایک آخری رسول ﷺ کو مانتے ہو تو مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں جو اتنے عرصے تک تمہارا انتظار کرتی رہی، تمہارے بچے پالتی رہی، تو یہ محض میری محبت کی دیوانگی نہیں تھی، میری حیا کا تقاضہ بھی تھا کہ میں اپنے بچے کو تمہارا نام دوں اور میں یہ نام دے کر رہوں گی۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں برتھ کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ "مجھے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ بہت سی باتیں سوچتا ہوں تو تم سچی نظر آتی ہو۔ تم چاہتیں تو ان بچوں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی انہیں مٹا دیتیں۔ مگر تم نے میری محبت میں، میرے انتظار میں انہیں جنم دیا میری خاطر بدنامیاں مول لیں۔ سوچتا ہوں کہ قدرت نے عجب تماشہ دکھایا ہے۔ میرے ایک بچے کو میرے ہی پاس پرورش کرنے کے لئے بھیج دیا۔ میرے والد کی سرپرستی میں ان بچوں نے جنم لیا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ مجھے اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔"

وحیدہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی باتیں سن رہی تھی اس نے پوچھا: "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ وہ تو ایک بہت ہی شفیق بزرگ تھے۔ بہت ہی شریف گھرانے کے لوگ تھے۔ وہ اور ان کی بہو نے جیسا میرا ساتھ دیا ہے، ویسا کسی خون کے رشتے نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ ہاں ایک بچہ اسی شریف عورت کی گود میں پرورش پا رہا ہے۔"

شہریار نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "ہاں! اس خاتون کا نام سلمیٰ ہے اور ان بزرگ کا نام ملک دین محمد تھا۔"

وہ حیرانی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب فرش پر گھٹنے ٹیک کر بولی: "تم کیسے جانتے ہو؟ کیا...؟ کیا...؟"

"ہاں! ملک دین محمد میرے والد ہیں اور سلمیٰ میری بیوی ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی: "تو پھر تم اپنے دونوں بچوں کو تسلیم کر رہے ہو؟"

"ہاں! بچوں کی تاریخ پیدائش کے حساب سے تم نے میرے ہی بچے کو جنم دیا ہے۔ جب میں آخری بار تم سے مل کر گیا اور حادثے کا شکار ہوا تو اس کے تقریباً نو ماہ کے بعد یہ پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت تک میرے علم کے مطابق اور میرے اعتماد کے مطابق تمہاری زندگی میں میرے سوا کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ میرے بچے ہیں۔"

وحیدہ نے خوش ہو کر اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ پہلے محبوب ملا تو وہ خوشی اور تھی۔ اب بچوں کا باپ ملا تو مارے خوشی کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شہریار نے اسے قدموں سے اٹھا کر دل سے لگا لیا۔ اگر ڈاکٹر ملک کی یہ رپورٹ درست ہے کہ وہ آئندہ بچوں کا باپ بنا دیا تھا اب وہ لاولد نہیں رہے گا۔ وحیدہ سے اسے بچھڑی ہوئی محبت مل رہی تھی، بچے مل رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار اسے پیار رہا تھا وحیدہ کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ ساری شکایتیں، ماضی کی جفائیں بھول کر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ آج اس کے لئے عید کا دن تھا۔ اب وہ اپنے محبوب کے ساتھ اپنا دوسرا بیٹا بھی ملنے والا تھا۔ ایسے وقت وہ سلمیٰ کو بھول گئی تھی۔

اسی وقت دروازے پر سے سلمیٰ کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں چونک کر الگ ہو گئے۔ دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ سلمیٰ کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ بڑے صبر اور تحمل سے ان کے ملاپ کا تماشہ دیکھتی رہی تھی۔ اس نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا "یہاں تک تو بہت اچھی فلمی کہانی بن گئی۔ ایک ہیرو اپنے بچوں کا باپ بنتا ہے اور اسے خبر نہیں ہوتی۔ ہیرو کے باپ کی سرپرستی میں بچے جنم لیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک بچہ ہیرو کی گود میں پرورش پاتا ہے آخر میں ہیروئن بھی آ کر مل جاتی ہے۔ تماشہ دیکھنے والے ہنسی خوشی گھر چلے جاتے ہیں لیکن یہ فلم کا نہیں، زندگی کا تماشہ ہے جواب شروع ہو گا۔ اب کیا ہو گا، میرے سرتاج؟ میرے ہوتے ہوئے آپ دوسری عورت کو گلے کیسے لگائیں گے؟ آپ ان ناجائز بچوں کے باپ کیسے بنیں گے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے وحیدہ نے آگے بڑھ کر پوچھا: "بہن! میرے بچے کہاں ہیں؟"

سلمیٰ نے جواب دیا۔ "تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ بچے خیریت سے ہیں۔ میرے شوہر نے حکم دیا تھا کہ وہ ناجائز ہیں انہیں یہاں سے لے جاؤں۔ جب تک بچوں کی ماں نہ ملے میں ان بچوں کے ساتھ اپنی بہن کے ہاں رہوں لیکن یہاں سے نکل کر مجھے خیال آیا کہ میری بہن ان میں سے ایک بچے امیر کو ہمارا بچہ سمجھتی ہے۔ دوسرے ہمشکل کبیر کو دیکھے گی تو طرح طرح کے سوال کرے گی۔ پھر مجھے شوہر کے حکم کے مطابق امیر سے بھی تو دستبردار ہونا ہے۔ بہن کے ہاں جانے سے معاملہ بگڑ جاتے گا۔"

وہ بولتے ہوئے اندر آ گئی۔ دروازے کو بند کیا۔ پھر کہنے لگی۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ اپنے ہی مرد کے گناہ کو چھپانے کے لیے اپنی

بہن کے ہاں جانے سے ڈر رہی ہوں۔ میں وہاں نہیں گئی۔ پھر کہاں جاتی ہے؟"

اس نے شہریار کو دیکھتے ہوئے کہا۔"آپ نے مجھے آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہاں بچوں کو لے کر واپس بھی نہیں آسکتی تھی۔ آخر میں نے ایک ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ وہاں دونوں بچوں کو آیا کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔ ارادہ تھا کہ پھر آپ کی خوشامد کروں گی۔ آپ کے قدموں میں گر کر امیر کو اپنا لینے کی التجا کروں گی۔ میں مجبور تو نہیں ہوں کہ قدموں میں گر جاؤں گی۔ بیوی ہوں گرنے ہی کی بات سوچ سکتی ہوں۔"

شہریار نے کہا۔"اب تو تم بولو گی۔ میری ایک کمزوری تمہارے ہاتھ آگئی ہے۔"

وہ بولی۔"میری کوئی کمزوری نہیں ہوتی تب بھی آپ بولتے ہیں۔"

وحیدہ سر جھکائے کھڑی تھی ندامت سے بولی۔"بہن! ابھی میں نے ان کی زبان سے آپ کا نام سنا تو بڑی حیران ہوئی دوسرے لمحے وہ حیرانی اس خوشی میں بدل گئی کہ میں یہاں اپنے دوسرے بیٹے امیر کو پاؤں گی۔ اُسے مدتوں بعد سینے سے لگا کر چوم سکوں گی۔ سچ ہے، انسان خواہ کتنا ہی پُر خلوص اور ملنسار ہو وہ اندر سے تھوڑا خود غرض ضرور ہوتا ہے۔ یہ میری خود غرضی ہے کہ میں آپ کے احسانات کو بھول کر اپنے نیک نام کی قربت سے بہتی چلی گئی۔ یہ بھی بھلا دیا کہ یہ نیک نام میری محسنہ کا جیون ساتھی ہے۔"

سلمیٰ نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"چلو کوئی بات نہیں۔ تمہیں غلطی کا احساس ہو گیا، یہ بڑی بات ہے۔ اب میرے ساتھ ہوٹل چلو اور اپنے دونوں بچوں کو لے کر چلی جاؤ۔ میرے شوہر جس چیز کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں، میں اُسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔"

وحیدہ نے حیرانی سے پوچھا۔"کیا اتنے عرصے تک امیر کو سینے سے لگائے رکھنے کے بعد آپ اُسے آسانی سے چھوڑ سکیں گی؟" ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ اپنی آواز میں آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے بولی۔"میں نے پرائی اولاد کو اتنا پیار دیا یہ میری نادانی تھی۔ مجھے پہلے ہی سمجھنا چاہیے تھا کہ میں ماں نہیں، ایک پالنا ہوں۔ بچہ پالنے سے ڈھلک کر اپنی ماں کی گود میں گرتا ہے۔ پالنا تو خالی ہی رہ جاتا ہے۔"

شہریار نے جھجکتے ہوئے کہا۔"تم خالی نہیں رہو گی۔ اب صرف امیر ہی نہیں، کبیر بھی تمہارا ہے۔ تم دونوں بچوں کو محبت اور ممتا دے سکتی ہو۔ اب میں اعتراض نہیں کروں گا۔"

"کیا آپ کے اعتراض نہ کرنے سے وہ بچے جائز ہو جائیں گے؟

کیا گناہ دھل جائیں گے؟ کیا آپ دونوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اپنے رسولؐ کی شریعت کے مطابق نکاح پڑھایا تھا؟ کیا آپ نے ان دونوں بچوں کو پیدا کرنے کے لیے دین اور دنیا کی رضامندی حاصل کی تھی؟ اگر نہیں کی تھی تو اب آپ اخلاق اور تہذیب کی کونسی نئی کتاب کھولیں گے؟ مجھ جیسی اندھا اعتماد کرنے والی بیوی کو کون سا نیا سبق پڑھائیں گے؟"

وحیدہ نے سلمیٰ کے ہاتھوں کو تھام کر عاجزی سے التجا کی۔ "بہن! میرے بچوں کو ناجائز نہ کہیں، کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ اگر یہ الزام نہ مٹا تو یہی بچے بڑے ہو کر مجھ پر تھوکیں گے۔"

شہریار نے بھی ذرا عاجزی سے کہا۔"میں سمجھتا ہوں۔ تمہیں ہم پر بہت زیادہ غصہ آرہا ہے۔ اس وقت تمہارے دماغ میں آندھیاں چل رہی ہوں گی۔ تم جب تک ہم پر کیچڑ اچھالتی رہو گی ہم برداشت کرتے رہیں گے۔ ہم خطاکار ہیں، ہمیں برداشت کرنا ہی ہوگا لیکن تمہارے غصے اور نفرت کی ایک انتہا ہوگی۔ ہر چیز فنا ہوتی ہے۔ تمہارا غصہ بھی ایک دن فنا ہو گا۔ تم ہم پر نفرت کا آخری لفظ بھی تھوک دو گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟ نہیں کبھی نہیں۔ میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔ تم میری ہی چوکھٹ پر جان دینے والی عورت ہو۔"

وہ غصے سے شہریار کو دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔"فی الحال یہ بتاؤ کہ بچے کس ہوٹل میں ہیں؟ میں انھیں واپس لے کر آؤں گا۔ اس بہانے تم دونوں سے ذرا دور چلا جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد تم اور وحیدہ یہاں تنہائی میں بیٹھ کر موجودہ حالات کو سمجھو اور مصلحت اندیشی سے سوچو کہ....."

وہ اب جو بات کہنا چاہتا تھا اُس کے لیے حوصلے کی ضرورت تھی۔ اس نے حوصلے کو ذرا جوان رکھنے کے لیے وحیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"کہ... ہم تینوں ایک... ایک ساتھ... یعنی کہ ایک ساتھ....."

یہ کہتے ہوئے اس نے سلمیٰ کو دیکھا تو بات حلق میں اٹک گئی۔ مطلب کی بات بول نہ سکا۔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔"مجھے ہوٹل کا پتہ اور کمرہ نمبر بتاؤ؟"

سلمیٰ نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا جیسے ہوٹل کے

پتے کو باہر نکلنے سے روک رہی ہو۔ ابھی وہ لڑائی کو جاری رکھنا چاہتی تھی۔ بحث کرنا چاہتی تھی کہ وہ بچے ناجائز ہیں۔ انھیں گود میں لیے کیوں جا رہے ہو؟ لیکن دماغ نے سمجھایا کہ وہ صدیوں تک لڑتی رہے گی تب بھی جیت نہیں سکے گی۔ اُسے اپنے اندر ذرا سی لچک پیدا کرنا چاہیے، حالات سے تھوڑا سمجھوتہ کرنے کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔

وہ منہ گھما کر بولی "ہوٹل دلشاد، کمرہ نمبر دس۔"

شہریار اپنی جگہ سے پلٹ کر تیر کی طرح کمرے سے نکل گیا۔

سلمٰی کے ڈوبتے دل نے کہا، "وہ محض بچوں کو لانے ہی نہیں گئے میرے لیے گڑھا کھودنے گئے ہیں۔ وہاں مجھے دفن کیا جائے گا۔ پھر میری قبر کی چھاتی پر میری سوکن کو بٹھایا جائے گا۔"

اس خیال سے سر چکرانے لگا۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ آہستہ آہستہ قالین پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وحیدہ اس کے روبرو بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک دونوں کے سر جھکے رہے۔ وہ اپنے اندر جیسے لڑ رہی تھیں۔ پھر انھوں نے نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا تو بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ تعجب ہے، کرتا کوئی ہے روتا کوئی ہے۔ وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

وہاں کوئی اُن کے آنسو پونچھنے والا نہیں تھا۔ انھیں خود ہی رونا تھا، خود ہی چپ ہونا تھا۔ وحیدہ نے ہچکیاں لے لے کر کہا "آپ نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ مجھے آپ کی ازدواجی زندگی میں آگ نہیں لگانا چاہیے۔ اپنے بچوں کو لے کر یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ مگر میں کیا کروں؟ وہ صرف آپ کے شوہر ہی نہیں میرے مجرم بھی ہیں۔ انھوں نے جس بُری طرح مجھے برباد کیا ہے وہ سارا قصہ آپ جانتی ہیں۔ آپ خود فیصلہ کریں۔ کیا میرے ساتھ انصاف نہیں ہونا چاہیے؟"

سلمٰی نے روتے روتے کہا "میں کہانیاں لکھنے والی ہوتی تو تمھاری حمایت میں قلم اٹھاتی۔ وکیل بیرسٹر ہوتی تو عدالت میں تمھارے حقوق کے لیے لڑنا شروع کر دیتی لیکن سب سے پہلے میں عورت ہوں۔ ایک سوکن کے حقوق کے لیے کیسے لڑوں؟ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

"آپ کی طرح ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتی۔ آپ اپنی جگہ قابلِ رحم ہیں۔ میں اپنی جگہ فریاد کناں ہوں۔ اپنے لیے انصاف چاہتی ہوں۔ ہمارا انصاف کون کرے گا؟ ہمارا انصاف تو ہمارا مرد ہی کرتا ہے نا؟"

"اور ہمارے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے مجبوراً سمجھوتہ کرنے کے لیے یہاں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہے۔ میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا سکتی ہوں مگر اپنے شوہر کو تمھاری طلب سے باز نہیں رکھ سکتی۔ تمھاری مظلومیت نے اور ان بچوں نے اُن کا پلّہ بھاری کر دیا ہے۔"

وحیدہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میں نے انھیں دھمکی دی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو تسلیم نہیں کریں گے تو میں انھیں عدالت میں چیلنج کروں گی۔ خود بدنام ہوں گی اور ان کی نیک نامی کی دھجیاں اڑاؤں گی۔ مگر ہم صرف دھمکیاں دے سکتی ہیں، دعوے کر سکتی ہیں۔ عمل نہیں کر سکتیں۔ اپنے مرد کے آگے اپنا سب کچھ ہار جانے کے بعد اُسے جیتنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ صرف جھکا ہوا سر رہ جاتا ہے۔ ہمارے لیے تو ان کی بدنامی ہماری بدنامی ہوتی ہے، ان کی عزت پر آنچ آتی ہے تو ہمیں اپنا سر ننگا لگتا ہے۔"

سلمٰی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "ہم دونوں کو جھکنا ہے، آج نہیں تو کل جھکنا ہے۔ ابھی وہ جاتے وقت ٹھیک ہی کہہ گئے ہیں کہ جب میرے غصے اور نفرت کی انتہا ہو جائے گی تو میں تھک ہار کر ان ہی کی چوکھٹ پر مرنے کے لیے بیٹھی رہ جاؤں گی۔"

وہ پھر رونے لگی۔ وحیدہ سرکتے ہوئے قریب آگئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے۔ وہ اور ٹوٹ ٹوٹ کر رونے لگی۔ وحیدہ اس کا سر اپنے شانے پر رکھ کر تسلیاں دینے کے انداز میں تھپکنے لگی۔ سلمٰی جیسے ڈوب رہی تھی۔ سہارا لے رہی تھی۔ اس سے لپٹ رہی تھی۔ بلک بلک کر کہہ رہی تھی "جیسی کرنی ویسی بھرنی کہاں ہوتی ہے۔ انھیں تو اپنی کرنی کے بدلے دو تحفے مل رہے ہیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "یہ مرد بڑے باکمال ہوتے ہیں۔ ہمیشہ نیک نام رہتے ہیں۔"

دیوتا
محی الدین نواب
21 حصّے
مت فی حصّہ
۲۵/